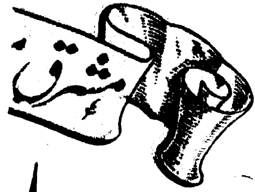
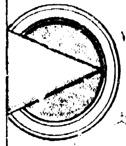
THE BOOK WAS DRENCHED





ore.

اوا



ڈاک کے ڈاکو:- ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکائتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملتا اور بیسوں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا حالانکہ چھاپنا اور پھر خریدار کو نہ بھیجنا پاگل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ ادبی دنیا ہر ماہ کی ۶ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے اگر [illegible] تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہو گیا۔ بس ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک کارڈ ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دراز سے پر ایک اور دستک دی جائے۔ (منیجر)

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ جنوری ۱۹۳۸ء

جلد ۱۶ — نمبر ۱

تصاویر:- (۱) رقص بہار (۲) صحرا کے تاجر

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ میں باہتمام مسٹر صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشیل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا

بزمِ ادب

مسرت کا مقام ہے کہ اہلِ ذوق نے ادبی دنیا کا سالنامہ ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہمارے قابل ادبی معاونین کے نتائجِ افکار اور ہماری ناچیز کوششوں کو قبولِ عام کا شرف حاصل ہوا۔ چونکہ مستقل خریداروں اور مضمون نگاروں کی خدمت میں سالنامہ رجسٹری کے ذریعہ سے بھیجا جا رہا ہے اس لئے اس کی روانگی میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ ان میں سے جن صاحبوں کو سالنامہ ابھی تک نہ ملا ہو وہ رجسٹری وزائد محصول کے لئے ۴ر کے ٹکٹ مینجر ادبی دنیا کو بھیج کر اپنی کاپی منگوا لیں۔ رجسٹری کے بغیر سالنامہ ارسال کرنا گم شدگی کو دانستہ دعوت دینا ہے۔ ہمیں چاروں طرف سے سالنامے کے متعلق قدر دانوں کی گرامی قدر آرا موصول ہو رہی ہیں۔ ہم ان تمام اخبارات رسائل اور ناظرین کے بے حد ممنون ہیں جنھوں نے علم و ادب کے اس ناچیز خادم کی خدمات کو بہ نظرِ تحسین دیکھا۔ آیندہ نمبر میں ہم ان آرا میں سے چند کا خلاصہ ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہمارے اہلِ قلم احباب میں سے بعض شاکی ہیں کہ اُن کے گرامی ناموں کے جواب میں دفتر کی طرف سے غیر معمولی تاخیر ہوتی۔ ہمیں ندامت سے اس امر کا احساس ہے کہ واقعی پچھلے دو ماہ میں ہم وقت پر خطوط کا جواب نہیں دے سکے۔ لیکن اس کی واحد اور قطعی وجہ سالنامہ کی ترتیب وتدوین اور اس کی نشر واشاعت میں ہماری حد درجہ مصروفیت تھی اور بس۔ اب ہم فرداً فرداً ہر صاحب کی خدمت میں جواب روانہ کر رہے ہیں اور اپنے تمام احباب سے اس غیر اختیاری تاخیر کے لئے معافی کے خواستگار ہیں۔

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ بے انتہا احتیاط کے باوجود سالنامہ میں کتابت کی کئی غلطیاں درست ہونے سے رہ گئیں۔ ان میں سے اس وقت تک جو نظر آئی ہیں۔ وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ سالنامے کے مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے مضامین بہ نظرِ احتیاط دیکھ لیں اور اگر مندرجہ ذیل غلطیوں کے علاوہ کوئی اور غلطیاں دیکھیں تو ایڈیٹر کو مطلع فرمائیں۔

نمبر	مضمون	صفحہ	کالم	سطر	غلط	صحیح
۱	برگفان	۱۹	۲	۷	نکتہ نگاہ	نقطۂ نگاہ
۲	گارڈنر خاندان کے اردو شعرا	۲۸	۱	۱۲	قمرہ	قمر
۳	جوانی کا خواب	۳۵	۱	۲۴	جدّت	جِدّت
۴	؍؍	۳۸	۱	۱۳	نخواستہ	ناخواستہ
۵	داغ	۵۱	۲	۷	منسخرے	مسخرے
۶	سوزِ ناتمام	۷۶	۱	۲۵	ہوتا ہے	ہوتا
۷	عزت اور مامتا	۹۴	۲	۷	چلا دیا	جلا دیا
۸	؍؍	۹۵	۲	۳	تمن	تین
۹	ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات	۹۹	۱	۱۲	کولی	کوئی
۱۰	؍؍	۹۹	۲	۱۷	یہاں	یہیں
۱۱	؍؍	۱۰۲	۲	۸	درع کدہ	درع ماکد
۱۲	ساقی نامہ	۱۳۳	۱	۱	نام نے مجھے	نام سے
۱۳	ہندوستان میں عورت	۱۳۵	۲	۳۲	ذکھپا	دیکھا
۱۴	؍؍	۱۳۸	۲	۱۴	رہے	رہی
۱۵	؍؍	؍؍	؍؍	؍؍	رکھتا	رکھنا
۱۶	چین کا ملک الشعرا	۱۴۷	۲	۳۰	بیان بھی	بیان
۱۷	؍؍	۱۵۶	۲	۲۹	ساتھ ساتھ	ساتھ
۱۸	؍؍	۱۵۷	۲	۵	طرف	طرف سے
۱۹	پروفیسر براؤن کے کتب خانہ میں	۱۸۳	۱	۱۴	اسلامی تصرف	اسلامی تصوف
۲۰	چنڈی داس	۱۹۵	۱	۵	مشترق	مستشرق
۲۱	؍؍	۱۹۷	۲	۸	تسکیں	تسکین
۲۲	پاربتی	۲۲۹	۱۲	۱۳	چڑھاتی	چڑھاتی

آئینۂ عالم

چین و جاپان کی موجودہ جنگ

[ذیل کے مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ چین و جاپان کے حالات پر علٰحدہ علٰحدہ روشنی ڈالی جائے۔ پہلے حصہ میں جاپان کے نقطۂ نظر سے حالات پر بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں چین کے نقطۂ نظر سے]

جاپان کے نقطۂ نظر سے

جاپان کے لئے چین کے خلاف موجودہ پالیسی اختیار کرنے کے علاوہ اور کوئی صورت نہ تھی۔ پہلے پہل جاپانیوں میں چین سے جنگ کرنے کے متعلق اختلاف پایا جاتا تھا لیکن اب تمام قوم یک جا ہوکر اس پر آمادہ ہے کہ نانکنگ کی حکومت پر قبضہ جمایا جائے۔

جاپان میں معدنیات کی بہت کمی ہے اور دوسرے ممالک یقیناً جاپان کی اس معاملے میں کوئی مدد نہیں کرسکتے۔

جاپان خیال کرتا ہے کہ اُس کے خلاف خواہ مخواہ پروپیگنڈا جاری ہے اور دوسری طرف چین سے ہمدردی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

چین جاپان کے لئے ایک وسیع بازار ہے اور اس کی تمام تجارت اسی ملک کے ساتھ وابستہ ہے۔ جاپان اسّی فی صدی چیزیں چین کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ جاپان کے دس کروڑ افراد کی تجارت چین کے پینتالیس کروڑ افراد کے ساتھ عین فطری ہے۔ اسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ جاپان چین سے خام اجناس خریدتا ہے اور چین اس کے بدلے میں جاپانی مصنوعات خرید لیتا ہے۔

لیکن باوجود اس کے چینی جاپانی تعلقات ہمیشہ خوشگوار نہیں رہے۔ چین ابھی تک انقلابی دور میں ہے۔ اس کے اربابِ حکومت بڑے بڑے جنگی افسر ہیں۔

لڑائی، خانہ جنگی، طوفان، بیماریوں اور دوسری آفات کی موجودگی میں تجارت کو فروغ نہیں ہوسکتا۔ ایسے ملک میں جہاں ہر وقت جنگ رہتی ہو، افسر بے انصاف ہوں اور اُن کی زندگی رشوت پر منحصر ہو اور آپس میں نااتفاقیاں ہوں تجارتی تعلقات کا استوار رہنا ناممکن ہے۔

اگر چین اور امریکہ کے ایسے تجارتی تعلقات ہوتے تو یقیناً امریکہ چین کی تجارت کو خیرباد کہہ دیتا لیکن جاپان کے لئے خیرباد کہنا ناممکن ہے کیونکہ جاپان کی تمام تر ترقی اسی پر منحصر ہے۔

جاپان نے بہت قلیل عرصے میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے اور صنعتی لحاظ سے اس کا کوئی ملک بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔

جاپان جیسے آلاتِ صنعت کسی کے پاس نہیں ہیں۔ انگلستان تک کے لئے بھی یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اپنے پرانے آلات چھوڑ کر جاپانی آلات استعمال کرے۔ لیکن ان وجوہات کے ہوتے ہوئے بھی جاپان کو اجازت نہیں کہ وہ کھلے بندوں کسی ملک سے تجارت کرسکے۔ اس کی تجارت کو نقصان پہنچانے کے لئے اس کے تجارتی مال پر زیادہ سے زیادہ محصولِ درآمد لگایا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے جاپان کی تجارتی ترقی کے لئے چینی بازار بہت ضروری ہے جاپان چاہتا ہے کہ چین کے ساتھ تجارت کرے لیکن چینی حکومت کی آئے دن کی مخالفت اور جاپانی مال کا بائیکاٹ ناخوشگوار فضا پیدا کر دیتا ہے

روس نے انتہائی کوشش کی کہ وہ جاپانی تجارت کو شکست دے

لیکن جاپان نے جنگِ روس و جاپان میں دس لاکھ انسان صرف اس لئے قربان

کہ روسی دریائے آمور کے آگے نہ بڑھ سکیں۔ صرف یہی نہیں

کو بالکل قطع کرنے کے لئے اس نے ۱۹۱۰ء میں کوریا پر قبضہ کیا لیکن روسی اثر ابھی تک بعینہٖ قایم ہے۔

جاپان کا دن بدن چین پر قبضہ کرنا صرف اسی رقیبانہ رشک کا نتیجہ ہے۔ روس اور چین کا معاہدہ ہوا لیکن جاپان اسے پرکاہ کے برابر بھی نہیں سمجھتا وہ صرف یہی پکارے جاتا ہے کہ چین ہمارے خلاف شورش بند کر دے۔

جاپان کو چین کے خلاف بہت سی شکایات ہیں اس میں بائیکاٹ معاہدوں کا توڑنا اور جاپان کو خواہ مخواہ ذلیل کرنا بھی شامل ہے۔ جاپان چین کے سیاسی و اقتصادی اضطراب سے خائف ہے اُسے معلوم نہیں کہ چین کا مستقبل کیا ہوگا۔

تاریخی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیائی طاقتیں ہمیشہ سے جاپان کو دھمکاتی آئی ہیں۔ مثلاً کوریا نے ۲۰۰ قبل مسیح میں منگولیا نے ۱۲۸۱ء میں چین نے ۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۵ء میں جاپان سے ٹکرانے کی کوشش کی۔ ۱۹۰۴ء و ۱۹۰۵ء کی روسی جاپانی جنگ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی یہ بالکل فطری معلوم ہوتا ہے کہ جاپان بھی حفظِ ماتقدم کے لئے کچھ تدابیر اختیار کرے۔

جاپان کے پڑوس میں اشتراکیت کا ہوا ہے اور وہ اس سے خوفزدہ ہے روسی اثر دن بدن ترقی پذیر ہے۔ اشتراکی خیالات کی خاصی اشاعت ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ جاپانی سامراج کے مقابلہ میں اشتراکی روس نیم اشتراکی چین کا ساتھی بن چکا ہے۔ منگولیا کا ایک بڑا علاقہ روس کے زیرِ اثر ہے۔ اشتراکیت کھلم کھلا جاپان کی مخالفت کر رہی ہے چین کی بڑی بڑی فوجیں اشتراکیت کے زیرِ اثر جاپان کا منہ چڑا رہی ہیں۔

جس طرح بیماری ہمیشہ غلاظت میں پھیلتی ہے بعینہٖ اشتراکیت لڑائی جھگڑوں کے دوران میں اپنا اثر دکھاتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے۔

اگر چین میں امن وامان ہوتا تو جاپان سب سے زیادہ فایدہ اٹھا سکتا لیکن شمالی صوبوں میں آئے دن کی جنگیں جاپان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ دخل اندازی کرے۔

اگر امریکہ خود معدنیات کے لحاظ سے اتنا امیر نہ ہوتا اگر اُس کے لوگوں کو چین سے کھلے بندوں تجارت کرنے نہ دی جاتی تو یقیناً اُسے بھی جاپان کی طرح لڑنا پڑتا۔

[illegible] ذرا خیال کیجئے اگر چین امریکہ کی تجارت اور میکسیکو میں رہنے والوں کو دھمکیاں دے رہا ہو، معاہدوں کی پرواہ نہ کرے امریکہ کے خلاف زور و شور سے پروپیگنڈا کرے تو امریکہ اپنے پڑوس میں یہی بدامنی دیکھ کر خاموش رہ سکتا ہے؟

سالہا سال تک منچوریا میں چین اپنی منظم شورش بند نہیں کرے گا۔ لالچی جنگی افسر ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔

جس طرح پریزیڈنٹ ولسن نے ویرا کروز پر قبضہ کیا اسی طرح جاپان نے بھی ۱۹۳۱ء میں چینی جنگی افسر شولانگ کے خلاف قدم اٹھائے۔ امریکہ نہایت آسانی سے میکسیکو کا محاصرہ اٹھا سکتا تھا لیکن جاپان کے کئی سالہ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جب تک قوت کے ساتھ اڈا نہ کیا جائے مانچوریا میں امن قایم کرنا محال ہے۔ جس طرح ٹیکساز نے امریکہ کے زیرِ سایہ ترقی کی اسی طرح مانچوریا نے بھی جاپان کی مدد سے آزادی حاصل کرنے کے بعد کافی ترقی کی۔ مانچوریا کے لوگ چین کے جنگی افسروں کے ظلم سے بچ کر بہت خوش تھے۔

چین مانچوریا کی آزادی تسلیم نہیں کرتا اور جاپان کے خلاف پروپیگنڈا اور جاپانی مال کا بائیکاٹ کرتا ہے۔

بائیکاٹ اقتصادی جنگ ہوا کرتی ہے۔ یہ جنگ صنعتی ملک کو اتنا ہی نقصان پہنچاتی ہے جتنا کہ سیاسی جنگ نوعِ انسانی کو۔

جاپان نہایت امن کے ساتھ چین سے تجارت کر سکتا ہے، اُسے چین پر قبضہ جمانے کی خواہش نہیں۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ چین کسی طرح اس کا دوست ہو جائے لیکن وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ چین پر کسی دوسرے ملک کا اثر قائم ہو۔

پچھلی جولائی اور اگست کی جنگ جاپان نے ہرگز شروع نہیں کی تھی۔ جاپان نے ہر ممکن نرمی دکھائی اور کوشش کی کہ یہ معاملہ زیادہ بڑھنے نہ پائے۔

موجودہ جنگ کی وجہ یہ تھی کہ چینی افواج شمال کی طرف بڑھنی شروع ہو گئیں۔ جاپان کے مشہور افسر قتل کئے گئے اور کوشش کی گئی کہ جاپان سے چھیڑ چھاڑ کی جائے۔ اب اس فضول کوشش کا نتیجہ ظاہر ہے۔

جب چینی جاپانی معاہدے کے خلاف چینی فوجیں شمال کی طرف بڑھیں تو جاپان کا مالی نقصان بہت زیادہ ہوا۔ پیکنگ میں جاپان کے خلاف بہت زہر اگلا گیا۔ جاپان کے خلاف نفرت بڑھانے میں ہر ممکن حربہ استعمال کیا گیا۔ نانکنگ نے بھی معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔

اس خلاف ورزی میں گیارہ جولائی کا لکھا ہوا معاہدہ بھی شامل ہے۔
اس شور و غوغا کے بعد جاپان کو مجبوراً احفاظتی قدم اٹھانا پڑا

اسی دوران میں جاپان کی طاقت کمزور کرنے کے لئے چین کو طاقت ور بنایا گیا۔ ۱۹۳۲ء کے معاہدہ کے خلاف شنگھائی میں لڑائی شروع کر دی گئی اور جاپانی جہازوں پر حملہ کیا گیا۔ چین نے اور بھی بہت حربے استعمال کئے جن سے جاپان مجبور ہو گیا کہ وہ دخل اندازی کرے۔

شنگھائی کی جنگ کی نسبت یہ کہنا کہ جاپان نے شروع کی سب غلط بات ہے۔ جاپان ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اتنے بڑے صنعتی اور تجارتی مرکز سے چھیڑ چھاڑ کرے لیکن اس کے باوجود جاپان کو کافی نقصان برداشت کرنا پڑا۔
اگر چین نے جاپان کے خلاف یہ چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ اگر وہاں جاپان کی اقتصادی پوزیشن پر حملے کئے گئے۔ اگر وہاں جاپانیوں پر ظلم کئے گئے تو جاپان کے لئے سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہیں کہ وہ بھی حفظِ ماتقدم کے لئے اینٹ کا جواب پتھر سے دے۔

جاپان چاہتا ہے کہ نانکنگ پر غیر ملکی اثرات کا بالکل خاتمہ ہو جائے اور وہ اکیلا ہی اس کا اجارہ دار بنا رہے۔

چین بذاتِ خود اس غیر ملکی اثر کو کم کرنے کے قابل نہیں۔ چین میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ منگولیا اور شمال مغربی حصہ میں روس کا مقابلہ کر سکے۔

چین کا مستقبل بھی اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ چینی جاپانی معاہدے کا چند سال سے زیادہ استوار رہنا ناممکن ہے کیونکہ چین کئی حصوں میں منقسم ہے وہاں جمہوریت قائم نہیں رہ سکتی اور ہمیشہ شہنشاہیت کامیاب رہی ہے۔ آئندہ بھی آمریت کے سوا کوئی طرزِ حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی۔

قومی حکومت جنگی افسروں کے ماتحت ہے مثال کے طور پر ۱۹۳۱ء میں ہشولائنگ کو مانچوریا سے نکال دیا گیا تو شیانگ کائی شیک در پردہ بہت خوش تھا اور اس نے جیحال میں کوئی فوج اس کی مدد کو نہ بھیجی۔

یہ درست ہے کہ بہت سی طاقتیں اس وقت جنرل شیانگ کو اکسا رہی ہیں کہ وہ جاپان سے لڑتا چلا جائے۔ لیکن یہ امر چینی مفاد کے خلاف ثابت ہو گا۔

یہ ممالک جاپان کی مخالفت کرنا اپنا سیاسی فرض سمجھتے ہیں۔

چین کے نقطۂ نظر سے

چین کے لئے بھی جاپان کے خلاف موجودہ پالیسی اختیار کرنے کے علاوہ اور کوئی صورت نہ تھی۔ چین اپنے پڑوسیوں کی اقتصادی اور سیاسی جنگوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور ان کی پالیسی ہی یہ ہے کہ چین کو ہڑپ کر لیا جائے۔

چینی اپنے آپ کو صلح پسند خیال کرتے ہیں لیکن جاپان ہر اس ملک کے ساتھ لڑنے کو طیار ہے جو اُسے مشرقی ایشیا میں جنگ کرنے سے روکے۔ جاپان کی لیشت پر لالچ، ظلم اور قبضہ کرنے کی خواہش تھی اور وہ اپنی خواہش کو کامیاب بنانے میں مصروف ہے۔

قدم بہ قدم جاپان نے چین پر قبضہ کر لیا ہے۔ جاپان معمولی سے معمولی واقعات پر لڑنے کے لئے طیار ہو جاتا ہے اور طیاریوں ہی طیاریوں میں چین کا کوئی نہ کوئی حصہ اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ مانچوریا پر قبضہ کرنے کی وجہ نہایت معمولی تھی کسی ریل پر چند بدمعاش چینیوں نے حملہ کر دیا لیکن رات ختم ہونے کے بعد دوسرے روز تمام کے تمام مانچوریا پر جاپان کا قبضہ تھا
۱۹۳۱ء میں مانچوریا کے علاوہ اور بھی بہت سے حصوں پر جاپان نے قبضہ کر لیا۔ اب مرکزی حکومت حاصل کرنے کا ارادہ ہے اور چاہتا ہے کہ شمالی چین کا ایک بڑا ٹکڑا اور پرانا دارالخلافہ پیکنگ ہضم کر جائے۔ ۱۹۳۲ء میں چاپی کو برباد کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں جیحال اور شمالی چاہار کی طرف بڑھا۔ ہیپر ہوف اور چاہار پر ۱۹۳۴ء و ۱۹۳۵ء میں قبضہ کیا۔ سیایون پر ۱۹۳۶ء میں حملہ کیا گیا اور اب ۱۹۳۷ء میں تمام چین کے ساتھ نہایت معمولی وجہ سے لڑائی شروع کر دی۔

اس واقعہ پر ٹائمز آف لندن نے ذیل کے الفاظ میں تبصرہ کیا ہے
"یہ نہایت معمولی واقعہ تھا اور بہت آسانی سے حل کیا جا سکتا تھا۔ جاپانیوں نے کسی نہ کسی طرح سے عادتاً اس رائی کو پہاڑ بنا دیا اور ہوف پر فوج کشی کر دی اور ساتھ ہی نانکنگ کی حکومت کو دھمکی بھی دی کہ وہ اس معاملے میں دخل اندازی نہ کرے۔ اب جاپان چین کے ہر علیحدہ علیحدہ حصے پر حملہ کر کے اپنی قوت قائم کر رہا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں بھی اگرچہ شنگھائی کی حکومت نے حملہ کا جواب دیا تھا لیکن جاپانی حملے کی تاب نہ لا سکی۔ ۱۹۳۲ء میں بھی چین انتہائی کوشش کرتا رہا کہ اپنے آپ کو مضبوط بنائے۔

۱۹۳۱-۳۲ء کے چین نے فوجی قوت بڑھانے اور مہذب بننے کی کوشش کی اور اس کے لئے دیگر ممالک سے مدد چاہی۔ آج نانکنگ گورنمنٹ کے ماتحت چین کی ترقی جاپان کو ا[illegible] نہیں بھاتی۔ جاپانی اخباروں نے دوسرے ممالک کو

نظر سے دیکھا۔ یہ ڈر اس لئے نہیں تھا کہ چین پر دوسرے ممالک قبضہ کرلیں گے بلکہ محض اس لئے کہ چین اپنی فوجی، سیاسی اور اقتصادی حالت کو مضبوط نہ کرسکے۔

جاپان چینی ترقی کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہا ہے اور اس کی روک تھام کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اس نے فوجی بربادی شروع کی اور سرکاری و غیر سرکاری عمارات گرادی گئیں۔

کالجوں۔ لائبریریوں اور ہسپتالوں پر دانستہ بم گرائے اور بظاہر یہ پکارتا ہے کہ میں چین کو اُسی کی دشمنی کا سبق دے رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ چین میرا دوست ہو جائے۔

موجودہ لڑائی اچانک نہیں تھی۔ جاپان عرصہ سے اس کی طیاری کر رہا تھا۔ آدھا بجٹ صرف فوجی طاقت پر صرف کیا جاتا ہے۔ شہنشاہیت کو واپس لانے کے بعد جاپانی گورنمنٹ فوج کو مستحکم کرنے کی بہت کوشش کر رہی ہے۔

جب جاپانی یہ دعوے کرتے ہیں کہ چین میں امن و امان قائم نہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ وہاں امن ہو جائے تو کیا وہ اپنی طرف نہیں دیکھتے کیا ابھی کل ہی لوگوں نے شاہی محل کے نیچے بغاوت نہیں کی تھی اور کچھ عرصے کے لئے متبرک بادشاہ کے خلاف نہیں ہو گئے تھے؟ کیا وہاں ہر روز سیاسی قتل نہیں ہوتے؟ جاپانی سرمایہ دار جینی مزدوروں سے خوف زدہ ہیں لیکن ان کو خود اپنی حفاظت کے لئے فوج کا دستہ رکھنا پڑتا ہے تاکہ انہی کی فوج کا کوئی آدمی انہیں قتل نہ کر دے۔

یہ درست ہے کہ چین میں جاپان کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ چین کا حق ہے کہ وہ استعمار پسند جاپان کے خلاف زہر اگلے۔

جاپان کی فوجی طاقت کے خلاف چین کا اضطراب بالکل فطری ہے۔

اگر چین میں جاپانی افسر قتل کئے گئے ہیں تو اس میں چین کا کوئی قصور نہیں۔ جاپان خود اس کا ذمہ دار ہے کیونکہ وہ چین پر سختی کر رہا ہے اور چین کے لئے یہ سختی ناقابل برداشت ہے۔

چین پر یہ الزام کہ وہ جاپان سے دانستہ چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ بالکل لغو ہے۔ ننانکنگ گورنمنٹ ایسا کبھی نہیں کرسکتی۔ چینی جنرل شیانگ کائی شیک خوب جانتا ہے کہ جاپان کو خواہ مخواہ چھیڑنے کے نتائج کیا ہوں گے اور حتی الوسع اس چھیڑ چھاڑ سے بچنے کی کوشش

اُس نے شانگ شو لائنگ کو سیانفو پر اسی لئے دبایا کہ وہ جاپان کے خلاف زبردست حصہ لے رہا تھا۔ اب شیانگ جاپان کی سختی کا جواب سختی سے دینا چاہتا ہے لیکن چین میں نہ تو اتنی طاقت ہے اور نہ کافی اسلحہ۔

۷ اپریل ۱۹۳۴ء کو ایک جاپانی اخبار نے اعلان کیا تھا "اس ملک کا فطری حق ہے کہ وہ مشرقی ایشیا میں امن قائم رکھے اور ایسا کرنے میں ہمیں یک طرفی وسختی اختیار کرنی پڑے گی۔

اس کے جواب میں چینی گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ کسی ملک کا حق نہیں کہ وہ ہمارے معاملات میں دخل اندازی کرے۔ اگر چین حفظ ماتقدم کے لئے اسلحہ بندی کرتا ہے تو اس کا بھی مقصد یہ ہے کہ ملک میں امن قائم رہے۔

لیکن جاپان ایسی باتیں کب ماننے والا ہے وہ برابر اعلان کر رہا ہے کہ ہم امن و امان چاہتے ہیں اور بس۔

دراصل جاپان کی یہ خواہش نہیں کہ چین میں امن قائم ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ وہاں ہمیشہ خانہ جنگی رہے اور اُسے دخل اندازی کا موقع ملتا رہے۔

وہاں جاپانی حکومت کی زیر نگرانی چین کو لوٹا جا رہا ہے۔ جب ۱۹۳۵ء میں امریکہ نے اپنی چاندی کی پالیسی تبدیل کی اور قیمتیں گر گئیں تو جاپان نے بہت مقدار میں چین سے چاندی نکال لی اور یہ سب کچھ جاپانی افسروں کے ماتحت ہوا تھا۔

اسی طرح جاپان خود بخود جھگڑا کھڑا کر لیتا ہے اور الزام غریب چین کے سر تھوپ کر کچھ حصہ اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

اب جاپان یہ چاہتا ہے کہ منچوریا کے سلسلہ میں فتوحات جاری رکھے اور کم از کم دیوار چین تک پہنچ جائے۔ اب چین کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ آخری دم تک اپنی حفاظت کے لئے لڑے اور یہی اب چینیوں کا ارادہ ہے۔

چینی حکومتیں آپس میں کبھی نہیں ملیں لیکن اب اُن کا اتفاق ہے اگر یہ قائم رہا اور جاپان نے اس غیر اعلان شدہ جنگ میں چین کو فتح کر لیا تو اس کی یہ فتح اُسے بہت گراں پڑے گی۔

افضل رفیعی

چین (دسمبر ۱۹۱۲ء - ۱۹۳۷ء)

تقریباً ۲۵ برس ہوئے کہ چین کی وسیع سلطنت میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا ہوا سن یٹ سین جو چین کی حدود کے باہر ایک انقلابی جماعت کی تشکیل کر رہا تھا، آخرکار اپنے پروپیگنڈے میں کامیاب ہوگیا۔ جنوبی چین میں انقلاب کی تُند رو پھیل گئی۔ عوام جوق در جوق شمال کی طرف یلغار کی غرض سے جمع ہونے لگے۔ حتیٰ کہ چین کے آخری بادشاہ کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور چین کو ایک جمہوریت قرار دے دیا گیا۔

سن یٹ سین اس جمہوریت کا پہلا رئیس اعلیٰ مقرر ہوا اور رفتارِ واقعات سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ چین میں بھی ایک ایسی مستحکم ریپبلک قایم ہو جائے گی۔ جس کی متعدد مثالیں یورپ میں پائی جاتی تھیں۔ لیکن قضا و قدر کو یوں ہی منظور تھا کہ چین کی تاریخ ایک نئی روش دکھائے۔ سن یٹ سین نے پریزیڈنٹ ہوتے ہی اپنے نصب العین پر عمل درآمد شروع کرنے کی کوشش کی اس کا مقصد اولیں یہ تھا کہ چینی قوم میں آزادی، خودداری اور بیداری کی روح پھونک دی جائے اور ملک کے مختلف علاقوں کے باشندوں کو ایک قوم کی لڑی میں منسلک کیا جائے۔ لیکن اس پروگرام کی تکمیل کی راہ میں اسے ایک ہستی سنگِ گراں نظر آتی تھی یعنی یوآن۔ یوان خود رئیس اعلیٰ ہونے کے عزائم رکھتا تھا سن یٹ سن یہ خیال کرتے ہوئے کہ آپس کی لڑائی اور خانہ جنگی اغیار کی دراندازی کا باعث ہو گی اپنے عہدہ سے دست بردار ہو گیا اور یوان اس کی جگہ پریزیڈنٹ مقرر ہو گیا۔

یوان کے برسرِاقتدار آنے کے بعد تو تاریخ چین کا وہ پُر مصائب و مذلت دور شروع ہوتا ہے جو اس کے نام پر سب سے بڑا دھبہ ہے۔ یہ وہ وقت تھا (۱۹۱۵ء) جب جاپان نے اپنے ۲۱ مطالبات چین کے سامنے پیش کئے جن کا مقصد بالفاظِ مختصر چین کو جاپانی سلطنت کا ایک حصہ یا صوبہ بنا دینا تھا۔ یوآن نے اپنے ذاتی مقاصد کو ملکی مفاد پر ترجیح دیتے ہوئے خفیہ خفیہ ان مطالبات کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ لیکن باوجود اس پوشیدگی اور پنہانی کے ملک میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ گئی حتےٰ کہ جب دسمبر ۱۹۱۵ء میں یوآن نے اپنے آپ کو بادشاہ قرار دیا تو دیارِ چین کو ایک اور انقلاب کے زلزلہ سے دو چار ہونا پڑا۔ بیسویں صدی کی جس آزادی ایک بار پھر اسی ملکِ چین میں "خوارئ شہریارہا" کا باعث ہوئی اور "زاری و قیصری" کو پھر بے نیل و مرام ہونا پڑا اسی گیرو دار و خانہ جنگی کے دوران میں یوآن راہیٔ ملکِ عدم ہوا لیکن چین کی سلطنت ریزہ ریزہ ہو چکی تھی اور جاپان نے ان حالات سے پوری طرح فائدہ اٹھانا شروع کیا۔

جن حالات میں جاپان نے اپنی جباری اور اپنے نامصالحانہ رویہ کا ثبوت فتح مانچوریا میں دیا تھا وہ تمام دنیا پر روزِ روشن کی طرح آشکارا ہے اگرچہ ۱۹۳۱ء میں چین میں ایسی ابتری نہیں پھیلی ہوئی تھی جیسی کہ یوآن کی موت کے فوراً بعد لیکن پھر بھی چیانگ کے شک کا اقتدار تمام مملکتِ چین پر حاوی نہ تھا اور نہ ہی اس کے پاس اتنی عسکری قوت تھی کہ وہ جاپان سے نبرد آزما ہو سکے۔ چنانچہ چین نے اس قضیہ کو جمعیتِ اقوام کے سامنے پیش کیا جمعیت نے لارڈ لٹن کی صدارت میں ایک کمشن مقرر کی۔ اس کمشن کی تحقیقات کی رو سے ثابت ہوا کہ جاپان نے جمعیت اقوام کے اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے اور ایک کمزور ہمسائے سے جابرانہ طور پر جنگ کی ہے۔ جب اس کفن دزدی پر انجمنِ تقسیم قبور نے اس دریدہ دہنی سے جاپان پر الزام لگایا تو جاپان نے اس کا یہ جواب دیا کہ جمعیتِ اقوام کی رکنیت سے مستعفی ہو گیا۔

جمعیتِ اقوام نے اس کے خلاف کوئی عملی کارروائی نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان نے جہول بھی فتح کر لیا۔ یورپ اپنی الجھنوں میں زیادہ مشغول ہوا تو جاپان نے اپنا دستِ تعدی اور دراز کرنا شروع کر دیا اور یہ لمحہ بھی ایسا ہے کہ دراز ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں میں ایک معمولی سا واقعہ پیش آیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مشرق بعید کی فضا جنگ کی گونجوں سے معمور ہو رہی ہے۔ تقریباً دو ماہ ہوئے عسکری صورتِ حالات یہ تھی کہ ہوپی (شمالی چین) میں ۷۰۰۰ جاپانی فوج موجود تھی جس کے پاس ہر طرح کے جدید سامانِ حرب یعنی توپ خانہ، ٹینک، بم بار طیارے وغیرہ موجود تھے بظاہر ان فوجوں کا قیام بوکسر معاہدہ کے مطابق تھا یعنی اس لئے کہ یہ افواج پیکنگ اور سمندر کے درمیان سلسلۂ رسل و رسائل نہ ٹ

دراصل ان افواج سے خفیہ طور پر یہ کام لیا جارہا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ اس علاقے کو اس قابل بنا سکیں کہ وہاں جاپان کا پرچم کامرانی لہراتا ہوا نظر آنے لگے۔ علاوہ ازیں جاپانی افواج دیگر مقامات (یعنی ٹنسٹن، ٹنگ چو) وغیرہ میں بھی مقیم تھیں جن میں ہر روز کچھ نہ کچھ اضافہ ہو جاتا تھا اور جن کی عربدہ جوئی و پیکار پسندی کی سرگرمیاں ہر روز بڑھتی جاتی تھیں حتیٰ کہ انہوں نے مارکو پولو کے پل کو نشانۂ توپ خانہ بنا کر ریزہ ریزہ کر دیا اور گرد و نواح کے کسانوں کی فصلوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ آج کل یہ افواج آس پاس کے مختلف شہروں میں گشت لگاتی ہیں، متعدد چینیوں کو بلا وجہ گرفتار کر لیتی ہیں اور بچوں اور عورتوں پر بھی دست درازی کرنے سے اجتناب نہیں کرتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مانچوریا کی فتح کے بعد جاپان پر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ جو امیدیں اس کو مانچوریا سے وابستہ تھیں ان میں سے کوئی بھی پوری نہیں ہو سکے گی۔ جتنی رقم مانچوریا کی مادی ترقیوں پہ خرچ ہو چکی ہے اس کا عشر عشیر بھی پیداوار کی صورت میں جاپان کو نہیں ملا نہ ہی اس خطہ میں جاپانی آباد ہو سکتے ہیں کیونکہ شدت سرما ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہے اس لئے جاپان نے چاہار اور ہوپی کی طرف نظریں جمانا شروع کر دی ہیں۔ لیکن یہ جاپان کی بدقسمتی ہے کہ اب چین نے بھی خلافِ معمول اپنی عسکری قوت مضبوط کر لی ہے جس کو مغلوب کرنا ناممکن تو نہیں لیکن بہت دشوار و گراں خروج ضرور ثابت ہوگا۔ ان حالات کو جاپان نے پہلے ہی سے بھانپ لیا تھا اس لئے اس نے بجائے جنگ کے دوسرے ذرائع اختیار کرنے شروع کئے اور شمالی چین کو مانچوکو (یعنی مانچوریا) میں ملانے کے لئے اقتصادی دخول (Economic Penetration) کا حربہ اختیار کیا اور ساتھ ہی جنرل سنگ کو شمالی چین پر مسلط کر دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ جنرل چیانگ کے شیک کی افواج کو شمالی چین میں ہرگز داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ لیکن جنرل سنگ نے جاپانیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بننے سے انکار کر دیا اور بجائے جاپانی زر سے خریدے جانے کے اس نے مادرِ وطن کے تحفظ کا زیادہ خیال کیا اور جاپانی اقتصادی حملوں کو حتی الوسع روکنے کی مساعی سرانجام دیں۔ جاپانیوں کا خیال تھا کہ اگر جنرل سنگ بندۂ زر ثابت نہ ہوا تو کم از کم اس کی کمزوری و متلوّن مزاجی کا فائدہ ضرور اٹھایا جائے گا۔ جاپان کا خیال تھا کہ وسیع و عریض شمالی چین وجاپان کی ملوں کے لئے کپاس کا ایک وسیع کاشت زار ثابت ہوگا۔ وہاں ریلیں بنائی جائیں گی اور اس کے اور جاپان کے درمیان ایک فضائی سلسلہ رسل و رسائل قائم کیا جائے گا لیکن ان میں سے کوئی بات بھی پوری نہ ہو سکی نہ تو زمین چین کا رنگ روئی کے پھنبوں سے سفید ہوا، نہ کوئلے کی کانوں نے جاپانیوں کے چہروں کو کالا کیا اور نہ ہی اس علاقے کی فضا طیاروں کی گونج سے آشنا ہو سکی۔ لاچار جاپان کو جنگ کرنا پڑی۔ اب تک جاپان زیادہ تر دھمکیوں سے اپنے مطالبات کو پورا کرانے کی کوشش کرتا رہا ہے دنیا کے سامنے ابھی تک وہ اپنے مطالبات کو صاف صاف الفاظ میں پیش نہیں کر سکا۔ نہ ہی غالباً جاپان کے ارباب بست و کشاد خود ان مطالبات کو اچھی طرح سے خود جانتے ہیں بجز اس کے کہ وہ چین کو اپنے تسلط کے تحت لے آئیں۔ یہ مطالبات ایسے نہیں کہ جاپان ان کو قانونی الفاظ کا جامہ پہنا سکے۔ ایک مطالبہ البتہ ایسا ہے جس کو جاپان علی الاعلان پیش کرتا ہے یعنی یہ کہ جاپان اور چین متفق ہو کر اشتراکیت کے خلاف ایک محاذ قائم کریں اور دونوں کی متحدہ افواج ہوپی میں اپنا مستقر قائم کریں۔ لیکن ظاہر ہے کہ چین اس مطالبہ کو بھی پورا نہیں کر سکتا کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو اشتراکیت کے ساتھ جنگ لڑنے کے قابل سمجھتا ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ جو افواج بظاہر جنگِ اشتراکیت کی غرض سے قائم کی جائیں گی۔ وہ آسانی سے چین کے خلاف کام میں لائی جائیں گی۔ لیکن جاپان "تو مان نہ مان میں تیرا مہمان" للکارتے ہوئے گھسا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ مدت تک اعلان جنگ نہیں ہوا لیکن دونوں طرف سے لاکھوں سپاہی میدان کارزار میں کام آ چکے ہیں۔

خادم محی الدین



صحرا کے تاجر



ترانۂ وطن

ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن !
حاضر ترے لئے ہیں دل و جان اے وطن !

(۱)

ہر صبح آفتاب دھلاتا ہے تیرے پاؤں
ہر شام تجھ پہ ہوتی ہے تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں
جنت ہیں تیرے شہر تو فردوس تیرے گاؤں
اس سے بھی کچھ سوا ہے تری شان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۲)

تیری بلندیوں پہ گھٹائیں ہیں مست مست
دریاؤں، وادیوں کی فضائیں ہیں مست مست
موجیں ہیں مست مست ہوائیں ہیں مست مست
آنند اور سرور کی تو کان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۳)

کلیوں پہ تیری رنگِ جواہر کھلا ہوا
باغوں کا روپ نورِ ازل سے دھلا ہوا
تیرے پھلوں کے رس میں ہے امرت گھلا ہوا
یہ رنگ۔ روپ۔ رس یہ تری شان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۴)

چاندی اتارتا ہے افق تیری خاک پر
سونا بکھیرتی ہے شفق تیری خاک پر
ملتا ہے زندگی کو وہ حق تیری خاک پر
جس کے لئے جہاں ہے پریشان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۵)

ہم کیا ہیں؟ کیا ہیں اپنے یہ اجسام تیری خاک
ہم سب کے ننگ و نام کا ہے نام تیری خاک
آغاز تیری خاک ہے، انجام تیری خاک
تو ہی ہمارے جسم میں ہے جان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۶)

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ مردانِ جاں فگن

شرمائے آسمان کو بھی جن کا بانک پن
پہنچے نہ جن کی گرد کو رستم سا صف شکن
ہے نام جن کا زندگی کی جان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۷)

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ فرزانِ حق شناس
سینوں میں جن کے سوز، زبانوں میں ہے مٹھاس
احسان جن کے خلق پہ بے حد و بے قیاس
وہ رہنمائے ملتِ انسان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۸)

اس خاک سے بنے ہیں وہ روشن ترین دماغ
آندھی کے سامنے جو جلاتے رہے چراغ
پاتے ہیں جن کے نور سے عظمت کا ہم سراغ
ہوتی ہے جن سے راہ کی پہچان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۹)

خاکِ وطن کے عشق کو ایماں بنائیں گے
اغیار کے قدم نہ یہاں جمنے پائیں گے
ہم اس کی آن کے لئے جانیں لڑائیں گے
رکھیں گے جان دے کے تری آن اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۱۰)

انگلی کوئی اٹھائے تو بازو تڑائے گا
دیکھا بُری نظر سے تو آنکھیں گنوائے گا
دشمن ترا نہ بچ کے کہیں ہم سے جائے گا
ہو گا ہمارے ہاتھ سے بے جان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۱۱)

کیوں ہے اُداس؟ قلب و جگر ہے ترے لئے
حاضر ہر ایک فرد کا سر ہے ترے لئے
ہر نوجوان سینہ سپر ہے ترے لئے
ستر کروڑ ہاتھ ہیں بلوان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

(۱۲)

جب تک بھی دم میں دم ہے ذرا جان میں
آنے نہ دیں گے فرق کبھی تیری شان میں
جھنڈا ترا بلند رہے گا جہان میں
رکھیں گے تیری لاج، ترا مان اے وطن
ہم تیرے پاک نام پہ قربان اے وطن

وقار انبالوی

موپساں اور اُس کی افسانہ نگاری پر ایک نظر

"میں ادبی زندگی میں داخل ہوا تو شہاب ثاقب کی طرح اور اس سے نکلوں گا تو بجلی کی کڑک کی طرح"۔

موپساں نے ایک ملاقات کے موقع پر یہ الفاظ اپنے ملاقاتی سے کہے تھے اور سچ یہ ہے کہ ان کی صداقت میں شبہ کی گنجائش کم نظر آتی ہے۔ اپنی مختصر حیاتِ ادبی میں، جس کی مدت دس سال ہے شاعری، ناول، رومان، افسانے، ڈرامے، سفر و سیاحت، غرض ادب کے ہر میدان میں اُس کا تخیل منہ زور گھوڑے کی طرح سرپٹ اڑا اور جیسا کہ اس مرکب سوار کا انجام ہوا کرتا ہے جس کا "نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" یہ شاہ سوار بھی بہت جلد دیوانگی اور موت کے غار میں غرق ہو گیا۔

اپریل ۱۸۸۰ء میں ایک مشہور فرانسیسی رسالے میں ایک مضمون شائع ہوا جس کے لکھنے والے کا نام اس سے پہلے سنا نہیں گیا تھا صاحبِ مضمون کا نام تھا "گے۔ دی۔ موپساں"۔ اس مضمون میں رومانی تحریک اور خیالی اور نقلی ادب کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا، اور ایسے ادب کو سچا اور پائیدار بنایا گیا تھا جو حقیقی زندگی کی سچی تصویریں پیش کرتا ہو۔ اس مضمون نے اہلِ قلم میں کھلبلی مچا دی مگر موپساں کے ہم خیال بھی کافی پیدا ہو گئے تھے۔ مصنفین کی فرضی خیال آرائیوں سے پڑھنے والے اکتا گئے تھے۔ انسان بالطبع جدت پسند واقع ہوا ہے۔ اب جو یہ ایک نئی آواز بلند ہوئی تو سب کے کان اس کی طرف لگ گئے۔ اس کے بعد ہی موپساں کا مشہور افسانہ "بُوے دی سوئف" شائع ہوا اور اسے دیکھ کر موپساں کے حریفوں نے بھی اُس کا لوہا مان لیا۔ اخبارات و رسائل نے اس نوخیز ادیب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سوانح نگار اور رپورٹر اُس کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس پر ٹوٹ پڑے۔ مگر موپساں کی زندگی اب تک سیدھی سادی اور بے رنگ گزری تھی، اس لئے سوانح نگاروں نے من گھڑت خاکے تیار کئے اور ان میں اپنے تخیل کے رنگ بھرنے شروع کئے اور اس رنگ آمیزی میں اتنے غلو سے کام لیا کہ اب جو ہم موپساں کے حالاتِ زندگی معلوم کرنا چاہتے ہیں تو زمانہ قدیم کے سورماؤں کی طرح اُس کی اوائل عمر اور موت کے واقعات پردہ راز میں پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ مگر موپساں کے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کی زبانی اور خود موپساں کی زبان قلم سے سنے ہوئے واقعات کی امداد سے اس کے سوانح نگار اے ڈوار ڈ مینیل نے موپساں کی زندگی کے دھندلے نقوش کو بڑی حد تک اجاگر کر دیا ہے۔ موپساں کے افسانوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے واقعاتِ زندگی سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت ہو، کیونکہ یہ افسانہ نگار اپنے افسانوں سے اس طرح پیوستہ ہے جیسے ناخن گوشت سے۔ اس لئے مختصر سوانح حیات پر پہلے ایک نظر ڈال لیجئے۔

موپساں ۵ اگست ۱۸۵۰ء کو ڈائپی میں پیدا ہوا۔ فلابیر کی طرح ماں کی طرف سے موپساں کی رگوں میں بھی نارمن قوم کا خون پہنچا تھا۔ بچپن اتریتات میں گزرا۔ بے فکری کا زمانہ کھیتوں اور میدانوں میں دوڑنے غاروں اور پہاڑی چشموں کا سراغ لگانے اور گھنی جھاڑیوں میں کھیلنے میں گزرا۔ مچھیرے جب اپنے جال لے کر سمندر کا رخ کرتے تو اس بچے کا دل چاہتا کہ وہ بھی ان کے ساتھ نامعلوم دنیا کی سیر کرے۔ اندھیری راتیں اُسے دور دراز ملکوں کی سیاحت کے خواب دکھاتیں۔ ایسی فضا میں اس بچے کی ذہنی صلاحیتوں نے نشوونما پائی اور یہیں سے اس کی روح کی کلی نے کھلنا سیکھا۔

ابتدائی تعلیم ماں کی نگرانی میں ہوئی۔ روئن میں کالج کی تعلیم حاصل کی اور اسی زمانے میں اُس نے لوئی بوئل ہے کی ہم جلیسی کے فیض سے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ چھٹیوں میں شمالی نارمنڈی واپس جانا پڑا۔ سیر و شکار کے سلسلے میں یہاں کی دلدلیں، کھیت اور جنگل سب روند ڈالے یہیں اُن گہری اور نازک جڑوں نے زمین پکڑی جنہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موپساں کو اس سرزمین سے وابستہ کر دیا۔ ساری عمر نارمنڈی اس کے لئے راحت و سکون کا گہوارہ بنی رہی! اور یہیں سے سمندر کے اُس شدید عشق کا آغاز ہوا جو اواخرِ عمر میں اس کے مصائب و آلام کو تسکین پہنچانے کا واحد ذریعہ ثابت ہوا تھا۔

۱۸۷۰ء میں وہ پیرس آگیا۔ خاندان کی مالی حالت بگڑ چکی تھی اس لئے ملازمت کی تلاش ہوئی۔ نظامتِ بحری میں کئی سال تک منشی کی خدمات خلافِ طبیعت انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد اُسے محکمہ ہدایاتِ عوام میں نسبتاً کچھ بہتر جگہ مل گئی۔

فرصت کے اوقات کو موپساں نے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک حصہ کشتی رانی کے لئے وقف تھا اور دوسرا ادب کے لئے۔ چھٹی ملی اور اُس نے دریا کا رُخ کیا۔ آس پاس کے سب کشتی راں اُسے جانتے تھے اور اُس کی مزے مزے کی باتیں سُن کر خوش ہوتے تھے۔ کشتی کبھی بہت تیز چلاتا تھا اور کبھی ساحل ساحل آہستہ آہستہ، ملاحوں سے باتیں کرتا کشتی کھینا چلا جاتا۔ کبھی خودرو پھولوں میں گھنٹوں لیٹا پانی کی سطح پر ننھے ننھے جانوروں اور جل مکڑیوں کا تماشہ دیکھتا رہتا، یا چت لیٹا بیدِ مجنوں کے پتوں میں سفید سفید تیتریوں اور بھونروں کی پرواز پر نظریں جماتا۔ اس انہماک سے جو وقت بچتا وہ لکھنے پڑھنے میں گزرتا۔ خاموشی اور استقلال کے ساتھ وہ اپنے مسودے جمع کرتا رہا اور کبھی ہراساں یا بد دل نہیں ہوا۔ ان مسودات میں شاعری۔ تنقیدیں، ڈرامے، رومان اور ناول سب ہی شامل تھے۔ جو کچھ لکھتا ہر ہفتے فلابیئر کو بھیج دیتا۔ یہ عظیم المرتبت انشا پرداز موپساں کی ماں اور ماموں کا ساتھ کا کھیلا ہوا تھا۔ کہنہ مشق اُستاد نے شاگرد کو وہ گر بتائے جو لکھنے والوں کو غیر فانی بنا دیتے ہیں۔ فلابیئر ہی نے اُسے تحقیق و اکتشاف کا چسکا لگایا تھا اور بتایا تھا کہ "سُنی سنائی باتوں اور خیالی روایتوں سے بچ کر خود دیکھنا اور محسوس کرنا سیکھو اور جو کچھ لکھو اس کی بنیاد گہرے مشاہدے پر رکھو"۔

موپساں جو کچھ لکھتا اپنے اُستاد کی خدمت میں پیش کر دیتا اور فلابیئر سختی سے اُس پر تنقید کرتا۔ کبھی یہ سخت گیری اس حد کو پہنچ جاتی کہ اور کوئی ہوتا تو شاید اس کی تاب نہ لا سکتا۔ مگر موپساں ضبط و تحمل سے سرِ تسلیم خم کر دیتا۔ فلابیئر کبھی پدرانہ شفقت سے اس نوجوان کو نشیب و فراز سمجھاتا اور کبھی خلوصِ قلب سے اس کی رہنمائی کرتا۔ سات سال تک فلابیئر نے موپساں کے مسودوں میں بے لاگ کانٹ چھانٹ کی، سارے سارے مضمون کاٹ کر ڈال دئیے اور پورے پورے مسودے بے کار کر دئیے۔ مگر شاگرد کو استاد پر کامل اعتماد تھا اس لئے دل برداشتہ یا شکستہ خاطر نہیں ہوا۔ پھر یکایک ایک دن آند کے رسالے میں موپساں نے بُولے دی سوئف لکھا۔ اُستاد اسے دیکھ کر چونک پڑا اور شاگرد کی اس کامیابی پر اُس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ دو مہینے بعد فلابیئر کا انتقال ہو گیا۔ لیکن موپساں جب تک جیتا رہا اُستادِ مرحوم کی روح سے مستفیض ہوتا رہا جیسا کہ بے چین روحیں اکثر مرنے والوں کی روحوں سے سکون حاصل کرتی رہتی ہیں۔ موپساں نے اپنے ایک خط میں بھی اس تعلق کا ذکر کیا ہے۔ اپنے دوست کو لکھتا ہے کہ "مجھے فلابیئر کا خیال ہر وقت آتا رہتا ہے اور میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے اس کا یقین ہو جائے کہ کوئی مجھے بھی اسی طرح یاد کرے گا تو میں آج مرنے کے لئے تیار ہوں"۔

لکھنے کی مشق کرنے کے زمانے ہی میں موپساں ادبی حلقوں میں شریک ہونے لگا تھا۔ اُس کی خاموشی کو دیکھ کر جب کوئی سبب دریافت کرتا تو وہ کہتا "میں ابھی اپنا کام سیکھ رہا ہوں"۔ لیکن اسی زمانے میں فرضی نام سے وہ چند مضامین رسائل میں شائع کرا چکا تھا اور بعد میں فلابیئر کے مشورے سے چند نظمیں بھی اپنے نام سے چھپوائی تھیں۔ بوسے دی سوئف کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کی شہرت کا آغاز ہوا پھر اخبار اور رسالے والوں کے پیہم تقاضوں سے اُس نے تیزی سے کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ اس کی ذاتی صلاحیت وقت کی گردش سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی انفرادیت اُسے سب سے نمایاں کرتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ اتنا مشہور ہو گیا کہ خود اس کے وہم و گمان میں بھی اتنی شہرت کی امید نہیں تھی۔ پھر اُس کی یہ شہرت صرف فرانس ہی میں محدود نہیں تھی بلکہ اس کی زندگی ہی میں ساری دنیا میں

پھیل چکی تھی۔ "پیہ شہاب ثاقب" مطلع شہرت پر چمکتا رہا اور اس کی شعاعوں سے مضمون پر مضمون اور جلدوں پر جلدیں تیار ہوتی رہیں۔

اب وہ دولت مند اور مشہور ہو گیا تھا۔ اس کی عزت و وقعت اور بھی زیادہ ہونے لگی تھی کیونکہ اب وہ امیر سمجھا جاتا تھا مگر اُس کے قدر دانوں کو معلوم نہیں تھا کہ یہ آزاد نوجوان جس کی محبت کے افسانے سرگوشیوں میں کہے جاتے تھے بیمار تھا، بہت بیمار۔

کامیابی نے اُسے اپنے آغوش میں لیا ہی تھا کہ مرض نے بھی اُسے اپنے چنگل میں لے لیا اور جیتے جی وہ اس کی گرفت سے نہیں نکل سکا۔ شدید دردِ سر اور بے خوابی کے ساتھ عصبی دورے پڑنے لگے۔ خواب آور دواؤں اور بے ہوش کرنے والی ادویات سے وہ اپنے مرض کی تسکین کرنے لگا۔ نظر میں پہلے کبھی کبھی کوئی خرابی پیدا ہو جاتی تھی مگر اب مستقل طور سے بینائی میں فرق آ گیا۔ شہرۂ آفاق جواں سال ادیب تنہائی میں طرح طرح کے اندیشوں سے کانپ اُٹھتا تھا۔

موپساں کے افسانوں کو پڑھنے والا اُس کے کمالِ فن پر اُچھل اُچھل پڑتا ہے مگر فطرت اور انسانیت کے بے مثل بیان کے دوران میں اُسے کہیں کہیں فوق الفطرت امور اور اندیشۂ نامعلوم سے بھی یکایک دوچار ہونا پڑتا ہے اور پڑھنے والا سمجھتا ہے یہ موپساں کا غیر معمولی کمال ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے مزاج کی پہنائیوں میں اتنا گہرا اتر جاتا ہے کہ اُن کی کوئی بات اُس سے چھپی نہیں رہتی۔ مگر پڑھنے والے کو اس کا علم نہیں ہے کہ وہ فریب نظر اور خوف انگیز کوائف ذہنی جن کو اس قدر صحت کے ساتھ موپساں قلم بند کرتا ہے خود اُس کے ذاتی تجربے ہیں، اس کی آپ بیتیاں ہیں۔ خطرے کا وجود، نامعلوم کا خوف، موت کا ڈر، یہ سب حالتیں خود اُس پر بیت چکی تھیں۔ اُس کے مرض نے اُسے ان سب کا تجربہ کرا دیا تھا۔ جسمانی تکلیفوں اور بھیانک کلفتوں سے موپساں اخیر تک لڑتا رہا۔ محسوس اور غیر محسوس دونوں طریقوں سے وہ اپنے اُس مرض سے لڑتا رہا جو خود اس کے اندر چھپا ہوا تھا۔

موپساں مضبوط کاٹھی کا آدمی تھا۔ پستہ قد اور چہرے سے اطمینان و استقلال ٹپکتا تھا۔ اس میں وہ جانا نہیں تھی جو اونچے طبقے کے افراد میں ہوتی ہے اور نہ اُن جیسی وجاہت تھی، لیکن اس کے ہاتھ نازک اور نرم تھے اور آنکھوں کے گرد سائے کے خوبصورت ہالے نظر آتے تھے۔ وہ بہت کم سخن تھا۔ جب کوئی اس سے ملتا تو وہ بہت کم ہی گفتگو کرتا۔ ملاقاتی اپنی کہتا رہتا اور وہ خاموش بیٹھا مسکرایا کرتا۔ اپنی تعریف سُن کر بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے اور قابل سے قابل آدمی سے بھی وہ اسی کم گوئی سے پیش آتا تھا۔ اگر کبھی بہت خوش ہو کر کوئی بات کی بھی تو کسی نہایت معمولی یا عامیانہ موضوع پر۔ سنجیدہ گفتگو میں کبھی اُس نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی باتوں سے یہ کبھی ظاہر نہیں ہوا کہ وہ خود فن کو کیا سمجھتا ہے اور وہ کیا چیز ہے جسے اُس کی زندگی کا ماحصل سمجھنا چاہئے۔ کبھی کسی معاملے میں اُس نے اپنی رائے نہیں دی۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ انسانیت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ انسانوں پر اُسے اعتماد و اعتبار نہیں تھا۔ بنی نوع انسان کی نیکی میں اُسے یقین نہیں تھا۔ یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے۔ موپساں متشائم تو تھا ہی لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں یہ جذبہ بھی موجزن تھا کہ اپنے خیالات کو پست ذہنیتوں اور عوام سے پوشیدہ رکھے۔

موپساں کے افسانوں کے کرداروں کی خصوصیات سے موپساں کی سیرت اخذ کرنا درست نہیں ہے۔ ہم ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ ہیرو کے کردار پر مصنف کا کردار منطبق کر دیں۔ موپساں کہتا ہے:۔

"مجھ میں فرسودہ رُوح نہیں ہے۔ میں اپنے اندر نہیں دیکھ سکتا اور نامعلوم روحوں کو سمجھنے کی انتھک کوشش کرتا ہوں۔ یہ میرے لئے ایک جذبۂ بے اختیار بن گیا ہے۔ میرے ارادے کو اس میں دخل نہیں ہے جو کچھ میرے گرد و پیش ہوتا ہے اُس کو دیکھنے اور سمجھنے کی عجیب صلاحیت مجھ میں از خود پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اثرات جو میرے چاروں طرف ہوتے ہیں مجھ پر چھا جاتے ہیں اور میں اُن میں ڈوب جاتا ہوں۔"

یہ خصوصیت ہر بڑے لکھنے والے کی ہوتی ہے۔ بالزک اور فلابیئر سے زیادہ اور کون اس کا ثبوت دے سکتا ہے۔ اسی طرح موپساں جب اپنے کردار پیش کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو کردار کی شخصیت میں جذب کر کے اپنے ہی جذبات و احساسات، اپنی ہی بھلائیاں اور برائیاں، اپنی ہی خامیاں اور کوتاہیاں بیان کرتا ہے۔ اپنی ہستی کو کردار میں اس درجہ مدغم کر دیتا ہے کہ مصنف غائب ہو جاتا ہے اور ہم یہی سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ پڑھا ہے اُس کے متعلق

مصنف کی رائے کیا ہے۔ غالباً مصنف کی اپنی کوئی رائے ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ ہمیں بتاتا نہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ موپساں مصائبِ انسانی پر غور تو کرتا ہے مگر اُن پر ترس نہیں کھاتا۔ کمزوروں سے اُسے ہمدردی ہے، سماج کے شکاروں کے لئے اس کا دل دکھتا ہے۔ غریبوں کی مصیبتوں پر وہ غم و افسوس ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے مُنہ سے خود کچھ نہیں کہتا مگر اس کے دل کی نرمی اور ہمدردی اس کی کہانیوں میں ہلکی ہلکی جھلکیاں دکھاتی رہتی ہے۔

~~~

موپساں نے شروع ہی سے عالمگیر شہرت کیوں حاصل کر لی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اس کی صلاحیتیں روایتی پابندیوں سے متاثر نہیں ہوئی تھیں۔ اُس کی بصارت زمانے کے گرد و غبار سے مکدّر نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے خود سیدھے سادے مگر مناسب و مضبوط اوزار بنائے اور رومان کے جنگل میں داخل ہوا اور اس کے دلکش اسرار میں گم ہو جانے کے بجائے وہ بغیر لغزش کئے ہوئے خوش خوش قدم بہ قدم اس میں سے گزر گیا۔

اس کے ہمعصر مسخ شدہ رومانی نظریوں میں بھٹک رہے تھے اور اس کی رواجی نمود سے بھوچکے ہو گئے تھے۔ موپساں نے انہیں انسانوں کی کہانیاں سنائیں، سیدھی سادی اور مطابقِ عقل کہانیاں، ویسی ہی کہانیاں جنہیں سُن کر ہمارے آباؤ اجداد مسرور ہوتے تھے۔ موپساں نے دیوی دیوتاؤں کے قصے نہیں سنائے بلکہ جیتے جاگتے انسانوں کے حقیقی افسانے سنائے۔ نقلی افسانے سُنتے سُنتے لوگوں کے دل بھر گئے تھے اور کان کسی اور نغمے کے لئے ترس رہے تھے۔ موپساں نے زندگی کا نیا راگ چھیڑا ہی تھا کہ سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا، مرجھائے ہوئے دل کلی کی طرح کھل گئے۔ یہ نیا نغمہ روح کی ہم آہنگی میں بلند ہوا تھا اس لئے پیاسی روحیں اس سے سیراب ہونے لگیں اور ہل من مزید کے نعرے گونجنے لگے۔ یہ انسانی روح کا نغمہ تھا اس لئے ساری دنیا کے انسانوں کے دلوں میں اس نے جگہہ پائی۔

موپساں کو نہ کبھی غصہ آتا ہے اور نہ اُس کے دل میں کبھی جذبۂ ہمدردی پیدا ہوتا ہے۔ وہ کسی چیز پر احتساب نہیں کرتا اور نہ اخلاق کا پرچار کرتا ہے۔ مقاصد اور طریقوں کو نفرت سے نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے۔ اُس کا صرف ایک مقصد ہے، اور وہ یہ کہ اپنے سننے والوں کو خوش کرے۔ زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا کرنے کے لئے وہ ہنستا ہے اور ہنسی اڑاتا ہے۔ مگر اس میں بھی وہ اور مصنفوں سے بالکل جداگانہ خصائص رکھتا ہے۔ مزاح سے وہ ناآشنائے محض ہے۔ کیونکہ زندگی میں اُسے یہ نظر ہی نہیں آتا۔

موپساں کی یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ اوروں کو ہنسائے۔ وہ تو صرف ایسی حقیقتوں کو بے نقاب کرکے ہنستا ہے جن کو خطرناک صداقتیں یا دکھاوے کی نیکیاں کہنا چاہئے۔ اپنی قنوطیت میں وہ نسل، سماج، تہذیب، تمدّن اور دنیا سب کو بغیر کسی رو رعایت کے حقارت سے دیکھتا ہے۔

موپساں نے اگر کسی سے استفادہ کیا ہے تو شوپن ہار اور ہربرٹ اسپنسر سے، گو وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان دونوں کی تعلیمات کا کبھی اُس نے غور سے مطالعہ کیا ہو گا۔ موپساں کو کتب بینی کا بالکل شوق نہیں تھا۔ اُس کا کمال نقشہ نویس کا سا کمال تھا۔ لٹریچر میں شاید ہی کوئی اور اس باب میں اُس سے ہمسری کر سکے۔ اس کے جتنے ہیرو ہیں، بڑے آدمی ہوں یا چھوٹے، شہر والے یا دیہاتی، نوکر پیشہ یا تاجر، طوائفیں یا شرابی، وہ اُن سب کو نہایت سُبک رنگ ماحول میں جگہہ دیتا ہے مگر اس کی حدود اتنی صحیح متعین کر دیتا ہے کہ یہ لطیف منظر پہلی ہی نظر میں کہانی کے منصوبے کو واضح کر دیتا ہے۔ جب وہ کہیں کچھ بیان کرتا ہے تو ذاتی رائے کو کہیں ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ جو کچھ اس کے کردار دیکھتے ہیں بس وہی موپساں بھی دیکھتا ہے اُن سے زیادہ خود کچھ نہیں دیکھتا۔ اس کے کردار اپنے خصائص خود کھولتے جاتے ہیں۔ مصنف انہیں کسی صفت سے متّصف کرتا ہوا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ انسانی بے چینیوں میں بے جان فطرت کو دخل دینے نہیں دیتا۔ وہ تو ہماری مسرّتوں اور غموں پر یکساں ہنستی ہے۔ لیکن اس کے باوجود موپساں فطرت سے محبت کرتا ہے۔ اِسی ایک چیز سے اس کا دل پسیجتا ہے مگر موپساں اپنی طبیعت کو روکے رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ اگر یہ محبت اپنا جوش دکھائے گی تو افسانہ نگار کی حُسن کاری مجروح ہو جائے گی۔

موپساں کی ودیعتِ خاص یہ ہے کہ وہ افسانے میں جس بات کو نمایاں کرنا چاہتا ہے اُس کو شروع ہی سے اپنے افسانے کے
~~~

کردار میں اجاگر کر دیتا ہے، اور پھر اس کے گرد ایسے حالات و واقعات تعمیر کرتا ہے کہ وہ خصوصیت اور بھی اُبھر جائے۔ کردار کے پیش کرنے میں اُسے جو قدرت حاصل ہے کسی اور مصنف کو حاصل نہیں ہے۔ بالزک بھی اس خصوص میں اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

موپساں جو کچھ دیکھتا ہے اُسے مصور کی طرح قلم کی تیز جنبشوں سے متعین کر دیتا ہے۔ وہ زیادہ رنگ آمیزی نہیں کرتا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ جلدی جلدی خاکے بناتا چلا جاتا ہے۔ بڑے بڑے حُسن کاروں کی طرح موپساں بھی سادگی پسند ہے۔ وہ دیکھنے والے کے ذہن کو اُلجھنوں میں نہیں ڈالتا۔

نگارش کی اس تیز رفتاری کا فایدہ یہ ہوا کہ موپساں نے افسانوی ادب کا اتنا وسیع سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا۔ اُس کے افسانوں میں ہر شخص کو اپنی سیرت کی تصویر نظر آتی ہے یا یوں سمجھئے کہ اس کے آئینہ خانہ میں ہر شخص اپنی زندگی کے خدوخال دیکھ سکتا ہے۔

موپساں کا اسٹائیل صاف ستھرا، صحیح، آسان اور بہت نمایاں ہے جو منصوبہ یا کینڈا وہ بناتا ہے نہایت مضبوط ہوتا ہے اور اس میں وہ لچک ہوتی ہے جو کسی جاندار وجود میں ہوتی ہے۔

موپساں کہتا ہے کہ "افسانے یا ناول کا منصوبہ گانٹھنے میں مجھے جتنا لطف آتا ہے لکھنے میں نہیں آتا"، اور جب افسانے کا ڈول پڑ جاتا تھا تو اُسے لکھنے میں کچھ دیر نہیں لگتی تھی۔ صفحے کے صفحے قلم برداشتہ لکھتا تھا۔ جنھوں نے اس کے مسودے دیکھے ہیں ان کا بیان ہے کہ مسلسل کئی کئی صفحے ایسے دکھائی دیتے ہیں جن میں کہیں ایک لفظ کی بھی ترمیم نظر نہیں آتی۔

موپساں جملوں اور الفاظ کے انتخاب میں زیادہ محتاط نہیں رہتا خیالات کو بار بار دہرانے سے بھی وہ اجتناب نہیں کرتا۔ موپساں کی باصرہ اور شامہ کی قوتیں تکمیل کو پہنچی ہوئی ہیں۔ مگر سامعہ ناقص ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ الفاظ کی موسیقیت معدوم ہو جاتی ہے۔ اپنے استاد فلابیئر کی سی سمع نواز ہم آہنگی اُسے میسر نہیں ہے۔ موپساں کے ہاں بے سُرے سازوں کی جھنکار زیادہ سنائی دیتی ہے۔ اس کے الفاظ کا ذخیرہ بھی محدود ہے۔ کوئی نادر لفظ یا اچھوتی ترکیب شاید ہی کہیں نظر آئے وہ لوگ جو فلابیئر کے نغمے سُن کر جھوم جاتے تھے اور گاتیئر کی شیوہ بیانی کے دلدادہ تھے۔ موپساں سے مطمئن نہیں تھے بلکہ بڑی سختی سے اعتراض کرتے تھے کہ صحیح معنوں میں موپساں انشاپرداز کہلانے کا مستحق نہیں ہے لیکن اسی زمانے کے چند مشہور نقاد، موپساں کے مداح نظر آتے ہیں اُن کا یہ کہنا بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ صرف اسٹائیل نہ ہونے کی بنا پر ہم موپساں کو انشاپردازوں کے زمرے سے خارج نہیں کر سکتے۔ موپساں نمائشی حُسن کاری کا قائل نہیں ہے۔ مولیئر کی طرح وہ ہمیشہ فطرت سے قریب رہتا ہے اور چونکہ فطرت کا ہم جلیس ہے اس لئے فطری زبان ہی میں اظہارِ خیال کرتا ہے۔ صنائع و بدائع کے گورکھ دھندوں میں پڑ کر وہ اپنی فطری سادگی کو غارت کرنا نہیں چاہتا۔

ستائش و شہرت کی تمنا موپساں کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوئی ایک خاتون کو خط لکھتے ہوئے کہتا ہے:۔

"زندگی میں ہر چیز میرے لئے تقریباً یکساں ہے۔ مرد، عورت، واقعات، سب ایک سے ہیں۔ یہ میرے عقیدے کا سچا اعتراف ہے۔ ہاں میں اتنا اور کہہ دوں، جس پر تم شاید یقین نہ کرو کہ میں اپنی طرف سے بھی اتنا ہی بے پروا ہوں جتنا کہ اوروں کی طرف سے۔ مجہولیت، مذاق اور درد و عذاب میں سب غرق ہیں۔ میں سب سے بے پروا ہوں۔ میرا دو تہائی وقت صحبتِ ناجنس میں ضائع ہوتا ہے۔ ایک تہائی وقت جو بچتا ہے اس میں کچھ لکھتا لکھاتا ہوں اور اسے مہنگے سے مہنگا بیچنے کی کوشش کرتا ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ مجھے یہ نفرت انگیز تجارت کرتی پڑتی ہے!"

موپساں کو فطرت سے دیوانہ وار محبت تھی۔ سمندر کی ہلکی ٹھنڈی ہوا جب اُسے پنکھا جھلتی تو اس کا جسم لرزنے لگتا۔ صرف سمندر ہی اُسے اپنے آغوش میں لے کر جھلانا اور سکون پہنچانا جانتا تھا۔ سمندر کے نظارے سے موپساں کی طبیعت کبھی نہیں بھری۔ وہ ہمیشہ لمبے لمبے سفر کرتا رہتا تھا۔

موپساں کا فلسفہ بھی بس اتنا ہی اُلجھا ہوا ہے جتنا کہ اُس کا نظریۂ حیات۔ سادگی اور گہرائی میں اُس کی قنوطیت اور سب حقیقت نگاروں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اُس کی قنوطیت کا انجام جب ترس کھانے اور رحم آنے پر ہوتا ہے تو شوپنہار کی طرح اسے بھی منطقی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ موپساں کے اکثر قدردان اس رائے سے اختلاف کریں گے اور کہیں گے کہ رحم کا شائبہ تک اس کی کسی کہانی میں نہیں ملتا اور یہ تو بالکل کھلی

ہوئی بات ہے کہ وہ کسی پر ترس نہیں کھاتا۔ لیکن اگر ذرا امعانِ نظر سے دیکھا جائے تو یہ جذبہ ہر صفحے میں کارفرما نظر آئے گا۔ فطری طور پر ہر موضوع کی تہ میں ترحم و ہمدردی کی جھلک نظر آئے گی۔ گو مصنف کا یہ منشا ہرگز نہیں تھا کہ وہ پڑھنے والے کے جذبۂ ترحم کو اکسائے یا اُسے مصائب زدہ پر ترس کھانا سکھائے۔

ایک نقاد کہتا ہے کہ "موپساں اتنا بڑا ہے جتنا کہ درخت۔ اُس نے ناول اس طرح پیش کئے جس طرح سیب کا درخت سیب پیش کرتا ہے۔" اور یہ ایک ناقابلِ تردید رائے ہے۔

"شہابِ ثاقب" اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ چاروں طرف سے اس کی واہ واہ ہو رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ الکزینڈر ڈوما نے تین دفعہ موپساں کو لکھا کہ "صرف تم ہی ایک ایسے مصنف ہو جس کی کتابوں کا انتظار میں بے چینی سے کرتا ہوں۔"

لیکن ایک دن آیا کہ موپساں کی بے پروائی زائل ہونے لگی اور اس کی کہانیوں میں نرم دلی جھلکنے لگی۔ اپنی جسمانی تکلیفوں اور اپنے دل و دماغ کے خطرات کو لپیٹ لپیٹ کر بیان کرنے لگا۔ یہ تبدیلی کیسے ہوئی؟ اس کا جواب اس کی کہانیوں میں ملتا ہے۔

شہرت نے اس کے قدم چومے اور بڑے بڑے گھرانوں میں اُسے مدعو کیا گیا۔ یہاں تک کہ خواتین کے ایوانوں میں بھی باریاب ہونے لگا۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں جن سے اُسے اتنی جلدی شہرت حاصل ہوئی تھی اب اُس نے لکھنی چھوڑ دیں اور ان کی بجائے محبت اور موت کے حسین رومان قلمبند کرنے لگا۔ داستاں گو نے دیہاتیوں اور کسانوں کا ساتھ چھوڑ کر اونچے طبقے میں امیر امرا کی صحبت اختیار کی۔ اس سے ملنے کے سب خواہشمند تھے اور سب اُسے عزت و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس طوفانِ نشاط میں موپساں کے پاؤں نہیں اکھڑے۔ وہ اپنے دل میں اس عیش و عشرت سے متنفر تھا اور کہتا کہ "میں ان کی ذہنیتوں ان کے اطوار، ان کے دلوں اور اُن کی روحوں کا خوب مطالعہ کرتا ہوں۔ مصنف کے لئے کیسا نفیس مشغلہ ہے۔ یہ انسانیت جس قدر نفرت مجھ میں پیدا کرتی ہے اسی قدر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں وہ کیوں نہ بن سکا جو میں بننا چاہتا ہوں ـــ ارسطو فینیز یا ربیلے۔"

اس نئی زندگی کی شرائط کے آگے موپساں کو جھکنا پڑا۔ تربیت چونکہ اچھی ہوئی تھی اس لئے اس زندگی کی روایات اور نقلی تہذیب کا احترام موپساں کم از کم بظاہر ضرور کرتا تھا۔

ناول نگار۔ اس جادو بھری فضا میں تھوڑے عرصے تک رہا تھا کہ اُس کے مرض نے ایک دم سے عود کیا۔ در حقیقت اور نئی پرانی ٹیسوں نے اس کی جان ضیق میں کر دی۔ اس کی تکلیف اتنی شدید تھی کہ وہ بڑی مشکل سے اپنی چیخوں کو روک سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ناشاد دل موم ہو گیا اور وہ نہایت جذباتی طبیعت کا آدمی بن گیا۔ اس کی ابتدائی صلاحیتیں از سرِ نو بروئے کار آگئیں اور زیادہ قوت و لطافت کے ساتھ عصبی تکلیفوں نے اس کی بصیرت کو وسیع کر دیا اور ہر چیز کو وہ نئی نظر سے دیکھنے لگا۔ یہی تکلیفیں موپساں کی عظیم الشان شخصیت اور کشادہ دلی کا سبب ہیں۔

اب اس میں غم و افسوس اور مستقبل کے اندیشے پیدا ہو گئے خواہش پیدا ہوئی کہ نامعلوم کو معلوم کرے اور ناقابلِ فہم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ وہ اپنے اندر محسوس کرنے لگا کہ کوئی چیز برباد ہو رہی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا مرض تاک لگا رہا ہے اور اب اس پر جھپٹا ہی چاہتا ہے۔ موپساں اُس سے بچنا چاہتا ہے لیکن پہاڑوں اور سمندر پر وہی فطرت جو اُسے سکون پہنچایا کرتی تھی اب اُسے ڈرانے لگی۔

اُس کا دل کشادہ ہو گیا۔ ان تمام خیالات کو جن کی وہ پہلے برائی کرتا تھا اب خود اپنے اوپر طاری کر کے ان کا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ اپنی کتابوں میں جذبۂ محبت، جذبۂ ایثار اور احساسِ درد کو نمایاں کرنے لگا۔ کبھی کبھی موپساں اپنی اس نئی شخصیت کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے۔ وہ شکایت کرتا ہے کہ پہلے کی طرح سوچنے کی اب اس میں صلاحیت نہیں رہی یعنی یہ کہ دنیا کی کسی چیز سے اُسے تعلق ہی نہیں ہے۔

موپساں کا جذبۂ ترحم اب ایک نیا پلٹا کھاتا ہے۔ اُن بدنصیبوں کو اب وہ حقارت سے نہیں دیکھتا جو خود اس کی طرح لاعلاج تکلیفوں میں مبتلا ہیں بلکہ ان کی طرف دستِ اعانت بڑھاتا ہے۔ بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر وہ افسردہ ہو جاتا ہے اور زخموں کو دیکھ کر اس کا دل خون ہو جاتا ہے۔ کسی بدنصیبی کی نوعیت یا ابتدا کی وہ تحقیق نہیں کرتا۔ جتنی تکلیفیں ہیں سب سے ہمدردی کرتا ہے۔ جسمانی تکلیفیں، اخلاقی تکلیفیں، وہ تکلیفیں جو دھوکے اور فریب سے پیدا ہوتی ہیں، سسکتی اور نامراد زندگیوں کے پچھلے پہر سے، غرض سب سے اُسے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔

اُس کا ذہن بھی تیز ہو گیا۔ سائنس میں دلچسپی لینے لگا۔ اُس کا

احساس اس سے پہلے کبھی اتنا واضح نہیں ہوا تھا۔ دماغ ہمیشہ مصروفِ کار رہنے لگا۔ وہ خود کہتا ہے "تعجب کی بات ہے کہ ذہنی اعتبار سے میں اب پہلے سے کس قدر مختلف آدمی ہوتا جاتا ہوں۔ میں اس فرق کو خوب دیکھتا ہوں اُس وقت جب میں کچھ سوچتا ہوں، کوئی انکشاف کرتا ہوں، کہانیوں کے منصوبے بناتا ہوں، اُن خیالی ہستیوں کا تجزیہ کرتا ہوں جو میرے تخیل میں تیرتی پھرتی ہیں۔ اب مجھے بعض خوابوں میں بھی ویسی ہی خاص ذہنی فرحت حاصل ہوتی ہے جیسی دھوپ میں دیوانہ وار کشتی چلانے سے حاصل ہوتی تھی"۔

اب اُسے اس یقین میں پہلی دفعہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحبِ کمال انشا پرداز ہے۔ اُس کے بعد کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ موپساں کوشش کر رہا ہے کہ اپنے آپ کو بدل لے۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ تاریک اور بیش قیمت دلوں کے بھید اُسے معلوم ہو جائیں، نامعلوم قوموں کے کوائف بیان کرے۔ اُس کا لائقِ رشک سکونِ خاطر جاتا رہا ہے۔

اُس کے مرض نے ایک خاص صورت اختیار کرنی شروع کر دی تھی، اس زمانے میں موپساں نے جنوبی فرانس کا رُخ کیا۔ جہاں اُس کی محبوب کشتی سطحِ آب پر اس کی منتظر رہتی تھی۔ اس کشتی میں وہ سیاحت کرتا رہا۔

عرصہ دراز تک موپساں دیکھتا رہا کہ اس کی صحت گرتی جا رہی ہے۔ مرض کا ہر حملہ اس کے قوائے ذہنی کو کم سے کمتر کرتا جاتا ہے اور اس کے تخیل پر بادل سا چھائے جاتا ہے۔ فالج کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ موپساں اتنا بدل چکا تھا کہ اُس کے دوست احباب بھی اب اُسے مشکل سے پہچان سکتے تھے۔ ایک ملاقاتی کا بیان ہے کہ "وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا اور کانپ رہا تھا۔ وہ بالکل گھل گیا تھا۔ تکلیف سے چہرہ دُبلا پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں شکوہ مصائب تھا اور ان میں سے بے رحم قسمت کے خلاف سسکتی شعاعیں نکل رہی تھیں"۔

اب بھی وہ لکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر بے سود۔ مایوسی کی حالت میں خودکشی کا خیال اس کے دل میں راسخ ہوتا جاتا تھا۔ علاج جاری تھا مگر حالت روبہ زوال تھی۔ ایک دن طبیعت کچھ حاضر تھی تو شاعر دورجین کو اُس نے اپنے ناول اینجی لس کا ابتدائی حصہ سنایا اور یہ کہہ کر سنایا کہ "یہ میرا شاہکار ہوگا"۔ لیکن جب سنا چکا تو رو پڑا۔ دورجین کہتا ہے کہ "وہ رویا یہ دیکھ کر کہ اب اُس کا ہنر پستی کی کس نوبت کو پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر رویا کہ اُس کی روح کا سوز و گداز اب اس لائق کبھی نہ ہو سکے گا کہ اپنے اظہارِ خیال سے اوروں کے دلوں کو متاثر کر سکے۔ اُس کی گفتگو اور اُس کے آنسوؤں میں کچھ وہ تقدیس تھی جو مذہبیت کا جزو ہوتی ہے اور یہ تقدیس زندگی کے خوف اور اس زوال کے بھیانک اثر پر چھائی ہوئی تھی"۔

اسی طرح کئی غمناک ہفتے بیت گئے اور موپساں اپنی عقلِ حیوانی کی مدد سے اپنے مرض کا مقابلہ کرتا رہا۔ یکم جنوری ۱۸۹۲ء کو اس نے بہ ثباتِ عقل و ہوش محسوس کیا کہ اب صحت کی کوئی امید نہیں ہے۔ مایوس ہو کر اُس نے خودکشی کا اقدام کیا مگر بدنصیبی اس میں بھی شریکِ حال رہی کہ موت نہ آئی۔ لیکن اس کے بعد سے خوشی و ناخوشی کا احساس ہی فنا ہو گیا اور اُس کے ذہن پر ابدی تاریکی مسلط ہو گئی۔

موپساں پیرس واپس لایا گیا اور ڈاکٹر میریو کے سینی ٹوریم میں رکھا گیا جہاں اٹھارہ مہینے کی مشین جیسی زندگی کے بعد یہ "شہابِ ثاقب" بے نور ہو گیا۔

شاہد احمد

سکوتِ شام

سوادِ شام میں تنہا رواں ہوں
نہیں معلوم مجھ کو میں کہاں ہوں

ادھر خاموش، ندّی کا کنارا،
اُدھر سنسان جنگل کا نظارا،

فضا پر خامُشی چھائی ہوئی ہے
ہوا کو نیند سی آئی ہوئی ہے،

ترنّم، زمزمے، نغمے، نوائیں
سکوں کی گود میں ہیں سب صدائیں

پرندے چھپ گئے ہیں گھونسلوں میں
مذاقِ سیر کو لے کر پروں میں

تڑپ کو کھو چکی ہے موجِ بے تاب
کنارِ جُو میں ہے مدہوشیٔ خواب

مناظر پر فسوں سا ہو رہا ہے
درختوں میں اندھیرا سو رہا ہے

مثالِ مرگ ساکت ہے ہر اک شَے
کہیں بھی زیست کی جنبش نہیں ہے

حجر خاموش ہیں اشجار خاموش
فلک پر انجمِ ضو بار خاموش

بہت ہیبت فزا یہ خامُشی ہے
بدن میں کپکپی سی آ گئی ہے

سعید احمد اعجاز

ایک فرانسیسی اُردو شاعر

اردو کی داغ بیل کچھ ایسی شبہ گھڑی ڈالی گئی تھی اور اس کا سنگِ بنیاد ایسے مقدس ہاتھوں رکھا گیا تھا کہ یہ نوزائیدہ ابتدا ہی سے ایسی شوخ، چنچل، رسیلی، چھبیلی نکلی کہ بڑے بڑے کٹر بھی اس پر جان دینے لگے، آقایانِ ایران نے اپنی فارسی کو چھوڑ کر اسے پسند کیا، زبان آورانِ عرب نے عربی سے منہ موڑ کر اس سے ناتا جوڑا اور نو اور فاتحینِ فرنگ بھی باوجود فرزانگی اپنے تئیں اس سے بچا نہ سکے۔ آخر انہیں بھی نیم بسمل ہونا پڑا، چنانچہ سینکڑوں فرانسیسی پرتگیزی اور یورپین اردو کے دام زلف میں پھنس کر بقول شخصے "فاتح مفتوح" ہو رہے،

"یورپین شعرا اردو" پر بہت سا مواد جمع ہو چکا ہے۔ اسی نام سے ایک مختصر تذکرہ بھی شائع ہو چکا ہے مسٹر محفوظ الحق (پٹنہ) اور دوسرے تعلیم یافتہ ہندوستانی اور یورپین حضرات کے کئی ایک مقالے طبع ہو چکے ہیں، حال ہی میں "کلیم" دہلی میں اسی قبیل کا ایک تحقیقی مضمون طبع ہو چکا ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے ادبی دنیا میں میرے پیارے دوست شاکر میرٹھی نے جارج برنس بیش شور میرٹھی پر ایک بسیط مقالہ سپرد قلم کیا ہے،

آج ہم ایک صاحبِ دیوان فرانسیسی نژاد نومسلم اردو شاعر کو پیش کرتے ہیں، ان کا نام الکزینڈر ہیڈرلی (ALEXENDER HEDERLEY) تھا، آزاد تخلص کرتے تھے۔ رسالہ مخزن لاہور میں مارچ ۱۹۰۹ء کی اشاعت میں "الکزینڈر ہیڈرلی" کے عنوان سے سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری کا ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا ہے اس کے بعد رسالہ معارف اعظم گڈھ میں جنوری ۱۹۲۲ء کی اشاعت میں "مرزا غالب کا ایک فرنگی شاگرد آزاد فرانسیسی" کے عنوان سے عبدالماجد صاحب بی اے (حال مدیر صدق) کا ایک مقالہ طبع ہوا ہے۔

فاروق صاحب نے اپنا مضمون صرف دیوانِ آزاد کو سامنے رکھ کر اس کے دیباچوں کی روشنی میں لکھا ہے اور عبدالماجد صاحب نے اس دیوان کے علاوہ لالہ سری رام کے تذکرہ خمخانۂ جاوید کو بھی پیش نظر رکھا ہے مگر فاروق صاحب کا مضمون ماجد صاحب کے پیش نظر نہیں رہا یا اگر رہا بھی ہو تو کم از کم ماجد صاحب نے اس مضمون کا حوالہ اپنے مضمون میں نہیں دیا،

یوں تو کئی ایک تذکرہ نویسوں نے آزاد کا ذکر کیا۔ ہے مگر تفصیل اور زیادہ حالات لالہ سری رام ہی نے خمخانۂ جاوید میں لکھے ہیں، اور لالہ جی کے پیش نظر دیوان آزاد بھی رہا ہے۔

۱۹۳۵ء میں سردار علی صاحب نے حیدر آباد سے ایک تذکرہ "یورپین شعرائے اردو" کے نام سے شائع کیا ہے جس میں (۲۰) شعرا کے مختصر حالات اور کلام کے نمونے ہیں انہوں نے اپنے تذکرے کی ابتدا آزاد ہی سے کی ہے اور خمخانۂ جاوید اور ماجد صاحب کے مضمون کو پیش نظر رکھا ہے۔ ماخذات کی فہرست میں "رسالہ معارف جلد دہم عدد دوم بابت ۱۹۲۲ء" ضرور لکھ دیا ہے مگر آزاد کے حالات کے ساتھ کوئی حوالہ نہیں ہے اور آزاد کے دیوان کا تذکرہ اس مزے سے کیا ہے گویا وہ ان کے پیش نظر ہی تھا حالانکہ اس وقت تک آزاد کا دیوان ان کی نظروں سے گزرا نہ تھا، افسوس ہے کہ بعض لوگ اس طرح کر کے اپنے تئیں مصنف اور مولف باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

خمخانۂ جاوید کی تفصیل مولوی فاروق اور مسٹر ماجد کے مضمون کے بعد آزاد پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی مگر صرف اس بنا پر مجھے خامہ فرسائی کی جرأت ہوئی کہ سالِ گزشتہ نواب ذوالقدر جنگ بہادر نے اپنے والد نواب سرور الملک بہادر مرحوم کی خودنوشتہ سوانح عمری "کارنامہ سروری" شائع کی تو اس میں من جملہ اور نئی باتوں کے ایک بات

یہ بھی تھی کہ غدر کے بعد ایک مقتدر انگریز نے اسلام قبول کیا تھا جو شاعر بھی تھا اور آزاد تخلص کرتا تھا۔"

کارنامۂ سروری کی عبارت یہ ہے (ایامِ غدر کے بعد کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے)

"اسی زمانے میں ایک مقتدر انگریز مسلمان ہوگیا تھا اور نام اپنا جان محمد رکھا تھا ذکی اور خوش کلام شاعر تھا اس کا تخلص آزاد تھا چنانچہ کہتا ہے۔"

"خدا کی قدرت ہے ورنہ آزاد میرا اور ان بتوں کا جھگڑا
نہ ہوگا فیصل تمام دن میں مگر برو زحساب آدھا"

مطلع بھی اچھا کہا ہے۔

نوید اے دل کہ رفتہ رفتہ گیا ہے اس کا حجاب آدھا
ہزار مشکل سے بارے رُخ پر سے اس نے اٹھا نقاب آدھا"

(دیکھو کارنامۂ سروری صفحہ ۴۹ حاشیہ)

کارنامۂ سروری کی منقولۂ بالا عبارت کے مطالعہ کے بعد اس تشویش کا پیدا ہونا لازمی تھا کہ آزاد جس نے اسلام قبول کیا کون تھا؟ چونکہ انگریز شعراء میں آزاد تخلص کرنے والا ایک ہی شاعر الکزنیڈر ہیڈرلی نظر سے گزرا تھا اس لئے قیاس تھا کہ یہی آزاد جان محمد بنا ہوگا مگر کوئی ثبوت اس کو باور کرنے کے لئے نہ تھا، کارنامۂ سروری میں جو دو شعر آزاد کے نام سے ملے وہ تذکرۂ یورپین شعراء اردو کے منقولہ اشعار میں نہ تھے، اسی غرض سے فاروقی صاحب کے مضمون کا مطالعہ کیا تو اسی بحر اور قافیہ اور اسی زمین کے دو شعر ملے مگر مطلع و مقطع فاروقی صاحب نے بھی نقل نہیں کیا تھا،

"شراب ہو وے جو تند ساقی نہ بے مزہ کر پلا کے پانی"
پلا وہ ساغر کہ جس میں ہو وے شراب آدھی گلاب آدھا"
لبوں سے بادہ لگا دے منہ سے یہ کیسی کرتا ہے چہل ساقی
غضب ہے مجھ جیسے بادہ کش کو دیا ہے جامِ شراب آدھا"

اسی غرض سے کہ شاید یہ شعر عبدالماجد صاحب نے نقل کئے ہوں "معارف" والا مضمون بھی دیکھا مگر افسوس ہے کہ اس غزل کا ایک شعر بھی ماجد صاحب نے نقل نہیں کیا تھا۔

میں اسی تلاش میں تھا کہ جان محمد الکزنیڈر ہیڈرلی ہی تھے یا کوئی دوسرا، کہ محبی مولوی تراب علی خاں صاحب باز نے دیوان آزاد عنایت کیا اس دیوان میں حساب آدھا، نقاب آدھا والی غزل ص۵۹ اور ص۶۰ پر موجود ہے البتہ دیوان میں مطلع کا مصرع ثانی یوں لکھا ہوا ہے ؎

ہزار مشکل سے بارے اٹھا انہوں نے رخ سے نقاب آدھا

اور مقطع کا مصرع ثانی یوں ہے، ؎

نہ ہوگا فیصل تمام دن میں بروز یوم الحساب آدھا

مگر یہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے صحیح مصرع وہی ہے جو نواب سرور الملک نے نقل کیا ہے ورنہ "بروز یوم الحساب" اور "شب لیلۃ القدر کی رات" جیسی غلطی کا امکان آزاد سے نہیں ہوسکتا،

سرور الملک بہادر نے غدر کے بعد کے واقعات میں یہ ذکر بھی کیا ہے۔ اس سے یہ قیاس ہوسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ واقعہ ہوا ہے کیونکہ جولائی ۱۸۶۱ء میں آزاد نے انتقال کیا ہے اس سے یہ متیقن ہوتا ہے کہ آزاد نے انتقال سے ڈیڑھ دو سال پہلے اسلام قبول کیا مگر حیرت ہے کہ دیوان آزاد کے دیباچوں میں اس کا ذکر مطلق نہیں، آزاد کے بھائی طامس ہیڈرلی نے شاید اپنے خاندان کے لئے ننگ اسلام کو پسند نہیں کیا اس لئے اس واقعہ کو قلمزد کر دیا مگر ایک دیباچہ شوکت علی صاحب ساکن شاہ پور ضلع فتح پور نے بھی لکھا ہے جس میں اس واقعہ کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں چونکہ مسٹر طامس ہیڈرلی نے اس دیوان کو چھپوایا اور شوکت علی صاحب سے دیباچہ لکھوایا ہے اس لئے ممکن ہے کہ طامس صاحب کی خاطر شوکت صاحب نے حرف مطلب کو قلمزد کر دیا ہو۔

بہر حال مسٹر الکزنیڈر ہیڈرلی آزاد نے غدر کے بعد اسلام قبول کیا اور جان محمد نام اختیار کیا۔

لالہ سری رام، ایم، اے نے خمخانہ جاوید میں (صفحہ ۲۷ جلد اول) لکھا ہے۔

"کپتان الکزنیڈر ہیڈرلی مسٹر جیمس ہیڈرلی فرانسیسی کے چھوٹے بیٹے، ایک مسلمان شریف زادی کے بطن سے تھے ان کے والد ان چند یورپین سے تھے جنہیں ہندوستان جنت نشان کی آب و ہوا خصوصاً دارالسلطنت شاہجہان آباد کی دلچسپیوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ ہندوستانی عورتوں سے شادی کر لینے کے باعث انہیں کی طرز معاشرت بھی اختیار کر لی تھی الکزنیڈر ہیڈرلی کی تربیت و پرورش دہلی

کے شرفائے اہل اسلام کی مانند ہوئی اور یہیں کی صحبتوں نے
ان میں شعر و سخن کا مذاق پیدا کر دیا، اٹھارہ برس کی عمر میں شعر
کہنے لگے . . . . آغاز شباب میں آگرہ چلے گئے تھے۔
مشورۂ سخن نواب زین العابدین خاں عارف سے لیتے تھے"۱۲

لالہ سری رام کے علاوہ کسی اور نے آزاد کے فرانسیسی النسل اور ہندوستانی شریف زادی کے بطن سے ہونے کا تذکرہ نہیں کیا ہے اس کی تصدیق آزاد کے دیوان سے بھی ہوتی ہے، دیوان کے شروع میں قصائد ہیں جن میں ایک قصیدہ اپنے ماموں خان صاحب حیات محمد خاں کی مدح میں کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

زہے نصیب ازل سے ہوں بے تردد و بیم ٭ نہ آرزوئے بہشت بریں نہ خوف جحیم

اس کے ساتھ ایک قصیدہ اپنے بھائی نظام الدین خاں کی مدح میں کہا ہے جس کا مطلع ہے،

ہو کے خاک عالم میں تیرے کشتگاں پھرنے لگے ٭ مصر میں جیسے غبار کارواں پھرنے لگے

ظاہر ہے کہ مسلمان ماں کے بطن سے پیدا ہونے اور اہل اسلام کی طرح تربیت اور پرورش پانے کی وجہ سے آزاد کو اسلام سے لگاؤ پیدا ہو گیا ہوگا اور آخر عمر میں انہوں نے اسلام کا اعلان کر دیا۔

دیوان آزاد رائل سائز کے ر۱۷۵ صفحات پر مطبع احمدی آگرہ میں ۱۸۶۳ء میں طبع ہوا ہے۔ کاغذ گندہ، مسطر ۱۷ سطری اور کتابت معمولی ہے ابتداً ۶ صفحے کا ایک دیباچہ شوکت علی صاحب ساکن شاہ پور ضلع فتحپور مضافات الہ آباد نے لکھا ہے جو فارسی ہے اس دیباچہ کا لب لباب یہ ہے کہ آزاد نے اٹھارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا، اساتذہ کے دواوین اور تصانیف کا مطالعہ کرتے تھے اور اپنا کلام غالب اور زین العابدین خاں عارف کے پاس بغرض اصلاح بھیجا کرتے تھے، فن طب میں بھی بہرہ کامل تھا اور بڑے اچھے معالج تھے مریضوں کی امداد بھی کرتے تھے اسی داد و دہش نے افلاس تک نوبت پہنچا دی تھی۔ راقم دیباچہ سے بہت خلوص تھا اگر ایک روز بھی یہ ان کے گھر نہ جاتے تو وہ ان کے گھر آتے تھے۔ مدت تک یہی حال رہا، آخر راقم دیباچہ مشرق کی طرف سفر پر گئے اور آزاد نے ریاست الور میں نوکری کر لی توپ خانے کے کپتان مقرر ہوئے، اور گئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ راقم دیباچہ کو آزاد کے بھائی کے خط کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ جولائی ۱۸۶۱ء میں آزاد قید ہستی سے بھی آزاد ہو گئے۔ انتقال کے وقت آزاد کی عمر تیس سال تھی، ان کے انتقال کے تیسرے مہینے اُن کے بھائی طامس ہیدرلی ڈپٹی کلکٹر ہو کر بھرت پور پہنچے اور انہوں نے راقم دیباچہ کو بلا کر آزاد کے منتشر کلام کو مرتب اور مردّف کر کے شائع کرنے کی خواہش کی۔ ان واقعات کے اظہار کے بعد آزاد کی شاعری کی شاعرانہ تعریف کی ہے جس میں کوئی خاص بات نہیں۔

دوسرا دیباچہ طامس ہیدرلی نے لکھا ہے۔ جو اس حیثیت سے دلچسپ ہے کہ آج سے پچھتر سال پہلے کے ایک انگریز کی نثر کا نمونہ ہے چنانچہ اسی غرض سے یہ دیباچہ نقل کیا جاتا ہے۔

"نیاز مند درگاہ لم یزلی طامس ہیدرلی ابن مسٹر جیمس ہیدرلی مرحوم بیان کرتا ہے اور اپنا راز دل صاحب دلوں پر یوں عیاں کرتا ہے کہ میرا حقیقی چھوٹا بھائی کپتان الکزانڈر ہیدرلی جوان سعادتمند شیریں زبان دانش پیوند ابتدائے عمر میں شعر و سخن کا مائل ہوا اور چند روز میں جیسا چاہیئے مایۂ سخنوری و معنی گستری اس کو حاصل ہوا۔ کیونکہ زہ طبیعت درّاک تھی فکر چالاک تھی جو کچھ دل سے زبان تک اور زبان سے قلم تک آیا اس نے گلہائے معنی کا ایک تختۂ خوشرنگ دکھایا رفتہ رفتہ اس کے کلام کی وہ صورت ہوئی کہ ہم فنوں کو رشک ہوا اور دانش مندوں کو حیرت ہوئی نواب زین العابدین خاں دہلی کے امیرزادے عالی خاندان جو عارف تخلص کرتے تھے اور جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد تھے وہ اس کے استاد تھے اور اس نوجوان کو اپنے استاد اور اپنے استاد کے استاد کے انداز پیش نظر تھے اور اکثر ان کے اشعار یاد تھے، ہنوز برادر موصوف بہت کچھ کہنے نہ پایا تھا بلکہ جو کچھ اس کے دل میں تھا زبان تک نہ آیا تھا کہ ناگاہ وقت ناگزیر آ پہنچا اور اس سعادت مند ازل کو پیغام اجل کا آ پہنچا۔ چونکہ سرکار الور میں عہدۂ کپتانی پر مامور تھا دنیا سے سفر کرتے وقت میری نظر سے دور تھا۔ ایسا لائق ہونہار بھائی جس نے کل دو اوپر تیس برس کی عمر پائی رسا تویں جولائی ۱۸۶۱ء کو کام تمام ہوا اس غم کا جس قدر بیان کیجئے اس سے سوا ہے جو حال اپنا بنا ہے اور جس قدر غم کیا ہے بجا ہے، ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد، افسوس نہ فریاد میں فایدہ دیکھا نہ رونے میں تاثیر پائی بہت روئے بیٹھے آخر صبر کرتے بن آئی اشعار اس مرحوم کے جو جابجا پریشان پڑے پاتے گویا سونے میں زمرد اور یاقوت کے نگینے جڑے پائے۔ خیال آیا کہ جواہر کو بکھرا پڑا

رہنے نہ دیجئے اور ان سب اشعار کو ردیف وار جمع کر کے دیوان مرتب کیجئے تاکہ جو دیکھے وہ کہے اس شخص کی تھوڑی سی زندگانی تھی مگر واہ اس مدت قلیل میں کیا گہر فشانی تھی نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے مجھ کو یقین ہے کہ یہ جو کاغذ پر سیاہی سے لکھے گئے ہیں اس واسطے اس کے اشعار اس کے ماتم میں سیہ پوش ہوئے ہیں، الٰہی یہ مجموعہ اشعار مقبول طبع ہر سخنور رہے اور الک زندر ہیدرلی کی روح کو حضرت یسوع کے قدم مبارک میں مغفرت میسر ہو۔"

زیر مطالعہ دیوان میں صفحہ ۱۲ سے قصائد شروع ہیں جو صفحہ ۴۵ تک ہیں ایک حمدیہ قصیدہ ایک مسدس نعت مسیح اور (۹) متفرق مدحیہ قصاید ہیں۔

خاک و باد و آب و آتش کو فراہم کر دیا ٭ دم میں پیدا صانع قدرت نے آدم کر دیا

درمیانی ایک شعر ہے۔

سوزش داغ جگر کا چوں ضیائے ماہتاب ٭ گاہ بڑھ کر دیا رتبہ گہے کم کر دیا

مقطع ہے۔

بے لوا او بند کفر و دین سے آزاد ہوں ٭ مجھ کو یکساں آب گنگ و آب زمزم کر دیا

نعت مسیح کی مسدس کے (۱۱) بند ہیں ایک بند نقل کیا جاتا ہے،

تیری رحمت حامیٔ رزق گدایاں یا مسیح ٭ تیری بخشش تاج بخش تاجداراں یا مسیح
تیری شفقت ہر کس و ناکس کی نگہباں یا مسیح ٭ ہے تجھی سے نیک و بد کی مشکل آساں یا مسیح

ساقیٔ کونین و شاہ دو جہاں تو ہی تو ہے
یا مسیحا! چارہ ساز عاصیاں تو ہی تو ہے

اس مسدس میں بالکل وہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو ہمارے شعرا رسول مقبول امی و ابی فداک کی نعت پاک میں اختیار کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ آزاد کا نہ تو کوئی نعتیہ قصیدہ دیوان میں ہے اور نہ نعتیہ غزل، میرا ذاتی خیال ہے کہ طامس صاحب نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ دیوان سے آزاد کے قبول اسلام کا پتہ نہ چلنے پائے ورنہ مجھے یقین ہے کہ آزاد نے نعت کہی ہوگی اور یقیناً کہی ہوگی ممکن ہے کہ کبھی منظر عام پر بھی آ جائے۔

مدحیہ قصاید میں پہلا قصیدہ اپنے ماموں خاں صاحب حیات محمد خاں کی مدح میں ہے جس کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

زہے نصیب ازل سے ہوں بے تردد و بیم ٭ نہ آرزوئے بہشت بریں نہ خوف جحیم
بری ہوں مدح و مذمت سے میرے نزدیک ہیں ٭ نہ بتکدے کی حقارت نہ کعبہ کی تعظیم
ہزار واعظ و ناصح کیا کریں بک بک ٭ سنوں نہ ایک کسی کی نصیحت و تفہیم

نہ مدح گو کا ادا ہو مری زبان سے شکر ٭ نہ طعنہ ساز سے مجھ کو شکایت تلویم
وصال زیست ہے میری بتوں پہ مرتا ہوں ٭ خدا بھی دے تو نہ لوں حوریان باغ نعیم

ایک قصیدہ اپنے کسی بھائی نظام الدین خاں کی مدح میں کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

ہو کے خاک عالم میں تیرے کشتگاں پھرنے لگے ٭ مصر میں جیسے غبار کارواں پھرنے لگے

علی محمد خاں فرزند خاص نواب فیض محمد خاں بہادر بھرتپور کی مدح میں بھی ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

عروج پر ہے میری آہ کی شرر کاری ٭ کرے ہے خرمن گردوں پہ صاعقہ باری

اپنے بڑے بھائی طامس ہیدرلی کی مدح میں بھی قصیدہ کہا ہے مطلع ہے۔

پھر سینہ تپ غم میں ہے مجمر سے زیادہ ٭ جو لخت ہے دل کا سو ہے اخگر سے زیادہ

مہاراجہ جیاجی راؤ سندیہ بہادر والیٔ گوالیار کے مدحیہ قصیدہ کا مطلع ہے

کس لئے ہے تجھ کو اے دل انتظار فصل گل ٭ ہے مہاراجہ کی محفل میں بہار فصل گل

مہاراجہ شیو دان سنگھ بہادر والیٔ الور کے مدحیہ قصیدے کا مطلع ہے،

جا کہاں اب دشت سے وحشت میں پہاڑوں کو نکل
سر شوریدہ ہے مخصوص پئے تیغ جبل

عبدالرحمن خاں بہادر والیٔ جھجر کی مدح میں مطلع کہا ہے

ایسی ان روزوں میں ہے فیض ہوا کی تاثیر
کہ لگے کھلنے ہر ایک غنچۂ باغ تصویر

اپنے بھتیجے ولیم کی ولادت پر ایک قصیدہ کہا ہے مطلع ہے

ہزار شکر بدرگاہ ایزد متعال ٭ کہ گنج خانۂ دل ہے خوشی سے مالا مال

ایک دوست منا لال کی مدح بھی کہی ہے جس کا مطلع ہے۔

آسمان جہان فضل و کمال ٭ صاحب ہوش و رائے منا لال

قصاید میں کوئی خاص بات نہیں معمولی ہیں البتہ بعض قصاید طویل اور پچاس پچاس شعر کے بھی ہیں۔ صفحہ ۴۶ سے غزلیات شروع ہوتی ہیں جو صفحہ ۱۵۰ تک ہیں۔

غالب، مومن، وغیرہ اساتذہ کی غزلوں پر اکثر غزلیں کہی ہیں بعض ان پامال ردیفوں میں بھی غزلیں موجود ہیں جو دلی اور لکھنؤ کے اساتذہ کی روندی ہوئی ہیں، چونکہ طبیعت اچھی پائی تھی اس لئے بعض ناصاف اور

ادق زمینوں میں بھی اچھے شعر کہے ہیں، نمونتاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں،

کچھ سمجھ کر دل میں اپنے پھر گیا شاید رقیب شب جو دروازہ ترا کھڑکا کھڑک کر رہ گیا

صبح تک سب جاگتے رہتے ہیں سو سکتا ہے کون نالۂ پرشور سے ہے میرے گھر میں رت جگا

آسماں کشتیِ طوفاں زدہ ہو جائے اگر چشمۂ دیدۂ تر جائے اُبل تھوڑا سا
غمزہ و ناز و ادا کی وہی صورت تا کے اب تو جوبن بھی گیا آپ کا ڈھل تھوڑا سا

نویدِ وصل کہ رفتہ رفتہ گیا ہے اُن کا حجاب آدھا ہزار مشکل سے بارے اُٹھا ہوں نیم جاں ہوں تپ آدھا
شراب ہو کے جو تند ساقی نہ بے مزہ کر ملا کے پانی پلا وہ ساغر کہ جس میں ہو ے شراب آدھی گلاب آدھا

گرمیِ رفتار سے وحشت میں جوں فانوسِ شمع آبلوں میں خار ہیں آزادؔ روشن زیرِ پا

کس کا گرمِ جستجو ہے مجھ کو کیا کیا وہم ہیں کچھ تو ہے جو یوں ہمیشہ ہے سفر میں آفتاب
چھوٹے وہ خورشید طلعت کیونکر ہر جائی پنا کب شرف پاتا ہے آزادؔ اپنے گھر میں آفتاب

میری شامت تھی جو زلفوں میں کسی کی پھنستا آ پڑی ہیں یہ بلائیں میرے سر پر آپ

یہ بزمِ بزمِ مغاں ہے ادب سے بیٹھ اے شیخ جو ناچنا ہے تو جا کر کسی مزار پہ ناچ

رخنہ پردازیِ اغیار کو پوچھو ہم سے سینکڑوں دل میں ہزاروں ہیں جگر میں سوراخ

جبینِ یار پہ قشقے کو دیکھ لے آزادؔ نہ دیکھا ہو جو کبھی تو نے آفتاب میں چاند

پیکان کوئی ٹوٹ کے رہ جائے نہ دل میں سینے سے نکالو نہ مرے تیر ہلا کر
کون اس کے مقابل ہو یہ ہے کس کی جرأت خم ٹھوکے ہے گو دربت بے پیر ہلا کر

یہ درد لا دوا ہے نہ مجھ کو دوا پہ چھوڑ ہمدم مریضِ عشق ہوں مجھ کو خدا پہ چھوڑ

لکھوں جو احوالِ سوزِ دل کا تو خط وہ بھیجوں تو کیونکہ بھیجوں
کہ جل کے کاغذ عجب نہیں ہے لگے کبوتر کے پر میں آتش

جان و دل تجھ پہ یہی ہے مرا ارمان فقط میں اسی موت پہ مرتا ہوں مری جان فقط

وہ ہے واقع میں اڑی ناک گہر ہیں بیچ و خم اتنے کہ رہتی ہے سمٹ کر گیسوئے خمدار گردن تک
بلاؤں نم کو کیا اس گھر میں جس گھر کا یہ عالم ہو کہ جدا ونچی سے اونچی ہے وہ ہے دیوار گردن تک

اس لاغری پہ لاکھ کرے بل نکل گئے تنکے کی طرح عاشقِ خستہ جگر کے بل

بہا لے عرقِ رخ نے گلاب کے مول شمیمِ زلف نہ ہاتھ آئے مشکِ ناب کے مول

چشمِ جاناں کے تصور میں جو رہتا ہو مجھے تیرتی پھرتی نظر آئی ہرن دریا میں

ہو دیں گے ہم ممنون سی برق یہ کچھ خوف نہیں آگ ہمارے دل میں لگا دے شمع و شرر ہو کوئی ہو
اس میں خفا ہوں آپ کہ جوشِ جنوں ٹھہرا اس پہ ہی فدا ایسی ہمیں بن جا لیا دہن ہو ایسی کمر ہو کوئی ہو

دیکھ کر تجھ کو بہ شادی سے بڑھے نخلِ چمن پتلی پتلی تھیں جو شاخیں وہ بھی ڈالے بن گئے

ان مشکل زمینوں میں ایسے شعر نکالنا ایک منجھی ہوئی طبیعت اور مشق والے ہی کا کام ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزادؔ خاصے مشاق اور حاضر طبیعت والے شاعر تھے۔

یوں تو آزادؔ نے مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ، سبھی کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں مگر غالبؔ کو انہوں نے زیادہ پیشِ نظر رکھا ہے، چند ایسی غزلوں کے شعر بھی نقل کئے جاتے ہیں،

جس قدر روتے گئے دونا ہوا سوزِ جگر آبِ اشکِ چشمِ گریاں اس پہ روغن ہو گیا

ذوقِ پامالی سے گھر ہے لامکاں اپنا مثلِ نقشِ پا یعنی مٹ گیا نشاں اپنا
تو نے کب نمک چھڑکا زخمِ دل پہ اے ہمدم تجھ سے تو سوا دشمن ہے مزاجِ داں اپنا
دل کے خون ہونے کی اور کیا علامت ہے چشمِ خوں فشاں اپنی نالہ خوں چکاں اپنا

تیغ ہوں معرکہ آرائیِ وحشت کے لئے ہوتے جوہر مرے ظاہر جو میں عریاں ہوتا

ہے جو ہم رنگ مئے تو بنِ تیرے خونِ دل بھی پیا نہیں جاتا
مومن کی غزل پر مومن ہی کے رنگ میں ایک غزل کہی ہے۔

محفل سے تری اٹھائیں گے ہم   یوں غیر کا دل بٹھائیں گے ہم
جنگل میں رلانہ جوشِ وحشت   پھر خاک کہاں اڑائیں گے ہم
کھانے کی قسم تو کیونکر کھاویں   کیا غم بھی نہ تیرا کھائیں گے ہم
کوچے سے تہارے لیں گے رستہ   جب راہ نہ کوئی پائیں گے ہم
ہے اس کو اگر سیر تماشا   گھر اپنا ابھی لٹائیں گے ہم
گر اس کے بچے تو پھر کسی سے   زنہار نہ دل لگائیں گے ہم
ہیں دردِ طلب تو زخمِ دل پر   مرہم نہ کبھی لگائیں گے ہم
سامان ہوا ہے کچھ اکٹھا   اب گھر تجھے پھر بلائیں گے ہم
پابندِ غمِ بتاں ہیں آزاد   کیا قید سے جی چرائیں گے ہم

اب ذرا غالب کے رنگ میں آزاد کو دیکھئے۔

فتنہ اٹھے ہے کس نمط اٹھ کے ذرا دکھا کہ یوں   حشر بپا ہو کس طرح چل کے ذرا بتا کہ یوں
میں نے کہا کہ عشق میں جلئے تو جلئے کس طرح   خس کو اٹھا کے اس نے جھٹ آگ پہ کھ دیا کہ یوں

یوسف کا منہ نہ دیکھے زلیخا تمام عمر   دیکھے جو ایک بار مرے سیم تن کے پاؤں
عارض کو اس کے گل کہیں پھر کیا سمجھ کے ہم   بہتر ہوں گل سے جب بتِ گل پیرہن کے پاؤں
اس بت کی راہ میں جو مجھے ساتھ لے چلے   دھو دھو کے بار بار پیوں برہمن کے پاؤں
رنگِ حنا کے بوجھ سے اٹھنا محال ہے   نازک ہیں کس قدر مرے نازک بدن کے پاؤں
اے غیرتِ بہار ترے انتظار میں   سن ہو گئے کھڑے کھڑے سروِ چمن کے پاؤں
آزاد وقتِ رقص پڑے شب کو بزم میں   کس کس ادا سے اس بتِ ناہید فن کے پاؤں

عشق میں ترے مرنا عمرِ جاودانی ہے   یہ جو زندگانی ہے خاک زندگانی ہے
ان کے سننے کے قابل کب مری کہانی ہے   وہ کبھی جو سنتے ہیں اپنی خوش بیانی ہے
آہ کی شرر ریزی آج آزمانی ہے   آگ گھر میں دشمن کے شب مجھے لگانی ہے
جو کریں وہ بدوضعی ان کی وضعداری ہے   گر کریں وہ بے مہری عین مہربانی ہے
مجھ پہ گو مصیبت ہے یاد تو ہوں میں ان کو   وہ ستم جو کرتے ہیں ان کی مہربانی ہے
اک امید رہتی ہے ہم کو ناامیدی میں   موت کی توقع پر اپنی زندگانی ہے

نہ دے جو بوسۂ ابرو نہ دے جواب تو دے   بلا سے جو تجھے دینا ہو وے شتاب تو دے

افسوس خاک تک نہ ہمیں بہر سر ملے   وہ بھی ہیں لوگ جن کے اڑانے کو زر ملے

آزاد اپنے شیوۂ تسلیم کی قسم   کہتا ہوں صاف زور کی عادت نہیں مجھے

ہم نے جس راہ میں دیکھا اسے دیکھا آزاد   اور کیا راہ بتا دیں گے طریقت والے

طبیعت کا چوچلا اور چلبلاپن ہر ایک شعر سے ظاہر ہے ایک غزل سنئے۔

بارِ تن سر ہے اسے جلد اڑا چک قاتل   میری گردن کی قسم خنجرِ براں کی قسم
اور بھی عقدے مرے رشتۂ مقصد میں نہ ڈال   بات الجھا نہ تجھے کاکلِ پیچاں کی قسم
غم میں جمعیتِ خاطر کسے ہوتی ہے نصیب   ہوں پریشان تری زلفِ پریشاں کی قسم
دل سے کھٹکا ترے غم کا نہیں جاتا کبھی   نشترِ غم کی قسم ناوکِ مژگاں کی قسم
تار رکھیں گے نہ اک ضد سے تری تا بصبح   دشتِ وحشت کی قسم چاک گریباں کی قسم
سر سے پا تک شبِ ہجراں میں جلا کرتا ہوں   آہِ سوزاں کی قسم شمعِ فروزاں کی قسم

مشہور ہو سر حلقۂ اربابِ جفا تم   معروف ہیں من جملۂ اربابِ وفا ہم
از بسکہ صداقت منشی پیشہ ہے اپنا   بے جا بھی جو کچھ کہئے تو کہتے ہیں بجا ہم
ہنگامِ سحر بادہ گساری کا مزہ ہے   اوقات کریں اپنی تلف بہرِ دعا ہم

عزت سے مجھے پاس جو بٹھلاؤ تو آؤں   کیوں آپ سے آؤں مجھے لے جاؤ تو آؤں
تم دل کو بٹھاتے ہو مرے مجھ کو بلا کر   دل کو نہ بٹھاؤ مجھے بٹھلاؤ تو آؤں
کیا گھر میں تمہارے در و دیوار کو دیکھوں   تم اپنی جو صورت مجھے دکھلاؤ تو آؤں
غیرت کو رکھا طاق میں جب کی ہے محبت   دشمن کے بھی گھر میں مجھے بلواؤ تو آؤں
گر کوئی بلاتا ہے تو کہتے ہیں مرے ضد سے   آزاد کو محفل میں نہ بلواؤ تو آؤں

چلبلے پن اور چونچلے کے علاوہ طبیعت میں سنجیدگی، اور خیالات میں بلندی بھی تھی بعض دفعہ بڑی دور کی سوجھتے تھے،

آپ اپنے راز کو لاکھ چھپاتے ہیں مگر محبوب آپ کی صورت دیکھتے ہی سب کچھ بھانپ لیتا اور بدظن ہو جاتا ہے

میری صورت سب کہے دیتی ہے مرا حالِ دل   میرے تیور دیکھ کر وہ مجھ سے بدظن ہو گیا

لوگ آتشِ ہجر میں جل کر سیاہ ہو جاتے ہیں مگر آزاد تپ کر سونے کی طرح دمکنے لگتے ہیں۔

ان شعلہ رخوں نے مجھے از بسکہ تپایا   تو رنگ مرا مثلِ طلا اور بھی چمکا

یہ غلط فہمی بھی کیسی مزیدار ہے کہ

وہاں وہ آہ سے میری سدا خطر میں رہا   یہاں میں خفتِ معدومی اثر میں رہا

غالب کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ ان کا مطلوب عشق و ہوس میں تمیز نہیں کرتا، آزاد کو بھی یہی گلہ ہے

ہوس و عشق میں شاید نہیں کچھ ان کو تمیز ؛ مجھ سے وہ باندھتے ہیں عہد وفا کیا باعث

جنت جیسی مقدس اور پاک جگہ شراب کی نہر کتنی بے جوڑ بات ہے آزاد اسے یاد نہیں کرتے

خاک سچ کہتا ہے تو خلد میں اور جوئے شراب
آگ پھلنکے ہے جلے تیری زباں اسے واعظ

جنت جیسے مقدس مقام پر حوران بہشت بھی ویسی ہی عارفہ اور کاملہ قسم کی تہجد گزار ہوں گی۔ بھلا اُن مریم صفت حوروں میں راز و انداز کہاں وہ تو بس رات دن تسبیح پڑھا کرتی ہوں گی۔

خیر صورت میں تو خاصی ہیں مگر حوروں میں
سحر کہاں ؛ غمزہ کہاں ؛ ناز کہاں ! اسے واعظ

معشوق جب آنے لگتا ہے تو غالب کے گھر میں بوریا تک نہیں ہوتا مگر آزاد کے پاس سبھی کچھ رہتا ہے۔ صرف یہ خرابی ہوتی ہے کہ بنگلہ کے کمپونڈ کی دیوار بالکل اپ ٹو ڈیٹ ہوتی ہے یعنی فقط گردن تک اونچی! برآمدے میں بیٹھ کر نہ تو جلسہ منعقد کیا جا سکتا ہے اور نہ وصل،

بلاؤں تم کو کیا اس گھر میں جس گھر کا یہ عالم ہو ؛ کہ جو اونچی سے اونچی ہے وہ ہے دیوار گردن تک

یہ بنگلہ بھی جس کی دیواریں تا گلو تھیں کرایہ ہی کا تھا آزاد نے محض اس خوف سے کہ کہیں خراب نہ ہو مکان ہی نہیں خریدا۔

خراب ہوئے گا آخر جو مرا گھر ہو گا ؛ مکاں لیا نہ کوئی مارے اس عذاب کے مول

شاید اکبر الہ آبادی نے کہا ہے۔

پہلے تو رہن سے ہوا پتلون رند کا ؛ اب کوٹ بھی غریب کا نیلام ہو گیا

اس حالت میں کوٹ پتلون سے "سبک جسم" ہو کر آزاد نکلتے ہیں تو لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے،

ننگا ہوں مفلسی کی بدولت جنوں نہیں ؛ کپڑے گلے کے بک گئے فصل بہار میں

شب فرقت یوں تو گزر جاتی ہے مگر جب صبح کو یار کے گھر جانے کا خیال آتا ہے تو ایک دم یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ کیا منہ لے کے جائیں۔ ایک رات یار سے الگ رہ کر زندہ رہنا کونسی عاشقی ہے۔

دکھاؤں صبح شب ہجر کیا انہیں صورت ؛ کہ ان بغیر رہا زندہ شرمسار ہوں میں

دیکھئے کتنی اچھوتی تشبیہ ہے

کس سرف کے ہیں اور خطوط شعاع مہر ؛ موزوں ہیں ڈوریاں تری چلمن کے واسطے

اس خیال کی نزاکت کو بھی دیکھئے،

ہو گیا میں از قد خم گشتہ چوڑی کی مثال ؛ ہاتھ کنگن کو نہیں درکار ہرگز آرسی

بھیجنے کو تو نامہ بھیج دیا مگر اب پریشان ہیں کہ کہیں قاصد ہی سے اس کی آنکھ نہ لڑ جائے،

اب کیا علاج نامہ پشیماں ہوں بھیج کر ؛ وہ شوخ، رخنہ دریں ہے، قاصد جوان ہے

مذکورہ بالا شعر میں خاصا ابتذال پیدا ہو گیا ہے مگر ایک اور شعر سنئے جس میں اپنے رشک کو نہایت عمدگی سے ظاہر کیا ہے۔

وہ رشک کا عالم ہے کہ غیروں کا تو کیا ذکر ؛ ہم وصل کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے

دیکھئے کتنا اچھوتا خیال ہے،

ہائے خدا کے ہاں بھی تکلف قبول ہے ؛ پیر فلک پہ ڈالی ستاروں کی جھول ہے

غالب محض اس وجہ سے جنت کو ناپسند کرتے ہیں کہ اس میں لاکھوں برس کی حوریں ہیں مگر آزاد محض اس وجہ سے جنت کے بدلے دوزخ قبول کر لیتے ہیں کہ حوریں غیر جنس کی ہوں گی دوزخ میں اپنی ہم جنس مخلوق کے ساتھ رہنا ہی بہتر ہے۔

حوران غیر جنس کی صحبت سے فائدہ ؛ دوزخ ہی ایسے خلد کے بدلے قبول ہے

آزاد چونکہ غالب کے سلسلہ کے تھے اس لئے امرد پرستی پسند فرماتے تھے کس اطمینان سے کہتے ہیں،

ہند میں کم ہیں عشوہ گر اطفال ؛ رہئے آزاد چل کے کابل میں

آزاد کے تغزل کا نمونہ آپ نے دیکھا، افسوس ہے کہ غریب کو مہلت نہ ملی ورنہ آزاد اگر مشق سخن جاری رکھتے اور عمر وفا کرتی تو اساتذہ کی صف میں داخل ہو جاتے،

صفحہ ۱۵۶ پر غزلیات ختم ہوتی ہیں اور وہیں سے متفرقات شروع ہیں۔

متفرقات میں ایک دوبیتی ہے اور ایک (۳۱) شعر کا قطعہ "در رسیدن کلاہ زریں" اور ایک تاریخ کسی کی تصویر کی ہے، جس کا تاریخی شعر ہے،

دور کر کر سر بد میں کو رقم کر آزاد ؛ سال تاریخ کہ کیا ہوش رُبا ہے تصویر

ایک اکتیس شعر کا قطعہ "در رسیدن انبہ" کہلاتا ہے جس کے چند شعر یہ ہیں،

انبہ جو مرحمت ہوئے مجھ کو ؛ از رہِ لطف اے کرم گستر
مدت العمر ایسے انبہ کبھو ؛ مجھے آئے نہیں جہاں میں نظر

ان کی تعریف کیجیے کیا کیا   ان کو کس کا بتائیے ہمسر
رشک بے جا نہیں حسینوں کو   ان کے سبب ذوق سے ہیں خوشتر
پوست میرے خیال سے نازک   مغز میرے سخن سے شیریں تر

ایک قطعہ تاریخ کتاب عبرتِ ارم کا بھی ہے۔ عبرتِ ارم میں د کا تدخلہ کرکے ۱۸۴۸ء تاریخ نکالی ہے۔ اس کے علاوہ چند متفرق تاریخیں ہیں اور مبارکبادیں بھی جن میں کوئی خاص بات نہیں، ۱۸۵۲ء میں مسٹر [illegible] ایجنٹ کے ہاں ۱۸۵۳ء میں اپنے بھائی کے ہاں لڑکا ہوا ہے اور ان دونوں کی ولادت کی تاریخیں کہی ہیں۔

ایک منظوم خط اپنے بھائی طامس ہیدرلی کے نام (۲۰ شعر) کا لکھا ہے جس میں اپنی فلاکت کا حال ظاہر کرکے امداد کی خواہش کی ہے۔

احمد خاں نامی کسی صاحب کے غسل صحت پر تاریخ کہی ہے جس سے ۱۸۴۷ء نکلتے ہیں، اس تاریخی قطعہ کے کہنے کے بعد طبیعت نے چند غزل کے شعر بھی موزوں کر دیئے ہیں جنہیں قطعہ کے بعد ہی لکھ دیا ہے۔

زندگی کیا خاک رہتی برقرار   گر زمانے میں نہ ہوتا انقلاب
کل تو وہ آفت تھی اور آزاد آج   یار ہے پہلو میں ساغر میں شراب
رکھ جہاں تک رکھ سکے ساقی کو پاس   پی جہاں تک پی سکے صہبائے ناب

عارف کی موت پر ایک قطعہ (۱۴ شعر) کا کہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عارف کی موت کا صدمہ آزاد کو بہت ہوا، زین العابدین خاں عارف، نواب الٰہی بخش خاں معروف کے نواسے نواب مرزا غلام حسین مسرور کے بیٹے اور غالب کی بیوی کے بھانجے تھے، غالب عارف کو بہت چاہتے تھے۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ

> غدر سے چند سال پہلے جبکہ ان کی (یعنی غالب کی) بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہو گیا اور ان کے دونوں بچے ایک باقر علی خاں اور دوسرے حسین علی خاں صغیر سن رہ گئے تو مرزا اور ان کی بی بی نے چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو جو اس وقت بہت کم سن تھا اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

(یادگار غالب ص ۳۹)

افسوس ہے کہ عارف نے شاعر کی حیثیت سے کچھ بھی شہرت حاصل نہیں کی حالانکہ اچھے شاعر تھے صرف غالب کے اس نوحہ نے

[illegible] فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف   کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

عارف کا نام بھی زبانِ زدِ مداحانِ غالب کر دیا، آزاد نے بھی بڑے خلوص سے عارف کا ماتم کیا ہے کہتے ہیں۔

اے اہلِ دید دیکھ لو آنکھوں سے کیا ہے آج   میں کیا کہوں کہ دہر میں کیا ہو رہا ہے آج
یاں بعد مرگ حشر کا رکھتے تھے انتظار   لو سر پہ جیتے جی ہی قیامت بپا ہے آج
مردے عجب ہے گر نہ اٹھیں جی کے قبر سے   ہم بانگ صور نالۂ اہلِ عزا ہے آج
ماتم سے کیوں نہ دہر میں پڑ جائے زلزلہ   تشہیرِ بے ثباتیٔ ارض و سما ہے آج
اے بے کسی کٹے گی مری عمر کس طرح   جو میرا جاں نواز تھا سو مر گیا ہے آج
ہم جس کے پاس بیٹھ کے کرتے تھے غم غلط   اس کا ہی یا نصیب جنازہ اٹھا ہے آج
جو عندلیبِ باغِ سخن تھا سو ہم صفیر   قسمت سے صیدِ پنجۂ بازِ قضا ہے آج
جو شاعرانِ ہند میں جادو مقال تھا   وہ اژدہائے موت کا لقمہ بنا ہے آج
جس جسم پر کہ جامۂ گل دوز بار تھا   وہ جسم کوہِ گرد کے نیچے چھپا ہے آج
بیکس ہوں کس سے اپنی حقیقت بیاں کروں   جز رنج و یاس کون مرا آشنا ہے آج
اک لحظہ جس کے بے ملے آتا نہ تھا قرار   اے روزگار حیف وہ مجھ سے جدا ہے آج
کل تک تو تیرا وصل میسر رہا دریغ   عارف ترے فراق کا مجھ کو گلہ ہے آج
سالِ وفات لکھ یہ سراپا میں دور کر   عارف پسندِ رحمتِ حق ہو چکا ہے آج

دیوان میں مصرع تاریخ کے نیچے ۱۲۶۷ھ لکھا ہوا ہے مگر الفاظ جوڑنے سے ۱۲۷۷ء ہوتے ہیں اس میں سے مصرع اولیٰ کے بموجب یاس یعنی ی کے دس عدد نکال دیئے جائیں تو ۱۲۶۷ھ رہ جاتے ہیں مگر یہ دونوں بھی غلط ہیں مولانا حالی کا بیان ہے کہ غدر سے چند سال پہلے عارف نے انتقال کیا۔

مسٹر اکرم نے غالب نامے میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں مومن اور ان کے بعد عارف نے انتقال کیا، ۱۸۵۲ء، ۱۲۶۸ھ اور ۱۲۶۹ھ کے مطابق ہوتا ہے اگر ۱۸۶۸ء بھی مان لیا جائے تو مادۂ تاریخ میں ایک عدد کی کمی رہ جاتی ہے، ہماری دانست میں آزاد نے صحیح تاریخ نکالی ہے عارف کا انتقال ۱۲۶۷ھ ہی میں ہوا ہوگا، مسٹر اکرم اور دوسروں کو غالب کا سنہ وفات غلط ملا ہے۔

عارف کی تاریخ وفات کے بعد ایک مثنوی (۷۴ شعر) کی "در بیان شکایت مخفی بطریق معما" کہی ہے جس میں کوئی خاص بات نہیں، ناسخ کی غزل پر خمسہ بھی کہا ہے۔

اٹھا پھر ولولۂ غم میں تنورِ دل سے طوفاں کا   نظیرِ بحرِ قلزم ہے ہر آنسو چشمِ گریاں کا
قیامت ہو گیا آنا خیالِ روئے تاباں کا   مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

ایک خمسہ غالب کی غزل پر بھی ہے۔

بلا سے میں نہ سہی خاک بھی عدو کیا ہے — نہیں اسی کی قسم اس کی آبرو کیا ہے
زبانِ شوخ بیاں کا یہ حسن خو کیا ہے — ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

آخر میں اپنے بھتیجے چارلس ہیدرلی کی تاریخ وفات ۱۸۵۲ء نکالی ہے۔

آزاد کے قصائد، قطعات وغیرہ میں کوئی بات نہیں تاریخ نکالنے میں بھی کچھ مہارت نہ تھی کوئی تاریخ اچھی نہیں نکالی ہے تقریباً سب میں تخرجہ اور تدخلہ ہے، خمسے بھی کچھ اچھے نہیں ہیں آزاد کا کارنامہ غزل اور صرف غزل ہے، واقعہ یہ ہے کہ بڑی اچھی غزل کہتا تھا

آزاد کی غزلیات ہر طرح اس قابل ہیں کہ انہیں دوبارہ شائع کیا جائے، پیشِ نظر دیوان نایاب ہے اور عام بھی نہ ہوسکا، بہت کم لوگ آزاد اور اس کے کلام سے واقف ہیں۔

برادرانِ دہلی ممکن ہے کہ آزاد کے قبولِ اسلام سے متعلق کچھ اور معلومات فراہم کرسکیں، مسٹر ظفر قریشی اور مسٹر شاہد احمد اس خصوص میں توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔

تمکین کاظمی

رباعی

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اثر صہبائی

غزل

بیٹھا ہوں تشنگی کو چھپائے نگاہ میں
ساقی کے آستانۂ عالم پناہ میں

پھر عرش و فرش میں ہے قیامت مچی ہوئی
پھر جنبشیں ہیں یار کی نیچی نگاہ میں

پروردگار میری "صبوحی" کو دیکھ کر
کیوں آگ لگ گئی ہے تیرے مہر و ماہ میں

ہر ذرّے پر ہے میری جبیں اب جھکی ہوئی
دیکھا تھا نقشِ پائے صنم خاکِ راہ میں

یہ صاحبِ خلوص تو وہ بندہ ہوا
یہ فرق ہے فقیر میں اور بادشاہ میں

خاکِ درِ حبیب پہ جب مجھ کو ناز ہے
پھر کیا دھرا ہے طُرّۂ و تاج و کلاہ میں

اس ماہِ نیم ماہ کو دیکھا جو اے ندیم
تارے چمک اُٹھے مری لوحِ سیاہ میں

[illegible]

ماہی گیر کی بیوی

...ھی ہوں اکیلی کٹیا میں اور اُن کی یاد ستاتی ہے
مدہوش گھٹا کے پردے میں پنہاں ہیں ستاروں کی شمعیں
دل کانپ رہا ہے سُن سُن کر موّاج سمندر کی چیخیں
...بے رحم اور بھیانک آندھی بھی رہ رہ کر شور مچاتی ہے

...نی کی بھینٹ نہ چڑھ جائے کمزور سی کشتی شوہر کی !
ایسا نہ کہیں ہو، طوفانی گرداب میں گُم ہو جائیں وہ !
ایسا نہ کہیں ہو، لہروں کی آغوش ہی میں سو جائیں وہ !
...ر ہے نہ ڈبو دیں اُن کو کہیں امواجِ مہیب سمندر کی !

...لمت کی خلیجِ بے پایاں طوفانِ بلا ہے سر تا سر
ممکن ہے بھنور کے چکّر میں بھولے سے پیر پھسل جائے !
ممکن ہے کوئی گھڑیال انہیں سرعت کے ساتھ نگل جائے !
...مکن ہے گرا بیٹھیں چپّو ہاتھوں سے اپنے گھبرا کر

میں قید ہوں غم کے زنداں میں کر لطف و کرم مجھ پر یارب
محفوظ و سلامت لوٹ آئیں اس رات وہ اپنے گھر یارب

تخت سنگھ برادرِ مصنف

حُسنِ نظر

محبت میں تیری ہے جینا ہی پینا　　نہ کچھ فکرِ ساغر نہ کچھ ذکرِ مینا
خزاں ہو گئی ہے بہارِ تمنا　　عجب گُل کھلائے بہار آفرینا
نگاہیں زمانے کی اِس پر جمی ہیں　　کسے دیکھ بیٹھی میری چشمِ بینا
کسی سے ہیں وابستہ میری امیدیں　　یہی میرا مرنا یہی میرا جینا
نگاہِ کرم تو نے یہ بھی نہ چاہا　　غمِ جاودانِ محبت بھی چھینا
خدا سے کریں شکوۂ ناخدا کیا　　غنیمت ہے یہ بھی کہ ڈوبا سفینہ

نظرؔ یوں بھی کرتا ہے کوئی محبت
نہ کوئی سلیقہ نہ کوئی قرینہ

قیوم نظر

اکبر ایک منتظم کی حیثیت میں

اکبر کا شمار دنیا کے عظیم الشان بادشاہوں میں ہے۔ فاتح، فرمانروا، مدبر، اور بانیٔ قوم کی حیثیت سے وہ مشاہیر عالم کی صف اولیں میں جگہ پانے کے قابل ہے اُسے تاریخ ہند میں بہت بڑا رتبہ حاصل ہے۔ وہ ایک روشن خیال اور عالی دماغ بادشاہ تھا جس نے اپنے زمانے میں تعصبات و توہمات کے بُت توڑنے کی جان توڑ کوشش کی اور ایک حد تک کامیاب بھی رہا۔ وہ ایک قابل حکمران اور زبردست فاتح تھا۔ لڑائیوں میں اکبر کے اس قدر نمایاں کامیاب ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس کی طرزِ حکومت اچھی ہونے کی وجہ سے اس کی سلطنت میں بغاوتیں کم ہوتی تھیں۔ یہ اُن مسلم حکمرانوں میں سے تھا جنھوں نے ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس بات کو محسوس کیا کہ ہندوستان میں کوئی سلطنت ہندوؤں کی اعانت کے بغیر زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ وہ جب تک زندہ رہا اس پر کاربند رہا اور جب تک اُس کے جانشینوں نے اس کے طریقے پر عمل کیا اُس وقت تک سلطنت عروج پر رہی۔

اکبر نے بڑے بڑے عہدوں پر لائق اور وفادار اشخاص مامور کئے جنھوں نے اُس کی سلطنت کو وسیع بنانے میں خوب جدوجہد کی۔ رعایا کو خوش حال بنانے کی غرض سے نظامِ حکومت میں مناسب تبدیلیاں کیں اور ایسے قوانین نافذ کئے جو ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے مفید ثابت ہوئے۔ وہ ہمیشہ غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کرتا تھا۔

انہیں وجوہات سے آج تک ہر فرقہ اور طبقہ کے بے تعصب اور انصاف پسند آدمی اس کا نام عزت اور عقیدت سے لیتے ہیں۔ اس کے زمانے میں ہر شخص کو مذہبی آزادی تھی اور اکبر کے مذہبی طریقے نے ہندوؤں کو اس کا ہمدرد، جاں نثار اور حلقہ بگوش بنا دیا اور ہندوؤں نے سلطنت کی ترقی میں اپنی جان تک لڑا دی۔ جس وقت یورپ کے حکمران غیر مذہب والوں پر ظلم و تشدد کر رہے تھے اس وقت اکبر نے صلح و آشتی اور غیر مذاہب سے رواداری کی آواز بلند کی۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ کسی طرح مذہب کے تلخ مناقشات کو جن کی وجہ سے اس کی رعایا میں بڑے بڑے اختلاف تھے ختم کر دے اور سارے ملک میں صلح و آشتی کا ڈنکا بجا دے۔ کیا یہ اس کی غیر معمولی دانشمندی کا اور قابلیت کا کافی ثبوت نہیں ہے؟

اکبر کے طرزِ حکومت میں شیر شاہ کے دستور العمل کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ ایسے وقت میں تخت نشین ہوا جبکہ دہلی کی مرکزی حکومت بالکل کمزور ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس کے تخت نشین ہوتے ہی یہ چار اہم سوال اس کے درپیش تھے۔ پہلا امیروں اور سرداروں کی سرکوبی کرنا اور انہیں اپنے قبضے میں رکھنا۔ دوسرے ہاتھ سے نکلی ہوئی ریاستوں کو اپنے قبضے میں لانا۔ تیسرے مرکزی حکومت کو مستحکم بنانا اور سلطنت کا ایسا بندوبست کرنا جس سے ملک میں امن و امان قائم ہو جائے۔ چوتھے سلطنت کی پائداری کے لئے ہندوؤں سے میل کرنا۔ ان مشکل عقدوں کو اکبر نے بڑی دانائی سے حل کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک چھوٹی سی ریاست کو نہایت وسیع اور عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کر دیا۔

سلطنت میں بیرم خاں سب سے بڑا عہدہ دار تھا۔ اس کو "وکیل سلطنت" کہتے تھے۔ اس کے ماتحت ایک دیوان ہوتا تھا جو صیغۂ مال کا ذمہ دار تھا۔ میر بخشی کے سپرد دو کام تھے پہلا دار الخلافہ کے سرکاری دفتروں کا انتظام کرنا اور تنخواہ بانٹنا۔ دوسرے فوجی عہدوں کا انتظام کرنا اور جنگ کرنا اور منصب داروں کی نگرانی اور لڑائیوں میں خود لڑنا خانِ سامان شاہی محل کے اخراجات اور انتظامات کا ذمہ دار تھا۔ صدر الصدور ان جاگیروں کا انتظام کرتا تھا جو مذہب کے لئے وقف کی جاتی تھیں۔ شہروں میں قاضی مقدمے سنتے تھے مفتی اور میر عدل فیصلے سناتے تھے۔ قاضی القضاۃ تمام سلطنت کے محکمۂ عدالت کا سب سے بڑا افسر تھا شہر

میں عدالتیں موجودہ زمانے کی سی نہ تھیں۔ ہندوؤں کی جائیداد یا وراثت وغیرہ کے معاملے پنچائت کے ذریعے طے ہوتے تھے مگر جب وہ سرکاری افسروں کے سامنے آتے تھے تو ہندو رسم و رواج کا خیال کیا جاتا تھا دیہات میں آپس کے جھگڑے پنچائت کے ذریعے طے ہوتے تھے۔ قانون تعزیرات سخت تھا۔ مگر ہندو مسلمان سب کے لئے یکساں تھا۔ پھانسی کی سزا کم دی جاتی تھی۔ مقدموں کی اپیل کبھی کبھی بادشاہ بھی سنتا تھا۔ اور دربار عام میں ان کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔ ایک داروغہ ڈاک اوچوکی کا ہوتا تھا جو محکمۂ ڈاک کا انتظام کرتا تھا۔ محتسب کا کام رعایا کے اخلاق پر نظر رکھنا تھا۔ داروغہ ٹکسال شاہی ٹکسال کا بندوبست کرتا تھا۔ علاوہ اس کے میر آتش کے سپرد توپ خانے تھے۔ ان افسروں کے علاوہ سلطنت میں تقریباً ایک درجن افسر اور تھے۔ ان میں سب سے بڑا داروغہ تھا جس کا کام شہر کی حفاظت کرنا اور عورتوں کو ستی ہونے سے روکنا تھا۔ خانساماں کو چھوڑ کر بقیہ آٹھ افسروں کے پاس جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ صوبوں سے ان کے صیغوں کی خبریں آتی رہتی تھیں اور وہ صوبوں کے افسروں کو حکم بھیجتے رہتے تھے۔

شیر شاہ کی طرح اکبر کی حکومت سیاسی کے دو خاص حصے تھے دارالسلطنت کا انتظام اور صوبوں کا انتظام۔ انتظام کی دیکھ بھال شہنشاہ خود کیا کرتا تھا۔ دارالخلافہ میں شہنشاہ کے نیچے وزیر اعظم تھا جو "وکیل سلطنت" کہلاتا تھا۔ اکبر نے شیر شاہ کی طرح تمام سلطنت کو مندرجہ ذیل پندرہ صوبوں میں منقسم کیا۔ آگرہ۔ احمد آباد۔ اجمیر۔ الہ آباد۔ بنگال۔ بہار۔ دہلی۔ کابل۔ لاہور۔ مالوہ۔ ملتان۔ اودھ۔ احمد نگر۔ برار اور خاندیش۔ ہر ایک صوبہ میں ایک صوبیدار یا سپہ سالار ہوتا تھا جو اکثر خود سرانہ حکومت کرتا تھا۔ سپہ سالار بادشاہ کا کوئی عزیز یا اعلیٰ رتبے کا امیر ہوتا تھا۔ دو تین سال کے بعد اس کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔ ہر ایک صوبہ میں کئی سرکار اور ہر ایک سرکار میں کئی پرگنے ہوتے تھے۔ صوبیدار تمام محکموں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ اُس کو فوجی اور جنگی اختیارات بھی پورے طور پر حاصل تھے۔

صوبے کی گورنمنٹ میں صوبہ دار سب سے بڑا افسر تھا۔ اُس کے اختیارات بادشاہ کی طرح بہت وسیع تھے۔ صوبہ دار کو بادشاہ خود مقرر کرتا تھا۔ دارالسلطنت سے دور ہونے کی وجہ سے وہ فرائض کی ادائیگی میں کافی سختی اور خود مختاری سے کام لیتا تھا اور اپنی مدد کے لئے جاسوسوں کا ایک گروہ رکھتا تھا فوجی اور عدالتی محکمے اُس کے سپرد تھے۔ لیکن وہ رعایا کے مذہبی معاملات میں کسی طرح دخل نہیں دے سکتا تھا اور نہ بغیر بادشاہ کی اجازت کے کسی کو موت کی سزا دے سکتا تھا۔ شہنشاہ کی طرح اس کے ماتحت بھی کئی افسر تھے۔ جن کو علٰحدہ علٰحدہ محکمے سپرد تھے۔ ان میں خاص دیوان تھا۔ صدر خود مختار ہوتا تھا۔ اور وہ مرکزی حکومت سے مقرر تھا۔ عامل ریونیو کلکٹر تھا۔ بدقچی موجودہ وقت کے تحصیلدار کے مانند تھا۔ فوجدار سرکار کا حاکم کہلاتا تھا۔ اس کا فرض تھا کہ وہ اس بات کی نگرانی کرے کہ بادشاہ کے قوانین پر عمل درآمد ہوتا ہے یا نہیں خزانچی روپیہ وصول کرکے دیوان صاحب کو بھیجتا تھا۔ پولیس کا انتظام اچھا تھا پولیس کا حاکم کوتوال کہلاتا تھا جو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرتا تھا۔ ملزموں کا چالان کرتا تھا اور چھوٹے چھوٹے جرائم کی سزا وہ خود دے سکتا تھا۔ بازار کی دیکھ بھال اور باٹوں کی جانچ پڑتال بھی پولیس کا فرض تھا۔ قانون گو، اور پٹواری، بدقچی کے ماتحت رہتے تھے۔ حکومت کی طرف سے واقعہ نویس بھی رہتے تھے جو ہر بات کی خبر بادشاہ کے گوش گزار کرتے تھے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ فوجی نظام میر بخشی کے سپرد تھا۔ اکبر کے عہد میں ۱۵۷۱ء میں منصب داری کا طریقہ شروع ہوا۔ اس کا منصب داری بندوبست یورپ کے جاگیرداری طریقے سے کہیں اچھا تھا۔ مثلاً منصب داروں کی طاقت کم تھی۔ اور بادشاہ کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ملک کا ہر عہدہ دار منصب دار بھی ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں آج کل کی طرح فوجی محکمہ جداگانہ نہ تھا۔ حکومت کے بڑے بڑے افسر چاہے وہ کسی منصب پر کیوں نہ مامور ہوں۔ وقت ضرورت پر فوجی کام بھی انجام دیتے تھے۔ یہ ضروری نہ تھا کہ جو شخص جتنے کا منصب دار ہو اتنے ہی سوار رکھے۔ بادشاہ جس کو چاہتا تھا منصب دیتا تھا اور جس کو چاہتا تھا معزول کر دیتا تھا۔ منصب داروں کا تبادلہ بھی عمل میں آتا تھا۔ کیونکہ اکثر لوگ مقررہ تعداد سے کم ہی سوار نوکر رکھتے تھے۔ سب سے بڑا منصب دس ہزار کا تھا جو بعد میں بارہ ہزار کا ہو گیا۔ سات ہزار سے اوپر کے منصب صرف شاہی خاندان کے افراد کو یا بڑے بڑے امرا کو ملتے تھے۔ مثلاً مان سنگھ، ٹوڈرمل کو بہت سے منصب دار دارالسلطنت میں حاضر رہتے تھے اور اکثر صوبجات میں بھی رہتے تھے۔ فوج چار حصوں میں منقسم تھی (۱) سوار (۲) پیادہ (۳) توپ خانہ اور (۴) ہاتھی۔ سواروں میں سب سے بڑی تعداد منصب داروں اور ان کے ماتحتوں کی تھی۔ سواروں کی دو قسمیں تھیں۔ داخلی اور احدی۔ داخلی سے مراد ان سواروں سے ہے جنہیں حکومت اپنی طرف سے بھرتی کرکے منصب داروں کے پاس بھیج دیا کرتی تھی۔ احدی خاص منصب داری سوار ہوتے تھے جن کو چالیس

روپیہ سے لے کر ۰۰ ۵ روپیہ تک تنخواہ ملتی تھی۔ فوج میں ہر مذہب کے لوگ تھے۔ فوج میں بندوقچی۔ دربان، شمشیر باز۔ کہار۔ پہلوان اور خدمت گار رہتے تھے۔ ہاتھیوں کے جھنڈ کو "حلقہ" کہتے تھے۔ سوار فوج کا اہم ترین حصہ تھے۔ مردوں کے ساتھ عورتوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بادشاہ کی توپ خانہ پر خاص توجہ تھی اور اس کا افسر "داروغہ توپ خانہ" تھا۔ اکبر کی فوج کی تعداد صحیح طور پر نہیں بتائی جا سکتی۔ کیونکہ مورخین کے درمیان اس بات پر اختلاف ہے۔

اکبر کا مال گزاری انتظام قابل تعریف تھا۔ علاء الدین خلجی اور شیر شاہ سوری نے بھی کئی ضروری اصلاحیں کی تھیں۔ لیکن اکبر کا انتظام ان دونوں سے بہتر تھا۔ خواجہ عبدالمجید خاں مالگذاری کا سب سے بڑا دیوان تھا۔ اس کے بعد مظفر تربتی ہوا۔ ٹوڈرمل نے جو شیر شاہ کا وزیر رہ چکا تھا۔ دہ سالہ بندوبست کی بنیاد ڈالی۔ یہ بندوبست ۱۵۸۲ء میں شروع ہوا۔ جبکہ ٹوڈرمل "دیوان اشرف" بنایا گیا۔ پھر ٹوڈرمل نے دس سال کی وصولیابی کا واسطے کر کے ہر حیثیت کی اراضی کے ٹکڑے کئے۔ ہر جنس کی ایک شرح معین تھی جس میں کبھی کمی و بیشی ہوتی تھی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ مختلف جنسوں کے لئے الگ الگ۔ . . . شرحیں مقرر تھیں جو گھٹ بڑھ نہ سکتی تھیں۔ اس کے لئے زمین کے چار حصے کئے گئے تھے۔ پولاج۔ پروتی۔ چاچر اور بنجر۔ بنجر وہ اراضی تھی جس میں کبھی کاشت نہ ہوتی تھی اور یوں ہی بیکار پڑی رہتی تھی۔ چاچر میں تین یا چار سال تک کاشت نہ ہوتی تھی۔ پروتی جو کبھی سال بھر کے لئے کاشت نہ ہوتی تھی۔ تخم ریزی کے بعد اس بات کی جانچ کر لی جاتی تھی کہ کس زمین میں کون سی فصل بوئی گئی ہے۔ اس کے حساب سے اُس اراضی پر لگان کی تشخیص ہوتی تھی۔ جب کوئی نئی یا بنجر زمین بوئی جاتی تو اُس پر لگان کم لیا جاتا تھا۔

اکبر کے عہد میں مالگذاری کا بندوبست تین حصوں میں منقسم تھا۔ (۱) ضبطی (۲) غلہ بخش (۳) نسق۔ محکمۂ مالگذاری میں دیوان سب سے بڑا افسر تھا۔ عامل ریونیو کلکٹر تھا۔ اس کا تقرر مرکزی حکومت سے ہوتا تھا۔ بدقچی، توپدار، پٹواری، قانون گو اور مقدم اس کے ماتحت افسر تھے۔ مقدم سب سے چھوٹا افسر تھا۔ اس کے علاوہ اکیس اور افسر تھے جن کا بیان بخوف طوالت نظرانداز کرتا ہوں۔ پیداوار کا ایک تہائی حصہ بطور لگان لیا جاتا تھا۔ لگان دو قسطوں میں لیا جاتا تھا۔ کاشتکاروں کو نقد یا جنس دونوں میں سے کوئی بھی ایک چیز دینے کا اختیار رہتا۔ حاکم اور ملازمان سرکار رشوت نہیں لیتے تھے لگان وصول کرنے کا کام مقدموں کے سپرد تھا اور انہیں مقرر تنخواہ دی جاتی تھی۔ کسانوں کو لگان کی رسید ملتی تھی۔ حساب سب فارسی میں رکھا جاتا تھا۔ اس لئے ہندو اقوام اس زبان کو حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ قحط کے زمانے میں بادشاہ تقاوی دیتا تھا۔ تمام سلطنت ۱۸۲ پرگنوں میں منقسم تھی، ہر ایک کی مال گذاری ایک کروڑ تھی۔ پرگنہ کا افسر کروڑی کہلاتا تھا۔ ٹوڈرمل کا انتظام سلطنت رعایا کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اور ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو گئی۔

المختصر اکبر ایک قابل اور کامیاب منتظم تھا جیسا کہ اس کی حکمت عملی اور اصلاحات سے ظاہر ہے۔ اس کی سیاسی، معاشرتی، فوجی اور مالگذاری اصلاحات نے ہندو اور مسلمانوں میں ملک کی محبت کا جذبہ اور بڑھایا۔ اس کی پالیسی نہایت دوراندیشانہ تھی۔ اسی لئے مغلیہ سلطنت ایک عرصہ تک قائم رہی لیکن جوں ہی اس کی پالیسی اور نظام کو چھوڑ دیا گیا۔ اس وقت سے مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار نمودار ہونے لگے اور ۱۷۰۷ء کے بعد اس کا شیرازہ بکھر گیا۔

بیجناتھ تواری

رباعی

کھلتے ہیں فلک کے باب ہنگامِ سحر
اٹھ جاتے ہیں سب نقاب ہنگامِ سحر
وہ حسن کہ ہے ہزار پردوں میں نہاں
ہو جاتا ہے بے حجاب ہنگامِ سحر

اثر صہبائی

نوائے فراق

یہ شوخیٔ نگاہ کسی پر عیاں نہیں
تاثیرِ دردِ عشق کہاں ہے کہاں نہیں

عشق اس طرح مٹا کہ عدم تک نشاں نہیں
آ سامنے کہ میں بھی تو اب درمیاں نہیں

مجھ کو بھی اپنے حال کا وہم و گماں نہیں
تم رازداں نہیں تو کوئی رازداں نہیں

صیّاد اس طرح تو فریبِ سکوں نہ دے
اس درجہ تو مجھے بھی غمِ آشیاں نہیں

اس درگزر سے اور کھلا عشق کا بھرم
یہ کیا ہوا کہ مجھ سے وہ اب سرگراں نہیں

پس ماندگان اب اور ہی ڈھونڈیں دلیلِ راہ
اتنی بلند گردِ رہِ کارواں نہیں

محوِ سکوتِ ناز ازل سے ہے بزمِ عشق
قصہ نہیں، فسانہ نہیں، داستاں نہیں

ہیں پرسشِ نہاں کے بھی عنوان سینکڑوں
اتنا ترا سکوتِ نظر بے زباں نہیں

اے دوست اہلِ درد کے رازِ سکوں نہ پوچھ
مدت ہوئی نگاہ تری درمیاں نہیں

کیا حشر دیکھیے ہو اب اس اعتدال کا
سنتے ہیں عشق درپئے آزارِ جاں نہیں

کیا حشرِ وعدہ، کیا رگِ جاں، کیا حریمِ راز
یہ جانتا ہوں تو ہے جہاں میں وہاں نہیں

ہمدم دیارِ دل کی جنوں خیزیاں ہیں اور
زنداں نہیں ہے، دشت نہیں، گلستاں نہیں

تھا حاصلِ حیات بس اک عشوۂ نہاں
اب یہ نہ پوچھ عشق کہاں ہے کہاں نہیں

کیا واقعی فریب ہے اے دل حیاتِ عشق
کیوں مژدۂ وصال سے میں شادماں نہیں

ہستی کے انقلاب کو کیا کیجیے فراق
مانا کہ ہجرِ یارِ غمِ جاوداں نہیں

فراق گورکھپوری

فارسی محاورات اور غالب

اُردو علم ادب کو محمد شاہی عہد کے دکنی اور دہلوی شعراء نے جب فارسی علم ادب کی تقلید پر ڈال دیا۔ تو اس میں عروض و قواعد زبان فارسی ہی کا تتبع کیا جانے لگا۔ اس لئے محاورات فارسی کا اردو علم ادب و زبان میں مستعار لیا جانا۔ وسعتِ زبان اور شعر و شاعری کی ضرورتوں کے لئے نہایت ضروری قرار دیا گیا۔ کیونکہ تلازمۂ محاورہ سے نہ صرف زبان بامحاورہ ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس میں کئی نازک سے نازک خیالات کا ادا کرنا بھی بہت آسان ہو جاتا ہے۔ مثلاً میر درد ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو   دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہاں تر دامنی کے لفظ سے جو لطف اور بیان میں نزاکت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ کسی اور طرح بالکل غیر ممکن تھی ؛ حضرت سودا ؎

ساقی چمن میں چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا   پیمانہ میری عمر کا ظالم تو بھر چلا

اس شعر میں عمر کا پیمانہ بھرنا۔ فارسی محاورہ پیمانہ پُر کردن کا لفظی ترجمہ ہے۔ لیکن اگر اس جگہ یہ محاورہ مستعمل نہ ہوتا۔ تو شعر بالکل بے لطف ہو جاتا۔ غرض فارسی محاورات کے استعمال سے بعض اشعار میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور آج تک فارسی علم ادب کے عام محاورات ہمارے شعراء نے بکثرت استعمال کئے ہیں۔ لیکن ایک زبان کے کسی محاورے کا دوسری زبان میں ترجمہ کر کے استعمال کرنا بعض اوقات بہت الجھنیں پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ بات غالب کے اُردو اشعار میں خاص طور پر پائی گئی ہے۔ جیسا کہ بیاناتِ ذیل سے واضح ہو گا ؎

بہ کس شوخی سے نازاں تر نشکیب نشستن کا   کہ شاخِ گل کا خم انداز ہے بالیں شکستن کا

اس شعر میں بالیں شکستن کا محاورہ بجنسہٖ مستعمل ہوا ہے۔ اور عام اردو دان ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ کہ بالیں شکستن سے مراد تعظیم بجا لانا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کس شوخ نے متانت کے ساتھ بیٹھنے کی دکھائی ہے۔ کہ شاخ گل (جو بہ عیب ستے جھکی ہوئی ہے) کے جھکاؤ کا انداز ایسا ہے گویا وہ کسی کی تعظیم بجا لا رہی ہے ؛ غالب ؎

وسعتِ جیب جنونِ تپشِ دل مت پوچھ   محملِ دشت بدوش رم نخچیر آیا

زبان فارسی میں جیب کردن سے مراد کسی کیفیت پر غالب آنا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ دل کے مجنونانہ اضطراب کو وسیع پیمانے پر جیب کرنے یعنی اس پر قابو پا جانے کی کیفیت مت پوچھ گویا سارا جنگل ایک محمل کی صورت بن گیا ہے اور وہ محمل ایک شکار کے کندھے کی باگ ڈور پر رکھ دیا گیا ہے۔ یعنی جبکہ تمام دشت ہی اس طرح ہاتھ میں کر لیا گیا ہے تو پھر اس میں چلنے پھرنے والوں کے جنون تپش کا کیا حال پوچھنا۔ بس سمجھ لے کہ وہ سب کچھ اسی میں شامل ہو گیا ہے۔ گویا ہر چہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ غالب

یک گامِ بیخودی سے لوٹیں بہارِ صحرا   آغوشِ نقشِ پا میں کیجے فشارِ صحرا

مطلب شعر:۔ ہم چاہتے ہیں کہ وحشت کا ایک قدم اٹھا کر جنگل کی بہار لوٹیں مراد یہ کہ دیوانہ بن کر دیوانہ گردی کے مزے اڑائیں۔ لہذا آغوشِ نقش پا یعنی اپنے پاؤں تلے کے نقش میں جو آغوش یا خلا ہوا کرتا ہے۔ اس میں صحرا کا فشار کر دیں۔ مراد یہ کہ تمام صحرا میں پھر کر اسی کی خاک اسی آغوشِ نقشِ پا میں لا کر جمع کر دیں ؛

اردو زبان میں اس قسم کے نازک خیالات فارسی محاورات کی شمولیت کے بغیر ہرگز ادا نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے شاعر کا ایسا کرنا ایک مجبوری امر تھا۔ کچھ اور مثالیں۔ غالب ؎

دادخواہِ تپش و مہرِ خموشی لب پر   کاغذِ سرمہ ہے جامہ ترے بیماروں کا

جامۂ کاغذی در بر کردن۔ زبانِ فارسی کا ایک محاورہ ہے بہ معنی فریادی ہونا۔ اور سرمہ سے مراد خموشی لی جاتی ہے۔ تو اس قسم کے فارسی محاورات کا لفظی ترجمہ کرنا اردو میں گویا اشکال کا دانستہ پیدا کرنا ہے۔ لیکن مرزا صاحب اس زمانے میں جبکہ اُن کی شاعری کی ابتدا تھی۔ ایسی باتوں کی مطلق پروا نہیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں فرماتے ہیں۔ تیرے بیماروں کا لباس

جیب کاغذ مسرمہ ہے۔ یعنی وہ ایک تو فریادی ہیں۔ دوسرے خاموش۔ کسی سے تیرے خلاف کچھ گلا نہیں کرتے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ تجھ سے داد خواہ ہیں۔ یعنی اپنے تڑپنے کا انصاف چاہتے ہیں۔ مگر اس پر بھی وہ مہر خاموشی برلب ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ کچھ شور و شر نہیں مچاتے۔ اور صبر کے ساتھ انصاف کے طالب ہیں ؛ غالبؔ ؎

جوہر آئینۂ فکر سخن موئے دماغ عرضِ حسرت پس زانوئے تامل تا چند

مفہوم شعر: سخن موئے دماغ، فارسی محاورہ ہے بمعنی عیش میں خلل واقع ہونا۔ کہتا ہے۔ جس طرح آئینے میں جوہر یا مواد کا ہونا کسی کی عیش آئینہ بینی میں خلل کا واقع ہونا ہے۔ اسی طرح زانوئے تامل کے بعد یعنی صبر کر کے بیٹھ جانے کے بعد عرضِ حسرت کرنا۔ کب تک (مناسب ہوگا) —— یہ عرضِ حسرت گویا صبر میں خلل اندازی ہے ؛

مندرجہ ذیل اشعار میں مرزا غالبؔ نے فارسی محاورات کو بزبانِ اردو ترجمہ کر کے استعمال کیا ہے۔ لہذا یہ شارحین کلام غالب کے اکثر سمجھ میں نہیں آئے۔ اور وہ ان اشعار کا کچھ کا کچھ حل سپرد قلم کر گئے ہیں۔ مثلاً ؎

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

اس شعر کو پہلے مرزا نے اس طرح باندھا تھا ؎

آتشیں پا ہوں۔ گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

مسبوق الثانی شعر کا مفہوم یہ ہے :-

قید خانے میں جو وحشت مجھے ہو رہی ہے۔ اس کی گداز یا جلن کا حال مجھ سے مت پوچھ۔ گویا میں آتشیں پا ہوں یعنی میرے پاؤں تک جل اُٹھے ہیں۔ اور ان سے میرے پاؤں پر کی زنجیر کی ہر کڑی موئے آتش دیدہ یا ایک جلے ہوئے بال کی صورت بن گئی ہے۔

مصنف نے اسی مضمون کی بنا پر پھر وہ شعر باصلاح لکھا ہے۔ جو کہ مروجہ دیوان غالب میں طبع ہوا ہے۔ یعنی ؎

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

تذکرہ آب حیات میں یہ شعر (صفحہ ۴۴) نقل کر کے آتش زیر پا ہونا کے معنی بیقرار ہونا لئے گئے ہیں۔ مگر یہ معنی غلط ہیں۔ کیونکہ مرزا نے اس محاورے کے لفظی معنی "پاؤں کے نیچے آگ کا ہونا" قرار دیے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کے ترجمے عام طور پر کسی زبان میں جائز نہیں ہو سکتے۔ تاہم جب متقدمین میں میر تقی میرؔ۔ سوداؔ اور دردؔ وغیرہ نے یہ تصرف اظہار مطالب کے لئے لازم سمجھا تو پھر غالب پر کیا اعتراض کیا جا سکتا ہے ؛

ایک اسی طرح کا اور بھی شعر ہے۔ جس میں "بسر زلف شدن"، کے فارسی محاورے کا لفظی ترجمہ کر کے غالبؔ نے اپنے تمام شارحین کلام کو سخت حیران کر رکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہوتے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مفہوم شعر: ہماری آہ کو مؤثر ہونے کے لئے ایک عمر یعنی عرصۂ دراز درکار ہے۔ کیونکہ تیرے سر زلف ہونے یعنی جس قدر کہ تو استغنا برتنے والا ہے اس مدت تک صبر کر کے اور آہیں بھر بھر کے کون جی سکتا ہے۔ اس شعر میں "بسر زلف شدن" کے اصلی معنی بیحد لاپروائی کرنا ہیں کہ فارسی میں ہیں۔ وہ اردو میں بتوسطِ ترجمہ لئے گئے ہیں اور اس سے یہ شعر کچھ عام فہم نہیں رہا۔ !

حاصل کلام فارسی علم لغت سے مرزا غالب نے اکثر ایسے محاورات اردو غزل میں مستعار لئے ہیں۔ جو متقدمین اور متاخرین شعرائے اردو میں سے کسی نے بھی استعمال نہیں کئے۔ مگر اب وسعتِ زبان کے لئے ان کو نظم کرنا متبعین غالب کی توجہ کے بہت مستحق امر ہے۔ عام طور پر مرزا موصوف کا تتبع یہی تصور کیا جاتا ہے کہ انداز بیان میں اختصارِ عبارت اور ندرت خیالات کے ذریعہ شعر کا مفہوم ادق سے ادق تر بنایا جائے۔ لیکن مقدمۂ دیوان حالی میں مرقوم ہے کہ قدما جس محاورے کو کسی طرح باندھ گئے ہوں اگر اس کو اُن سے کچھ اور اختلاف کر کے نظم کیا جائے تو یہ بھی ایک طرح کی جدت اور خوبی تصنیف میں داخل ہے تو غالب کے اپنائے ہوئے فارسی محاوروں کو بھی اسی اصول کے مطابق ہمارے شعرا کو پھر اپنے استعمال میں لانا چاہیئے اور اپنا کمال فن ان میں دکھانا چاہیئے۔ کچھ ایسے ہی محاورات کی مثالیں کلام غالب سے درج کی جاتی ہیں۔ مثلاً

دنداں در جگر افشردن۔ یعنی دانتوں میں جگر کو کھونسنا۔ اس سے مراد آمادہ بہ ہلاکت ہونا ہے۔ جیسا کہ اس شعر میں ؎

دیکھیئے مت چشم کم سے سوئے ضبط افسردگاں
جوں صدف پُر در ہیں دنداں در جگر افشردگاں

نمد در آب یعنی پانی میں نمدے کا ہونا۔ مراد مکر و فریب ہے۔ مثال ؎

کجا معزولیٔ آئینہ کو ترکِ خود آرائی
نمد در آب ہے اے سادہ پرکار اس بہانے سے

مطلب شعر: دوست کہاں معزولیٔ آئینہ کرتا ہے۔ یعنی آئینے کا دیکھنا وہ کب ترک کرتا ہے۔ اور وہ کب خود آرائی کا شغل موقوف کرتا ہے۔ تو اے سادہ دل عاشق وہ دوست اگر ایسا کہتا ہے تو وہ اس بہانے سے پرکار نمد در آب ہے

یعنی سخت فریب دیتا ہے۔ یا وہ سادہ پرکار دوست ہمیں ترکِ آئینہ وخود آرائی کا وعدہ دے کر بہت فریب دے رہا ہے۔

خارخار ایک فارسی محاورہ ہے۔ جس سے مراد مرغوبِ دل ہونا۔ یا کسی چیز کی خواہش یا دل میں اس کی طرف سے کچھ لگاؤ رکھنا ہے۔ غالب نے اس کو بہت سے اشعار میں برتا ہے۔ مثلاً ؎

تکلّف خارخارِ التماسِ بیقراری ہے
کہ رشتہ باندھتا ہے پیرہن انگشتِ سوزاں کا

مطلب شعر:- چونکہ دھاگہ سوئی پر لپیٹ کر ایک پیراہن سا لگا دیتا ہے اس لئے کہ زخم کی وجہ سے جو بیقراری پیدا ہوئی ہے۔ اس کی التجا کو بھی مرغوب ہے۔

دوسری مثال ؎

تھا مجھ کو خارخارِ جنونِ وفا اسدؔ
سوزن میں تھا نہفتہ گل پیرہن ہنوز

یہاں بھی خارخار سے مراد دل میں اٹکنا یا مرغوب ہونا ہے۔

غزل

ہرچند بستہ چشم رہا بستہ لب رہا
میں مدتوں نشانۂ تیرِ غضب رہا

غیروں پہ لطف کا بھی بتایا گیا جواز
مجھ پر ترا ستم بھی مگر بے سبب رہا

تو نے جو کچھ دیا وہ دیا لطفِ خاص سے
پابندِ آستیں مرا دستِ طلب رہا

اس بزم میں نگاہ پہ قابو نہ رکھ سکا
ہاں مجھ کو اعتراف ہے میں بے ادب رہا

سو بار تیرے غم نے دکھائی رہِ فنا
سو بار تیری یاد میں مَیں جاں بلب رہا

دل کی فسردگی نے یہ مجھ پر ستم کیا
میں وقفِ انتظارِ اجل روز و شب رہا

فطرتؔ رموزِ شوق نہ کہہ گریہ کوش رہ
"سب کچھ کہا اسی نے جو یاں بستہ لب رہا"

شادؔ عظیم آبادی

عبدالعزیز فطرتؔ

سرخوش

رباعی

یہ جوش و خروش یہ روانی تیری!
ہے عشق سے آشنا جوانی تیری!
اے سرخوشیِ بادۂ طرب! اے دریا!
ہے رقص و سرود زندگانی تیری!

اثرؔ صہبائی

غزل

پاؤ گے اُسی کی نگہہ ہوش رُبا میں
تاثیر ہے اے صدق دوا میں نہ دعا میں

ممتاز وہ کشتے ہیں شہیدانِ وفا میں
سر جن کے کٹے سجدۂ نقش کفِ پا میں

جذبِ دلِ بلبل کا اثر تم نے بھی دیکھا
دامن کوئی بے چاک نہیں گل کی قبا میں

سرمے نے بڑھا دی نگہہِ ناز کی تاب اور
یہ آب نہ پہلے تھی کبھی تیغِ جفا میں

ملنا تو کجا آنکھ ملاتا نہیں لیکن
ظالم کے یہ انداز بھی داخل ہیں ادا میں

اترا نہ بہت ہستئ موہوم پہ غافل
کچھ اس کی حقیقت نہیں چشمِ حکما میں

ترکیبِ عناصر میں خلل آگیا جس دن
جز خاک ہے کچھ آگ نہ پانی نہ ہوا میں

ناقدرئ اربابِ کدورت کا گلہ کیا
اے صدق مرا گھر ہے دلِ اہلِ صفا میں

صدق جائسی

ہیر وارث شاہ

سنا یاراں کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا (انشاؔ)

وارث شاہ پنجابی کا ہومر اور فردوسی ہو گزرا ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر اور فصیح و بلیغ سخنور ہونے کے علاوہ علم النفس انسانی (ہیومن سائیکالوجی) کا ایک بہت بڑا ماہر تھا۔ کیونکہ اس کی عظیم الشان تصنیف میں عورت اور مرد کے تمام جذبات کا نقشہ ایسے طریق پر کھینچا گیا ہے جس کی قدر آج کل کے بڑے بڑے ماہرین علم النفس ہی کر سکتے ہیں۔ اس کی شاعری اکتسابی نہیں بلکہ وہبی ہے اور نظم میں غضب کی آمد ہے۔ وارث شاہ نہ صرف ایک زبان دان تھا بلکہ زبان آفرین بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقلیم سخن میں زبان اس کی دست بستہ کنیز تھی۔ "ہیر" پر منظوم تقریظ کرنے والے مولوی پارس علی۔ پیراں دتہ ترگڑ۔ نبی بخش ٹھیکیدار۔ محمد دین۔ سراج الدین۔ حکیم محمد دین۔ ہاشم علی وغیرہ ہیں۔ اس بزرگ کی شاعری پر مفصل تبصرہ اصل مضمون میں کیا جائے گا۔ یہاں صرف ایک اہم مشکل کی وضاحت مقصود ہے جو مقالہ نگار کو "ہیر" کے اہم مقامات سے اقتباسات حاصل کرنے کے دوران میں پیش آئی ہیں نے کتاب کے کم وبیش ڈیڑھ درجن مختلف ایڈیشن فراہم کئے اور جب ان کا آپس میں مقابلہ کیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب دیکھا کہ وہ تمام کی تمام کتابیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ بہت سے اشعار ایسے تھے جو ایک کتاب میں موجود تھے اور دوسری میں ندارد۔ کسی نسخے میں کم اشعار کسی میں زیادہ۔ کسی میں بہت سی سرخیاں غائب کسی میں کئی عنوانات کا اضافہ اور کہنے کو تمام سید وارث شاہ کی مصنفہ تھیں۔ جب یہ کتاب تصنیف ہوئی تو چونکہ یہ تمام کتاب سوال وجواب کی صورت میں تھی اس لئے گا کر سوال وجواب کرنے والے میراسیوں اور پیشہ ور گانے والوں نے اس کے بہت سے حصوں کو رٹ لیا اور نتیجۃً اکثر اشعار اصل الفاظ پر مشتمل نہ رہے بعض فراموش ہی کر دئیے گئے اور بعض خود گھڑ لئے گئے۔ اشعار کے مقدم و موخر ہونے کا سبب بھی یہی ہے۔ گانے والوں کی زبان سے بیسیوں ایسے اشعار سنے گئے ہیں جو مطبوعہ کتب میں کہیں نہیں ملتے۔ یہ طرز اشعار کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ اسی وزن اور بحر میں ایک ہی مضمون پر اشعار کہے گئے اور وہی اشعار رفتہ رفتہ بعض مطبوعات میں

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

کہتے ہوئے اصل اشعار میں شامل ہو گئے۔ جتنا ظلم وارث کی کتاب پر بن بلائے اضافہ اور ادغام کی صورت میں ہوا ہے اتنا شاید ہی کسی اور کی کتاب پر ہوا ہو۔ اس کے بعد کتاب کے لاتعداد مرتب کرنے والوں کی نوازشوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ کتاب مرتب کرتے وقت ایسے اوقات اکثر آئے جب مرتب حضرات کی اپنی طبع بھی شعر کہنے پر مائل ہوئی اور وہ اصل اشعار بالائے طاق رکھ کر نہایت بے تکلفی سے کتاب کا حجم بڑھاتے گئے۔ محض چند اشعار پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ درجنوں نئے عنوان وضع کئے گئے اور ان کے تحت میں اپنی طبع کی جولانی دکھائی گئی۔ ان کی فیاضی کی حد یہ تھی کہ مقطع میں نام وارث شاہ کا ہی لکھا گیا۔ اول اول تو ان اشعار کو نمبر کے ذریعے علیحدہ رکھا گیا مگر بعد میں کئی نسخوں میں یہ نوترمیم اشعار اصل اشعار میں مدغم کر دئیے گئے اور اس طرح اصل و نقل میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ محمد الدین سوختہ امرتسری۔ ہاشم علی ظفر والی۔ کرم الٰہی سلطانوی وغیرہ ترمیم کرنے والوں میں سے ہیں۔ مقدم الذکر

نے سینکڑوں اشعار اپنی طرف سے لکھے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے صحیح نسخۂ ہیر مرتبہ محمد الدین ڈیہڑیالوی کا ہے جو پیر اندتا ز گڑھ کے وسیلے سے کسی قدیم قلمی نسخے سے نقل کیا گیا ہے اور کتاب پر مرتب کا دعوےٰ ہے بھی ہے کہ ؎ جیہڑی ابو سعید چھپاندا وڈی ہیر اصلی ہے اس دے باہجوں ہور جو چھاپے جاوں اہنوں نقلی (جو کتاب ابو سعید محمد الدین ڈیہڑیالوی کی مطبوعہ ہے وہی اصلی اور بڑی ہے۔ ماسوا اس کے دیگر مطبوعات نقل تصور کرو) اسی قسم کے دعوے بہت سی کتب پر موجود ہیں۔ بہر حال میں نے اس مقالے کے اقتباسات ہیر کے ایک بہت قدیم نسخے سے لے کر درج کئے ہیں جس کا مرتب عنایت اللہ نامی کوئی شخص ہے مگر ان اقتباسات میں بھی بعض اشعار وارث شاہ کے معلوم نہیں ہوتے کیونکہ وارث تو قافیہ کا بادشاہ ہو گزرا ہے اور بعض اشعار کے قوافی کمزور اور ناقص ہیں۔ امید ہے کہ مقالہ نگار کو اس بات پر مورد الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر بہت زیادہ کاوش اور جستجو سے کام لیا جاتا تو وارث کے اصل اشعار کے علاوہ کوئی دوسرا شعر شامل نہ ہوتا۔ اب بھی اگر ممکن ہوا تو بہت جلد کسی دوسری اشاعت میں وارث سے منسوبہ اشعار متعلقہ مقالہ ہذا کی تصحیح کردی جائے گی۔

محمد صادق قریشی

ہیر وارث شاہ ایک غیر فانی ادبی شاہکار ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب پنجابی ادب کا ایک بیش بہا گنجینہ ہے۔ ہم لوگ رومیو جیولیٹ۔ دانتے بیٹرس یوسف زلیخا وغیرہ کی بابت بہت کچھ پڑھتے ہیں اور اپنی سرزمین کے اس زندۂ جاوید رومان کی طرف بھول کر بھی اپنی توجہ مبذول نہیں کرتے۔ یہ کتاب اس زبان میں سب سے پہلی اور آخری تصنیف ہے جس کے اثرات براہِ راست دل و دماغ سے لے کر نفس اور روح تک کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وارث شاہ کی شاعری عام مشرقی شاعری کی نسبت بہت زیادہ سادہ اور نیچرل ہے۔ بالکل عام فہم اور سادہ الفاظ میں ان فطری کیفیات کی تصویرکشی کی گئی ہے جن کی موجودگی میں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ اشعار کا مجموعہ نہیں بلکہ نفسیاتی اور قلبی کیفیات کی ان تصاویر کا البم ہے جن کے اصل نقوش و خطوط کو کسی قسم کے غیر ضروری رنگ، تصنّع یا حاشیہ آرائی سے بدلنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ میرے نزدیک کتاب کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ جذبات نگاری میں وارث شاہ کو ید طولےٰ حاصل تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کتاب کے مطالب و معانی پر تفصیل سے تبصرہ کیا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ٹریجیڈی یعنی المناک داستان کے پلاٹ یعنی قصے کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ قصہ کے تمام غیر ضروری عناصر کو عمداً نظر انداز کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ امر غیر ضروری طوالت کا باعث نہ ہو۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ ہیر رانجھا کی داستان کئی ایک دردناک اور روح فرسا واقعات پر مشتمل ہے ہیر اور رانجھا اپنی تمام حسرتوں اور امیدوں کو ناکام بناتے ہوئے اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ افسانہ یوں شروع ہوتا ہے:-

۱؎ رانجھا جاٹ ان کی قوم کا نام تھا

پنجاب کے ایک گاؤں میں موجو نامی ایک فارغ البال زمیندار رہا کرتا تھا۔ دھیدو عرف رانجھا اسی کا بیٹا تھا۔ یہ لڑکا بہت ناز و نعم میں پل کر جب جوان ہوا تو موجو انتقال کر گیا۔ رانجھا کو کاشتکاری کا کام پسند نہ آیا جس پر اس کی بھاوجوں نے بہت کچھ طعن و تشنیع سے کام لیا اور بے چارہ رانجھا کبیدہ خاطر ہو کر تخت ہزارہ کو چھوڑ کر جھنگ سیال کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں دریائے چناب آتا تھا جس کو عبور کرنے کے لئے اس نے لڈن نامی ایک ملاح کی منت و سماجت کی لیکن اس نے بلا اجرت پار لگانے سے انکار کر دیا۔ اس پر دونوں میں تکرار ہو پڑی اور رانجھا نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ اس جگہ اس نے ونجلی یعنی بانسری بجا بجا کر اردگرد کی بسنے والی آبادی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہاں تک کہ لڈن ملاح اپنی دونوں بیویوں کے اصرار کی وجہ سے رانجھا پر مہربانی ظاہر کرنے لگا اور اسے اس کی خواہش کے مطابق پار پہنچا دیا گیا۔ سوءِ اتفاق سے اسی کشتی میں جھنگ کے چوچک نامی ایک چودھری کی لڑکی ہیر کا پلنگ جارہا تھا۔ اس پر رانجھا غلطی اور نادانی کی وجہ سے لیٹ گیا تھا۔ یہی ہیر ہماری اس داستان کی ہیروئن ہے۔ وہ اس وقت معہ اپنی سہیلیوں کے دریا کی سیر کو آئی تھی۔ ایک اجنبی کو اپنے پلنگ پر دراز دیکھ کر اس نے اپنی سہیلیوں کو حکم دیا کہ اُسے ذرا سرزنش کریں۔ ناگاہ اس کی نظر رانجھے کے چہرے پر پڑی اس کے مردانہ اطوار اور وجیہہ شکل و صورت دیکھ کر وہ اس پر فریفتہ ہو گئی۔ ادھر رانجھے میاں کا یہ حال تھا کہ ع۔ ہم نے بھی دین و ایمان قربان کر دیا ہے۔

ان دونوں میں کچھ عرصے تک گفتگو ہوتی رہی اور ہیر نے وفاداری اور خدمت گزاری کا وعدہ دیا۔ اس طرح رہِ عشق و وفا کا یہ اولین مرحلہ طے ہوا۔ اس کے بعد ہیر ہی کے ایما پر رانجھا اس کے باپ کی بھینسیں چرانے کا کام کرنے لگا۔ وہ اکثر اوقات باہر دریا کے کنارے اسے

ملتی رہتی اور اس کی ہر طرح سے خدمت کرتی رہتی۔ کامل بارہ برس تک رانجھے نے بھینسیں چرائیں۔

شومیٔ بخت سے ایک دن کیدو، ہیر کے چچا نے ان دونوں کو یک جا دیکھ لیا۔ اس کے بعد حسن و عشق کا وہ ہنگامہ جس کے راز دار صرف دو دل تھے اور جو دریائے چناب کے پانی کی روانی، چراگاہ کی سبزی اور درختوں کی بے زبانیوں میں محفوظ تھا، دنیائے الفت کی وہ امانت جس کی امین صرف دو بے قرار روحیں تھیں .... رنج و محن کا واحد ملجائے سکون، دو سینوں میں بھڑکتی ہوئی آگ عشق، ہاں وہ ماجرائے عشق اب لفظ رسوائی بن کر جھنگ سیال کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میاں رانجھا کو بیک بینی و دو گوش گھر سے باہر نکال دیا گیا ع

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اور رنگ پور کھیڑیاں کے ایک شخص سیدا نامی سے ہیر کی نسبت ٹھہرا دی گئی اور بہت جلد شادی کے انتظامات مکمل کر دئیے گئے۔ جب برات آئی اور قاضی نے خطبۂ نکاح شروع کیا تو ہیر نے سیدا کو بطور شوہر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر قاضی اور ہیر کے درمیان دیر تک بحث ہوتی رہی اور ہیر نے طوالت کے ساتھ رموز عشق سے قاضی کو آگاہ کیا مگر بے چاری اکیلی ہیر کیا کر سکتی تھی۔ آخر کار وہ بغیر رضامندی کے جبراً سسرال پہنچا دی گئی۔ رانجھا اپنے متاع حیات یعنی ہیر کی روانگی کے وقت وہاں موجود تھا اور اس قلیل مدت میں بھی انہوں نے ایک دوسرے سے درد بھری [illegible] کرنے سے کوتاہی نہ کی۔

ہیر سسرال میں اپنے خاوند سے قطعی طور پر علیحدہ رہی۔ وہ رانجھا کے فراق میں ماہیٔ بے آب تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے رانجھے کی طرف ایک درد بھرا پیغام بھیجا کہ خدارا میری خبر لیجو۔ رانجھے نے یہ ترکیب نکالی کہ بالناتھ نامی ایک جوگی کی خدمت میں حاضر ہو کر جوگی بن گیا اور اسی فقیرانہ صورت میں رنگ پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ گاؤں کے باہر اسے ایک چرواہا ملا جس کی وساطت سے وہ ہیر کے گھر تک پہنچ گیا اور جب دروازے پر صدا دی تو سیدا کی بہن اس کے سامنے آئی۔ اس کا نام سہتی تھا جب سہتی جوگی کو خیرات میں کچھ اناج وغیرہ دینے لگی تو جوگی نے عمداً اپنا پیالہ گرا دیا اور سہتی سے مطالبہ کرنا شروع کیا کہ مجھے یہی پیالہ دیا جائے کیونکہ یہ میرے نزدیک اپنے پیر کی نشانی ہونے کی وجہ سے متبرک تھا

اس پر بہت دیر تک بحث و تکرار ہوتی رہی۔ جوگی یعنی رانجھا کا اصل مقصد تو یہی تھا کہ نیازمندی بارگاہِ ناز میں سجدہ ریز ہو یعنی ہیر کسی طرح باہر آئے اور اس ناکام اور نامراد عاشق زار کے سامنے اپنے وفاداری کے تمام پیمان یاد کر کے آئندہ ان کی تکمیل کے لئے کوئی سبیل نکالے۔ ناگاہ اس کی مراد بر آئی۔ پنجابی نسوانیت کا وہ بہترین پیکر، جوگی کی تمام تمناؤں کا مرکز، ہیر اس کے سامنے تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں نے نہ معلوم کیا کچھ کہہ سن لیا کہ رانجھا گاؤں کے باہر کالے باغ میں دھونی رما بیٹھا۔ کتاب کا یہ حصہ جس میں رانجھا اور سہتی کا مکالمہ درج ہے، حقایق و معارف انسانی خواہشات۔ جذبات۔ احساساتِ عشق اور ستم ہائے فراق کے متعلق بہترین خیالات کا اظہار ہے۔

کچھ عرصہ بعد سہتی اور ہیر جو کہ ایک دوسرے کی راز دار بن چکی تھیں کسی بہانے باہر نکلیں۔ سہتی بھی مراد نامی ایک بلوچ کے دامِ الفت میں گرفتار تھی اور جوگی نے اسے ملانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ گھر واپس آ کر اہل خانہ کو سہتی نے یہ بتا کر تشویش میں ڈال دیا کہ ہیر کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ گھر والے فوراً کسی ماندری کی تلاش میں نکلے اور کالے باغ سے ایک ایسے ماندری کو لے آئے جو فراق اور ہجر کے سانپ کے کاٹے کا بہترین معالج ہو سکتا تھا۔ رانجھے بے چارے کو بھی مدت سے اسی سانپ نے کاٹ رکھا تھا۔ اس کی مراد بر آئی۔ اس کی فرمائش تھی کہ علاج کے لئے علیحدہ کمرہ ہونا چاہیئے لہذا اسے ہیر اور سہتی کے ساتھ علیحدہ کمرے میں بند کر دیا گیا۔ تمام رات راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں اور ابھی کچھ رات باقی تھی کہ میاں جوگی اپنے مریض ہجراں یعنی ہیر کو لے کر گاؤں سے بھاگ نکلے۔ جوگی کی دعا کا اثر سمجھو یا حسن اتفاق کہ مراد بلوچ بھی سہتی کو آ ملا اور وہ اُس کے ساتھ فرار ہو گئی۔

ہیر اور جوگی میاں گاؤں سے دور باہر جنگل میں ایک غار کے اندر پناہ گزیں ہوئے۔ بدقسمتی سے یہ ایک شیر کی گپھا تھی۔ مگر رانجھے کی مردانگی اور بہادری نے اپنے جوہر دکھائے۔ اس نے خنجر سے شیر کو مار گرایا اور دونوں بجنت ہو کر نیند کی سحر پاش آغوش میں چلے گئے۔ کھیڑے تعاقب میں آ رہے تھے۔ یہاں سے دونوں پکڑے گئے اور معاملہ قاضی کے روبرو پہنچا قاضی نے فریقین کے بیان سے کر جوگی کو جھوٹا قرار دیا اور ہیر کو کھیڑوں کے حوالے کر دیا۔ اس پر جوگی اور اس کی متوالی جوگن کے دلوں سے آتشیں نالوں کا ایک طوفان اٹھا جس کے سوز اور حدت سے گاؤں کا گاؤں

جل اٹھا۔ حاکمِ وقت (راجہ صاحب) کو اس معاملہ کی خبر ہوئی۔ اس نے کچھ تحقیق کے بعد جوگی کی بددعا سے خوف کھاتے ہوئے ہیر کو اس کے حوالے کر دیا۔ دونوں جھنگ سیال پہنچے۔ جہاں جوگی نے درویشانہ صورت کو خیرباد کہا اور اپنے تمام مردانہ وقار کے ساتھ ہیر کے والدین کے سامنے پہنچا اور ہیر کو حاصل کرنے کی درخواست کی۔

ہیر کے باپ نے رانجھے سے کہا کہ وہ باقاعدہ برات لے کر آئے تاکہ ہیر سے اس کی شادی کر دی جائے۔ رانجھا تخت ہزارے پہنچا اور ایک شاندار برات لے کر چلا۔ گھر والوں نے کچھ بدنامی کے خوف سے اور کچھ کھیڑوں کے جذبۂ انتقام سے ڈر کر ہیر کی کشتیٔ حیات کو غرق کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ رانجھے کی عدم موجودگی میں ہیر کے چچا کیدو نے ہیر کو زہر کھلا دیا۔ رانجھا برات لے کر آ رہا تھا۔ اس کی زندگی کے سنہری خواب آگے آگے رقصاں تھے۔ امیدوں اور مسرتوں کی دلفریب شعاعیں اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں اس کا دل غیرارضی انبساط کا مرجع بنا ہوا تھا۔ مگر آہ یہ فلک کج رفتار راحت اور طمانیت کے بے پناہ جذبات کو اپنی آنکھوں میں پناہ دینے سے عاجز ہے۔ وہ ہمیشہ ان احساسات کو حرفِ غلط کی طرح بساطِ دل سے ناپید کر دیا کرتا ہے۔ وہ انسان کی خوش ترین توقعات کو باطل قرار دیا کرتا ہے۔ ہاں تو رانجھا بارات لے کر آ رہا تھا کہ بدنصیب کو اپنے دل کی کائنات کے برباد ہو جانے کا علم ہوا۔ ہیر مر چکی تھی۔ اس روح فرسا خبر کو سنتے ہی رانجھے کے دل سے ایک دردناک چیخ اٹھی اور وہ بے چارہ بھی وہیں گر کر مر گیا۔ انتہائی مسرت اور انتہائی غم کا یہ منظر بہت دل سوز اور جگر پاش ہے۔

شیکسپیئر کے ایک ڈراما MUCH ADO ABOUT NOTHING کے کردار ہمارے اس حزنیہ سے ملتے جلتے ہیں۔ رانجھا کلاڈیو اور ہیر ہیرو ہے۔ سہتی بیٹرس اور کیدو ڈان جان اور اسی طرح دوسرے کردار ڈان پیڈرو چوچک وغیرہ ہیں۔ مگر کلاڈیو اور ہیرو تو ہزاروں ارمان اور خواہشات کو پورا کرنے کے لئے زندہ رہے اور یہ ہر طرح سے ناکام اور نامراد رخصت ہوئے۔ ہیرو تو موت کے بعد بھی زندہ ہو گئی اور اپنے محبوب کی آغوش میں پہنچ گئی مگر ہماری ہیر کے زہر کے لئے کوئی تریاق مہیا نہ ہو سکا جو غمزدہ رانجھے کو ایک بار پھر ہیر کی روشن اور چمکتی ہوئی آنکھیں دکھا سکتا۔

یہ افسانہ اپنے اثر اور جذبات کے باعث اس قدر مقبول ہو چکا ہے کہ پنجاب کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں اس کے قدردان موجود نہ ہوں

بعض حلقوں میں تو اسے تصوف اور الٰہیات کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض انتہا پسند تو اسے قرآن مجید کی تفسیر سمجھتے ہیں۔ ہیر رانجھا کو خدا اور رسول مانتے ہیں۔ ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو وارث شاہ کو ایک بہت بڑا ولی اللہ اور اس کے کلام کو اسرارِ تصوف کا خزانہ تصور کرتے ہیں۔ صوفیوں کا جانی شاہی نامی گروہ تو ہیر کی کتاب کو خوبصورت ریشمیں غلافوں میں لپیٹ کر ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ وہ لوگ عام الفاظ کے پردے میں عرفانیات الٰہیات اور تصوف کے غیر فانی حقایق کے دریا بہتے دیکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہیر سے مراد روح ہے رانجھا جسم ہے۔ بالناتھ پیر طریقت ہے کیدو شیطان ملکی اور چوچک فقہ اور اصول ہیں۔ سہتی موت ہے۔ کشتی پلصراط اور شیر نفس امارہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

بعض کے نزدیک ہیر مثنوی مولانا روم کی مکمل شرح ہے۔ کئی ایک اصحاب علم وارث شاہ کی تصنیف کو کلامِ صوفیائے عظام ثابت کرتے ہیں۔ بہرحال اگر صرف شاعرانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس امر کے تسلیم کرنے سے ہمیں انکار نہیں ہو سکتا کہ اس میں گلستاں کی طرح فطرت انسانی کے تمام پہلو واضح کئے گئے ہیں۔ حافظ کے وجد انگیز ترانے امرؤالقیس کی شاعرانہ نازک خیالیاں۔ میر تقی کا سوز و اثر شیلے کے روح پرور نغمات اور شیکسپیئر کے انسانی عوالم کے خاکے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔

وارث شاہ کے متعلق بھی ضروری ہے کہ کچھ بتا دیا جائے۔ وہ ۱۱۴۷ھ میں موضع جنڈیالا شیر خاں؎ ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰۰ھ میں انتقال کر گئے۔ پہلے پہل گھر پر ہی مذہبی کتابیں پڑھیں اور اس کے بعد قصور میں حافظ غلام مرتضےٰ صاحب کے پاس تحصیل علم کے لئے پہنچے۔ علم حاصل کرنے کے بعد جب وہ واپس آ رہے تھے تو جا ملکے کے ٹھٹھہ نامی ایک گاؤں میں ٹھہرے اور وہاں کی ایک عورت مسماۃ بھاگ بھری پر دل و جان سے فدا ہو گئے۔ وہیں ایک مسجد میں ڈیرے ڈال دیئے۔ لوگوں نے مولوی اور سید سمجھ کر خدمت کرنی شروع کر دی۔ یہیں انہوں نے عشق سے سرشار ہو کر ہیر رانجھا کا قصہ لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد وہ شاید اپنے وطن کو چلے گئے اور اس زندہ جاوید تصنیف کے اشعار لوگوں کو سنانے لگے۔ اس کے استاد کو جب علم ہوا کہ اس کے شاگرد نے حسن وعشق کا ایک عریاں سا طویل قصہ نظم کیا ہے تو وہ بہت خفا ہوئے اور اسے بلا بھیجا۔ وارث شاہ کے حاضر ہونے پر اسے حافظ صاحب دیر تک

؎ یہ مقام حال ہی میں فسادات کی وجہ سے اخبارات میں بہت مشہور ہو چکا ہے۔ صادق

طعن وتشنیع کرتے رہے اور پھر از رہ مذاق کہا کہ جو کچھ لکھا ہے کچھ اس سے سناؤ تو۔

وارث شاہ نے بغل سے مسودہ نکالا اور چیدہ چیدہ مقامات سے شعر سنائے۔ آخر میں اس نے یہ اشعار پڑھنے شروع کر دیئے ؎

ہیر روح تے چاک قلبوت جانو بالناتھ ایہہ پیر بنایا ئی
پنجے پیر نی پنجے حواس تیرے جنہاں تھاپنا ن مدتھوں لایائی
کیدو لنگا شیطان ملعون جانو جس نے وچہ دیوان بھڑایا ئی
کوٹھا گور تے عزرائیل کھیڑا جیہڑا الیبندا ای روح نوں دھایا ئی

. . . . وغیرہ الخ

[ہیر کو روح اور رانجھے کو جسم تصور کرو اور بالناتھ پیر طریقت بنایا گیا ہے پانچوں پیر تمہارے حواس خمسہ ہیں جن کے مجموعہ سے تمہارا جسم بنا ہے۔ کیدو لنگڑا شیطان ملعون ہے جس نے عدالت میں (ان کو) گرفتار کروایا۔ جھونپڑی قبر اور کھیڑا عزرائیل ہے جو روح کو تصرف میں لاتے ہی گریز پا ہو جاتا ہے وغیرہ . . . . الخ]

جب یہ سنا تو شاہ صاحب کی حالت بدل گئی۔ عشق الٰہی کی آگ بھڑک اٹھی اور ایک محویت کا عالم طاری ہو گیا۔ درویش سر پر پانی ڈالتے تھے جب ذرا ہوش میں آتے تو وارث سے پھر پڑھنے کو کہتے اور آپ پھر بے خودی کے عالم میں گم ہو جاتے۔

(۲)

اب میں کتاب میں سے چیدہ چیدہ مقامات سے اشعار لیتا ہوں تاکہ اس کی ادبی خوبیاں صفحۂ قرطاس پر واضح ہوں۔

جب رانجھا گھر کی تکالیف سے تنگ آ کر روانگی کا قصد کر لیتا ہے تو اس کی بھاوجیں اس کا ارادہ سفر ترک کروانے کے لئے کہتی ہیں ؎

بھرجائیاں آکھیا رانجھا وے اسیں باندیاں تیریاں ہنیاں ہاں
ناؤں لینا ایں جدوں توں جاونے دا اسیں ہنجواں رتدی رُنیاں ہاں
جان چلا انیہاں گئی ساڈی تیرے دردِ فراق نے بھنیاں ہاں
جان مال قربان ہے تدھ اتوں لتے آپ وی جیہے کھنے ہنیاں ہاں
سانوں صبر نہ آوندا اک ساعت جس ویلڑے نیتھوں وچھنیاں ہاں
وارث شاہ دا آکھیا من دیورا اسیں سب مرادتے پُنیاں ہاں

[بھاوجوں نے کہا اے رانجھا ہم تیری کنیزیں ہیں۔ ہم تیرا قبول کرتی ہیں۔ جب تو جانے کا نام لیتا ہے تو ہم خون کے آنسو روتی ہیں۔ ہماری جان محبت کی آگ کی نذر ہے اور ہم تیرے دردِ فراق میں جل رہی ہیں۔ جان و مال کے علاوہ ہم خود تجھ پر قربان ہوتی ہیں۔ جب تجھ سے جدا ہوتی ہیں تو ایک ساعت کے لئے بھی ہمیں صبر میسر نہیں آتا۔ اے دیور! اگر تو وارث شاہ کا کہا مانے تو ہماری تمام مرادیں بر آئیں]

علم النفسیات کے ماہر اس میں نسوانی فطرت کے چھپے ہوئے راز فوراً پالیں گے۔ عورت کے جذبۂ عجز و خوشامد کی مثال وارث کے ان اشعار سے بہتر نہیں دی جا سکتی۔ پنجابی زبان کے ٹھیٹھ الفاظ کا استعمال بھی قابل غور ہے۔

رانجھا اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر چلا آتا ہے۔ وہ رات اس نے ایک مسجد میں بسر کی اور صبح جھنگ سیال کی طرف روانہ ہو گیا۔ روانگی کے وقت کی تصویر ملاحظہ ہو:۔

چڑی چوہکدی نال جاں ٹرے پاہندے پیاں دُودھ دے وچہ مدھانیاں نی
صبح صادق جاں آن کے ہوئی روشن تدوں آن چڑیاں چہلانیاں نی
اکناں اُٹھ کے ریڑکا پا دتا اک دھوندیاں پھرن دوانیاں نی
اک اٹھ کے ہلیں تیار ہوئے اک ڈھونڈدے پھرن پرانیاں نی
وضو ساز کے زاہداں پھڑی تسبیح بانگاں مسجدیں کہیاں ہوانیاں نی
ہوئے قلقلے کو تج سراں اندر جیہل کھڑکے ٹل بھربات چلانیاں نی
کار وکار وچہ ہو یا جہان سارا چرخے ڈاہندیاں اُٹھ سوانیاں نی
اٹھ غسل دے واسطے جان دوڑے سیجاں جنہاں نے رات نوں مانیاں نی
رانجھے کوچ کیتا آیا ندی اُتے ساتھ لدّیا بو رہسا نیاں نی
وارث شاہ میاں لدّن بہت موٹا کپیا شہد والدیا بانیاں نی

[چڑیا بولنے کے وقت جب برہمن گھر سے نکلے تو دودھ میں مدھنیاں ڈالی گئیں۔ جب صبح صادق روشن ہوئی تو چڑیوں نے چہچہانا شروع کیا بعض عورتوں نے اٹھ کر چھاچھ بنانی شروع کی اور بعض دودھ والے برتن دھو رہی تھیں۔ کوئی اٹھ کر ہل جوتنے چلا اور کوئی چابکیں وغیرہ ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔ زاہدوں نے وضو کر کے تسبیح ہاتھ میں لی اور ملاؤں نے اذانیں کہیں۔ قلقلے سراؤں میں سے چلنے لگے اور صبح کی گھنٹیاں وغیرہ بجنے لگیں۔ تمام جہان کاروبار میں مشغول ہوا۔ عورتوں نے چرخے رکھے اور رات بھر جو بستر عیش پر دراز رہے وہ غسل کے واسطے بھاگے۔ رانجھے نے کوچ

کیا اور ندی پر آیا دریا پار کرنے والے مسافروں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا اے وارث شاہ لڈن بہت بھاری بھرکم آدمی تھا جیسے بنیوں نے شہد کا کپا لا در رکھا ہو]

ان اشعار میں منظر نگاری قابل تعریف ہے۔ مشرقی شاعری پر عام الزام ہے کہ اس میں مناظر کشی بہت کم پائی جاتی ہے۔ وارث شاہ کے یہ اشعار اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس کے یہ اشعار صبح کا ایک دلفریب منظر ہمارے سامنے کھڑا کرتے ہیں۔ اس منظر کی سادگی پر کسی قسم کی شاعرانہ رنگینی کارفرما نہیں ہے۔ چڑیوں کا چوں چوں کرنا۔ دودھ کی مدھنیاں۔ چھاچھ کا بننا۔ ہل۔ مؤذن۔ مسجد۔ قافلے۔ چرخے۔ دریا۔ کشتی۔ ملاح وغیرہ تمام مناظر ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس سے بہتر منظر کشی اور کونسی ہوسکتی ہے!

وارث کے کلام میں تشبیہیں اور استعارے بھی بہت ہیں۔ ذرا ہیر کی تعریف وارث کی زبانی سنئے۔

دند چنبے دی لڑی کہ ہنس موتی دانے نکلے حسن انار وچوں
لکھی چین تصویر کشمیر جٹی قد سرو بہشت گلزار وچوں
سرخی ہوٹھاں دی لوہڑ دنداسڑے دا خوجے کھتری قتل بازار وچوں
باہاں ویلنے ویلیاں گھت مکھن چھاتی سنگ مرمر گنگ دھار وچوں
گردن کونج دی انگلیاں رواں پھلیاں ہتھ کولڑے برگ چنار وچوں
چھاتی ٹھاٹھ دی ابھری پٹ کھینوں سیب بلخ دے چنے انبار وچوں
ایویں سرکدی آوندی لٹکدی جیوں کونج اک نکلے ڈار وچوں
جو کوئی ویکھدا اوسدے حسن تائیں کھائے زخم خنجر تلوار وچوں
قزلباش جلاد اسوار خونی نکل دوڑیا اڑد بازار وچوں
وارث شاہ جاں نیناں دا داؤ لگے بچے کوئی نہ جوئے دی ہار وچوں

[دانت چنبے کے پھولوں کی لڑی یا ہنستے ہوئے ہنس تھے۔ یہ انار حسن سے نکلے ہوئے دانے تھے۔ یہ جٹی گویا کشمیر کی ہے (کشمیر حسن نسوانیت کا مرکز سمجھا جاتا ہے) یا نقاشان چین کی کوئی تصویر۔ اس کا قد باغ بہشت کے سرو جیسا ہے۔ ہونٹوں کی سرخی اور دنداسے کی خوش نمائی سر بازار خوجے اور کھتری کو قتل کر رہی ہے۔ اس کے بازو مکھن ڈال کر بیلنے پر بنائے گئے اور چھاتی موج گنگا کے سنگ مرمر جیسی ہے۔ اس کی گردن سارس کی۔ انگلیاں لوبیا کی پھلیاں اور ہاتھ چنار کے نرم و نازک پتوں کے سے ہیں۔ اس کا سینہ اس شان سے ابھرا ہے گویا ریشم کے گیند ہیں یا انبار ہیں سے بلخ کے چنے ہوئے سیب ہوں۔ وہ "رہزن تمکین و ہوش" اس طرح چلی آتی ہے جیسے ایک سارس قطار سے باہر چل نکلے جو اس کے حسن کو دیکھتا ہے وہ خنجر اور تلوار کے زخم کھاتا ہے۔ وہ جلاد جیسنہ قزلباش اور خونی سوار ہے جو چھاؤنی سے نکل دوڑا ہو۔ اے وارث! جب آنکھوں کی بازی لگ جائے تو اس قمار بازی کی ہار سے کوئی نہیں بچ سکتا]

غور کیجئے کہ ہیر کے حسن نسوانی کو کن کن چیزوں سے تشبیہیں دی گئی ہیں اور تشبیہیں کیسی موزوں اور برمحل ہیں۔

رانجھا ہیر کے باپ کی بھینسیں چرانے کے کام پر مامور ہے۔ ہیر اسے اکثر اوقات دریا کے کنارے ملا کرتی ہے۔ ایک دن وہ اسے قوانین محبت کی پابند بنانے کی غرض سے اس کے سامنے نسوانی کمزوریوں کو واضح کرتا ہے:۔

شرع وچ منظور نہ قول رناں رانجھا ہیر نوں آکھ سناوندا اے
مکر رن دے جیڈ نہ مکر کوئی رب وچ قرآن فرماوندا اے
مرشد جن تے رن دا جھ شیطان جیہڑا افترا مکر پڑھاوندا اے
رناں سچیاں نوں کرن جا جھوٹھا مرداں وچ نہ کوڑ سماوندا اے
رناں منڈیاں پوستیاں بھنگیاں دا اعتبار زبان نہ آوندا اے
وارث شاہ جے قول تے دین پہرہ پٹ تھیر دا چاک سدوندا اے

[شریعت میں عورتوں کی بات قابل اعتبار نہیں۔ رانجھا ہیر کو اس طرح مخاطب کرتا ہے۔ عورت کی فریب کاری کی مانند اور کوئی فریب نہیں۔ خدا خود قرآن میں یہ بات فرماتا ہے۔ عورت اور جن کا مرشد شیطان سمجھو جو افترا اور کذب نہیں سکھاتا ہے۔ عورتیں تو صادق کو کاذب بنا سکتی ہیں۔ ایسا کذب مردوں میں سما نہیں سکتا۔ عورتوں، لڑکوں اور بھنگ پوست کے عادیوں کی زبان کا اعتبار نہیں (اے وارث شاہ) اگر تو اپنے قول پر قائم رہے تو بڑے بلند ارکان کا تمہارا خادم کہلاتا ہے۔]

ان اشعار میں شاعر نے نسوانی فطرت کو اچھی طرح روشن کیا ہے۔ "FRAILTY THY NAME IS WOMAN" (اے عورت تو مجسم کمزوری ہے۔ شیکسپیر) کی اس سے بہتر اور کونسی تشریح ہوسکتی ہے۔ اب ہیر جواباً لب کشائی کرتی ہے:۔

ہیر آکھدی رناں نوں نند نائیں رن جیہڑی جند گال دی اے

رن جیوڑ نہ سدھ ہے کسے کرنا رن مال تے ملک نہ بھال دی اے
مجنوں تھیچے لیلی پھرے خوار ہندی سوہنی آپنے آپ نوں گال دی اے
زلیخا چھڈ سرداریاں ہوئی عاجز جھگی پائیکے ہٹھ سمہال دی اے
پیکے ساہوریاں سبکاں دین پھاہکی کرن نہ دولتاں مال دی لے
سسی ہو شہید وچ تھلاں موئی شیریں سمجھ لے او سدے نال دی اے

[ہیر کہتی ہے اے رانجھے، عورتوں کو مت کوس۔ ضد پر آئی ہوئی عورت زندگی برباد کر سکتی ہے۔ عورت کے برابر کوئی درست نہیں کرسکتا۔ عورت کو مال و ملک کی پرواہ نہیں ہوتی۔ لیلٰے اپنے محبوب مجنوں کے پیچھے خوار ہوئی اور سوہنی نے اپنے آپ کو تباہ کیا۔ زلیخا نے سرداری چھوڑ کر عاجزی اختیار کی اور اپنی ضد پر قایم رہتے ہوئے جھونپڑی بنا کر رہنے لگی۔ عورت کا گھر سسرال اور عزیز و اقارب سب اس سے منہ موڑ لیتے ہیں مگر وہ محبت کی راہ میں مال و دولت کی چنداں پرواہ نہیں کرتی سسی شہیدوں کی طرح تھل میں مر گئی اور یہی حال شیریں کا ہوا]

ان اشعار میں مصنف نے عورت کے جذبۂ محبت کی تشریح کی ہے پہلے ایک دعوٰے پیش کیا گیا ہے کہ عورت کی محبت غیر فانی اور بے غرض ہے پھر اس کے ثبوت میں لیلٰی۔ زلیخا۔ سوہنی۔ سسی وغیرہ کی مثالیں دی گئی ہیں۔

ہیر وفاداری اور ثابت قدمی کا پیمان باندھتی ہے۔ دیکھئے میثاقِ وفا کس قدر مستحکم اور پر اخلاص ہے۔

اللہ سچ تے نبی برحق میاں منوں اپنا سچ اقرار مینوں
تیری بندی ہاں جچرہے جان میری کھڑ ویچ توں ہٹ بازار مینوں
مینوں بھلیاں نے ہو سب گلاں تیرے درس دی بس ہے کار مینوں
تیرے دامن لگڑی رہاں میاں جو بن جاناں ایں پار اتار مینوں
تیرے نال ہے قول نباہناں ایں بھاویں جت آوے بھاویں ہار مینوں
من جیوندی مکھ نہ موڑساں گی وارث شاہ دے نال اقرار مینوں

[خدا کی ذات کمل سچائی اور نبی کریم برحق ہے۔ مجھے اپنے دل سے سچا اقرار ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں تیری کنیز ہوں خواہ تو بازار میں لے جاکر فروخت کردے۔ مجھے اور سب باتیں بھول گئی ہیں اور تیرے دیدار ہی کا کام باقی رہ گیا ہے میں تیرا ہی دامن پکڑے رکھوں گی۔ خدارا مجھے پار لگا۔ میں تمہارے ساتھ اس قول کو نباہوں گی خواہ اس کا انجام شکست پر ہو یا فتح پر۔ تو مان لے کہ میں جب تک کہ دم میں دم ہے منہ نہ موڑوں گی۔ میرا وارث شاہ کے ساتھ یہ اقرار ہے]

اس وقت ہیر رانجھا کو صورت احوال سے اچھی طرح آگاہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ اسے اپنی خطرناک پوزیشن کا احساس کروانا چاہتی ہے جبکہ وہ چاروں طرف دشمنوں اور حاسدوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ان اغراض کے ماتحت۔

ہیر کرے تسلیاں رانجھنے دیاں میری گل دے وچ دھیان کرنا
دوتی دشمناں وچ ہے واس ساڈا صابر ہوئیکے دکھانوں چا جرنا
ایس عشق دے بحر دی لہر مارو اسیں لڑھ جانا اکے ڈب مرنا
دوجا کید وہے شکل شیطان دی جی چارہ ہندیاں اوس نہ فرق کرنا
صبر شکر کرنا تے چپ چاپ رہنا ہر اک زمانے دا دکھ سہنا
سر دے کے عشق دی اکھلی وچ فیر غم دھمکاں تھیں کی ڈرنا
گھمن گھیر دا نہیں ہے خوف کوئی اساں عشق دے بحر دیوچ ترنا
شاید تدھ نوں ایس دی قدر ناہیں میری زندگی عشق دے وچ مرنا
جاہل عاشقاں نوں اینویں دیہن طعنے کتے باولے لگے جیوں مگر ہرنا
وارث شاہ اک رب دی مہر باجھوں نہیں عاشقاں آسرا ہور پھڑنا

[ہیر رانجھے کی تسلیاں کرتی ہے کہ میری بات کی طرف غور کرو۔ ہمارا ٹھکانا حاسدوں دشمنوں میں ہے۔ مصائب کو صابر بن کر برداشت کرنا چاہیئے بحر عشق کی لہر قاتل ہوتی ہے یا تو یہ بہالے گئی یا ڈبو گئی۔ دوسرے کیدو مجسم شیطان ہے موقع پانے پر وہ کیا کچھ نہ کرے گا۔ ہمیں صبر و شکر سے کام لینا چاہیئے اور خاموشی سے رنج والم سہنا ہوگا۔ کیونکہ عشق کی اوکھلی میں سر دے کر غم والم کی دھمکیوں سے ڈرنا مناسب نہیں۔ ہمیں بھنور کا خوف مطلق نہیں اس بحر میں سے ہم تیر نکلیں گے۔ شاید تمہیں اس کی قدر نہ ہو میری تو زندگی ہی عشق میں مر جانا ہے۔ جاہل لوگ عشاق کو اسی طرح لعن و طعن کا نشانہ بناتے ہیں۔ جیسے دیوانے کتے ہرنوں کے تعاقب میں ہوں۔ اے وارث شاہ) ایک خدا کی مہر کے سوا عشاق اور آسرا نہیں ڈھونڈیں گے]

ان اشعار میں ایک عاشق صادق کے دلی جذبات کا اظہار ہے۔ ہیر کو اپنے جذبۂ عشق و وفا پر کامل اعتماد ہے۔ اسے لوگوں کے مضحکہ اور تمسخر بازی کی کچھ پرواہ نہیں۔ آخرکار، ہیر کے اٹل عقیدے کے مطابق، عاشق اس بحر عشق سے تیر نکلے گا۔ آہ اے محبوب! شاید تو اس گنجینۂ بے بہا اس گوہر آبدار، عشق کی قدر و قیمت سے ناواقف ہے۔ ارے میں تو اس راہ میں مر جانے کو ہی حقیقی زندگی تصور کرتی ہوں" ہیر کے یہ الفاظ اس کے جذبۂ عشق کے دوام کی تصدیق کرتے ہیں۔

جب ہیر کے والدین اس کی نسبت سیدے کھیڑے سے کر دیتے ہیں تو ملاقات ہونے پر ہیر رانجھے کو اس طرح مخاطب کرتی ہے :۔

تیر یاں دو نتاں رانجھیا لٹ لیاں ایہناں ظالماں کھیڑیاں گھت گھیرا
روز ازل دا ندھنال ہنوں لگا ضامن رب رسول گواہ میرا
تیری واٹ اتوں صدقے کراں کھیڑا بجھ گیا کیوں سجناں جی تیرا
سیدے کھیڑے دے سر سواہ پاکے تیرے سر بنھ ولاں وساں انہیرا
کراں میں کی چلے نہ وس میرا نہیں تاں ونڈ لیندی ادھا دکھ تیرا
مرجاؤ تا آؤناں نہیں مڑکے وارث جگ اُتے اکو ہے پھیرا

[آہ اے رانجھا! ان ظالموں نے مل کر تیری دولت لوٹ لی۔ میری محبت تجھ سے روز ازل کی ہے خدا اس کا ضامن اور رسول شاہد ہے۔ تیری راہ سے کھیڑے قربان کروں۔ اے محبوب! تیرا دل کیوں بجھ گیا میں تو سیدے کے سر خاک جھونک کر آخر تیرے ہی سر سہرا باندھوں گی۔ میں کیا کروں میرا اختیار نہیں چلتا ورنہ تیرا آدھا دکھ بٹا لیتی۔ ایک دفعہ مر کر پھر واپس نہیں آتا۔ دنیا پر بقول وارث ایک ہی بار آنا ہے]

واقعی بیچارے رانجھے کی متاع گرانبہا۔ اس کی حاصل زندگی۔ اس کی نشاط روح لٹ چکی تھی۔ اس کی تمام امیدوں اور خواہشوں کا جنازہ نکل رہا تھا ؎

کیوں نہ ہو عرش تک بلند فغاں چشم تر سے ہوں کیوں نہ اشک رواں
خرمن سوختنہ ہے پیش نظر مثل سیماب کیوں نہ دل ہو تپاں

(صادق)

اندریں حالات اگر رانجھے کا دل بیٹھا جا رہا تھا تو یہ عین فطری امر تھا۔

اب ذرا ہیر کی زبانی عشق کی مزید وضاحت سن لیجئے۔ ہیر کی برات آجاتی ہے۔ قاضی نکاح پڑھنے کے وقت اسے سیدے کے ساتھ نکاح قبول کر لینے کو کہتا ہے۔ وہ انکار کرتی ہے اور ببانگ دہل اعلان کرتی ہے کہ میں اپنے دل کی متاع رانجھے کے سپرد کر چکی ہوں۔ سیدو کے ساتھ میرا نکاح نہیں ہو سکتا۔ قاضی اس کے عشق کو فرضی اور ناجائز اور دعوئے محبت کو باطل قرار دیتا ہے۔ ہیر قاضی کو عشق کی حقیقت سے یوں آگاہ کرتی ہے۔ قاضی صاحب ذرا کان کھول کر سنئے :۔

ہیر آکھیا عشق دے راہ پونا کم نہیں ملوانیاں قاضیاں دا
ایس عشق میدان دیاں کٹھیاں نوں رتبہ کربلا دے ہے غازیاں دا
نرت وچہ درگاہ قبول ہووے سجدہ عاشقاں پاک نمازیاں دا
راہ حق دے جان قربان کرنی ایہہ کم نہیں جھوٹھیاں پاجیاں دا
کر کے قول زبان تھیں ہار جانا فعل بے ایماناں دھوکے بازیاں دا
عشق سر ہے ذات خدائے دا دے عاشق شان ویکھن کارسازیاں دا
جدوں کدوں کردا ترس عاشقاں نے مالک رب غریب نوازیاں دا
وارث شاہ حقیقی دی لین لذت پہلوں چکھ کے لون مجازیاں دا

[ہیر نے کہا کہ عشق کی راہ پر چلنا ملاؤں اور قاضیوں کا کام نہیں۔ میدان عشق میں مرنے والوں کا مرتبہ کربلا کے غازیوں کے برابر ہے۔ پاک باز صلوٰۃ عشاق کا سجدہ درگاہ خداوندی میں جلد قبول ہو جاتا ہے۔ سچائی کے راستے پر جان دے دینا جھوٹے اور ریاکار لوگوں کا کام نہیں۔ زبان سے لفظ نکال کر اس پر قائم نہ رہنا مکار اور دغا بازوں کا فعل ہے۔ عشق تو ذات الٰہی کا ایک بھید ہے۔ عاشق قادر مطلق کی کارسازیوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ غریب نواز پروردگار جب کبھی عشاق پر نظر کرم کرتا ہے تو اے وارث! وہ مجازیات کا ذائقہ چکھ کر حقیقت کی لذت حاصل کرتے ہیں]

یہاں عشق کی حقیقت نہایت موثر الفاظ میں بیان کی گئی ہے اور وعدہ خلاف کے متعلق بہت جوش کے ساتھ اظہار نفرت کیا گیا ہے۔ ع

کر کے قول زبان تھیں ہار جانا فعل بے ایماناں دھوکے بازیاں دا

اور پھر مجاز اور حقیقت کے معمے کا حل چند الفاظ میں کر کے رکھ دیا ہے۔

عشق کے متعلق کتاب میں جگہ جگہ شاعر نے حکیمانہ افکار کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کا آغاز ہی اس شعر سے ہوتا ہے ؎

اول حمد خدا دا ورد کیجے عشق کیتا سو جگ دا مول میاں
پہلوں آپ ہی رب نے عشق کیتا تے معشوق ہے نبی رسول میاں
بناں عشق درگاہ تھیں پلن دھکے بناں عشق نہ کجھ مقبول میاں
عشق باجھ بے سود نے کم سارے عشق وچ دا اصل تے سول میاں

[پہلے حمد الٰہی کہیں جس نے عشق کو حاصل دنیا بنایا۔ پہلے خدا نے خود ہی راہ عشق میں قدم رکھا۔ معشوق نبی کریم ہے عشق کے بغیر درگاہ سے نکال دیا جاتا ہے اس کے بغیر کچھ بھی مقبول نہیں۔ تمام کام اس کے بغیر بے سود ہیں۔ عشق ہی زندگی کے بیوپار کا اصل زر اور سود ہے]

قاضی کے زبردستی نکاح پڑھ دینے پر ہیر خشمناک ہو کر اسے مخاطب کرتی ہے۔

ہیر آکھیا قاضیا دغا کیتو کی وٹنا ایں ایس جہان توں جی
بنا پچھیاں پڑھیں نکاح میرا ایہہ فتوے نہیں قران توں جی
لے کے رشوتاں کریں خوشامداں توں نہیں سنگدا رب برہان توں جی
جھوٹھی دنیا نے نشان گمان جھوٹھا کیوں بھرنا ایں آپ ایمان توں جی
جیہا کیتو ئی ملگ سزا تینوں پاویں بدلہ رب رحمان توں جی
وارث شاہ کجھ عمل کما چنگے اد تر جائیں گا ایس جہان تیں جی

[ہیر نے کہا اے قاضی! تو نے دغا دیا اس جہان سے کیا حاصل کرنا ہے تو بغیر میری رضامندی کے نکاح پڑھتا ہے یہ مسئلہ قرآن سے نہیں ہے۔ رشوت وغیرہ قبول کر کے تو خوشامد کے طور پر ایسا کرتا ہے اور خدائے تعالیٰ سے نہیں ڈرتا ارے نادان! یہ دنیا اور یہ نشان وگمان تو باطل ہے تو کیوں ایمان کھو بیٹھا جیسا کیا ہے تمہیں ویسی ہی خدائے رحیم سے سزا ملے گی (اے وارث) بھائی کچھ نیک عمل پیدا کرلے ورنہ اس جہاں سے ناکام ونامراد جائے گا۔]

"ارے تجھے کیا خبر کہ قرآن کا فتوے کیا ہے تو تو ایمان فروش ہے۔ آہ اے بندۂ حرص وہوا! اس دار فانی سے اگر کچھ ساتھ جائیں گے تو نیک اعمال ہیں تیرے۔ خیر جیسا کرو گے وہ قادر عدل پرور ویسی ہی سزا تمہارے لئے تجویز کرے گا۔" ہیر کی یہ تقریر قاضی کے لئے تازیانۂ عبرت ثابت ہونی چاہیئے تھی۔

جب ہیر کو زبردستی کھیڑوں کے ساتھ بیاہ کر روانہ کر دیا جاتا ہے تو وہ روانگی کے وقت ایک دردناک پیغام چھوڑتی ہے۔ اپنی بے بسی کا خاکہ چند الفاظ میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

ڈولی چڑھ دیاں ہیر فریاد کیتی ایہہ رانجھیا ہویاں جدائیاں وے
اپنے دلوں تہیر تے زور لائے ایہہ رب تقدیر کرائیاں وے
نزع وقت نہ مشکلاں حل ہوون اکھیں دید دے باجھ پتھرائیاں وے
ہوئی ہیر پردیسن آج تیری پیاں دوستا کٹھن جدائیاں وے
وفاداریاں کیتیاں مدھ نے سن ڈاہڈی نیں ولوں شرمائیاں وے
تیرا باغ امید دا اجڑ گیا کیہاں چلیاں خزاں دیاں وائیاں وے
توں بھی صبر کر اپنے نصیب اتے منیاں رب دیاں ہیں رضائیاں وے
سنجے محل تے ماڑیاں ویکھ کے تے چیکاں ماریں نہ وانگ سودائیاں نوں
اوکھے ویلے نہ کوئی دی کم آوے سب سہیلیاں ہیں آزمائیاں وے
ٹر جا تخت ہزارے نوں سجناں وے کریں بھائیاں نال جنائیاں وے
ایس خیال تھیں سینے وچ چبک پوے طعنے دین گیاں تینوں بھرجائیاں نوں
ایہہ پیچھے وی تیرا نہیں کوئی سجن وارث کرن گے سخت برائیاں نوں

[تخاطبہ میں بیٹھتے وقت ہیر نے فریاد کی کہ اے رانجھے اب وقت قریب آپہنچا۔ اپنی طرف سے تو کافی جدوجہد کی مگر یہ سب کام تقدیر الٰہی کے ہیں۔ آخری وقت مشکلات حل نہیں ہوسکتیں۔ میری آنکھیں تمہیں نہ دیکھنے سے پتھرا گئی ہیں۔ آہ اے محبوب! تمہاری ہیر آج پردیسن ہوگئی ہے اور سخت فراق نے گھیر لیا ہے۔ تم میرے ساتھ وفاداری کرتے رہے۔ تمہاری طرف سے میں بہت شرمسار ہوں۔ آہ یہ کیسی باد خزاں چلی کہ تیرا گلشن امید اجڑ گیا۔ میں نے تو رضائے الٰہی قبول کرلی تو بھی اپنی قسمت پر صبر وشکر کر کہیں خالی محلات دیکھ کر دیوانوں کی طرح چیخ وپکار برپا نہ کر دینا۔ میں تمام سکھیوں کو آزما چکی مشکل پڑنے پر کوئی بھی کام نہیں آتا۔ میرے حبیب! اب تو تخت ہزارے کی طرف چلا جا اور اپنے بھائیوں کے ساتھ محنت ومشقت کر۔ اس خیال سے میرے سینے میں ٹیس اٹھتی ہے کہ تیری بھاوجیں تجھے طعنے دیں گی۔ مگر یہاں بھی تو تیرا کوئی غمخوار نہیں یہ لوگ (اے وارث) تیرے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے]

نہایت دردناک اور موثر الفاظ میں رانجھے کو اپنی تقدیر پر شاکر اور راضی برضائے الٰہی رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے اور اس تلخ حقیقت کو بے نقاب کر دیا گیا ہے کہ مصیبت کے وقت اچھے سے اچھا ساتھی بھی کام نہیں آتا ع

اوکھے ویلے نہ کوئی وی کم آوے سب سہیلیاں ہیں آزمائیاں نوں

رانجھا فرط غم سے مجبور ہو جاتا ہے اور ایک الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ شادی کا ہنگامہ باجوں کی جھنکار اور شور وغل اس کے دل میں ناسور پیدا کرنے کے لئے کیا کم تھے کہ ہیر بھی اب اسے چھوڑ کر جا رہی ہے اور اس کی تسلی اور تشفی کے لئے اسے اپنی تقدیر پر شاکر رہنے کا مشورہ دے رہی ہے۔ ہیر اس کے غم واندوہ کا صحیح انداز لگانے سے قاصر تھی۔ اس کی یہ طفل تسلیاں ایک ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کی بجائے اور بھی ریزہ ریزہ کرنے والی تھیں۔ شدت غم کی وجہ سے اب اسے ہیر پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ ہیر کے مندرجہ بالا پیغام کا جواب وہ یوں دیتا ہے:۔

موہوں مٹھیے تے دلوں کھوٹیے نی اینویں جھوٹ دے قصے نہ جوڑ ہیرے
بڑے چانال بیٹھی ایں وچہ ڈولی رانجھے نال محبتاں توڑ ہیرے
نال کھیڑیاں دے رشتہ گنڈیوئی کرکے رانجھے نال انجوڑ ہیرے
خوشی نال سویں نویں سیج اتے رڑکن اکھیاں بیریاں روڑ ہیرے

تیرے عشق نے ویلنے وانگ بیری ساری لئی لے رسا نچوڑ ہیرے
مینوں وچ اوھواڑٹے سٹیو ئی چاہئے عشق نبھاوناں توڑ ہیرے
تیرے جیو پر چان نے لکھ حیلے مینوں ہے گی تدھ دی لوڑ ہیرے
تیرے ہجر والا خار دار وار یا میرے کالجے نوں پا سی کھوڑ ہیرے
تیرے کول وفا دی بو ناہیں بے وفا ہیں سخت انوڑ ہیرے
وارث عشق دے وید حکیم بھالے دل بیمار نوں ہئی نہ موڑ ہیرے

[آہ اے ہیر! اے میٹھی زبان اور کھوٹا دل رکھنے والی ہیر! اس طرح افسانہ طرازی سے باز رہ۔ تم تو بڑے چاؤ سے ڈولی میں بیٹھی ہو۔ رانجھے غریب سے پیمان الفت توڑ دو تم نے کھیڑوں کے ساتھ رشتہ جوڑا ہے اور رانجھے سے قطع تعلق کیا ہے اب مخمور ہو کر بساط پر سوئے گی اور میری آنکھوں میں کنکر محسوس ہوں گے۔ تمہارے عشق نے بیلنے کی طرح میرے جسم سے رس نچوڑ لیا ہے۔ مجھے راہ کے درمیان میں ہی چھوڑ گئی ہو۔ عشق کو تو اس سرے تک قایم رکھنا چاہئے۔ تمہارے دل بہلانے کے لاکھوں بہانے ہیں۔ مگر مجھے تو تمہاری ضرورت ہی رہے گی۔ تمہارے ہجر کا خار دار برابر میرے کلیجے میں سوراخ کر دے گا۔ آہ اے ہیر! تو سخت بے وفا اور خود رائے ہے تیرے پاس تو وفا کی بو بھی نہیں (اے وارث) میں نے مرض عشق کے کئی اطباء دیکھے مگر دل بیمار کا حال بہتر نہ ہوا]

یہ عاشقانہ غلط فہمی ہے جو شدتِ غم سے اکثر ایسے لوگوں کو ہو جایا کرتی ہے۔ رانجھا خیال کرتا ہے کہ ہیر اسے عمداً چھوڑ کر کھیڑوں کے ساتھ جا رہی ہے۔ وہ عشق و محبت سب کچھ بھول چکی ہے اور ہنسی خوشی اب سسرال جا رہی ہے۔

پڑے چاناں بیٹھی ایں وچ ڈولی رانجھے نال محبتاں توڑ ہیرے

اور پھر اپنے مرض عشق کا حال ہے کہ تمام اطباء و بید صفا جان عاجز آ گئے ہیں ۔ ؎

مریض عشق پر رحمت خدا کی   مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ہیر یہ سن کر بولی

میرے رانجھنا کہے خیال ہیوں سیدے نال میں رشتہ گنڈھنا ئیں
آپے من لیں سارے کھیڑیاں نوں ہن نال وچ برادری بھنڈنا ئیں
جیکر ہتھ لائے میرے جسم تائیں منہ سیدے دا مار میں چنڈنا ئیں
وارث شاہ دہتھڑاں مار کے تے رُٹی وانگ منہ اوس دا چھنڈنا ئیں

[میرے پیارے رانجھا! تو کس خیال میں ہے۔ میں اور سیدے سے تعلق پیدا کروں! تو خود ہی سن لے گا کہ میں تمام کھیڑیوں کو برادری میں ذلیل کرتی ہوں۔ اگر سیدا مجھے ہاتھ لگائے تو خنجر مار کر اس کا منہ زخمی کر دوں اور دونوں ہاتھوں سے روئی کی طرح اس کا منہ پینک دوں گی]

ہیر نے میرے رانجھنا کہہ کر تمام شبہات کو دور کر دیا ہے جو ایک ناکام و نامراد دل میں پیدا ہو چکے تھے۔

رانجھا جوگی بن کر ہیر کے دروازے پر آتا ہے اور سہتی سے اس کی تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ اسی اثنا میں ہیر گھونگٹ نکالے وہاں آ پہنچتی ہے گھونگٹ کی وجہ سے اس نے رانجھے کی طرف نہ دیکھا اور نہ ہی اسے پہچانا۔ جوگی کا دعوے تھا کہ

اسیں فقر اللہ دے ہاں پورے کجھ منگ اساں یقین گو رئیے نی
کرئیے مطلب سب جہان پورے تقدیر خدا نہ موڑئیے نی
سوال کسے دا موڑ نہ رد کرئیے دن رات ہی رب نوں سوریئے نی
یار چھڈ کے یار نوں نس جائے نقش لکھ کے جوڑنا جوڑیئے نی
اساں رٹھڑے یار ملا دتے دکھ درد دلدراں تو ڑیئے نی
سر نے آئی بلا نوں ٹال دئیے حکم رب دے نال جا موڑیئے نی

[ہم خدا کے کامل فقیر ہیں۔ اے حسینہ ہم سے کچھ مانگ لے۔ ماسوائے تقدیر الہٰی سب دنیا کے کام پورے کر دیتے ہیں۔ ہم دن رات خدا کی یاد میں رہتے ہیں اور کسی کا سوال رد نہیں کرتے۔ اگر کوئی حبیب اپنے محبوب کو چھوڑ کر چلا گیا ہو تو ہم نقش لکھ کر ان کو ملا دیتے ہیں۔ ہم نے روٹھے ہوئے دوست ملا دیئے اور درد دکھ بھل انکار ہی دور کر دیتے ہیں اور سر آئی بلا کو حکم ربانی سے ٹال دیتے ہیں]

یہ سن کر ہیر کا جذبۂ عشق ہیجان میں آ جاتا ہے۔ آتش فراق کے شعلے اس کی رگ رگ میں دوڑ جاتے ہیں اور اس کی تپش اسے بے چین کر دیتی ہے۔ مگر وہ شرمیلی دلھن کی طرح ان جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی بلکہ کہتی ہے:۔

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں کون رٹھڑے یار ملا وندا ای
ایسا کوئی نہ ملیا میں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑ لیا وندا ای
میرا جیو جامہ جیہڑا آن میلے سر صدقے اوسدے ناوندا ای
بھلا موئے تے وچھڑے کون میلے اینویں جیوڑا لوک ولاوندا ای

[ہیر نے کہا اے جوگی تو جھوٹ بولتا ہے۔ بھلا روٹھے احباب کو کون ملا سکتا ہے۔ میں تو ڈھونڈتی ڈھونڈتی تھک چکی ہوں مجھے ایسا کوئی نہیں ملا جو رفتگاں کو واپس لے آئے۔ وہ جان جاں جو مجھے ملا دے اس کے نام پر اپنا سر قربان کر دوں۔ اے نادان

ہلا مرجانے والے اور بچھڑ جانے والے کون ملا سکتا ہے۔ لوگ یوں ہی جھوٹی
سے دلوں کو دیتے ہیں]

افسانے کا یہ پارٹ بہت ڈرامیٹک ہے۔ ہیر کو معلوم نہیں تھا کہ
کی آرزووں کا مرکز اس کے خوابوں کا سرتاج اس کی توجہات کا نشانہ اور
کے جذبات کا مقصود اس کے سامنے ہی کھڑا ہے جسے مخاطب کرکے
رہی ہے کہ

ایسا کوئی نہ ملیا ہیں ڈھونڈ تھکی جیہڑا گیاں نوں موڑلیاوندا ئی

کتاب میں ایسے مقام بہت ہیں جہاں قابل مصنف نے عام اخلاقی
اشرتی باتیں اچھے خاصے فصیح اشعار میں بھر دی ہیں۔ مثال کے طور پر دو
مقامات سے اشعار دئے جاتے ہیں:۔

(کلام جوگی باہتی)

رانجھے جیڈ نہ ہے بدبخت کوئی عشق ہیر ہے سپ سنگچور جیہا
کھیڑیاں جیڈ نہ نیک نصیب کوئی کوئی تھاں نہ بہشت معمور جیہا
احمد جیڈ نہ کوئی سوہنا حسن اندر یوسف حسن ہے رنگ کافور جیہا
قاروں جیڈ نہ ہتھ بخیل کوئی تے غریب ہے سخت مجبور جیہا
زمیں جیا نہیں صابری کسے دی تے بے شرم نہیں کوئی مغرور جیہا
ناقے کٹنے تے سولی چڑھ جانا رتبہ عشق سخاوت منصور جیہا

• (رانجھے جتنا بدبخت کوئی نہیں اور ہیر کا عشق ایک سانپ زہریلے کی مانند ہے
یوں جتنا نیک نصیب کوئی نہیں اور بہشت معمور جیسی اور کوئی جگہ نہیں، احمد مرسل جتنا
اور کوئی نہیں حسن یوسف کا نور جیسا ہے۔ قارون جیسا بخیل کوئی نہیں اور بندہ مجبور
کسی کوئی نہیں۔ زمین جتنا کوئی صابر نہیں اور مغرور جتنا بے شرم کوئی نہیں۔ کھانے
بغیر رہنا اور دار پہ لٹک پڑنا یہ رتبہ عشق منصور جیسوں کو نصیب ہوا]

(کلام جوگی باہتی)

عدل بنا سردار ہے رکھ ابجھل رن گدھی جو وفادار ناہیں
نازنیاں سب کنجنی بان جیہی مرد گدھا جو عقل دا یار ناہیں
عمل باجھ عالم کوئی نہیں ہوندا کتب لدیا خر کسے کار ناہیں
پانی باجھ دریا بھی نہیں ہوندے استغفار باجھوں جھٹکار ناہیں
فقر ہوئے جے صبر نہ کرے جیہڑا جیہڑا فقر دا او ہ سزاوار ناہیں
شرم باجھ مچھاں بناعمل داہڑی طلب باجھ فوجاں بیشرم بھارناہیں
ہمت باجھ جوان بن حسن دلبر بن باجھ طعام سوار ناہیں

عقل باجھ وزیر صلوٰۃ مومن تے دیوان حساب شمار ناہیں
بے پرواہیاں بناں معشوق ناہیں سراں دتیاں باجھ دیدار ناہیں
وارث رن فقیر تلوار گھوڑا چارے تھوک ایہ کسے دے یار ناہیں

[بغیر انصاف کے سردار بے پھل درخت کی مانند ہے بے وفا عورت گویا گدھی
ہے، ناز وادا سے عاری کنچنی بان جیسی ہے اور بے عقل مرد گدھا ہے بغیر عمل کے کوئی
عالم نہیں ہو سکتا بار کتب بر خرے کسی کام نہیں، پانی کے بغیر دریا کیسے ہیں اور توبہ کے
بغیر جھٹکارا کیسے حاصل ہو! جو فقیر صابر نہ ہو وہ جیسے فقر کا سزاوار نہیں، مونچھوں کی موجودگی
بغیر شرم کے اور داڑھی بغیر عمل کے اور فوجیں بغیر کسی طلب کے فضول ہیں۔ ہمت
کے بغیر جوان دحسن کے بغیر دلبر اور نمک کے بغیر طعام درست نہیں۔ عقل سے خالی
وزیر۔ نماز سے خالی مومن اور حساب دانی سے خالی دیوان نہیں ہو سکتا۔ معشوق کے
سوا بے پروا اور کون ہو گا جس کا دیدار سر کٹوائے بغیر نہیں میسر آسکتا۔ اے وارث
عورت، فقیر، تلوار، گھوڑا یہ چاروں چیزیں کسی کی دوست نہیں۔

(کلام ایضاً)

جیٹھ مینہہ تے سیال وچ واءمندی کتک ماہ وچ منع اندھیریاں نی
رن ناد یاہ وچ گاونا وچ سیاپے ستر مجلساں کرن مندیریاں نی
چغلی خاوندادی بدی نال ملاں کھان لون حرام بدخبریاں نی
حاکم ہتھ کمذات دے سونپ دینا نال دوستاں کرنیاں ویریاں نی
مڑن قول زبان تھیں بھڑن پیراں بریاں دناں دیاں ایہہ بھی پھیریاں نی
خصماں نال برابری کرن رناں نہیں چنگیاں ایڈ دلیریاں نی
بھلی نال بھلیاں بدی نال بریاں یاد رکھ نصیحتاں میریاں نی
بناں حکم دے مرن نہ اوہ بندے ثابت جنہاں دیاں رزق دیاں ڈھیریاں نی

ماہ جیٹھ میں بارش اور سردیوں میں ہوا بری ہے اسی طرح ماہ کاتک میں آندھیاں
غیر ضروری ہیں۔ شادی کی محفل میں گریہ اور مجلس عزا میں نغمہ سرائی۔ پردہ دار گھروں میں مجلسیں نہایت
معیوب ہوتی ہیں، شوہر کی غیبت اور ملا کے ساتھ بدی اور نمک حرام کرنا برا کام ہے۔ کمینے کو
حاکم مقرر کرنا اہل وفا سے دشمنی کرنا ہے جو زبان سے پھر جائے اور مرشد ڈھونڈتی پھرے
اس عورت کے گویا برے دن پھر آئے ہیں۔ اسی طرح خاوندوں سے برابری کرنا عورتوں
کو زیبا نہیں نیکوں سے نیکی اور بدوں سے بدی کر اور میری یہ نصیحت یاد رکھ۔ حکم الٰہی کے
بغیر وہ مرد نہیں مر سکتے جن کا رزق سالم ہے۔

(کلام سہتی با جوگی)

دوست سوئی جو بپت وچ بھیڑ کٹے یار سوئی جو جان قربان ہووے

شاہ سوئی جو کال دِچ دُکھ کٹے گل بات دا جو نگہبان ہووے
کواری سو جو کرے حیا بہتا نیویں نظر تے باہجھ زبان ہووے
بناں جنگ تے چور تے ملک وسے پٹ سوئی بن آنڈیوں بان ہووے
علم ہے اوہو جس تے عمل ہووے یاد معنیاں نال قرآن ہووے
نہیں رب نوں اوہ پچھان سکدا جہنوں نفس دی ناں پچھان ہووے
سید سوئی جو شوم نہ ہووے کاذب زانی سیاہ نے نہ قہروان ہووے
چاکر عورتاں سدا بے عذر ہوون اتے آدمی بے نقصان ہووے

دوست وہی ہے جو مصیبت میں کام آئے اور عاشق وہی ہے جو جان قربان کرے۔ بادشاہ وہی ہے جو قحط میں مصائب کا خاتمہ کرے۔ اور ہر بات کی نگہبانی کرے۔ دوشیزہ وہی ہے جو بہت باحیا ہو اور آنکھیں نیچے رکھے اور بے زبانوں کی طرح ہو۔ خوشحال ملک وہی ہے جو جنگ و جدل اور چوری چکاری سے محفوظ ہو۔ اسی طرح ریشم وہی ہے جس میں انڈے کی بان نہ دی گئی ہو علم وہی جس پر عمل ہوا قرآن تب ہی یاد ہو اجب معانی حفظ ہوں۔ وہ شخص خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا جس کو اپنے نفس کی پہچان نہ ہو۔ سید وہی ہے جو بخیل۔ کاذب۔ سیاہ و زانی یا غصیل نہ ہو۔ غلام عورتیں ہمیشہ بے عذر ہوتی ہیں اور ایسے مرد بے چارے بے خطر ہوتے ہیں۔

ان کے علاوہ کتاب میں ہزارہا اخلاقی پند و نصائح بیان کئے گئے ہیں جو اپنی حقیقت کی وجہ سے بطور ضرب الامثال زبان زد عوام ہو چکی ہیں۔ مشتے از خروارے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ع۔ وارث سپ دا ڈنگیا ہوئے اچھا اچھا ہووے نہ جیبھ دا ڈنگیا ووے
اے وارث سانپ کا کاٹا اچھا ہو جائے مگر زبان کا کاٹا درست نہ ہو۔

۲۔ع۔ اک باہجھ عقل بازی جت لیندا اک عقل والا بازی ہار دا نی
ایک عقل کے بغیر بازی جیت لیتا ہے اور ایک عقل کے باوجود شکست کھاتا ہے۔

[کیمیا گر بغصہ مردہ و رنج — ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج]

۳۔ع۔ جیہڑا رب دے نام تے بھلا کردا اگے ملن گیاں اوس بھلیائیاں نی
جو خدا کے نام پر نیکی کرتا ہے قیامت کے دن اسے نیکیاں نصیب ہوں گی

۴۔ع وارث شاہ وساہ کی زندگی دا بندہ بکرا ہتھ قصائیاں دے
وارث شاہ زندگی کا بھروسہ نہیں آدمی مثل اس بکرے کے ہے جو قصاب کے ہاتھ میں ہو۔

۵۔ع وارث شاہ نہ عشق دی نبض وسے جدوں آپنے آپ نوں تجے نی
وارث نبض عشق تب محسوس ہوسکتی ہے جب اپنے آپ کو بھلا دیا جائے۔

انسان کی ہستی کی بے ثباتی کے متعلق ہمارے شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

۶۔ چھاں بدلاں دی عمر بندیاں دی عزرائیل نے یار نا سیونائیں
بھانویں تخت بہے بھانویں زمیں سووے آخر خاک دے وچ رلیونائیں
اج کل جہان دا سہج میلا کسے نت نہ حکم نے تھیونائیں
وارث شاہ میاں انت خاک ہونا لکھ آب حیات جے پیونائیں

[انسانی عمر بادلوں کے سائے کے مطابق ہے۔ آخر کار عزرائیل جامہ ہستی پھاڑ گا۔ خواہ کوئی تخت پر بیٹھے خواہ زمین پر سوئے۔ انجام کار خاک میں مل جائے گا۔ یہ دنیا چند روز کا تماشہ ہے کسی کو ہمیشہ احکام برداری نہیں کرنا۔ بقول وارث آخر کو خاک ہونا ہے خواہ لاکھ دفعہ بھی آب حیات کیوں نہ پیا گیا ہو]

جی تو چاہتا ہے کہ ایسے اشعار سناتا ہی جاؤں مگر مجھے خوف ہے کہ یہ مضمون ضرورت سے زیادہ طویل نہ ہو جائے۔ اس جگہ اس بات کا اظہار نہایت ضروری ہے کہ وارث شاہ نے بعض جگہ نہایت عریاں اور اخلاق کے درجے سے گرے ہوئے اشعار کو قلمبند کیا ہے۔ چنانچہ ہیر جب جوگی سے باغ میں ملاقات کرکے واپس آتی ہے تو رانیاں اور صبر قاں نامی دو سہیلیاں ہیر کو نہایت اخلاق سوز طعنے دیتی ہیں اگر کتاب ان فحش اشعار اور دیگر تمام عریاں خیالات سے پاک ہوتی تو بہتر ہوتا۔ بعض اشعار تو اس قدر عریاں ہیں کہ مجلس میں ان کا پڑھنا اپنی بے حیائی کی دلیل پیش کرنے کے مرادف ہے۔

وارث کا دماغ پنجابی الفاظ کی ایک زبردست انسائیکلوپیڈیا ہے "ہیر" کے بعض الفاظ زبان کی تدریجی ترقی کی وجہ سے آج کل کچھ غیر مانوس سے ہو گئے ہیں مگر پھر بھی ہمیں وارث شاہ کی بے پناہ شاعرانہ الفاظ جوئی اور الفاظ آفرینی کی داد دینی پڑتی ہے:

کتاب ڈرامائی طریق پر لکھی گئی ہے اور افسانہ کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے جگہ جگہ "مقولہ شاعر" کے عنوان سے اشعار لکھے گئے ہیں جو افسانہ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے علاوہ حالات مندرجہ پر شاعر کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔

ہیر کی زبان خالص پنجابی ہے مگر اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے

کہ وارث نے ٹھیٹھ پنجابی کے علاوہ کسی دیگر زبان کا کوئی لفظ استعمال کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ کتاب میں عربی فارسی کے بے شمار الفاظ پائے جاتے ہیں مثلاً قبول۔ قلوب۔ نزول۔ صدق۔ برص۔ جذام منفعج۔ علی الحساب۔ غلطان۔ سرعت۔ تجویز۔ ساعت وغیرہ مگر یہ درست ہے کہ پنجابی الفاظ اپنے اصل رنگ میں جلوہ گر ہیں اور زبان عام فہم اور سلیس ہے۔ وارث نے فطرت انسانی کے تمام ظاہری اور پوشیدہ پہلوؤں کی تصویریں مصرعہ مصرعہ پر کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ ہیر پنجابی ادبیات کا ایک غیر فانی شاہکار اور عدیم المثال معجزہ ہے۔ عشق و محبت۔ حسرت و ارمان۔ سوز و گداز۔ عیش و مسرت۔ فقر و امارت۔ علم و عقل۔ مذہب و اخلاق۔ صبر و سکون۔ ہجر و اضطراب۔ بے وفائی و عہد شکنی۔ وصل اور شوق اور اس قسم کے تمام دیگر جذبات اور حقایق کے بہترین نقشے اور بہترین توضیحات ہیر میں مل سکتی ہیں۔ انسانوں کی عادات۔ عورتوں کی مکاری، غرور، حسن، شہرت، عزت کی حمایت۔ بے ثباتی عالم۔ ہیجان جذبات وغیرہ پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادبی حیثیت سے ہمیں اشعار میں بعض مقامات پر اسقام دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ہیر کا گر پڑھنے کے لئے لکھی گئی تھی اور گانے میں وہ تمام ادبی اغلاط جو لفظی اور عروض کے دیگر شعبے پیش کرتے ہیں غائب ہو جاتی ہیں۔ مقصد تو ایک وجد انگیز اثر ہے جو سامعین میں فوراً پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک خاص لے اور ترنم سے ہیر کو پڑھنے والے پنجاب کے گاؤں گاؤں میں پائے جاتے ہیں اور ان کا مسحور کن طرز بیان اور ترنم ریزی سننے والوں کے دلوں میں اترتی جاتی ہے۔ پنجاب کی عظیم الشان دیہاتی آبادی ہیر کو متعدد مقامات سے ازبر کئے ہوئے ہے اور ہر مرد اپنی موجودہ حالت کے مطابق ہیر میں سے مقام ڈھونڈھ لیتا ہے تاکہ کنج تنہائی میں دل بہلانے کا سامان بہم پہنچے۔ ایک عام دیہاتی کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آسکتا جس کے متعلق ہیر میں اشعار موجود نہ ہوں یہ اشعار ہماری معاشرت کا جزو بن چکے ہیں۔ گورو نانک نے بھی اپنی مقدس زبان میں فرمایا کہ

"مینوں رانجھنے واسطہ جنگیرا بھٹھ کھیڑیاں دیاں سیجاں"

ہیر ہمارا قومی سرمایہ ہے اس میں ہماری دیہاتی زندگی کے مناظر کھنچے ہوئے ہیں ہمارے گاؤں کی رومان بھری فضا دکھائی گئی ہے اور ہماری مشکلات روزمرہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

جھنگ مگھیانہ میں ہیر کا شکستہ سا مقبرہ ابھی تک زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہے۔ یہ ایک بہت اونچے ٹیلے پر ریل کی لائن کے متصل جانب شرق واقع ہے۔ سیال نامی قوم کے افراد اب بھی بہت معزز ہیں اور ہیر کا تذکرہ اپنی مجالس میں وہ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اس زبردست مخالفت کے باوجود مقبرہ اور اس کی ملحقہ جاگیر اپنے عاشقانہ احترام کے ساتھ قائم ہے۔ مقبرہ ایک محو انتظار عاشق کی طرح کھڑا ہے۔ ہیر رانجھے کی بارات کے انتظار میں ہی مر گئی تھی۔ مقبرہ کے روزن تخت ہزارہ کی طرف ہیں۔ رنگ پور کھیڑیاں کی طرف کوئی روزن نہیں۔ یہ روزن گویا عاشق خستہ حال کی ٹکٹکی میں لگی ہوئی آنکھیں ہیں جو اب سفید ہو چکی ہیں۔ مقبرہ زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ✦ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ہیر اور رانجھا دونوں راہ عشق میں ثابت قدم نکلے اور وفا کے پیمان پورے کرتے رہے مگر آہ یہ فلک ناہنجار قلوب انسانی کی انتہائی گہرائیوں سے نکلنے والے جذبات کو ہمیشہ کچل دیا کرتا ہے۔ دنیاوی نقطۂ نظر سے تو وہ بے چارے مر گئے مگر یہ موت ایک دائمی وصال تھا۔ وہ ایک ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں سے کوئی کھیڑے ہیر کو زبردستی نہیں لے جا سکتے کوئی کید و حسد نہیں کر سکتا۔ کوئی راٹیاں طعنے نہیں دے سکتی اور کوئی قاضی تکرار نہیں کر سکتا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

محمد صادق قریشی ردلاسوی بی اے

رباعی

جب سر سے ردائے شب سیاہی اٹھی
دوشیزۂ صبح مسکراتی اٹھی
انوارِ جمال سے ہے معمور جہاں
سن ناز و ادا سے گنگناتی اٹھی

اثر صہبائی

دنیائے ادب

فصیح الملک

ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک، بلبل ہندوستان، جہاں استاد، نواب مرزا خاں بہادر داغ دہلی کے "لعل شب چراغ" راقم الدولہ ظہیر دہلوی ان کے استاد بھائی تھے۔ ظہیر کا ناز تو دیکھیے! کہتے ہیں:۔

ہم بھی جناب داغ کے ہم درس ہیں ظہیر   بلبل ہیں وہ تو طوطی ہندوستاں ہیں ہم

شعرا کی یہ سنت ہے کہ اپنے اپنے باکمال استاد کا ذکر خیر کہیں نہ کہیں کر جاتے ہیں جس سے اکتساب فیض پر روشنی پڑتی ہے مثلاً بحر کا یہ شعر:۔

فیض پہنچا اک جہاں کو اُن کی تحقیقات کا
حضرتِ ناسخ کا کیا کہنا جگت استاد ہیں

رند لکھنوی

جا کے اب حضرتِ آتش سے کرو عرض اے رند   معرکہ آپ کا یہ طفل دبستاں جیتا

تسلیم لکھنوی

میں ہوں اے تسلیم شاگردِ نسیمِ دہلوی   مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

نسیم بھرت پوری

دلکش نہ ہوں کیوں نسیم کے شعر   شاگرد ہے داغ دہلوی کا

خود داغ کہتے ہیں:۔

بعد استاد ذوق کے کیا کیا   شہرت افزا کلامِ داغ ہوا

اس موضوع پر سینکڑوں نہیں ہزاروں شعر پیش کئے جا سکتے ہیں، جنابِ داغ کو دیکھئے کہ ان کی ہم درسی پر اُن کے استاد بھائی فخر کرتے ہیں، اپنے آپ کو طوطیٔ ہندوستان کہتے بھی ہیں تو محض اس لئے کہ انہیں بلبلِ ہندوستان کی ہمدرسی کا شرف حاصل ہے ع

داغِ معجز بیاں ہے کیا کہنا

اب اور آگے بڑھئے امیر کا تعلق لکھنؤ سے داغ کا تعلق دہلی سے ان دونوں اسکولوں میں جو مغائرت تھی وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس مغائرت پر معاصرانہ چشمک، سونے پر سہاگہ، باوجود اس کے صوفی باصفا امیر، داغ کی غزل پر غزل کہتے ہیں۔ مقطع ملاحظہ ہو!

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

امیر صاحب، داغ صاحب سے "دامنِ گلچیں" کے لئے غزل طلب کر رہے ہیں:۔

"... موجودہ گلدستوں سے فروغ کی صورت اگر ہے تو یہی کہ محاسن معنوی میں کوشش کی جائے، اس کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ معدودے چند نامور شعرائے خوش فکر و خوش مذاق کا کلام ہمیشہ اس میں چھپے، آپ کی ذات سراپا صفات اس طبقۂ نامور کی افسر ہے اور غایت مشتاقی سے اب غزل کہہ دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لہٰذا خواستگار ہوں کہ اپنی طبع نازک پر جبر کر کے بالالتزام غزل دینے کا وعدہ کیجئے۔ مگر یہ پہلے سے کہے رکھتا ہوں کہ غزل ایسی کہا کیجئے گا کہ ہم عزیبوں کو بھی کہنے کی گنجائش رہے یہ نہ ہو کہ پہلے ہی سے دنیا بھر کے قلم توڑ دیئے جائیں"۔

اچھا اسی سلسلہ میں امیر صاحب کا ایک اور مکتوب ملاحظہ فرمایئے:

"میرے پرانے یار پرانے غمگسار حضرت داغ سلامت

خداوند تعالیٰ یوماً فیوماً آپ کے اعزاز کو بڑھائے اور اس فن کو چمکائے ملک کو آپ کی قدر ہو یا نہ ہو میری نظر میں تو جس قدر ہے اس کو آپ کا دل بخوبی جانتا ہوگا۔ آپ حاسدانِ کوتہ اندیش کا کچھ خیال نہ کریں، ارباب کمال

سے منشی صاحب کی جامعیت سے میں بہت مرعوب ہوں لیکن "تغزل" کی حد تک کبھی آد داغ اور کبھی وہ داغ کہنا پڑتا ہے ۱۲ •

خصوصًا وہ جن سے زمانہ کچھ موافقت کرتا ہے ہمیشہ محسود ہوا کرتے ہیں۔ محسود ہونا سرمایۂ ناز و فخر ہے، حاسد ہونے سے خدا محفوظ رکھے"۔

"تذکرۂ انتخاب یادگار" دیکھئے اس میں حضرتِ امیر مینائی جناب داغ کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں:۔

داغ نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدین خاں مغفور، چوالیس برس کی عمر، صاحبِ دیوان شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگردوں میں فردِ کامل خوش مذاق ہونے میں یکتائی حاصل۔

امام الفن حضرتِ جلیل۔ حضرتِ امیر مینائی کے خاص شاگرد اور جانشین ہیں۔ ان خصوصیات کے حامل ہو کر بھی فرماتے ہیں ؎

داغِ فراقِ داغ کو مدت ہوئی جلیل
اب بھی زباں پہ اہلِ زباں کی ہے ہائے ہائے

حقیقت بھی یہی ہے ؎

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ　　اے داغ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

جلیل کے استاد بھائی مولانا ریاض خیرآبادی جلیل کے دیوان کی تاریخ کہہ رہے ہیں بھلا داغ کے ذکر کا یہ کونسا موقع تھا؟ مگر نہیں موقع ہو یا نہ ہو ع

داغ اپنی جگہ ہے جاتا ہے

دیکھئے! حضرت ریاض، داغ کو کس طرح یاد کرتے ہیں ؎

داغوں کے تھے باغ کھلے بعدِ داغ　　کس سے کہوں دردِ نہانِ سخن
کس سے کہوں کون بنا بعدِ داغ　　چارہ گرِ دردِ نہانِ سخن
داغ مٹے مٹ گئے استاد امیر　　ہے سخن اب مرثیہ خوانِ سخن
رہ گئے "ہم" گردِ پسِ کارواں　　نقشِ کفِ رہروانِ سخن
نقشِ کفِ پا بھی نہیں نقشِ آب　　خاک سرِ آبِ روانِ سخن

غور کیجئے! اس "ہم" میں کون کون ہیں اور ان کی "ہستی" کیا ہے! دیکھا آپ نے ریاض کا اعتقاد داغ کے ساتھ!

امیر مینائی کے ایک اور باکمال شاگرد ہیں، مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب انہوں نے مجموعۂ مکاتیب شائع کر کے ہم شیفتگانِ اردو پر بڑا احسان کیا ہے، اس مجموعے کی ابتدا میں امیر و داغ کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

آخر عمر میں اُستاد نے داغ کے رنگ کلام اور قبول عام کو دیکھ کر زبان کی صفائی اور تاثیر پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے، تاہم صنم خانۂ عشق کی جلوہ آرائی گلزارِ داغ کی شادابی کو نہیں پہنچی"۔

یہ سب کچھ بجا و درست ہے۔ لیکن اسی "موازنہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا رجحان اپنے اُستاد حضرت امیر مینائی ہی کی جانب زیادہ ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

شکوہِ الفاظ، متانت بیان اور شاعرانہ لطافت ان کے اشعار میں ایسی ہے کہ جو داغ کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ اصناف سخن پر قادر اور استاد ماہر ہیں قصاید باشوکت دفر کہتے ہیں اور سخنور با سرمایہ صاحب علم و فضل، داغ ان اوصاف سے معرا ہیں"۔

علامہ شبلی نے ثاقب صاحب کے ان دلائل تفضیل کو اسی کتاب کے "ریویو" میں یوں رد کر دیا ہے:۔

داغ کی کمزوریاں اور غلطیاں دکھلائی ہیں اور اس میں اس بات سے مدد لی ہے کہ داغ کا سرمایۂ علمی کچھ نہ تھا۔ لیکن اہلِ عرب کا خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہوگا اسی قدر بڑا شاعر ہوگا۔ یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے۔ فارسی میں دیکھئے تو ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی، انوری اور نظامی کے مقابلے میں جاہل تھا تاہم انوری کو اس کی عبودیت کا اقرار ہے۔

اور نظامی کہتے ہیں ؎

کہ آراست زلف سخن چوں عروس

جامی علم و فضل میں نظامی سے بڑھ کر ہیں۔ غرض شاعری کا تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں"۔

علامہ شبلی ہی اپنی ایک نظم میں دکن سے خطاب کرتے ہیں اور اس کی مابہ الامتیاز خصوصیات میں اپنے آپ کو اور نواب مرزا خاں داغ کو اس طرح

ؔ ہمارے بعض . . . ہم دلی بزرگوں نے بعض حاسدوں کے بہکانے کی وجہ سے یہ بات مشہور کر رکھی تھی کہ داغ کو "دال منڈی" کے ناٹک نے مشہور کیا ہے۔ داغ جب یہاں آئے ہیں تو ان کی عمر (۶۰) برس سے بھی متجاوز ہو چکی تھی، امیر کا تذکرہ نکلنے کے وقت وہ صرف (۴۴) برس کے تھے مگر دیکھئے امیر صاحب نے ان کی تعریف کن لفظوں میں کی ہے!! دکن آنے سے پیشتر خود حضرتِ داغ اپنی شہرت روز افزوں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ؎

ہند سے تا بہ دکن داغ ہے شہرت تیری　　اب تو کچھ اور ترا بختِ رسا کہتا ہے

شامل کرتے ہیں ع

شبلی سحر فن و داغ غزل خواں بانست

واہ کمال بھی کیا چیز ہے، وہ علامہ جو آگے چل کر "مجدد دین اسلام" میں شریک ہونے والا ہے اپنے بازو پر اس شان سے ایک غزل گو کو جگہ دے! میرے ایک دوست مجھ سے یہ فقرہ سن کر مجھ پر بہت برہم ہوئے تھے کہ:-

آپ نے یہ کیا لکھ دیا۔ شبلی اگر دربار فضلا میں سنہری کرسی پر جلوہ فرما ہیں تو داغ بھی مسند آرائے شعر و سخن ہیں۔ خیر مولانا شبلی کے ساتھ مولانا حالی کی بھی رائے سن لیجئے:-

غزل میں ضرور ہے کہ بہ نسبت اور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے، آج تک فارسی یا اردو میں جن لوگوں کی غزل مقبول ہوئی وہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس اصول کو نصب العین رکھا . . . ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارہ زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور ادا کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ داغ کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی، روزمرہ کی بہتات کے طرز ادا میں ایک شوخی اور تیکھا پن ہے جو اسی شخص کا حصہ ہے (اقتباس از مقدمہ شعر و شاعری)

اسی رائے کی تائید میں اسی "مقدمہ" کا اور ایک مقام ہدیہ ناظرین ہے:-

ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر انیس نے مرثیہ کو بے انتہا ترقی دی اور نواب مرزا شوق نے مثنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے، اسی طرح دلی میں ذوق، ظفر اور خاص کر داغ نے غزل کی زبان میں وسعت اور صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے

واہ رے داغ واہ ؎

داغ فراق داغ کو مدت ہوئی جلیل
اب بھی زباں پہ اہل زباں کی ہے ہائے داغ

مولانا حالی نے ہی جامع مکتوبات امیر مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب سے فرمایا کہ جناب مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ صاف شعر کو پسند کرتے تھے اور اس لئے اشعار داغ کے مداح تھے۔

جناب مولانا حالی نے خود حضرت امیر مینائی کے استاد حضرت اسیر سے سنا ہے کہ:-

بھئی! مشاعرہ کیا جائیں ہماری طولانی غزلوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور مشاعرہ ختم ہونے پر داغ کی غزل سب کی زبان پر ہوتی ہے[1]

یہی مولانا داغ کو ایک رقعہ لکھتے ہیں اور اس میں یہ شعر خواجہ شیراز کا سرنامے پہ تحریر فرماتے ہیں ؎

آں سیہ چردہ کہ شیرینی عالم با اوست
چشم میگوں، لب خنداں، دل خرم با اوست[2]

صاحبان ذوق "شیرینی عالم" پر نظر رکھ کے داغ کی کوئی ایک غزل پڑھ لیں، بخدا مزا آجائے گا مزا۔ یہ لطف سخن خداداد ہے۔

مولانا حالی نے ہی بطور پیشین گوئی ایک شعر کہا تھا۔

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

میں تو اس پیشین گوئی کا قائل ہوں اور آپ!

بندہ پرور منصفی کیجے خدا کو دیکھ کر

زمانہ ہوا مولانا حالی کی ایک غزل "مخزن" کے ایک قدیم پرچہ میں ہم نے دیکھی تھی جس کا مقطع اب بھی ہمارے ضبط ذہن ہے ؎

نعم البدل ہے داغ کا حالی کلام داغ
ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

مولانا حالی اور مولانا شبلی کے بعد کسی اور نقاد کی رائے پیش کرنے سے فائدہ؟ لیکن قند پارسی بھی تو آخر کوئی چیز ہے! اس سے میں حلاوت پا رہا ہوں تو آپ کیوں محروم رہیں:-

داغ نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدین خاں بہادر برگزیدہ ترین تلامذہ خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق و از مشیران خاص فرماں روائے رام پور من و او راغائبانہ اتحادے است، ہر چند ملاقات صوری صورت نہ بستہ دریں نزدیکی گفتار دل آویز خویش را فراہم آوردہ گلزار داغ نام دیوانے ترتیب دادہ است بعد طبع یکے نسخہ نامہ گرد آور فرستادہ شوخی کہ در کلام او ست بندہ ندانم کہ امروز دیگرے را دادہ باشند و زبانے کہ او را بخشیدہ اند[3]

[1] مقابر خطوط منشی امیر احمد [2] خمخانہ جاوید [3] مقدمہ خطوط منشی امیر احمد۔

فی زماننا کسے را بہتر نیست. بیشتر ازیں ستائش گفتارے
چہ تواں گفت - خیر الکلام ماقل و دل"۔
معزز ناظرین! یہ رائے بھی کسی معمولی شخص کی نہیں، نواب
صدیق حسن خاں غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے، یہ رائے دہندہ اسی فرد
فرید کا فرزند رشید ہے۔ الولد سر لابیہ؛ داغ سے متعلق ہمارے
پاس اگرچہ اور اتنا ہی ذخیرہ ہوگا جتنا کہ آپ کے روبرو پیش کیا گیا ہے
لیکن بخوف طوالت اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ۵

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے یاد کن ایں شاعر دیرینہ را

"ساقی"

علی منظور حیدرآبادی

گاؤں کی ایک شام

لہلہاتے کھیت اور ان پر شفق کی سرخیاں — آسماں پر منتشر یہ ننھی ننھی بدلیاں
اک کھلا میدان تا حدِ نظر پھیلا ہوا — غرقِ شعریت ہوائیں بے خودی پرور فضا
اک طرف ننھے کبڈی کھیلنے والوں کا شور — اور ڈھلانوں میں ادھر بہتے ہوئے پانی کا زور
ڈاٹ پر معصوم و سادہ لڑکیوں کی ٹولیاں — میٹھے میٹھے قہقہے اور پیاری پیاری بولیاں
پانی بھرنے والیوں کے پاؤں کی یہ نرم چاپ — یہ دھندلکا شام کا، یہ دونوں وقتوں کا ملاپ
دھندلی دھندلی ٹیڑھی دیواریں یہ گارے کے مکان — کچھ گھروں میں جل رہی ہیں دھیمی دھیمی بتیاں
روٹی پکنے کی یہ آوازیں، یہ تنوروں کی آگ — گھر کو واپس آتے چرواہوں کے درد انگیز راگ
دور قبرستان سے یہ "ہیر" گانے کی صدا — گھونسلوں میں طائروں کے پھڑپھڑانے کی صدا
شام اور یہ شام کی دلکش ملاحت ریزیاں — موسمِ باراں کی کافر ولولہ انگیزیاں
یہ ہرے کھیتوں پہ اک رومانیت چھائی ہوئی — پتّی پتّی اپنی رعنائی پہ اترائی ہوئی

کاش ان لمحات میں وہ انجمن آرا بھی ہو
لطفِ نظارہ ہے جب وہ جانِ نظارہ بھی ہو

سیّد ضمیر جعفری

لے ایک چشمہ کا نام

"ھمایوں"

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء

جلد ۱۶ — تصاویر:- ۱۔ ماں اور بچہ ۲۔ ندی کنارے ۳۔ نسیمِ شمال — نمبر ۴

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مسٹر صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

بزمِ ادب

سالنامہ کے انعامات میں سے مصور گولڈ میڈل پچھلے ماہ بن کر تیار ہو گیا تھا۔ اور وہ حسبِ اعلان جناب منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کی خدمت میں اُن کے مضمون "گارڈنر خاندان کے اردو شعرا" پیش کر دیا گیا ہے۔ ہم اپنی طرف سے اور ناظرینِ ادبی دنیا کی جانب سے جناب شاکر کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ سالنامہ کے دیگر انعامی مضامین کا آخری فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا۔ لیکن واثق امید ہے کہ مئی کے آغاز تک ضرور ہو جائے گا۔ اور مئی کے پرچہ میں انعام حاصل کرنے والے ادبا و شعرا کے ناموں کا اعلان کر دیا جائے گا۔

مضمون نگار حضرات میں سے ایک خاصی تعداد ایسے اصحاب کی ہوتی ہے جو مضمون بھیج کر اس امر کے متوقع ہوتے ہیں کہ اُن کے مضامین رسالے کے دفتر میں پہنچتے ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائیں گے۔ ایسے اصحاب کی خدمت میں ہماری گزارش ہے کہ ہر اہم رسالہ کے دفتر میں روزانہ مضامین نظم و نثر (نظم نسبتاً زیادہ) کی ایک بڑی تعداد موصول ہوتی ہے اور اس عظیم الشان انبار میں شامل ہو جاتی ہے جو غریب ایڈیٹر کی میز بلکہ روح پر پہلے سے موجود ہوتا ہے۔

ان مضامین میں مبیشتر ایسے ہوتے ہیں جو رسالہ کے معیار یا پالیسی کے مطابق نہیں ہوتے۔ باقی مضامین میں سے بھی اکثر کافی کاٹ چھانٹ اور ترمیم و تنسیخ کے محتاج ہوتے ہیں یا بہت کم چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی اصلی صورت میں شائع ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ذمہ دار ادارہ کا تمام وقت اس چھانٹ پھٹک اور تہذیب و ترتیب کی نذر ہو جاتا ہے اور اس اثنا میں جدید مضامین کا سیلاب بدستور امڈا چلا آتا ہے اور نئے نئے نوادر کے ساتھ پرانے شکوے شکایتیں بھی اپنی تیز و تند رو میں بہائے لاتا ہے۔ ایسی حالت میں بے چارے ایڈیٹر سے یہ توقع رکھنا کہ وہ یا تو مضمون فوراً شائع کر دے یا صاحبِ مضمون سے اس کی نسبت سلسلۂ خط و کتابت جاری کرے سراسر ناانصافی ہے جو مضامین قابلِ اشاعت ہوتے ہیں یا جو مزید غور و خوض کے محتاج ہوتے ہیں۔ اُن کی نسبت مضمون نگار حضرات کو مطلع کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جو مضامین شائع نہیں ہو سکتے اور جن کی واپسی کے لئے مضمون نگار ڈاک کے ٹکٹ بھی ملفوف نہیں کرتے۔ وہ یونہی پڑے رہتے ہیں اور ایک عرصہ کے بعد مجبوراً تلف کر دیئے جاتے ہیں۔ سالنامہ کے سلسلے میں ہمارے پاس ایسے بے شمار مضامین غیر معمولی تعداد میں موصول ہوئے وہ جوں کے توں پڑے ہیں۔ اگر ان کے مصنفین انہیں واپس منگانا چاہتے ہیں تو ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر منگا لیں ورنہ بدرجۂ آخر آج سے ایک ماہ کے بعد وہ تلف کر دیئے جائیں گے اور ہمیں اس کا بہت رنج ہو گا۔

بعض اصحاب مضمون کے نیچے اپنا نام نہیں لکھتے۔ بلکہ علیحدہ خط میں اپنا نام پتہ وغیرہ لکھ دیتے ہیں۔ مضمون کے نیچے صاحبِ مضمون کا نام اور پتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ بعض اوقات خط مضمون سے جدا ہو کر ضائع ہو جاتا ہے اور مضمون بے نام رہ جاتا ہے۔

گزشتہ سال سے ہمارے ہاں نظمیں اور غزلیں اس کثرت سے وصول ہو رہی ہیں کہ ہم حیران ہیں کہ انہیں کب اور کیونکر شائع کیا جائے گا۔ سنجیدہ اور پر از معلومات مضامین لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان ادیب اپنی قابلیت اور ذہانت مفید اور دلچسپ مضامین لکھنے میں صرف کریں اور اپنی زبان و ادب کی ترقی و وسعت میں اپنے شایانِ شان حصہ لیں۔ شاعری کی عظمت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن شاعری چونکہ ایک وہبی اور خداداد جوہر ہے اس لئے اسے صرف انہیں لوگوں کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے جو طبعاً اور فطرتاً اس کے لئے موزوں ہیں۔ ہر نوجوان کا شاعر بننے کی کوشش کرنا نہ صرف تضیعِ اوقات ہے۔ بلکہ ہمارے ادب کو انحطاط اور زوال کی طرف لئے جاتا ہے۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

ہٹلر اور مسولینی ایک جدید روشنی میں

اگر ۲۳ سال کی عمر میں مسولینی اور ہٹلر کی تصاویر کا موازنہ کیا جائے تو ہمیں ایک تو جاذبِ نظر خد و خال اور استوار نقوش کا مالک نظر آئے گا اور دوسرا اس کے مقابلے میں ایک ایسا ناقابلِ بیان نوجوان ہوگا جو اس عمر میں بھی کسی قسم کی نمایاں خصوصیات نہ رکھتا تھا۔ ہٹلر اپنی نشو و نما کے ابتدائی ایام میں ایک سست الوجود انسان تھا۔ نہ اُسے مطالعے کا شوق تھا اور نہ ہی اس میں ذہانت، قوتِ حیات یا نئے خیالات موجود تھے۔ وہ کبھی کبھی تصویر دار کارڈ بیچ کر تھوڑا بہت کمانے کی کوشش کر لیا کرتا تھا۔

مسولینی اپنی جوانی کے زمانے میں اپنے باپ کی آہنگری کی دکان میں کام کرتا تھا۔ اس نے اٹھارہ سال کی عمر سے اپنے لئے کام کاج کر کے کمانا شروع کر دیا تھا۔ اور اس دوران میں وہ مستقل طور پر مطالعے میں بھی مصروف تھا۔ اس کا تمام زمانۂ جوانی ہمیں قوتِ حیات اور امنگوں سے لبریز نظر آتا ہے چھبیس سال کی عمر تک پہنچنے سے پیشتر ہی وہ نو بار سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے سلسلے میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اور اٹلی کے سب سے بڑے سوشلسٹ اخبار کا ایڈیٹر بن گیا تھا۔

مسولینی نے میدانِ جنگ میں بھی کارِ نمایاں کئے لیکن ہٹلر کی زندگی ان کارہائے نمایاں سے یکسر عاری رہی۔ وہ جنگ جویانہ اشغال جو آج جرمنی کی نوجوان نسل کو سکھلائے جا رہے ہیں اُن میں اُس نے خود کبھی حصہ نہ لیا تھا۔ البتہ اس سلسلے میں اُس کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے کہ وہ ۱۹۲۳ء میں اپنے دوستوں اور حامیوں کو میونخ کے بازاروں میں گولیوں کا نشانہ بنتا چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا اور اب بھی وہ جب کبھی فوجی جلوسوں میں شامل ہوتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ بازاروں میں دو رویہ تین تین قطاریں سپاہیوں کی متعین ہوں

جرمنی کے عوام میں ہٹلر کی مقبولیت اور کامیابی کا راز اس کا واحد جوہرِ خداداد ہے یعنی تقریر کی قابلیت۔ آج تک جرمنی میں ایک زبردست مشہور مقرر نا پید تھا۔ اور ہٹلر جرمنی کے لوگوں پر ایک جادو سا کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس کی تقریروں میں وہ خصوصیت موجود ہے جو ویگنر کی موسیقی میں تھی —— چند مؤثر ٹکڑوں کا تواتر: آہیں اور چیخیں اور ان سب سے بڑھ کر دیوتاؤں اور جوانمردوں، خونریزی اور قومیت کا ایک دھندلا ازدہام۔

مسولینی کا آہنیں لہجہ سادہ فقروں کو ایک مردانہ آواز میں ادا کر دیتا ہے۔ ہٹلر جب تقریر کرتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو جوش و خروش کی عصباتی بلندی تک لے جاتا ہے۔ تقریر کرتے ہوئے چبوترے پر سے وہ ایک بٹن دبا کر اپنے آپ پر برقی روشنی پھیلا دیتا ہے۔ اس ساز و سامان کی موجودگی ہی سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی اس عصباتی کیفیت کے لئے کس قدر تیاری کرتا ہے۔ حبشہ کی فتح کے بعد اپنی فاتحانہ تقریر میں مسولینی نے "میں" کا لفظ صرف دو بارہ استعمال کیا تھا۔ لیکن ہٹلر اپنی تقریر میں صدہا بار اس لفظ کو دہراتا ہے

چونکہ مسولینی کو اپنی ذات پر اعتماد ہے اس لئے وہ اپنے متعلق بہت کم باتیں کرتا ہے۔ لیکن ہٹلر میں خود اعتمادی پختہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ اپنے متعلق متواتر ذکر کرتا رہتا ہے۔ ولیم ثانی کی طرح ہٹلر ہمیشہ ایک مضبوط انسان کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا باعث اس کی جبلی کمزوری ہے اس حقیقت سے جرمنی کے لوگوں کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے کہ جرمنوں نے دوسری دفعہ اپنی تقدیر کو ایسے درخشاں متواتر بولنے والے، دھمکیاں دینے والے عصباتی شخص کے سپرد کر دیا ہے۔

اس نکتے کے لحاظ سے مسولینی اور ہٹلر کا فرق خاص طور سے نمایاں ہے۔ مسولینی جسمانی لحاظ سے اچھی ساخت کا ہے یعنی ہر طرح سے مردانہ خصائص کا مالک۔ لوگوں کے لئے اچھی مثال قائم کرنے کی غرض سے وہ اپنے ہاتھ میں کدال اٹھا کر عوام کے سامنے مصروف عمل ہونے کو تیار ہو جاتا ہے۔ ۵۳ سال کی عمر میں اس نے ہوابازی کا امتحان پاس کیا ہے۔ لیکن ہٹلر نہ کسی کھیل میں حصہ لیتا ہے، نہ موٹر چلا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور قسم کا جسمانی کام کرتے ہوئے اسے دیکھا گیا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ پرانے زمانے کے ناٹکوں کی طرح وہ بادشاہ کا پارٹ ادا کرتا جائے اور لوگ اسے دیکھتے رہیں۔

مسولینی نے اپنی قیادت کے زمانے میں اپنے علم و تہذیب کے ذخیرے میں معتدبہ اضافہ کیا ہے۔ وہ جرمنی، فرانسیسی اور انگریزی زبانیں نہایت روانی سے بول سکتا ہے۔ جب کبھی مسولینی سے مل کر کوئی شخص جدا ہوتا ہے تو اس ملاقات سے مسولینی ہمیشہ فایدہ اٹھاتا ہے۔ اور اپنی معلومات میں کسی نہ کسی بات کا اضافہ کرتا ہے۔ لیکن ہٹلر ملاقات کے تمام عرصے میں خود ہی بولتا رہتا ہے۔ ملاقاتی کو کچھ کہنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ صرف ہٹلر ہی گرجتا ہے، اپنی آنکھوں کو گھماتا ہے میز پر زور زور سے مکے مارتا ہے اور بہت سے فقرے کہہ لینے کے بعد اچانک اپنی ملاقات ختم کر دیتا ہے۔

مسولینی اپنے تمام ماتحتوں سے جو حقیقتاً اس کے سر کردہ ہیں، قابلیت میں برتر ہے۔ لیکن ہٹلر سے اس کے کئی وزرا زیادہ قابل ہیں۔ صرف پروپیگنڈے کے میدان میں اس کا کوئی حریف نہیں، مسولینی صرف موسم گرما میں دارالسلطنت سے باہر جاتا ہے اور سماجی تقریبوں میں کبھی حصہ نہیں لیتا اور نہ کبھی لوگوں کو دعوتیں دیتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک بے حد مصروف انسان ہے۔ لیکن ہٹلر تنہائی سے ڈرتا ہے۔ وہ خاموشی اور سکون سے خائف ہے۔ بلکہ وہ علم سے بھی گریزاں ہے۔ وہ سال کا زیادہ تر حصہ اپنے دیہاتی مکان میں بسر کرتا ہے جو برلن سے بہت دور ہے اور اس کے ملنے والے زیادہ تر سینما کے ایکٹر ہوتے ہیں۔ ایک مشہور سینما ایکٹر نے ایسی ہی ایک دعوت کا ذکر کیا ہے۔ جب ایک شام ہٹلر کے ہاں بیس کے قریب سینما سٹار جمع تھے۔ ہٹلر سب کی تواضع شراب سے کر رہا تھا لیکن خود سادہ پانی پیتا تھا۔ اس شام ہٹلر اپنے ساتھیوں کے سامنے تین گھنٹے تک متواتر تنہا بولتا رہا۔ ان تمام باتوں سے ہٹلر کی اس مایوس اداکارانہ فطرت کا اظہار ہوتا ہے جسے ہمیشہ تماشائیوں اور سامعین کی ضرورت رہتی ہے اور اسی بات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہٹلر کے فیصلے اور افعال کیوں اس قدر خطرناک ڈرامائی انداز لئے ہوتے ہیں۔ کیونکہ کسی کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ اب کیا کہے یا کرے گا اور کہاں جا کر سر نکالے گا۔

اس موازنے سے دو بے حد مختلف خصوصیات رکھنے والے قایدوں کے کردار نمایاں ہوتے ہیں۔ مسولینی کسی صورت میں بھی یورپ میں جنگ بپا کر کے اٹلی کی سرحدیں وسیع کرنا نہیں چاہتا۔ وہ ایک مکمل مثالی اطالوی سیاست دان ہے — بدگمان اور حقیقت پرست۔ وہ انتظار کرنا جانتا ہے اور انتظار کے بعد فاتح کے ساتھ مل جانا۔ لیکن ہٹلر جرمنوں کی برتری کے لئے ہر بات کو بساط پر لگائے بیٹھا ہے۔ اور اس کی ہر کوشش جرمن قوت کی توسیع کی طرف مائل ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ جرمنوں کو حقیقتاً نوآبادیات یا یوکرین کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ ان کو صرف فتح کی ضرورت ہے اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک وہ ایک بار پھر ۱۸۷۱ء کی طرح ورسیلز کے شیش محل میں فاتحانہ طور پر داخل نہ ہو جائیں۔

ان کا قائد جو ایک جذباتی اداکار ہے۔ انہیں اسی منزل کی جانب لئے جا رہا ہے۔ ایسی ہی امیدوں سے وہ جوانوں میں ایک برقی اثر دوڑا دیتا ہے۔ ہٹلر ولیم ثانی کی طرح جنگ کے لئے مجبور ہو جائے گا۔ اگرچہ یہ بہت ممکن ہے کہ اس کے ہولناک نتایج سے خوفزدہ ہو کر اسے آخری لمحوں میں اس سے احتراز کی سر توڑ کوشش کرنی پڑے لیکن مسولینی جو جذباتی نہیں بلکہ ایک عملی سیاست دان ہے ہٹلر کی اس جنگ سے فایدہ اٹھائے گا اور ہٹلر کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ (رایمل لڈوگ)

چین مر نہیں سکتا

اس وقت جبکہ ہر شخص چین کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اور جاپان کی چیرہ دستیوں کا تاسف سے مشاہدہ کر رہا ہے۔ چین کے ماضی سے اس کے مستقبل کا اندازہ لگانا بے جا نہ ہوگا۔

نظامِ تعلیم

بہت سے علما کی رائے میں چینی قوم دنیا کی قدیم ترین قوم ہے۔ کیونکہ زبان کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو چینی زبان ایک جزو کے لفظوں والی زبان ہے۔ اگرچہ الفاظ انفرادی طور پر مختصر ہیں لیکن زوردار بھی ہیں اور ایک وجہ یہ بھی ہے جس کی بنا پر غیر ممالک کے لوگ اس زبان کا مطالعہ آسانی سے نہیں کر سکتے۔ ان کا طریقۂ تعلیم بہت مشکل ہے۔ ان کے ہاں حروف کوئی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی تحریر اصطلاحی نقوش میں ہوتی ہے۔ یہ اصطلاحی نقوش معانی کے وضعی استعارے ہیں۔ در یہ اُس وقت سے موجود ہیں جب دوسری زبانیں شاید نشو و نما کی ابتدائی منزلوں ہی میں تھیں۔ ان اصطلاحی نقوش کا طریقہ تعلیم بے حد مشکل ہے۔ کیونکہ معانی کا دار و مدار لہجے پر ہوتا ہے اور اس لئے صحیح سماعت کو کام میں لانا پڑتا ہے یا دوسرے لفظوں میں پورے طور پر ہوش برآواز رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی طریقے سے اس زبان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مارش ہین کے الفاظ میں "چینی زبان کے قواعد کی بنیاد حرکت و سکون پر ہے۔" اصطلاحی نقوش کے مطالعے اور مخصوص تعلیمی نظام سے حافظے کے اجتماع اور تسلسل خیال کی خصوصیات کو مدد ملتی ہے اور بلند ذہانت کے لوگوں میں اختراعی خلاقی اور فن کارانہ اہلیت اور چابک دستی پیدا ہوتی ہے۔ طبقۂ عوام ضرب الامثال کو حافظے میں محفوظ کرتا ہے۔ وہ ضرب الامثال جو زندگی میں ان کی رہنما ہوتی ہیں۔ چین کے طلبا کو اپنے موضوع سے متعلقہ تمام علوم کا بھی مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ ایک مینڈرن یعنی چینی عالم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذیل کے علوم کا مطالعہ کرے۔ قانون، فلسفہ، علم ادب، مختلف فنون، تاریخ، منطق اور ملکی تنظیم۔ ایک ڈاکٹر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذیل کے علوم کا مطالعہ کرے۔ علم الابدان، علم نباتات، کیمیا، علم الادویہ، علم تشخیص، علم جمادات، اور تقریباً ہر وہ علم جس کا تعلق قدرت سے ہو۔ ذہانت کے لحاظ سے اور ممالک کی بہ نسبت چینیوں کی کھیلیں بھی برتر اور پیچیدہ تر ہیں۔

چین کے اقتصادی ذرائع

دنیا کے بہت سے دولت مند ملک ایسے ہیں جن کی دولت اب باقی نہیں رہی۔ کیونکہ ان میں یورپی اقوام کی زبردستیاں اپنا مہلک کام کر چکی ہیں۔ قدیم روما کی سطوت و دولت کا دار و مدار ایشیا، سپین، کارتھیج اور یونان پر تھا۔ سپین نے میکسیکو کی تمام دولت چوس کر جمع کر لی۔ اور افریقہ اور اس کی دولت کے لئے یورپ کی تمام قومیں باہم دست و گریباں ہیں۔ آسٹریلیا کی سرزمین سے انگلستان کا خزانہ بھر گیا۔ ہندوستان ماضی اور حال میں گوری اقوام کی حرص و آز کا شکار رہا۔ چین کی دولت کا اگرچہ سب کو علم ہے لیکن اس کے باوجود اب تک اسے نسبتاً محفوظ ہی رہنے دیا گیا تھا۔ چین کے کوئلے کے معادن انگلستان کے مقابلے میں بیس گنا بڑے ہیں۔ تانبا، سونا، چاندی، سیسہ، چکنی مٹی، تیل، پارہ اور سنکھیا ـــــ یہ سب اشیاء چین میں موجود ہیں۔ دریائے امور کی وادی میں سونے کی زرخیز کانیں ہیں۔ مانچوکو سے سونا، لوہا، کوئلہ اور تیل بہ افراط برآمد ہوتا ہے۔ اگر ان کانوں سے کام لیا جائے تو چین کی دولت کی کوئی حد ہی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ چند سال ہوئے جاپان نے مانچوکو کا علاقہ چین سے چھین لیا اور اب جنگ کے ذریعے اس سے بھی آگے قدم بڑھا رہا ہے۔ جاپان کو اپنے کارخانوں کے لئے ان دھاتوں اور خام پیداوار کی ضرورت ہے۔ لیکن کیا چین بغیر کسی قسم کی جوابی تگ و دو کے اپنے آپ کو یوں ہی لٹنے دے گا؟ واقعات حاضرہ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔

پختگیٔ حیات کا اظہار

سخت قوانین کے نفاذ سے چینی قوم کو آج تک خالص اور استوار رکھا گیا ہے۔ یہ قوانین چینیوں کے ہجرت کرنے اور دوسرے ممالک کے مہاجرین کے چین میں بود و باش اختیار کرنے کے خلاف تھے اور اس لئے چین کی قسمت روما کی تقدیر سے مختلف ہے۔ جہاں

اقبال سے

اے کہ تری ذات سے قائم ہے ملت کا وقار ‏ ‏ اے کہ تجھ سے ملتہب ہے زندگانی کا شرار
اے کہ تری روح میں ہیں جذبِ فطرت کے رموز ‏ ‏ اے کہ تیرا دل ہے روشن مثلِ مہرِ نیم روز
اے کہ تیرا فلسفہ ہے جانِ اسرارِ خودی ‏ ‏ اے کہ تیرا نغمہ ہے مضرابِ سازِ زندگی
اے کہ تیری لوحِ دل ہے مہبطِ انوارِ حق ‏ ‏ اے کہ تیری روح پر ہیں منکشف اسرارِ حق
اے کہ تیرے شعر میں جاں سوزیٔ پروانہ ہے ‏ ‏ اے کہ تو بہبودِ ملت کے لئے دیوانہ ہے
اے کہ تیری رفعتِ تخئیل کا یزداں شکار ‏ ‏ اے کہ تیرے دم سے قائم نوعِ انساں کا وقار
اے کہ جدّ و جہد کے میدان کا غازی ہے تو ‏ ‏ اے کہ اپنے وقت کا رومی ہے تو رازی ہے تو
اے سراپا التہاب اے پیکرِ سوز و گداز ‏ ‏ اے حریفِ بادۂ سرمست و سرجوشِ حجاز
اے خمِ آشامِ مئے پاکیزۂ حبِ وطن ‏ ‏ اے شہیدِ خنجرِ اخلاق و تہذیبِ کہن
کس قدر حرماں نصیب اے شاعرِ مشرق ہے تو ‏ ‏ قوم ہے باطل پرست اور رہبرِ صادق ہے تو
کچھ ٹھکانا ہے تری محرومیٔ تقدیر کا ‏ ‏ تو غلام آبادِ ہندوستان میں پیدا ہوا
یعنی تو پیدا ہوا ہوتا اگر افرنگ میں ‏ ‏ مشورہ لیتی تجھی سے قوم صلح و جنگ میں
سرزمینِ ہند میں ہے ان دنوں قحط الرجال ‏ ‏ قعرِ گمنامی میں ہیں کھوئے ہوئے اہلِ کمال
وقت آئے گا کہ قوم ان کو ابھارے گی کبھی ‏ ‏ لیلئ تقدیر کے گیسو سنوارے گی کبھی

پھر تجھے اقبال اے سرآمدِ اہلِ کمال
قوم سمجھے گی کہ تو ہے واقعی بھارت کا لال

ناظر

جہاں گرد طلبا کے گیت

بارھویں صدی کے جہاں گرد اور خانہ بدوش یورپی طلبا کے لاطینی گیت سننے اور سمجھنے سے پہلے بہت ضروری ہے کہ ہم یہ بات معلوم کریں کہ اس زمانے کے یورپ میں زندگی کے مختلف پہلو کس نہج پر تھے۔ یہ طلبا ایک خاص فرقے کی حیثیت رکھتے ہیں اور جب تک اُن کی نفسیات، اُن کی طرزِ بود و باش اور زندگی کی روش کے متعلق چند خاص باتیں پیشِ نظر نہ کر لی جائیں ان کے نغموں سے پورے طور پر لطف اور فایدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ ——

جب ہم زمنہ وسطیٰ میں یورپ کی ذہنی اور اخلاقی کیفیت کا تصور باندھیں تو چند مقررہ اور معیّن خیالات ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت یورپ کی تمام اقوام ایک مجہول ذہنی خوابِ خرگوش میں مبتلا تھیں۔ یونان اور روما کے علوم و فنون رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو کر معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ بڑے بڑے کتب خانے بے کار رہ کر کرم خوردہ ہونے کے لئے بھلا دیے گئے تھے اور ہر قوم کے افراد قیامت کے خوف اور انتظار میں انتہا پسند بن چکے تھے۔ نیکی کی طرف مائل ہوتے ہوئے وہ زندگی کی عام مسرتوں کو بھی گناہ کبیرہ خیال کرتے تھے اور برائی کی طرف رجوع کرتے ہوئے وہ ایک وحشیانہ اشتیاق کے ساتھ اپنی ہستی کو پست خواہشات اور نفس پرستی کے حوالے کر دیتے تھے۔ آیندہ دنیا اور آیندہ زندگی کے متعلق حد سے زیادہ غور و تفکر نے انہیں اس لائق نہ رہنے دیا تھا کہ وہ اُن باتوں پر قابو پا سکیں جن سے اس دنیا میں اُن کی موجودہ زندگی خوشگوار بن سکے۔ فلسفیوں اور حکماء کے دانش اور تدبّر کی ایسی قلب ماہیت ہو چکی تھی کہ اُن کے خیالات جہالت کے درجے کو پہنچے ہوئے تھے اور ایسے بیکار اور لاحاصل مسائل اور موضوع ان کا مشغلہ تھے جن کو حقیقت اور واقعیت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ مذہبی جنون نے آزاد مطالعے اور مدلّل تجربات کی شمع کو گُل کر دیا تھا۔ تمام سماج دقیانوسی خیالات کے بارِ عظیم کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ ہیئت ور مذہبی نمایندے دوزخ کی مکروہ اور گھناونی مصیبتوں اور عذاب کے ذکر و بیان سے سامعین کے خیالات کو تلخ بناتے تھے اور تعویذ گنڈے اور مقدس مقامات کی زیارت کو ہی ذریعہ نجات تصور کیا جاتا تھا۔ لوگوں کے دل و دماغ کی قدرتی نشو و نما رُک گئی تھی اور وہ شیطانی قوتوں سے عہد و پیمان باندھے ہوئے، نظم و نسق کے فقدان کی وجہ سے، جادو اور مجنونانہ خواہشات کی طرف مائل ہو کر اوٹ پٹانگ تصورات کی دنیا میں مگن تھے۔ سماج میں عورت کا اصلی درجہ قایم نہ رہا تھا۔ ایک طرف تو لہو و لعب اُسے جنسی جذبات کا آلہ کار سمجھتے تھے۔ اور دوسری طرف اُس کا رتبہ اتنا بلند سمجھا جاتا تھا کہ اُسے ولایت کا رتبہ، ایک تقدیس کا ذریعہ اور آخری منزل کہا جاتا تھا۔ عام سوجھ بوجھ، فیصلے کی قوت، حقیقت کو حقیقت سمجھنا، زندگی کے بُرے پہلوؤں سے بچنا اور نیک صورتوں کی طرف مائل ہونا، —— ان تمام باتوں کی زندگی کے ہر شعبے میں کمی تھی۔ ضد اور غلط فہمی کی وجہ سے زندگی کے مناسب مقاصد ان کی نظروں سے دور ہو چکے تھے اور وہ حقایق کی طرف مائل ہونے کی بجائے اپنی قوتوں کو موہوم سایوں کے تعاقب میں ضائع کر رہے تھے اور اس مستقبل کے منتظر تھے جس کے متعلق انہیں کوئی خبر نہ تھی اور اُس حال کو قابو میں کرنے کی کوشش نہ کرتے تھے جس سے وہ دو چار تھے۔ اس زمانے میں متحدہ یورپ کا سب سے اہم اقدام محاربہ صلیبی تھا اور یہ ایک فاش غلطی تھی جس سے انجام کار خون خرابے کے سوا اور کچھ نہ حاصل ہو سکا۔

یہ وہ کیفیت ہے جو یورپ وسطیٰ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ لیکن یقیناً یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ کیونکہ اِن کا ماخذ راہبوں کا وہ علم ادب اور تاریخ ہے جس میں احیائے علوم

دفنون کے ردِّ عمل کی وجہ سے مبالغے کی بہت آمیزش ہے۔ اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زمانے میں یورپ کی ذہنی فضا غیر قدرتی طور پر دھندلی ہو رہی تھی جس کی مثال ہمیں روما کے زوالِ سلطنت اور تیرھویں صدی عیسوی کے درمیانی وقفے میں اور کہیں نہیں ملتی۔ لیکن اس کے باوجود اس زمانے کی کئی باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر ہم اُس عہد کے حق میں بھی زبان کھول سکتے ہیں۔ ابتدائی ازمنہ وسطیٰ نے یقیناً قدیم تہذیب و تمدن کو مٹا دیا۔ لیکن آخری ازمنہ وسطیٰ نے احمقوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا جس کی ہستی سے قدیم خیالات اور قدامت پرستی کو بقا حاصل رہی۔ لوگوں کے ذہن اور ضمیر اس بات کے عادی ہو گئے کہ ان تصورات کی خیالی دنیاؤں اور مذہبی عذابوں کے اندیشوں کے ہمدوش رہ سکیں جو حقیقی قابلیتوں کے غلط استعمال کے منت کش تھے۔ چنانچہ جب ہم ان مقررہ خیالات کی موجودگی میں یورپی طلبا کے ان لاطینی گیتوں سے دو چار ہوتے ہیں تو ہمیں بہت حیرانی ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمیں ان گیتوں میں زندگی کا ایک بے باک، تازہ و شگفتہ، قدرتی اور آزاد اندازِ نظر معلوم ہوتا ہے اور یہ اندازِ نظر ہمیں مجبور کر دیتا ہے کہ ہم اس زمانے کے متعلق اپنے مقررہ خیالات سے علیحدہ ہو کر منصفانہ رائے زنی کریں۔ ان گیتوں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں بھی مردوں اور عورتوں کی طبعی تحریکات اور آرزوئیں ویسی ہی زور دار اور گہری تھیں جیسی کہ یونان اور روما کے زمانے میں یا احیائے علوم و فنون کے بعد۔ ہاں ایک بات ہمیں ماننی پڑتی ہے کہ اس زمانے میں ان تحریکاتِ طبعی میں ویسی باقاعدگی اور پختگی نہ تھی۔ اِن جہاں گرد اور خانہ بدوش طلبا کی شاعری اس گروہ کی تخلیق تھی جو مذہبی علم کے طالبوں میں ذیلی درجہ رکھتا ہے اس سے روزمرہ کے انسانی رجحانات کا اظہار ہوتا ہے اور اس وجہ سے یہ شاعری ایک عامیانہ رنگ کی حامل نظر آتی ہے۔ اس سے عوام الناس کی افتادِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس میں کبھی کبھی علم اور مذہب کی گہری جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔

یورپ کے ازمنہ وسطیٰ میں ایک ایسا احیا وجود میں آیا جس کے لئے ابھی مناسب موقع پیدا نہ ہوا تھا۔ اس کا مرکز فرانس تھا اور اس کے عروج کا زمانہ بارھویں صدی کا وسطی اور آخری حصہ تھا۔ نیز لوتھر سے دو صدی پہلے انگلستان میں ایسی مذہبی تحریکات ہوئیں جو مشرقی یورپ پر پھیل گئیں۔ طلبا کے ان گیتوں سے جو بارھویں صدی کی پیداوار ہیں۔ ان دونوں تحریکی کوششوں کا اظہار ہوتا ہے جو لوگوں نے فریبِ نفس سے رہائی پانے کے بعد کیں۔ ان سے لوگوں کے اُن بے روک احساسات کا اظہار ہوتا ہے جن میں ایک ہلکی سی عالمانہ جھلک بھی موجود ہے اور جو تمام ملک میں پھیل چکے تھے۔ ان سے ایک ایسے گروہ کے جذبات کا پتہ چلتا ہے جو اس زمانے میں اپنے خیالات کی وجہ سے یکتا نظر آتا ہے۔ ان سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو زندگی اور نفسی لذتوں سے وہ حظ اندوزی جو زمانۂ احیا کی ایک خصوصیت ہے اور دوسرے روم کی پاپائیت سے جو نفرت جو بعد میں اس کے خلاف بغاوت

اس شاعری کے متعلق ہماری معلومات کے ماخذ دو ہیں۔ ایک نویں صدی کا وہ مسودہ جو بویریا کے بالائی علاقے کی ایک خانقاہ سے برآمد ہوا اور دوسرے وہ مسودہ جو ۱۲۶۴ء سے پیشتر لکھا گیا۔ اور ۱۸۴۷ء میں شائع کیا گیا۔ ان دونوں مسودوں میں بہت سی نظمیں یکساں ہیں۔ لیکن پہلے مسودے میں وہ نظمیں جو احیائے علوم و فنون سے پیشتر لکھی گئیں کثرت سے ہیں اور دوسرے مسودے میں سنجیدہ اور طنزیہ نظمیں زیادہ ہیں۔ ان دونوں مسودوں کے علاوہ فرانسیسی اور جرمن علما کی مختلف تصانیف و تالیفات سے بھی طالب علموں کی اس شاعری کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

ان گیتوں کو پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے مصنفوں کے حالات اور ان کی شاعری کے فنی تجزیہ پر ایک نگاہ ڈال لیں۔

اہلِ روما اپنے علم ادب کے انتہائی ترقی یافتہ اور معیاری زمانے میں بھی شاعری کے لئے عام طور پر قدرتی اور آسان بحریں اختیار کیا کرتے تھے۔ لیکن مشکل اور مقررہ بحریں رومی علما نے یونانیوں کے تتبع میں اختیار کیں۔ اس سلسلے میں حقیقت کچھ بھی ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ جوں جوں پرانے تہذیب و تمدن کو زوال ہوتا گیا، لاطینی نظم نگاری میں مقررہ اور مشکل بحروں کی جگہ موزوں اور لہجے کے لحاظ سے قدرتی اور آسان بحروں نے لے لی۔ کلیساؤں کی مذہبی موسیقی کی وجہ سے نظم نگاری کے نئے طریقے ایجاد ہوئے۔ قوافی کا رواج جاری ہوا، اور کئی اور اختراعات عمل میں آئیں۔ اس طرح شاعری میں ایک وسیع تنوع پیدا ہو گیا اور نغموں میں شگفتگی، لچک اور زورِ بیان کا رنگ آ گیا۔ اس کے علاوہ اگرچہ دسویں صدی سے پہلے کے زمانے کو علوم و فنون کی کمی اور زوال کی وجہ سے

تاریک زمانہ کہا جاتا ہے لیکن اس عہد میں بھی چند کرنیں اس بے باک اور آزاد نور کی دکھائی دے جاتی ہیں جو گزشتہ صنم پرستی اور شرک کے زمانے کی خصوصیت تھا۔ یا جسے موجودہ زمانے کی صاف گوئی کی ابتدائے بعید کہا جا سکتا ہے۔ ساتویں اور دسویں صدی کی شاعری میں اس خیال کو ثابت کرنے کے لئے چند مثالیں موجود ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بھی جب قیامت کے قرب کا وحشتناک اندیشہ لوگوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا تھا وہ شراب وشعر ونغمہ اور ان سب سے بڑھ کر عورت کو بھولے نہیں تھے۔ ان میں تا حال اس بات کی اہلیت تھی کہ وہ دنیاوی مسرتوں سے حظ اندوز ہو سکیں۔

ازمنۂ وسطیٰ کے اوائل کی لاطینی شاعری کی ان مثالوں کے متعلق تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ان کے متعلق محض اشارہ کر دینا ہی کافی ہے کیونکہ بارھویں صدی کے احیائے علوم وفنون اور گزشتہ فنی زوال میں یہی ایک مبہم اور نازک ارتقائی رشتہ ہیں اور یہی سلسلہ آگے چل کر اٹلی کی چودھویں اور پندرھویں صدیوں کی فنی اور علمی بلندی سے جا ملتا ہے۔ اس شاعری کی تین خصوصیتوں کو مختصر طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس شاعری میں قدیم نظم نگاری کی بہ نسبت موسیقی نمایاں طور پر موجود ہے اور اس میں قدیم بحروں کو ان نئے اثرات کے ماتحت زیادہ سریلی یا نغماتی بنا لیا گیا ہے۔ دوسرے عوام کی مذہبی شاعری نے خانقاہوں کی فاضلانہ اور عالمانہ شاعری کو پسِ پشت ڈال دیا اور تیسری قابلِ غور خصوصیت یہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے تاریک ترین عہد میں بھی لامذہبی اور آزاد خیالی کی رنگ آمیزی، پرانے علم الاصنام کی ہلکی ہلکی خوشبو، جلاوطن دیوتاؤں کی سرگوشیوں کی صدائے بازگشت اور ایسی تمام باتیں جو انسان کو اس دنیاوی زندگی کے عیش ومسرت سے محظوظ ہونے پر اکساتی ہیں، یورپ کے طول وعرض سے کلیتہً معدوم نہیں ہوئی تھیں۔

ایک بات اور، اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں لوگ اپنے شاعرانہ جذبات اور احساسات کو لاطینی زبان میں اس لئے ظاہر کرتے تھے کہ ان کی اپنی زبانیں ابھی اس قابل نہ تھیں کہ وہ نزاکتِ خیال کے ہر پہلو کا بار سنبھال سکتیں۔

جہاں گرد طلبا کے یہ گیت عالمانہ شاعری کا نمونہ نہیں ہیں بلکہ انہیں سلاست اور قبول عام کا تمغہ حاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ نغمے ایسے لوگوں کی تخلیق تھے جو متمدن اور مہذب تھے اور کسی نہ کسی قسم کے علم وفن سے متعلق۔۔۔ اور لاطینی زبان کے متعلق اُن کا علم اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انہیں بغیر مبالغے کے علامہ سمجھا جا سکتا ہے لیکن یہ جہاں گرد طلبا تھے کون!
ان کا سرسری ذکر تو یورپ کے علم ادب اور تواریخ میں لیسا اوقات آتا ہے لیکن ان کے بارے میں کوئی بیانات نہیں ملتے۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ جہاں گرد اور خانہ بدوش سے انسان تھے جو علم کی تلاش میں مختلف ممالک یورپ میں پھیلی ہوئی یونیورسٹیوں کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ اپنے اپنے وطن سے دور، بغیر کسی قسم کی ذمہ داریوں کے بغیر دولت کے، بغیر فکر وتردد کے، بے پروا، عشرت پسند، وہ ایک آزاد زندگی بسر کرتے تھے۔ اور منطق یا دینیات کے کسی مسئلے پر بحث کرنے کی بجائے شراب وشعر ونغمہ اور عورت ان کے دلپسند موضوع سخن ہوا کرتے تھے اور اُن کو لکچر کے کمرے کی بہ نسبت کسی میخانے کی زینت بڑھانا زیادہ مرغوب خاطر تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے مختلف ممالک مختلف علوم کے راہ نما تھے۔ اس لئے ایک طالب علم کے لئے مختلف یونیورسٹیوں کا سفر ایک ناگزیر چیز تھا اور صلیبی جنگوں کے بعد سماج کے ہر حلقے میں ایک بے چینی سی چھا گئی تھی، جس کی وجہ سے ہر طرح کے لوگوں میں جہاں گردی کا ذوق ترقی پا چکا تھا نیز تیرتھ یاترا کے لئے تجارت کے لئے، محض تجسس اور شوق علم کے لئے، تجارتی لحاظ سے صنعتی پیشوں کو بلندی پر پہنچانے کے لئے یا مختلف فنون کے محض ذاتی حصول کے لئے اس زمانے میں جہاں گردی کا یہ ذوق جس قدر ترقی حاصل کر چکا تھا اُس کا اندازہ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا علماء نے لگایا تھا۔ بارھویں صدی کا ایک راہب لکھتا ہے۔ "ایک عالم کے لئے ضروری ہے کہ وہ دنیا کا چکر لگائے اور اس کے تمام شہروں میں پہنچے۔ یہاں تک کہ علم جب حد سے بڑھ جائے تو اُسے دیوانہ کر دے۔" گویا جس طرح ایشیا میں مہاتما بدھ کے بھکشو تبلیغی مقاصد کو لئے ہوئے تمام کرۂ ارض کی خاک چھانتے پھرتے تھے اُسی طرح یورپ کے یہ طلبا اور سیّاح ہر ملک کے کونے کونے میں جا پہنچتے تھے۔ لیکن ان سب میں اُن لوگوں کی ایک علیحدہ جماعت تھی جو علم کی چھان بین کے لئے گھر سے نکلتے تھے۔
لیکن مذہبی فرقوں سے متعلق زاہد سیاحوں سے ان کی ایک جدا اور نمایاں حیثیت تھی۔ کیوں کہ یہ لوگ نہ تو کسی مخصوص فرقے سے تعلق رکھتے تھے، نہ انہوں نے کوئی حلف اٹھا رکھا تھا اور نہ ہی یہ کسی قسم کے رسم و روایات کے پابند تھے۔ عام شہریوں سے ان کو نفرت تھی اور ان

سے وہ کسی طرح کی راہ و رسم پسند نہیں کرتے تھے ۔ سپاہیانہ پیشے کے افراد سے اگرچہ انہیں کوئی خاص مخاصمت ہرگز نہ تھی، پھر بھی یہ اُن سے اپنے آپ کو بالاتر ضرور خیال کرتے تھے۔ اگرچہ وہ طبعاً اور ضرورتاً آزاد منش تھے۔ پھر بھی ان کی ہمدردی مذہب کے ساتھ تھی ۔

ازمنہ وسطیٰ میں جس قسم کے رجحانات زندگی کے ہر پہلو پر طاری و ساری تھے، ان کے مطابق یہ طلبا بھی خود بخود ایک جماعت یا فرقہ تصور کئے جانے لگے اور ان کی شاعری سے بھی اگر کسی بات کا سب سے واضح اظہار ہوتا ہے تو وہ یہی جماعتی احساس ہے، جس کی وجہ سے ان میں اخوت اور ایک طرح کا بھائی چارہ پیدا ہو گیا تھا۔

دینی وجوہات اور جبلی حاجتیں جن کے باعث وہ مجبوراً ایک بے ساختگی کے ساتھ افراد سے ایک جماعت کی شکل میں منتقل ہو گئے۔ انہیں کی بنا پر اُن کے لئے ضروری ہوا کہ اپنا کوئی پیر مقرر کریں۔ لیکن چونکہ ان کا گروہ آزاد خیالات کا حامل تھا۔ اس لئے یہ بات لازمی تھی کہ اُن کا سرگروہ بھی آزاد منش ہی ہو۔ اس پیر کی حیثیت حقیقتاً وہی تھی جو مغل زمانہ میں پیر مغاں کی ہوسکتی ہے۔ اس سرگروہ کو وہ گولیاس کے نام سے موسوم کرتے تھے اور خود اُس کے مرید ہونے کے لحاظ سے گولیارڈی کہلاتے تھے۔ گولیاس کا رتبہ باپ اور آقا کے برابر ہوتا تھا اور گولیارڈی یعنی اس کے مرید اُس کے خاندان اس کے بال بچوں اور اس کے شاگردوں کا درجہ رکھتے تھے۔

کیا طلبا کے اس فرقے کی نمو کسی شخص گولیاس نامی سے ہوئی یا خود بخود اس فرقے کے صورت اختیار کر جانے کے بعد پیر کے طور پر گولیاس کا وجود ظاہر ہوا۔ اس سوال کا قطعی جواب اب ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ البتہ ایک بات طے شدہ ہے اور وہ یہ کہ گولیاس یا گولیارڈی کا ماخذ لاطینی زبان کا لفظ "گولا" ہے۔ جس کے معنی چٹورے، پیٹو اور چٹخارے باز کے ہیں اور اگر اس کا ماخذ دیہاتی زبان کا لفظ "گولیار" قرار دیا جائے تو اس صورت میں اس کے معنی دھوکہ باز کے ہو جائیں گے۔ چٹخارے باز اور دھوکے باز ــــ بازی کا تعلق ہر صورت میں ان کے ساتھ رہے گا۔ کیونکہ وہ لوگ منچلے تھے اور زندگی کو سنجیدگی کے ساتھ کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ بہرحال جہاں گرد طلبا کے لئے اس لفظ کا اطلاق ازمنہ وسطیٰ میں عام تھا جس کا پتہ مذہبی دستاویزوں سے چلتا ہے

ان طلبا کی شاعری کو ہمیں اس نظر سے دیکھنا ہوگا گویا وہ ایک مخصوص جماعت کا تخلیقی کارنامہ ہے۔ لیکن تفاصیل اور ہر مصنف یا شاعر کے حال کی عدم موجودگی اور نایابی کے باوجود یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ یہ نغمے بہت سے مختلف شاعروں کا کلام ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی انفرادی حیثیت کا بھی مالک تھا۔ اور یہ بات ان گیتوں کو نظر تنقید سے دیکھنے کے بعد نہایت آسانی سے پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔

مذہبی دستاویزوں کے مطالعے سے ایسا بات ظاہر ہوتی ہے کہ عوام کی نگاہوں میں ان طلبا کا وہی درجہ تھا جو مسخروں اور آوارہ گرد بھاٹوں کا۔ کیونکہ آوارہ گرد بھاٹ اور جہاں گرد طلبا ـــ ان دونوں جماعتوں کا ازمنہ وسطیٰ کے معاشری نظام میں یکساں رتبہ تھا۔ دونوں کا کام اُن لوگوں کی تفریح طبع کا سامان مہیا کرنا تھا جن کا درجہ دنیوی لحاظ سے ان سے بالاتر تھا۔ مستثنیات کے علاوہ دونوں جماعتوں کے افراد کا کوئی مقررہ مسکن و مامن نہیں ہوتا تھا۔

ان تمام نغموں میں شاعر کی شخصیت ہمیشہ روپوش ہو کر معدوم ہو جاتی ہے۔ شاعر کے انفرادی نام کی بجائے صرف انفرادی انداز بیان باقی رہ جاتا ہے۔ اور نظم یا گیت گولیاس یا سرگروہ کی زبان سے ادا ہوتے ہوئے گویا جماعتی احساسات کا ترجمان بن جاتا ہے۔ مقبول عام ادب کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ فرد، جماعت میں گھل مل جائے۔ کیونکہ وہ جذبات اور خیالات جو مقبول عام شاعری کا موضوع ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ ذاتی ہونے کی بجائے جماعتی ہوتا ہے۔ وہ جذبات ایسے ہوتے ہیں کہ یکساں ہمدردی اور ذہانت کی بنا پر تمام دنیا انہیں محسوس کر کے شاعر کے طرز نگارش کو اپنا سمجھتے ہوئے اختیار کر لیتی ہے اور اس سلسلے میں اگر کوئی رکاوٹ ہوتی ہے تو وہ صرف اتنی کہ ان کی عالمگیر مطابقت میں وقتی اور سماجی صورت حالات ایک معمولی سی خلیج پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے دیہاتی گیتوں سے کسانوں کی زندگی اور شہری زندگی کا تضاد ظاہر ہوتا ہے ویسے ہی طلبا کے ان گیتوں سے بھی آوارہ گردی کی زندگی کے تعصبات اور دیگر خصوصیات منکشف ہیں ان گیتوں میں نمائی جذبہ صحیح اور سچا ہوتا ہے، احساس کے ساتھ غیر منصفانہ انداز نظر نہیں برتا جاتا، اور ان میں ہر جگہ حقیقت کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان میں وہ ذاتی اور شخصی پکار معدوم ہوتی ہے جو شاعرانہ تخلیق میں ایک خاص ہمدردی اور گہرائی پیدا کر دیتی

ہے۔ کیونکہ ان نغموں کو تیار کرتے ہوئے ایک شخص ہزارہا انسانوں کا ترجمان بن جاتا ہے۔ دیہاتی گیتوں کی طرح ان نغموں میں عالمگیر احساس کی وجہ سے شخصی خصائص ضائع ہو جاتی ہیں۔ وہ دلچسپی جس کا تعلق مخصوص حالات سے ہوتا ہے ان نغموں کی انسانی طبیعت سے وسیع مطابقت کی بھینٹ ہو جاتی ہے۔ ایسا نغمہ ہر اُس شخص کو اپنا نغمہ معلوم ہوتا ہے جو رنج و اندوہ کی حالت میں ہو یا کسی کو چاہتا ہو یا کسی پر فتح حاصل کر چکا ہو۔ ان نغموں سے سب دنیا کو چھوڑ کر کسی ایک انسان کے غم، محبت اور جیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ ان میں اُن ان گنت انسانی زندگیوں کے احساسات و تاثرات موجود ہوتے ہیں جو نسلاً در نسلاً مختلف زمانوں میں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ ان میں ایسے فرق نہیں ہوتے جو یہ کہنے پر مجبور کر دیں کہ انسانی جذبات کی یکسانی کے باوجود میر، غالب اور داغ کے نغماتِ محبت ایک نہیں ہیں۔ ان میں مختلف فنکارانہ اثر کم ہوتا ہے اور پائیدار انسانی خصوصیت زیادہ اس قسم کا ہر نغمہ تخلیق کے بعد عوام کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ ملک کے اطراف و جوانب میں گھومتا پھرتا ہے۔ سینہ بسینہ اور زبان بہ زبان اس نغمے کا سفر جاری رہتا ہے کہیں پہنچ کر وہ خود کو ضائع کر دیتا ہے اور نئے نغمے پیدا کرتا ہے کہیں پہلے موجود نغمے کو معدوم کر کے اس کی جگہہ خود لے لیتا ہے۔ کبھی اسے کانٹ چھانٹ کے باعث اصلی ہیئت سے دور کا تعلق بھی نہیں رہتا کبھی اس میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے کی وجہ سے اسے ایک بہتر یا بدتر مگر بہرحال نئی شکل مل جاتی ہے۔ کہیں یہ مختلف مقاصد کو پورا کرنے کے لئے گھٹایا بڑھایا جاتا ہے۔ مقبول عام شاعری کا ہر زمانے اور ہر ملک میں یہی حال ہوتا ہے اور مذکورہ خصوصیات ایسی شاعری میں ہمیشہ نمایاں ہوتی ہیں۔ ان کے بیان کی ضرورت یہاں اس لئے درپیش آئی کہ طلبا کے ان گیتوں میں یکساں جذبات و احساسات اور خیالات، یکساں اندازِ نظر اور طرزِ بیان بلکہ بعض اوقات یکساں مصرعوں پر حیرانی محسوس نہ کی جائے چنانچہ اسی وجہ سے ہم شاعروں کی شخصیت کا مسئلہ بحث سے منسوخ کئے دیتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مقبول عام ادب اور شاعری میں اس بات کی کوئی خاص اہمیت ہی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہم ان گیتوں کے مصنفوں کی قومیت کا مسئلہ بھی معرض بحث میں نہیں لاتے۔ کیونکہ اطالیہ، انگلستان، فرانس اور جرمنی تمام ملک ان کے مصنفین کا اپنے سے وابستہ ہونے کا دعوٰے کرتے ہیں اور اصل بات بھی یہ ہے کہ ان طلبا میں ہر ملک اور قوم کے افراد ہوتے تھے۔ اس لئے قدرتاً ان نغموں کے شاعر بھی یورپ کے ہر ملک اور ہر قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اور چونکہ ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کی ہمہ گیر زبان لاطینی تھی اس لئے یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ کون سی نظم یا گیت کون سے ملک یا قوم کے شاعر کی تخلیق تھا۔ البتہ یہاں مشہور انگریزی عالم جے۔ اے۔ سائمنڈز کی رائے بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ نغمے زیادہ تر جنوب مغربی جرمنی اور بویریا سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ گیت جو بہاریہ اور عشقیہ ہیں۔ ان کی شدتِ احساس سے ظاہر ہے کہ وہ جرمن رشتے میں منسلک ہیں۔ وہ گیت جن سے انگریزی سیاسی رجحانات کا اظہار ہوتا ہے۔ انگلستان سے متعلق کہے جا سکتے ہیں۔ وہ گیت جن کو ایک فرانسیسی شاعر سے منسوب تسلیم کر لیا گیا ہے اور وہ گیت جن میں ٹیپ کے مصرعے فرانسیسی ہیں، فرانس سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ گیت جن میں زیتون اور صنوبر کے درختوں کا ذکر ہے انہیں اطالوی شعرا سے نہیں تو اطالوی اثرات اور حالات سے نسبت دی جا سکتی ہے۔

ان گیتوں کی ہیئت اور بیان کے متعلق دو باتیں کہی جا سکتی ہیں پہلی یہ کہ ان میں سے اکثر کی بحریں مذہبی نظموں اور مناجاتوں کے ڈھب پر مقرر کی گئی ہیں۔ اور ان کا اندازِ بیان مذہبی شاعری کا سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور مناجاتوں کے تتبع میں لکھی ہوئی نظمیں اور تضمینیں زیادہ ہیں لیکن ایسی تمام نظمیں طنزیہ یا ہجائیہ ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو گیت مقبولِ عام مناجاتوں کے ڈھب پر تیار نہیں کئے گئے وہ نغماتی ضرورت کے لحاظ سے لکھے گئے ہیں اور ان کی ہیئت کئی بار بہت پیچیدہ سی ہو جاتی ہے۔ اُن کے مصرعوں کی لمبان مختلف اور اُن میں کبھی سادہ اور کبھی دوہرے قوافی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی بغیر قوافی کے بھی کام چلالیا جاتا ہے۔

ان گیتوں کو موضوع کے لحاظ سے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے حصے میں ایسی نظمیں ہیں جن کے موضوع ان طلبا کی آوارہ، کھلنڈری اور منچلی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہار کے موسم کی باتیں، دیہات کی کھلی فضا کی مسرتیں، عشق و محبت کے مختلف پہلو، مختلف قسم کی عورتوں کا ذکر و بیان اور شراب اور قمار بازی۔ یہ تمام چیزیں اس حصے کی زینت ہیں۔ دوسرے حصے میں زیادہ سنجیدہ باتوں کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ اس میں سماج پر طنزیہ نظمیں خصوصاً روم کے دربار کی ہجویں، ہر ملک کے مذہبی پیشواؤں کی زندگی پر نقد و نظر، اخلاقی غور و تفکر، اور انسانی زندگی کے اختصار کے متعلق خیال آرائی

موجود ہے۔ ان دونوں حصوں میں پہلا حصہ ایسا ہے جس سے ان شعرا کے متعلق زیادہ شگفتہ اور واضح تصور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے حصے کی نظمیں عموماً ایسے لہجے کی حامل ہوتی ہیں جس سے اُس زمانے کے راہبوں کی پند و نصائح والی خشک نظم نگاری کا رنگ ظاہر ہے۔ البتہ اس کے مقابلے میں ان سنجیدہ نظموں میں بے باکی اور خلوص نسبتاً زیادہ اور نمایاں تر ہے۔ کیونکہ ان طلبا کی زندگی سماج اور سماجی اصولوں سے علیحدہ اور آزاد تھی۔ اس لئے وہ طنزیہ نظموں اور ہجووں میں زیادہ تلخ طریقے پر وقتی عیوب کا جائزہ لیتے ہیں۔

طلبا کی اس شاعری میں قدرت اور مناظر قدرت کو بہت دخل ہے۔ ان کے نغماتِ محبت کی فضائے بعید اور ماحول ہمیشہ ان جنگلوں اور کھیتوں میں ہوتا ہے جن پر بہار نے اپنا اثر پھیلا رکھا ہے۔ ہر طرف پھول کھلے ہیں، اُن کی ایک کثرت اور بہتات ہے۔ سریلی صداؤں والی ندیاں بہ رہی ہیں۔ لیمو، صنوبر اور زیتون کے پیڑ کھڑے ہیں۔ جن کی ٹہنیوں اور پتوں سے ہوائیں سرسراتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ گلشن ہیں اور بلبلیں، اور نرم و نازک قدموں والے غزال جنگل کی منو ہر پریاں اور بن دیوتا رقصاں و لرزاں، سبزہ زاروں پر محو خرام ہیں اور اس منظر میں فانی دوشیزاؤں کے جھرمٹ گیت گاتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں ـــــ ان مناظر کا بیان اُن کے ذاتی تجربے اور احساس کے جوش و شدت پر مبنی ہوتا ہے۔ ان سے تر و تازہ اور صحت ور ہوا کی خوشبو آتی ہے۔ ان سے اس مسافرانہ زندگی اور عشرتِ سرا ہے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اُن طلبا کا شعار ہے جن کی عمر ایک قدرتی بہاؤ میں فطرت کے عین مطابق بہی چلی جاتی ہے۔ اس شاعری کو گرہست آشرم کے کسی پہلو سے تعلق نہیں ہے اور دنیوی باتوں کا ذکر اگر کہیں ہے بھی تو اتنا طفلانہ اور نازک اور سادگی سے پُر ہے کہ ہم ان شعرا کی عمومیت پسندی سے درگزر کر جاتے ہیں۔

پریتم اور پریمی رہائی کٹھن منزلوں کے دُکھ درد سہنے کے بعد آپس میں ملے ہیں، گاؤں کے لوگ رقص کی تقریب میں اکٹھے ہوئے ہیں، پریمی پریتم کو لگاتار دیکھے جا رہا ہے، پریمی کو وطن سے دور وطن کی یاد ستاتی ہے۔ طالب علم اور دیہاتی دوشیزہ کا افسانہ محبت جاری ہے اور یا کبھی کبھی ـــــ پریمی ہے، غمگین، دکھی اور وہ اس لئے کہ اس کی پریتم نے پریم کے بندھن توڑ کر کسی اور خوش قسمت سے رشتہ جوڑ لیا ہے ـــــ یہی اداکار ہیں اور ایسی اداکاری جس کا ذکر ان گیتوں میں آتا ہے۔ ہر وہ خصوصیت جو طبع انسانی سے تعلق رکھتی ہے۔ ان گیتوں کے تغزل کی پکار کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہے۔

اس شاعری میں جس محبت کا ذکر کیا گیا ہے وہ دوستانہ یا جانبازانہ محبت نہیں ہے۔ اخلاقی نظریوں کے تنگ دل حامی اگر ان میں کسی نام نہاد "پاک محبت" کی تلاش کریں تو وہ بیکار ہے۔ ان نغموں میں محبت ایک طبعی تحریک، ایک جبلی حاجت اور ایک نفسی کیفیت کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس محبت کو ہم بے باک اور آزاد محبت کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ان گیتوں سے نظم کے اداکاروں یعنی شاعر اور محبوب یا مرد اور عورت کی سیرتوں یا اخلاقی خصوصیتوں کے متعلق کوئی بات ہمیں معلوم نہیں ہو سکتی۔ بس یہی سمجھ لیجئے کہ اس پریم ناٹک کے دو مقررہ کردار ہیں، طالب علم شاعر اور کوئی عورت خواہ اس کا نام فلیس ہو یا فلورا، لیڈیہ ہو یا سیسلیہ ـــــ یہ فرق صرف ظاہری ہوگا۔ اس کی سیرت ہر صورت میں یکساں ہوگی۔ محبوب کے نام کے متعلق تو فیصلہ ہو گیا۔ لیکن شاعر ان گیتوں میں ہمیشہ گمنام ہوتا ہے اور پریمی کا نام ہو بھی کیا، سوائے اس کے کہ پریمی؛ یہی نام کافی ہے اور اس کے علاوہ اُس کے جذبات کی شدت ہی اس کی انفرادیت کی نمایندگی کے لئے کافی ہے

مے نوشی اور میخواری کے مختلف پہلوؤں کے متعلق جو گیت ہمارے پیش نظر تھے۔ اُن میں سے صرف ایک ہی لیا گیا ہے اور وہ اس لئے کہ اس میں بہت سی فن کارانہ خوبیاں یک جا ہو گئی ہیں۔

اور اب لیجئے گیت لیکن گیتوں سے پہلے ایک بات واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ترجمے میں مطالب کی ہمنوائی کے ساتھ ساتھ اس بات کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ اصل کی روح بھی ضائع ہونے نہ پائے۔ اس لئے اس سلسلے میں یہ احتیاط رکھی گئی ہے کہ مقامی اور ملکی خصوصیات کو مترادف ہندوستانی لباس میں ڈھال لیا ہے۔ مثال کے طور پر ساون، بسنت اور بہار، تینوں الفاظ بہار کے موسم کا اظہار کرتے ہیں یا سرما کو اس کی بیزارکن کیفیات کی وجہ سے خزاں ہی کہا گیا ہے۔ نیز اکثر گیتوں کی سرخیاں خود تجویز کی گئی ہیں۔ چنانچہ پہلے گیت کی سرخی اگرچہ "نشہ میلی محبت" ہے لیکن شاعر کو اس سے اپنے عشقیہ جذبات دکھانا مقصود نہیں ہیں۔ بلکہ وہ بہار کے موسم کی جنون انگیزی کو میر تقی کے اس

شعر کے مطابق پیش کر رہا ہے کہ ؎

دھوم ہے پھر بہار آنے کی،
کچھ کرو فکر مجھ دیوانے کی!

(۱)

شرمیلی محبت

بسنت رُت کی شوبھا دیکھو، پھولی سب پھلواری،
پیارے پیارے دن ہیں سارے، راتیں بھی ہیں پیاری!
سجی ہوئی ہے سندرتا سے موہن دھرتی ساری،
بیت گئیں پت جھڑ کی گھڑیاں، اب ہے سکھ کی باری!
لیکن پریم کا گھاؤ ہے میرے من میں پریتم پیاری!
رہ رہ کر اک درد ہے اٹھتا، آنسو بھی ہیں جاری!
کیسے دُکھ سے پیچھا چھوٹے، آئے سکھ کی باری؟
جب تک تو من جانے نہ مجھ سے کیسے مٹے دکھ بھاری؟
دیا کرو، ہاں، دیا کرو، اب آکر مجھے سنبھالو،
اپنے ننھے پیارے دل کو میرے دل میں پالو،
اپنے پریم کے رنگ میں میرے پریم کا رنگ ملا لو؛
پریم پجارن بن کر یوں جیون کے انت کو پالو!

دوسرا گیت خالص بہاریہ چیز ہے!

(۲)

آمدِ بہار

لو، آگیا ہے لوٹ کے موسم بہار کا،
راحت سے درد مٹ گیا قلبِ فگار کا۔
غم گیں خیال دور ہوئے کھو گئے تمام،؟
احساس اب نہیں ہے کسی اضطرار کا!
زرّیں شعاعِ مہر نے پھیلا دیا ہے نور!
منظر ہرا بھرا ہے ہر اک سبزہ زار کا!
دورِ خزاں کو آج ہوئی ہے شکستِ فاش،
نیزہ لگا ہے دل میں بہاریں سوار کا۔
اب ابرِ غم فضا میں کہیں بھی نہیں رہا۔

ہر دل پہ کیف چھا گیا ہلکے خمار کا!

اور اب ذرا چہل پہل شروع ہوتی ہے۔ والہانہ سرگرمیوں کا دور جاری ہوتا ہے۔

(۳)

دعوتِ عمل

صحیفوں کو اٹھا ڈالو، تفکر کو بھلا ڈالو،
کہیں نادانیاں شیریں، جنوں سامانیاں شیریں،
بہار آئی ہے — آئی ہے، مسرّت ساتھ لائی ہے!
اب آغازِ جوانی ہے، محبت کی کہانی ہے!
تفکر کام پیری کا، تفکر نام پیری کا!
جوانی اور آزادی، سُبک بادِ صبا ایسی
جوانی ایک سپنا ہے، یہ بس دو پل کو اپنا ہے!
صحیفوں کو اٹھا دو تم۔ تفکر کو بھلا دو تم!
جوانی پھر نہ آئے گی جوانی آہ! فانی ہے!
مسرّت منہ چھپائے گی یہ اک شب کی کہانی ہے
جوانی کو نہ یوں کچلو، نہ اِن پھولوں کو یوں مسلو،
صحیفوں کو اٹھا دو اب
تفکر کو بھلا دو اب

اس گیت میں مطالعہ اور کتب بینی سے بیزاری اور طالب علمانہ بے نیازی بھی موجود تھی۔ اب ہم ذرا جرأت سے کام لیتے ہوئے آگے قدم بڑھاتے ہیں۔

(۴)

خلوت

چار سو چھائی خزاں، چلتی ہے سرما کی ہوا،
برگ پژمردہ گرے جاتے ہیں پیڑوں سے تمام!
اب تو خاموشی ہے، خاموش پرندے سارے!
جب تک اس دہر پہ طاری تھا بہاروں کا سماں،
آنکھ کے واسطے گلزار کھلے تھے ہر سو!
لیکن انسان کے غم کی تو حقیقت ہی نہیں،
اس سے سو درجہ زیادہ ہے پرندوں کا الم،

ان کے دل کو نہ ہوئی، اور نہ ہوگی تسکیں،
میرے دل کا ہے مگر آج جدا ہی عالم۔
ہاں، مرے دل کو کوئی غم ہی نہیں، غم کیوں ہو،
جب مرے پہلو میں وہ ہستی پُرافسوں ہو،
آج وہ مان گئی، مان گئی بات مری!
آج تو دن ہے مرا۔ دن ہے مرا۔ رات مری!
آج تو جیت ہی لی پریم کی بازی میں نے!
آخر کار کیا ہے اُسے راضی میں نے!
اُس کی چتون میں تبسم ہے ہمیشہ قائم!
شوخی و عشوہ گری کام ہے اس کا دائم!
سانس میں کیف ہے، اور آنکھ میں اک نور بھی ہے،
نرم سے سینے میں اس کا دلِ مخمور بھی ہے!
وہ مجھے دیکھتی ہے، دیکھتی جاتی ہے مجھے!
اور ہر لمحے میں دیوانہ بناتی ہے مجھے!
آہ! روکے کوئی۔ روکے کوئی میری ہستی!
اس نے تحلیل ہی کر ڈالی ہے میری ہستی!
ایک بوسے میں مری روح کا رس چوس لیا!
ایک بوسے میں مجھے بے خود و بے ہوش کیا!
اس سے بڑھ کر ہے بھلا کھیل کوئی من بھاتا؟
دل پہ قابو ہی نہیں، دل ہے یہ نغمہ گاتا
آہ! لو، مان گئی آج وہ باتیں میری!
اب تو دن میرے ہیں۔ دن میرے ہیں، راتیں میری!

جرأت سے کام لیتے ہوئے قدم تو بڑھایا تھا۔ لیکن "ایک بوسے" کے پردے میں ہی بات کو چھپا گئے! اب ہم ان واضح باتوں کو چھوڑ کر دو لمحوں کے لئے شاعر کی ذہنی الجھنوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(۵)

محبت کے شبہے

کیا ہے وعدہ جو اُس نے، وہ شیریں ہے،
مرے بے چین دل کو وجۂ تسکیں ہے!
اسی وعدے سے دل میں گرمیاں پیدا ہوئی ہیں اک تمنا کی!
امیدیں مجھ سے کہتی ہیں کہ آئے گی،
کرے گی آج وہ اقرار کو پورا،۔۔۔ تسلی رکھ!
مگر شک لوٹ آتے ہیں۔
مرے دل کو ستاتے ہیں،
کہ شاید تیری امیدیں نہ بر آئیں،
کوئی بے رحم لمحہ پھول کو دل کے کچل ڈالے!
اچانک ٹوٹ جائے رشتۂ امید ہی سارا!
بس اک ہے، ایک ہے مرکز خیالوں کا،
کہ جیسے اک ستارا ہو فلک پر۔ دور۔ وسعت میں!
ہیں اس کے ہونٹ مدھ والے،
ملائم پھول کی پتی سے، اور میٹھے!
تبسم میرے ہونٹوں پر بھی آتا ہے۔ اسی کی مسکراہٹ سے!
اور اس کی آرزوئے عشق دل میں آگ بھر دیتی ہے اک پل میں!
جب عشقِ آتشیں سے جامِ دل لبریز ہو جائے،
تو پھر درد و اذیت کی تھکن سے روحِ انسانی،
تنزل گیر ہوتی ہے!
دلِ عاشق کو ہلاک آرزوئے عشق تڑپاتی ہے فرقت میں،
یوں ہی میں بھی شکوکِ تلخ کا مظلوم ہوں ہمدم!
کوئی دکھ اس سے بڑھ کر اس جہاں میں ہو نہیں سکتا!
میں عشقِ بدگماں کے آتشیں طوفاں میں جلتا ہوں۔ جلتا ہوں،
ذرا دیکھو، کہ یوں بیکار بیتے جا رہے ہیں مختصر لمحے!
بس اب ہے اک ذریعہ زندگی کا۔ میں جو پیتا ہوں،
شرابِ آتشیں جامِ محبت سے!

اور اب ایک گیت ایسا جس سے نہ صرف اُن طلبا کی مسافرانہ زندگی کی جھلک معلوم ہوتی ہے بلکہ اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ آزاد، بے باک اور لاپرواہ مفکر شراب اور عورت کے علاوہ مناظرِ قدرت سے خط اندوز ہونے کی اہلیت بھی رکھتے تھے۔

(۶)

سُونا موسم

چپکے چپکے جنگل،

جن کی ہوائیں اب کب تھر کے اس پنچھی کا راگ،
جو ساون میں کہتا تھا "جاگ، نیند کو تیاگ"
روتے روتے جنگل،
سرو و صنوبر اونگھ رہے ہیں، تھک کر ہیں ہلکان!
پہلی بات مٹی ہے ایسی، گویا ہیں بے جان!
پت جھڑ والے جنگل،
کیسا غم ہے! پت جھڑ فانی، ساون ہے کیا دُور!
جلد آئے گا پھر وہ سماں بھی، سب ہوں گے مسرور!
خوشیوں والے جنگل!
اور اب ایک مختصر سا نغمہ فرقت کا ہے۔

(۷)

ناکام

"تلخیِ ایام کو نغموں میں کھو دیتا ہوں میں،
درد بڑھتا ہے اگر حد سے، تو رو دیتا ہوں میں!
ہنس اپنے آخری لمحوں میں جیسے گائے گیت،
موجِ موسیقی میں یوں غم کو ڈبو دیتا ہوں میں!
میرے چہرے پر نہیں باقی جوانی کی بہار!
اشتیاقِ آرزو سے دل ہے پژمردہ، فگار!
ہر گھڑی رنج والم بڑھتے ہی جاتے ہیں مرے،
شمع بجھتے ہی فضا ہو جائے گی تاریک و تار!
آہ! لو، مرنے کو ہوں، مرنے کو ہوں ناشاد میں!
ہو گیا برباد میں، لو، ہو چکا برباد میں!
عشق ہے فطرت مری، اتنی ہے مجبوری مجھے،
اُس کی چاہت دل میں ہے جس کو نہیں ہوں یاد میں!
اور اب ذرا نفسیات کی پیچیدگیوں کو نغمے کے رنگوں میں سلجھایا جائے

(۸)

انکارِ محبت

گوری پیت کرے پر بولے "کون آنسو کے موتی رولے؟"
"پیت نہیں ہے میرا کام"
دل کا بھید چھپائے دل میں، جیسے لیلیٰ ہو محمل میں
لیکن انگ انگ یوں بولے سوئے پیت کی نیندیں سولے"
"پی کر مدھ مستی کا جام"
اتنی ضدی اور کٹھور! یوں انجانی جیسے ڈر!
لیکن دل پی ہو، سے خالی انگ انگ جوں ڈالی ڈالی!
ہلتی، جھومتی اور لہراتی! نامعلوم سے نغمے گاتی!
بات کرے تو کھوئی ہوئی سی آنکھیں جیسے سوئی ہوئی سی
آنکھوں پر حلقے چھائے ہیں پتلی پتلی کالی دھاری!
چاند میں دو اور دو ہالے ہیں روپ کی راتیں ہیں اجیاری!
پیلے پیلے بے رس گال! ہلکی، سوچتی سوچتی چال!
ٹھنڈی آہیں چغلی کھائیں! دل کا سارا بھید بتائیں!
چھوٹی چھوٹی سانس ہے کیسی! کیوں دل کی دھڑکن ہے ایسی!
کام دیو! آؤ، آ جاؤ! آؤ، تیر پہ تیر چلاؤ!
پیت کا اُلٹی چال بچھاؤ، ایسی بھڑکتی آگ لگاؤ،
منہ سے بول اٹھے بے چاری
"ہاں، تم جیتے اور میں ہاری!"
اب ذرا ایک ہلکی پھلکی سی سادہ چیز!

(۹)

پیت کا گیت

گاؤ، گاؤ، پیت کے گیت
جن سے من کو ہو آرام!
آج مرے کومل من میں۔
دُکھ کا نہیں ذرا بھی نام!
خوشی، محبت اور ہنسی،
آج بنے ہیں میرے میت!
آج مرا من شادان ہے،
گاؤ، گاؤ، پریت کے گیت!
گاؤ، گاؤ پیت کے گیت،
جیون سُکھ ہی سُکھ ہے سارا!
ساون آیا اور چلی۔

من کی ندی پریم کا دھارا!
آخر اس دل کی بر آئی،
آج ہوئی ہے اپنی جیت!
جیت ہوئی ہے آج ہماری
گاؤ، گاؤ، پیت کے گیت!

اور اب ذرا اِن موسم اور محبت کے نغموں سے ہٹ کر "رکھ دیجئے پیمانہ صہبا مرے آگے"۔ لیکن واضح رہے کہ اس گیت میں رجے گیت کی بجائے نظم کہنا موزوں تر ہوگا) مقبول عام شاعری کی وہ عمومیت نہیں جو طلبا کے گیتوں کی عام خصوصیت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مطالعے اور علم وفن سے شغف کی وجہ سے وہ کبھی کبھی ایسی تخلیق بھی کر جاتے تھے جسے ہم بہتر شاعری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

(۱۰)

مے خانہ

حیاتِ گرم رَو ساکن ہے، ساکن زندگی ساری!
چمکتی ہیں شعاعیں روشنی کی سطحِ مینا پر!
شرابِ آتشیں مینا میں ساکن ہے!
ہیں ساکن دست و بازو مے کے متوالوں کے مستی میں!
پھلوں کا رس نکل کر، چھوڑ کر گہوارۂ طفلی
ہوا ہے منجمد ذہنوں کی لہروں میں!
در و دیوار ساکن ہیں،
ہیں آوارہ ہوائیں ساکن و معدوم سی ہستی!
غم و اذکار ساکن ہیں!
نشاط و عیش کی ہستی نہیں باقی!
ہر اک انسان کے جذبے۔
عدم سے جا ملے ہیں چند لمحوں کے لئے اور یوں
فضائے نائے و ہو یکسر،
بنی ہے مرمریں منظر،
اکیلا ایک ساغر ساکن عہد فراموشی!
شرابِ آتشیں مینا میں ساکن ہے!
حیاتِ گرم رو ساکن ہے، ساکن زندگی ساری!

ایک مکمل تصویر ہے اور شاید شاعر نے مصور کے رنگوں کی بہ نسبت اُسے زیادہ چابکدستی سے الفاظ کے جال میں گرفتار کیا ہے۔

میراجی

رباعی

مانا کہ ہے جن سے فسانہ غمناک اپنا
مانا کہ ہے آلِ عبث دو مٹھی خاک اپنا
کیوں کھینچئے اس رنج میں وحشت بیباک
کیوں چھوڑئیے معشوق و مے و سایۂ تاک اپنا

سعید احمد اعجاز

کوئل سے

(۱)

دیارِ غم

مغنیٔ دیارِ غم

کہاں سے پھر ہوئی بلند تری صدائے دردمند

جمود پاش بےقرار

الم فزا طرب فگار

جگر گداز کیف بار

حسینہ سیاہ پوش نہ بن حریفِ عقل و ہوش

خموش سازِ غم خموش خموش سوزِ دل فروش

مغنیٔ دیارِ غم

نہ جان کر نثارِ غم

(۲)

نثارِ غم

نہ جان کر نثارِ غم

گھٹا ہے دیکھ چھا رہی مسرتیں لٹا رہی

جہاں ہے لالہ زار دیکھ

چمن ہے زرنگار دیکھ

ہرا ہے کوہسار دیکھ

نشاط زا بہار ہیں حسین مرغزار ہیں

ہوائے مشکبار ہیں فضائے سحر کار ہیں

نہ جان کر نثارِ غم

نہ ہو عبث شکارِ غم

(۳)

شکارِ غم

نہ ہو عبث شکارِ غم

وفا خراب نازنیں وفا ہے مارِ آستیں

وفا ہے عشق کا گناہ

وفا ہے دردِ بے پناہ

وفا ہے غم وفا ہے آہ

نہ چاہ غم نواز کو نیاز مندِ ناز کو

وفا سی حیلہ ساز کو نہ چاہ عشق باز کو

نہ ہو عبث شکارِ غم

اجاڑ دے بہارِ غم

(۴)

بہارِ غم

اجاڑ دے بہارِ غم

نہ کر شکایت جہاں یہی ہے رسمِ آسماں

خوشی کا چھیڑ کوئی راگ

ملا نہ جوگ میں بہاگ

تیاگ درد کو تیاگ

نہ کوک بدنصیبِ غم نہ اور بن حبیبِ غم

سنا نہ اے نقیبِ غم فسانۂ مہیبِ غم

اجاڑ دے بہارِ غم

مغنیٔ دیارِ غم

قیوم نظر

نوائے سرمدی

کیفِ جمال و دید میں عالمِ انتظار دیکھ
بزمِ طرب میں گردشِ نرگسِ پُرخمار دیکھ

شمِ سیاہ کار دیکھ گردشِ روزگار دیکھ
کیفِ جمالِ یار میں دردِ فراقِ یار دیکھ

ابِ نظر کی فکر کیا ذوقِ نظر کا ذکر کیا
جلوۂ بے قرار دیکھ تابشِ بار بار دیکھ

برِ حجابِ ناز میں کوندرہی ہیں بجلیاں
تیرے سکونِ دل کی خیر عشوۂ شرمسار دیکھ

لاکھ قیامتیں نثار ایک اس انقلاب پر
عالمِ عشق بدگماں رنگِ نگاہِ یار دیکھ

بند سی آچلی ہے کچھ ہر دلِ بے قرار کو
دیکھ یہ رنگِ بے خودی گیسوئے تابدار دیکھ

س کا پیام زیرِ لب باعثِ کائنات تھا
اس کی نظر کی زد پہ آج عالمِ اعتبار دیکھ

ام بہار سے خزاں لوٹتی تا بہ کے چمن
آج خزاں کے نام سے آتی ہوئی بہار دیکھ

شق کی پہلی زندگی عشق کے پہلے سوز و درد
بھول۔ مگر ندامتِ حسنِ وفا شعار دیکھ

گے نگاہِ شوق سے اب تو ہے کاروانِ دل
منزلِ یار کے قریب اٹھتا ہوا غبار دیکھ

سازِ نوائے راز ہے معنیٔ رنگ و بوئے گل
برقِ جمالِ یار میں سوزِ فراقِ یار دیکھ

ور وہ جلوہ گاہ ہے عالمِ وصل و ہجر سے
یا وہ جمالِ دل فروز یا غمِ روزگار دیکھ

رازِ غمِ فراق کا اس سے کھلے گا کیا مگر
دیکھ سکوتِ بے خودی دردبھری پکار دیکھ

فراق گورکھپوری

رازِ دلگداز

نالہ و شیون کو محرومِ اثر پاتا ہوں میں
اک تصوّر ہے جسے کچھ چارہ گر پاتا ہوں میں

شورشِ غم جب بدلتی ہے تصوّر کا نظام
بیشتر کھوتا ہوں تجھ کو بیشتر پاتا ہوں میں

گرچہ مجھ کو تیرے دامن میں نہیں ملتی پناہ
تجھ کو لیکن زیبِ آغوشِ نظر پاتا ہوں میں

رات ہو، دن ہو، گھٹائیں ہوں، خزاں ہو یا بہار
تیری جانب دل کو مصروفِ سفر پاتا ہوں میں

آہ تو اور حلقۂ سود و زیانِ دو جہاں
دو جہاں کو حلقۂ بیرونِ در پاتا ہوں میں

مل گیا سب کچھ ترے الطافِ بے تکمیل سے
سینکڑوں جلووں کو فرشِ رہگزر پاتا ہوں میں

کاش ان خوابوں کو ہو خوابِ ابد بننا نصیب
آنکھ لگتے ہی ترے قدموں پہ سر پاتا ہوں میں

تجھ کو مجھ سے سینکڑوں تجھ سا کہاں مجھ کو نصیب
اپنی خوبی کو ترا حسنِ نظر پاتا ہوں میں

احسانِ دانش

تماشاگاہِ عالم

را جلوہ ڈوبتے سورج میں شرمایا ہوا — تیرا نغمہ موجۂ مضطر میں تھرّایا ہوا

لہاتی کھیتیوں میں سرسراتی ہے ہوا — یا زمیں والوں کو سمجھاتی ہے کچھ تیری صدا

ھر طوفاں خیز میں اٹھتی ہوئی لہروں کا شور — یاد کھاتا ہے تو اپنی عظمت و قدرت کا زور

نچے اونچے کوہساروں میں ہیں یہ چشمے رواں — پتھروں سے یا تری رحمت کے ابھرے ہیں نشاں

طلوعِ صبح کے آثار آتے ہیں نظر — یا دعاؤں کے لئے وا ہیں فلک کے بام و در

دھندلکے سے افق کی دھار پر چھائے ہوئے — یہ لحد کے روزنوں میں پھول مرجھائے ہوئے

نگ کے میداں میں بسمل کی صدائے درگلو — میکدوں میں مست و بےخود ساقیانِ ماہ رو

نعموں کی عیش گاہوں میں ہر اک شے پر نکھار — مفلسوں کے جسمِ لاغر پر گلیم تار تار

ایک جانب شوکت و قوت کی چیرہ دستیاں — ایک جانب رہبرِ مذہب کی ذہنی پستیاں

ایک دل فردوس زارِ زندگی میں شاد ہے — ایک دل محوِ تماشائے عدم آباد ہے

اس قدر ہنگامے اک میرے لئے؟ پروردگار!
کیوں بھٹک جاتا ہے پھر بھی زندگی کا راہوار؟

احمد ندیم قاسمی

غزل

اسی کا نقش یہ ہستی ہے مٹ گیا ہوں میں
کوئی بتائے کہ اب کس کو دیکھتا ہوں میں

نکل گیا تھا بہت دور اپنی ہستی سے
یہ کس کو ڈھونڈھ رہا تھا کہ مل گیا ہوں میں

وہ جس نے چھوڑ دیا مجھ کو پاس منزل کے
اسی مسافرِ عارف کا نقش پا ہوں میں

تمام عمر ہے اس ذوق بے خودی کے نثار
وہ مل گیا ہے مگر اس کو ڈھونڈتا ہوں میں

دیئے جا گردشِ پیہم نگاہ کو ساقی
کشید ہر دو جہاں آج پی رہا ہوں میں

حرم میں مجھ کو ہے یہ ذوق بندگی تسلیم
بتوں کے باب میں شرمندۂ خدا ہوں میں

اسی کا نام سکوتِ نصیب ہے شاید
ازل کی بزم ہے اور سازِ بے صدا ہوں میں

سمجھ گیا ہے حقیقت مجازِ خود بینی
کہ اس کے شوق میں اپنے کو پوجتا ہوں میں

یقین دل سے ہے اب وہ مجھے کرے گا قبول
لبِ رقیب پہ ہوں شوق کی دعا ہوں میں

سمجھ چکا ہے مسیحا بھی ایک مدت سے
کہ دردِ زیست میں جب سے ہوں مبتلا ہوں میں

یہ کفرِ عشق ہے کیفیؔ کہ عشق ایماں ہے؟
کہ یادِ بت کی ہے اور بندۂ خدا ہوں میں

کیفیؔ چریاکوٹی

ستارہ

ہے گوشِ حسنِ ازل کا تو دُرِّ تابندہ   قبائے عرش کا تو تکمۂ درخشندہ
تو مہر و ماہ کے رشتے سے طفلِ زائیدہ   ترے جمال کی سب کائنات گرویدہ
تو نور ہے کہ جمودِ نگاہِ یزداں ہے   کہ ایک حور سرِ عرش اشک افشاں ہے
تو مسکرایا ہے یا آنکھ ڈبڈبائی ہے؟   تو شاد ہے کہ تجھے غم سے آشنائی ہے
تو اک تبسمِ لرزاں ہے حور کے لب پر   کہ ملگجا سا ہے اک پھول تربتِ شب پر
تو آسمان کی پائندہ رفعتوں کا مکیں   بساطِ عرش کی تابندہ محفلوں کا حسیں
تو دور مجھ سے ہے لیکن نگہ سے دور نہیں   میرا خیال تری جلوہ گہ سے دور نہیں
ترے کنار میں شاید یہ کوئی محشر ہے   کہ تیری ہستیِ نازک ہمیشہ مضطر ہے
تو ایک رندِ خراباتِ عرش جام بدست   فضائے چرخ میں رقصاں ہی مثلِ شاعرِ مست
کوئی یہ کیسے کہے کیا ہے کیا نہیں ہے تو   خدا نما ہے اگرچہ خدا نہیں ہے تو
عجب موت سے ہے تیری عجب ہستی ہے   عجیب ہوش سے ہے تیرا عجیب ہستی ہے
عجیب تر یہ کہ شب کو تو سو نہیں سکتا   ق   تو رو تو دے مگر افسوس رو نہیں سکتا
غمِ نہاں تری آنکھوں میں اشک لاتا ہے
مری طرح تو مگر حالِ دل چھپاتا ہے

مسعود شاہد

گو بظاہر ہمہ تن طالعِ ناساز ہے یہ   اور گنبد میں پریشانی آواز ہے یہ
شاہدِ حسن کا پر زمزمہ پرداز ہے یہ   ہم نفس تارے کا اور چاند کا ہمساز ہے یہ

مے لذّت سے یہ مدہوش جو ہو جاتا ہے
آپ بھی وادیٔ نظّارہ میں کھو جاتا ہے

ساغرِ فکر سے لیتا ہے وہ مستی اپنی   سوچ کو جانتا ہے بادہ پرستی اپنی
دور دنیا سے بناتا ہے وہ بستی اپنی   دل میں کرتا ہے بپا محفلِ ہستی اپنی

عالمِ وجد میں بے ہوش پڑا رہتا ہے
لہجۂ زمزمہ میں کہتا ہے جو کہتا ہے

ساز سے اس کے کبھی زمزمہ خانہ ہے جہاں   جاوداں ایک مسرّت کا ترانہ ہے جہاں
اور کبھی حیرت و عبرت کا فسانہ ہے جہاں   زندگی خواب ہے محض ایک بہانہ ہے جہاں

بات میں ذرے سے خورشید بنا دیتا ہے
بات میں خلد کو دوزخ میں جلا دیتا ہے

گو وہ ساحل کی طرح بحرِ جہاں میں ہے خموش   دور سے بیٹھا ہوا سنتا ہے موجوں کا خروش
دل مگر اس کا ہے سینائے نوا کی آغوش   گیت اس کے ہیں زمانے کے لئے بانگِ سروش

دل میں کرتا نہیں وہ الفت دنیا پیدا
جام کو توڑتا ہے تا کہ ہو مینا پیدا

روشن الدین تنویر

شفقِ قطبی

کرۂ ارض کے قطب شمالی و قطب جنوبی کے خصوصاً برفانی علاقہ میں کئی مقامات پر اکثر اوقات ایک نہایت عجیب و غریب نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ مختلف رنگوں کے صاف و شفاف مجموعۂ انوار کی ناگہاں جلوہ نمائی سے آسمان تجلی زار بن جاتا ہے۔ ان برق صفت انوار کا کارواں فلک کی نیلگوں وسعتوں میں حیرت انگیز نظاروں کا مرقع پیش کرتا ہوا اُس پار چلا جاتا ہے۔ یہ مجموعۂ انوار یا روشنی کی چھٹک ظہور پذیر ہوتے ہی اپنے بوقلموں اور متلون انداز میں نہایت تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا شروع کر دیتی ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں رنگ بدلتی، کایا پلٹتی اور نورانی عشوہ طرازی و کرشمہ سازی سے تماشائی کے دلِ ذوقِ آشنا میں ہل چل مچاتی ہوئی ایک دم غائب ہو جاتی ہے۔ اس عجیب و غریب قدرتی روشنی کو منطقہ باردہ شمالی میں ’ارورا بوریلیس‘ (AuroraBorealis) یعنے شفقِ شمالی اور منطقہ باردہ جنوبی میں ’ارورا آسٹریلیس AuRORA AuSTRALIS‘ یعنی شفقِ جنوبی‘ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اس قسم کی روشنی کے ظہور و نمود کے اسباب ہنوز پردۂ راز میں ہیں، بعض اصحاب کا خیال ہے کہ اس نوعیت کی روشنی کا قطبِ شمالی و قطبِ جنوبی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کچھ بھی ہو اس حیرت انگیز اور پُر اسرار روشنی نے دنیائے سائنس میں جس خاص ذوقِ تحقیق و تدقیق کی روح پھونک دی ہے وہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں ظاہر کیا جا چکا ہے کہ منطقۂ باردہ میں اس قسم کی ’ارورا‘ یا حیرت انگیز روشنی کا ظہور عام ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین کے کسی دوسرے طبقہ میں اس عجیب روشنی کا جلوہ قطعاً ناپید ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زمین کے دیگر طبقات میں منطقۂ باردہ کی بہ نسبت یہ روشنی شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی تمام طبقات کے بعض مقامات پر اس کا ظہور ایسی تیزی سے ہوتا ہے کہ دور دراز سے بھی اس کی تابانیوں اور ضیا پاشیوں کا نظارہ قابلِ دید ہوتا ہے۔ اس قسم کا منظر لمبے وقفوں کے بعد ہی میسر آتا ہے۔ زمین کے کس کس حصہ میں یہ روشنی (شفق) اکثر رونما ہوتی ہے۔ اس کی چھٹک کہاں، کتنے عرصے کے بعد اور کس درجہ نور و رقبہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان امور کا پتہ بھی عمیق ترین اور باقاعدہ مشاہدات و تجربات سے لگایا گیا ہے۔ منطقۂ حارہ میں اس قسم کی ”ارورا“ کا نظارہ مفقود ہے۔ منطقۂ حارہ سے قطبِ شمالی کی جانب جتنا آگے بڑھا جائے اس ’ارورا‘ یعنی روشنی یا قطبی شفق کا ظہور بتدریج زیادہ ہوتا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص مقام پر مرکوز ہو کر روشنی کی یہ چھٹا اپنے انتہائی جوبن کے ساتھ رونما ہوتی ہے۔ اس خاص مقام کا تذکرہ ’ارورل پول‘ (AuRORAL POLE) یا قطبِ شفقی کا نام دے کر کیا جا سکتا ہے۔

منطقۂ باردہ شمالی کے جن تمام مقامات پر یہ ردائے نور یا روشنی کی چھٹا زیادہ سے زیادہ جوبن دکھاتی ہے اُن کے بیچوں بیچ اگر ایک خط کھینچا جائے تو وہ نوواز یمبلیا کے تمام شمالی حصہ، شمالی راس، سائبیریا کی شمال مشرقی سرحد، خلیج ہڈسن، لبراڈر سے ہو کر گرین لینڈ اور آئس لینڈ کو ملاتا ہے۔ اس خط کے جنوب و شمال میں اس قسم کی روشنی کا ظہور بتدریج کم ہوتا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا خط سے معلوم ہو گا کہ ’ارورا‘ یعنی شفقِ قطبی امریکہ کے جس عرض بلد پر جیسی شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ یورپ میں اُسی عرض بلد پر ویسی قوت کے ساتھ نہیں ہوتی۔ یہاں تک مشاہدہ کیا گیا ہے کہ سپین کے جنوبی حصہ میں اوسطاً دس سال میں ایک بار، فرانس میں سال کے اندر پانچ دفعہ، لندن میں چھ بار۔ آئرلینڈ کے شمالی حصہ میں تیس دفعہ امریکہ کے صوبجات متحدہ کے شمالی حصہ میں سال بھر میں اوسطاً پچاس بار۔ کنیڈا میں ایک سال میں اسی بار۔ جزیرہ فیرو، سائبیریا کے شمالی ساحل سمندر، خلیج ہڈسن اور لبراڈر کے جنوبی خطہ میں سال کے اندر سو بار یہ ’ارورا‘ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خالی آنکھوں کے مشاہدہ سے شفقِ قطبی کے متعلق صرف مندرجہ بالا

اعداد ہی حاصل ہو سکے۔ مسٹر ڈی۔ ایم۔ شلفا کی فلکی مشاہدہ گاہ کے تجربات متعلقہ معرض الوان کی مدد سے اس قسم کی بے شمار اورا معلوم کی گئی ہیں جو کہ خالی آنکھوں سے عموماً ناقابل مشاہدہ رہتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خط استوا کے بلند تر مقامات پر اس طرح کی مبہم و مدہم اورا ممکن طور پر ہمیشہ انسانی آنکھ سے اوجھل رہتی ہیں۔

شفق قطبی ہر جگہ ایک ہی انداز و درجۂ نور میں رونما نہیں ہوتی کبھی وہ مدھم، مضمحل اور پریشان کرنوں کی صورت اختیار کرکے اور کسی جگہ پھر منوّر انداز و شکل میں نہایت مجلا رنگینیوں کے ساتھ چاروں طرف ضوفشاں ہوتی ہے۔ کہیں وہ آسمان کے صرف ایک حصے کو منور کرتی ہے اور کہیں اس کی جھلک سی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس سارے قطعہ میں اورا کی روشنی ہلکی ہلکی چاندنی کی طرح ظاہر ہوتی ہے اور اس پر کہکشاں کا گمان ہو سکتا ہے۔ اس طور کی مدھم اورا کی روشنی کا ایک مدت تک غروبِ آفتاب یا طلوعِ آفتاب کی کرنوں کا پرتو سمجھا جانا کوئی عجیب بھول نہیں۔

منور اورا یا شفق قطبی کا طغرائے امتیاز خاص کر عوام کی نظروں کو کھینچ لیتا ہے۔ وہ جھبردار بادل (CIRRUS) کی مانند نہایت لطیف، ماہتاب گوں بکھرے ہوئے روئی کے گالوں کا منظر پیش کرتی ہے۔ حقیقتاً اس قسم کے بادلوں اور روشنی کے درمیان خطِ امتیاز قایم کرنا بہت عرصے تک مشکل رہا۔ ایک اور قسم کی اورا دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ مذکورہ بالا بادلوں کی مانند پنبہ گوں اور جھبردار نہیں ہوتی۔ بلکہ اُمڈے اور گھرے ہوئے بادلوں کی صورت میں گاہے گاہے ظہور میں آتی ہے۔ اس کی صوری یا ظاہری و طبعی حالت میں بڑی سرعت کے ساتھ تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی رقبہ میں کمتر ہو کر ناگہاں اس کی نورانی چھٹا کچھ اس طرح چاروں طرف ضیا پاشں ہوتی ہے جیسے سرچ لائٹ کی شعاعیں آسمان سے ٹکرا کر نور برسا رہی ہوں۔

مذکورا بالا اورا کے علاوہ ایک اور نوعیت کی اورا بعض دفعہ مشاہدہ میں آتی ہے۔ یہ نہ صرف صوری اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے بلکہ چمک، تابش اور طرفہ رنگ آفرینیوں کے لحاظ سے بھی شفق قطبی سے مختلف واقع ہوئی ہے تمام عجیب منظر روشنیوں میں سے اس محراب آسا اورا یا شفق قطبی کی داستان نہایت دلچسپ ہے، اس کو بہت مدت تک کراؤن، یا ڈریپری، کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ یہ تمام اوررل آرکس (AURORAL ARCS) اکثر کرہ نما یا کبھی بیضوی صورت میں رونما ہوتی ہیں۔ اس قسم کی اوررل آرکس یا محراب آسا شفق ہائے قطبی جن نورانی شعاعوں کی حامل ہوتی ہیں۔ ان کا رنگ چمکدار ہوتا ہے اور وہ نچلے حصے سے خوب منوّر اور بالائی حصے سے بتدریج مدھم و مضمحل سی ہوتی ہوئی آسمان کی گہرائیوں میں کھو جاتی ہیں۔ مختلف نورانی کرنوں سے مزین ایک یا ایک سے زیادہ ہم مرکز نیم دائرے بھی بیچ بیچ میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی آرکس کی روشنی ایک کرن سے دوسری کرن میں اس سرعت کے ساتھ منتقل ہوتی چلی جاتی ہے کہ اس سے نزنگوں کا ایک تسلسل بندھ جاتا ہے۔ اس طرح کی اوررل آرکس کا صوری منظر برق رفتاری کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے کبھی وہ ایک دم اوپر اٹھتی ہیں اور کبھی نیچے اتر آتی ہیں کبھی ان کا کوئی خاص حصہ کامل طور پر غائب ہو جاتا ہے مگر دوسرے ہی لمحہ میں وہ پھر دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ بھی مشاہدہ میں آچکا ہے کہ آرک کا بالائی حصہ قائم رہتا ہے اور نچلا حصہ اس کے گرد طواف کرتا ہے۔ وہ تمام کرنیں جن سے اس قسم کی آرک یا پرکالہ نور معمور ہوتا ہے۔ عموماً ان کا طول زیادہ نہیں ہوتا۔ تب بھی وہ اچانک طویل سے طویل تر ہو کر اوپر کی طرف اٹھنے لگتی ہیں اور کبھی فرش زمین کے متوازی چلنا شروع کر دیتی ہیں کبھی تمام کرنیں ایک جگہ جمع ہو کر گول کمان کی سی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ کبھی ہر ایک کرن کسی ایک نقطہ پر آکر مل جاتی ہے۔ کرنوں کی یہ نقل و حرکت اور سریع الرفتار صوری منظری و طبعی تبدیلی شفق قطبی (ارورا) کی سب سے محیر العقل و قابلِ ذکر خصوصیت ہے جو زمانہ قدیم سے عوام کی نگاہیں اپنی طرف کھینچتی رہی ہے کبھی کبھی یہ نورانی کرنیں صوری طور پر غیر متغیر رہتے ہوئے بھی اوپر نیچے ناچتی دکھائی دیتی ہیں۔ کینیڈا میں اس قسم کی اورا ماریونٹس (MARIONETTES) یعنی کٹھ پتلی کے نام سے مشہور ہے۔ جزائر شٹلینڈ میں بھی اسی نوعیت کی ناچنے والی نورانی کرنیں مشاہدہ میں آئی ہیں۔ "اورا بوائیلس" یا شفق شمالی کے حیرت افزا نظاروں کی بدولت بے شمار عجیب و غریب داستانیں بھی زبان زد خلائق ہو چکی ہیں "آسمان پر بہشتی فوجیں جنگجو بر سرِ پیکار ہیں" وغیرہ ——— اس طرح کے بے شمار مافوق العادت افسانے انہیں مناظر سے حاصل کئے گئے ہیں۔

"کراؤن" نامی انوکھی شفق قطبی (ارورا) کا رنگیں منظر از بس حیرت افزا

ہوتا ہے۔ وہ اکثر قطب کے نزدیک واقع بلند عرض بلد پر دیکھی جاتی ہے۔ شفق قطبی کی نورانی کرنیں جب اکٹھی ہوکر کرۂ زمین کے مقناطیسی مرکز (Magnetic Zenith) پر آکر ملتی ہیں تو ایک عدیم المثال منظر پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت یہ تمام نورانی کرنیں کبھی خیمہ کی شکل اور کبھی مالا کی صورت میں چمکدار رنگوں کے ساتھ جلوہ نما ہوتی ہیں۔ ڈریپری ارورا کی نورانی کرنوں کا انبوہ زیادہ تر تابناک ہوتا ہے ایک رنگین اور باریک ریشمی کپڑا ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے جس طرح لہراتا ہوا ایک دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ اسی طرح اس شفق قطبی کی رُدائے تجلیات عجیب عجیب رنگوں کے ساتھ وجد آور مناظر کا باب کھولتی ہے۔

شفق قطبی کی کرنوں کا انبوہ جو زیادہ تابناک نہیں ہوتا وہ عموماً زردی مائل مہتابی رنگ اختیار کئے ہوتا ہے۔ ڈریپری کی قسم کی شفق قطبی کا نچلا حصہ منگنی رنگت کے ساتھ تجلی آمیز لال گلابی جھلک پاتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ زردی مائل مہتابی ہوتا ہوا بھی ذرا ذرا زمردیں جھلک رکھتا ہے۔ جب تمام ارورا اسی طرح ایک منور پھریرے کی مانند لہراتی ہے تو ایک نہایت جاذب نظر و حیرت فزا جلوہ زار پیدا ہو جاتا ہے۔ کراؤن ارورا سے بھی اسی قسم کی سرخ و سبز رنگین دلفریبیاں رونما ہوتی ہیں۔ نورانی کرنوں کی روانی میں گاہے گاہے عجیب وقفے واقعہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی بوقلمونی و تلون خیزی بھی غضب کے سین پیش کرتی ہے۔ کرنوں کا کارواں نیچے اترتے وقت جس قدر تابناک رنگ اختیار کرتا ہے اوپر کی جانب مائل سفر ہوتے ہی آہستہ آہستہ اسی قدر مدھم سے مدھم ہوتا چلا جاتا ہے۔

شفق شمالی کی تابانی کا کماحقہ اندازہ لگانا یا درجۂ نور معلوم کرنا آسان نہیں تاہم یہ ایک امر واقع ہے کہ وہ ضیائے مہتاب کی طرح منور نہیں ہوتی یعنی اس کا درجۂ نور مہتاب سے کم تر ہوتا ہے۔ شفق شمالی کی روشنی یا تابانی کے متعلق عمیق تحقیق و مشاہدہ کے بعد زمین کے شمال بعید علاقہ کے شاہدین و محققین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ گیس کی روشنی کو جو نسبت بجلی کی روشنی سے ہے وہی نسبت شفق شمالی کو چاندنی سے ہے تاہم شفق قطبی میں عجوبہ روزگار مناظر پیش کرنے کے جو طبعی لوازم و خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ کسی دوسری روشنی کے حصہ میں نہیں آئے۔

شفق شمالی کی رنگین چھٹا یا الوانی مرقع کا محققانہ مشاہدہ کر کے معلوم کیا گیا ہے کہ اس میں کئی ایک چمکدار دھاریاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک دھاری کی خصوصیت دلچسپی سے خالی نہیں۔ سر ولیم ریمزے کی معلوم کردہ کرپٹن نامی ایک لطیف شے (جو فضا میں پائی جاتی ہے) کی رنگین چھٹا میں جو دھاری نظر آتی ہے، شفق شمالی کے معرض الوان کی دھاری کی اس کے ساتھ بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ایک چمکدار دھاریاں اس کے معرض الوان میں ظاہر ہوتی ہیں۔ کارٹس رقمطراز ہے کہ شفق شمالی جب ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ ایک نہایت شیریں صدا بھی پیدا ہوتی ہے بعض اصحاب کی رائے ہے کہ یہ صدا ہوا میں لہراتے ہوئے ریشمی کپڑے کی آواز کی مانند ہوتی ہے۔ تاہم عام تماشائی کے کانوں میں اس قسم کی صدا نہیں آتی۔ شفق شمالی یا ارورا بوائیلس کی روشنی اتنی سرعت کے ساتھ ایک جگہ سے منتقل ہوتی چلی جاتی ہے کہ فرش زمین سے اس کی بلندی کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک وسیع رقبے میں جو روشنی ظاہر ہوتی ہے اس کی بلندی زمین سے ساٹھ میل سے بھی زیادہ ہوگی۔ نارویجین جیو فزیکل کمیشن نے آج سے کچھ عرصہ پہلے ایک ہی وقت میں تین مختلف مقامات سے اس طرح کی شفق شمالی کی روشنی کا فوٹو لے کر معلوم کیا تھا کہ ایک ہی روشنی کے تین قطعوں کی بلندی بالترتیب ۸۳ و ۱۱۰ اور ۱۱۳ میل ہے۔ کہیں زمین سے تین سو میل سے بھی زیادہ بلندی پر شفق شمالی کا معرض تصدیق کیا گیا ہے۔ اس قسم کی بلند ارورا کئی بار یورپ و ایشیا کے بیشتر مقامات پر، اسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور نصف کرۂ جنوبی کے بہت سے مقامات پر ایک ساتھ رونما ہوتی ہیں۔ تاہم سطح سمندر کے برابر قطعہ زمین سے کئی سو گز کی بلندی پر اکثر اوقات بہت سی شفق ہائے شمالی ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی بادلوں کے زیریں حصے کو بھی منور کر دیتی ہیں۔ مختلف شفق ہائے شمالی کی بلندیوں میں اس طرح کا فرق دیکھ کر کئی اصحاب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں قدرتی مناظر ارورا کے نام سے منسوب ہونے پر بھی درحقیقت مختلف نوعیت کے ہیں۔ زمین سے زیادہ بلندی پر جو تمام ارورا یا شفق ہائے قطبی ظہور پذیر ہوتی دیکھی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ زمین کی مقناطیسی کیفیت میں ایک تضاد و مغائرت یا انتشار سا پیدا ہو جاتا ہے۔ سویدائے آفتاب یعنی (Sun Spots) کے اتفاقی تغیر کے ساتھ بھی اس قسم کی بلندترین شفق ہائے قطبی کا تعلق رہتا ہے۔ سائنسدانوں نے دن کے مختلف اوقات میں شفق قطبی کے عجیب تغیر و تبدل و صوری انقلاب کا مشاہدہ

کیا ہے۔ اکثر صبح کے وقت ارورا آرکس کا ظہور ہوتا ہے۔ دس بجے سے گیارہ بجے تک حیرت انگیز رنگوں کی ارورا دیکھنے میں آتی ہیں۔ دوپہر کی ڈیڑھ گھڑی میں سرچ لائٹ کی نوعیت کی نورانی چھٹا ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ماہرین سائنس کا بیان ہے کہ برقی اسباب ہی اس قسم کی شفق ہائے قطبی کے جنم داتا ہیں، بجلی اور مقناطیس کے متعلق مختلف تجربات عمل میں لانے کے بعد سائنسدانوں کا مذکورہ بالا عقیدہ مضبوط ہوتا گیا ہے۔ چھوٹے پیمانے کی شفق قطبی کے ساتھ آب وہوا کی کیفیت کا بھی خاص تعلق دیکھا گیا ہے۔ غبار، کرہ ہوائی کا دباؤ، کہر و برف وغیرہ کے اثرات بھی اس قسم کی روشنی کے ظہور میں مشاہدہ کئے گئے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس سلسلے میں مکمل حقائق معلوم نہیں ہو سکے۔

شفق قطبی کی تخلیق کے اسباب اور اس کی طبعی کیفیات کے متعلق مختلف آرا، وعقاید قرار پا چکے ہیں تاہم برقی واقعات سے ساتھ اس کا جو خاص تعلق ہے اس سلسلے میں سائنسدان متفق الرائے ہیں۔ گیسلر ٹیوب میں لطیف کردہ ہواؤں میں برقی لہر دوڑانے سے دیکھا گیا ہے۔ کرہ ارض کے قطبی دامن میں جس قسم کی ارورا یا شفق قطبی ظہور میں آتی ہیں ان سے بھی اسی طرح کی روشنی پیدا ہوتی ہے۔ الیکٹرک فیلڈ (Electric Field) کے اچانک تبدیل ہونے سے اسی قسم کی رنگین دلفریبیاں یا الوانی تلون رونما ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ اس لئے سائنسدانوں نے برقی اسباب سے ہی شفق قطبی کا پیدا ہونا تسلیم کیا ہے۔

سویڈن کے مشہور سائنسدان 'آرہینین' فرماتے ہیں۔ آفتاب سے بڑی سرعت کے ساتھ الیکٹرن خارج ہوتی ہے۔ وہ جیسے ہی زمین کی جانب رواں ہوتی ہے زمین کی عالمگیر قوت مقناطیسی اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر اس قسم کے عجیب وغریب مناظر رونما ہوتے ہیں۔ اسباب یا وجوہات کچھ بھی ہوں شفق شمالی واقعی ایک عجوبہ روزگار ہے اور اقلیم فطرت کے رموز کی محیر العقول داستان کا ایک باب درخشاں کھولتی ہے۔

جگن ناتھ شرما

غزل

ابھی تک ہے دھبہ جبین خودی پر
پشیماں ہوں میں سجدۂ بندگی پر

تجھی نے تو برباد مجھ کو کیا ہے
ارے رونے والے مری بیکسی پر

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر

نمی اس میں اشکوں کی شامل ہے زاہد!
مجھے ناز ہے اپنی تردامنی پر

ابھی مجھ کو پینے کا ہے ہوش ساقی!
یہ اک داغ ہے دامن بیخودی پر

گوپال متل
بی اے

حسیات

ظلم پیہم سے مدعا کیا ہے	میرے دل میں ترے سوا کیا ہے
لطفِ بیداد ناروا کیا ہے	مصرفِ جانِ بے وفا کیا ہے
قیدِ ہستی کا کچھ سبب نہ کھلا	مجھ گناہ گار کی خطا کیا ہے
جبکہ تو خود ہے قادرِ مطلق	میری ہستی سے مدعا کیا ہے
یہ فضائے بسیط کیسی ہے	ماہ و پرویں ہیں کیا سہا کیا ہے
یہ سکوتِ شب اور یہ تارے	یہ سحرگاہِ خوش نما کیا ہے
یہ گل و لالہ یہ ہوائے چمن	یہ تمنائے جاں ربا کیا ہے
لطفِ نظارہ جب میسر ہے	یہ غمِ صبر آزما کیا ہے
زندگی جب کہ جاودانی ہے	موت کیا چیز ہے فنا کیا ہے
اپنے عاشق سے یہ سلوک ہے کیوں	یہ تماشائے کربلا کیا ہے
کب سے ہوں مائلِ غزل خوانی	کون سمجھے کہ مدعا کیا ہے
اُن کی باتیں سنی نہ تھیں جب تک	کس کو معلوم تھا خدا کیا ہے
تم سے ناکامیوں کی داد ملے	اور عاشق کا مدعا کیا ہے
ہم نہ واعظ کو آج تک سمجھے	راہزن ہے کہ رہنما کیا ہے
بات کیا بے خودی میں کہہ بیٹھے	شہر میں ذکر جابجا کیا ہے

خلوتِ دل دکھا نظیرؔ انہیں
چاہِ کنعاں ہے کیا حرا کیا ہے

اصغر حسین خاں نظیرؔ

عیدِ فراق

یاد ایامے کہ تھا ہر رنج سے آزاد دل ۔۔۔ بسکہ تھا نامحرم رسم و رہ فریاد دل
جبکہ تیرا حسن تھا اک بےخودی میرے لئے ۔۔۔ عشق تھا سرمایہ دارِ زندگی میرے لئے
روکشِ فردوس تھا حسن شبابِ زندگی ۔۔۔ مطربِ عشرت تھا ہر تارِ ربابِ زندگی
زندگی اب میری یکسر شیون و فریاد ہے ۔۔۔ عشرت آبادِ تمنا ایک تیری یاد ہے
آہ لیکن یاد تیری بادۂ بےجوش ہے ۔۔۔ دم بخود دل ہے زبانِ آرزو خاموش ہے
نالۂ حسرت فغانِ یاس اشکِ بےکسی ۔۔۔ ایک وحشت خانۂ ماتم ہے میری عاشقی
داغِ مہجوری شرارِ دامنِ امید ہے ۔۔۔ کیا یہی اے سوزِ الفت غمزدوں کی عید ہے
کونسا دل ہے نہیں جس میں خیالِ روئے دوست ۔۔۔ کونسا سر ہے نہیں جس میں سرِ کوئے دوست

"بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد
کور بہ چشمے کہ لذت گیرِ دیدارے نشد"[1]

اے کہ تیرے نور سے روشن تھی الفت کی جبیں ۔۔۔ اے کہ ہے تیرے تصور سے مری دنیا حسیں
دیکھتا ہوں پھر شبِ ہجراں میں رنگِ خوابِ شوق ۔۔۔ پھر ابھرنا چاہتا ہے جذبۂ بےتابِ شوق
آ کہ پھر صحرائے وحشت میں ہوں آوارہ گزر ۔۔۔ آ کہ اب مجبورِ منزل ہے مرا ذوقِ سفر
جادۂ امید کا سنگ و نشاں ملتا نہیں ۔۔۔ رہنما تائب کو تجھ سا مہرباں ملتا نہیں
ہے کلی دل کی بہت بیتاب کھلنے کے لئے ۔۔۔ اے گلِ باغِ محبت تجھ سے ملنے کے لئے
اٹھ رہا ہے سینۂ مضطر میں اک ہنگامۂ نو ۔۔۔ ایک طوفانِ تمنا ایک حشرِ آرزو
ہو رہی ہے آج شمشیرِ محبت بےنیام ۔۔۔ دے رہی ہے امتحانِ شوق کا مجھ کو پیام

عید[2] قربانست می خواہم کہ قربانت شوم
مثلِ چشمم گوسفند کشتہ حیرانت شوم

(ملک مراتب علیخاں تائب)

[1] زیب النساء مخفی کی ایک مشہور غزل کا مطلع [2] سعید خاں دور مغلیہ کا ایک مدبر گوشہ نشیں تھا عید الضحیٰ کے روز دارا شکوہ نے ایک بکرا ذبح کیا اور اپنے ندیم خاص سعید خاں کی طرف دیکھنے لگا سعید خاں نے برجستہ یہ شعر کہا۔

دنیائے ادب

زندہ اور فطری زبان

پہلی کسوٹی۔ اصولِ ارتقا

زبان کی تعریف و توضیح میں تحقیقات کرنے والوں نے مختلف خیالات پیش کئے ہیں مگر اس کی تعریف بھی شعر کی تعریف کی طرح رنگارنگ ہوتی گئی ہے۔ کسی نے اسے نمونہ صنعت الٰہی کہا تو کسی نے بلبلِ ہزار داستان کسی نے طوطی شکرشکن سے تشبیہہ دی اور کسی نے اُسے قدرت کے راز سربستہ کی کلید کہا۔ مگر اس کی جو تصریح مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ نے اپنے اپنے قواعد اردو کے مقدمے میں کی ہے۔ وہ نہایت جامع اور بہتر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سچی زندہ اور فطری زبان کی تعریف اس سے زیادہ صاف شاید ہی ہو سکے۔ آپ کے تصریحی الفاظ یہ ہیں:۔

"زبان نہ کسی کی ایجاد ہے اور نہ کوئی اسے ایجاد کر سکتا ہے۔ جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے۔ پتے نکلتے ہیں، شاخیں پھیلتی ہیں، پھل پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا سا پودا درخت تناور بن جاتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔"

زندہ زبان کی یہ عام تعریف ہے اور اُس کے زندہ ہونے کی کسوٹی بھی اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ زندہ اور فطری زبان میں حسب ذیل خوبیوں یا خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔

(۱) زبان کی ابتدا صرف و نحو دگرییمر سے نہ ہوئی ہو۔

(۲) اس میں قانونِ ارتقا پایا جائے یعنی اپنے جنم سے لے کر آغاز شباب تک تیز رفتار ترقی۔ اور شباب میں کامل جلوہ نمائی ہو۔ پھر رفتار ترقی مستقل ہو جائے اور درخت تناور کی طرح پھل پھول پیدا کر کے اس کے فایدے سے دنیا کو فیض پہنچائے۔

(۳) ماحول کا اثر اس کے نشو و نما میں نمایاں ہو اور اس کا اثر ماحول پر بھی آگے چل کر ظاہر ہو جائے۔

(۴) جس طرح انسان کی کوشش درخت کے مزاج (پھول کی خوشبو اور پھل کے ذائقے) کو تبدیل نہیں کر سکتی، اسی طرح ایک زندہ زبان بھی مسخ نہیں ہو سکتی۔ غیر فطری رجحانات سے وہ بگڑے گی مگر پھر وہ قدرتی رجحانات کی بدولت سنور جائے گی۔

یہی سبب ہے کہ ہر ملک و قوم کی ایک زندہ زبان ہے جو اس کی تہذیب اور تمدن کی ترجمان ہے۔

ہندوستان کی زبان بھی ان تمام درجوں سے گزرتی ہوئی موجودہ صورت کو پہنچی ہے۔ فطری اور غیر فطری رجحانوں نے اُسے اکثر بنایا اور بگاڑا۔ مگر آخر میں بازی فطرت اور قدرت ہی کے ہاتھ رہی اور یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ مصنوعی تحریکیں وقتی ہوتی ہیں۔ اور تھوڑے ہی دن چل کر ٹھنڈی ہو جاتی ہیں یا دب جاتی ہیں۔ زبانِ ہند کی تاریخ میں یہ حقیقت بار بار ملتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ ہندوستان جنت نشان کی زبان دیو بانی (زبان الٰہی) ویدک تھی۔ اسے ہم زبانِ ہند کا بیج یا چشمہ زبان کا منبع کہہ سکتے ہیں۔ دانے کا پھوٹنا اور چشمے کا آگے بڑھنا لازمی تھا۔ قانونِ ارتقا کے خلاف پوری طاقت صرف کی گئی کہ زبان الٰہی کی شکل نہ بدلے۔ کونپل نہ پھوٹنے پائے ورنہ بڑا غضب ہوگا، زبان مسخ ہو کر ناپاک ہو جائے گی۔ برفستان میں جس طرح تخم اپنے بخت خفتہ پر خشک آنسو روتا ہے۔ وہی حال ویدک زبان کا رہا اور وہ برہمنوں کے سینوں میں مدفون یا محفوظ رہی۔ مگر یہ کب تک۔ آخر شمس ارتقا کی کرنیں پہنچ گئیں۔ دانے پھوٹ نکلے۔ آن کی آن میں اُس کی دوسری شکل تھی۔ گویا زبان ویدک نے جنم بدلی۔ اس جنم میں اس نے نیا نام پایا۔ ویدک پراکرت، کے نام سے وہ

پکاری گئی۔ اس پراکرت کو اگر مجسم شکل تصور کیا جائے تو پالی کو رجوگوتم بدھ۔ بودھ مذہب اور اس عہد کے حالات کی آئینہ دار ہے) اس کا دست راست سمجھنا چاہیے

اس زبان کو پراکرت کی اور شاخوں کے مقابلے میں زیادہ فروغ ہوا۔ بدھ مذہب کے وسیلے سے اس کے پڑھنے اور جاننے والے کم و بیش شمالی ہندوستان کے اکثر حصوں میں پائے جانے لگے۔ دوسری پراکرتیں۔ ماگدھی، شورسینی، مرہٹی پنجابی، اودھی، بندیل کھنڈی، بھوج پوری، مقامی حیثیت رکھتی تھیں۔ نہ تو ان کا تعلق ہندوستان کے ہمہ گیر مذہب بدھ سے تھا اور نہ اس جیسی سرپرستی نصیب ہوئی۔ مگر باوجود مذہبی توسط اور بدھ حکمرانوں کے دستگیری و حمایت کے یہ زبان ہندوستان کے لئے زبان عام نہ بن سکی، کیونکہ وہ ایک محدود خطے کی زبان تھی بدھ مذہب کے زوال کے بعد گپتا خاندان کے عہدِ حکومت میں برہمنوں کو اپنا قدیم مذہب زندہ کرنے کا اچھا موقع ملا۔ انہوں نے قدامت پسندی کی نظر سے جو زبان کی طرف دیکھا تو چونک پڑے۔ ایں! زباں کہاں سے کہاں جا پہنچی! چنانچہ قواعد کی زنجیروں سے باندھ کر خوب کاٹ چھانٹ تراش خراش کرکے ایک نئی زبان وضع کی۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ زبان کہاں تک فطری ہو سکتی ہے۔ اس کا نام سنسکرت (آراستہ کیا گیا) رکھا گیا۔ کیونکہ ویدک پراکرت کی چھینٹی چھنٹائی اور قدیم ویدک کے قالب پر ڈھالی ہوئی زبان تھی۔ اس زبان میں اعلیٰ پائے کی مہا تصنیفیں وکرم کے درباری شاعروں کے زورِ قلم سے وجود میں آئیں۔ فصاحت اور بلاغت، صنائع و بدائع غرض جہاں تک انسانی کوشش کو دخل ہے اس نے زبان کو موقر اور قابلِ قدر بنایا گیا۔ شکنتلا کا دمبری، میگھ دوت دنیائے ادب کے خزانوں کے چمکتے ہوئے رتن ہیں اور نظر انصاف ان کی ادبی شان کو ہمیشہ ہمیشہ سراہتی رہے گی۔ مگر جہاں تک زبان کا مسئلہ ہے وہ اس عیب سے پاک نہیں کہ وہ عوام کی تشنگی کو دور نہ کر سکتی تھی۔ عام فہمی سنسکرت میں نہ تھی۔ اس لئے کہ یہ بول چال کی زبان تھی ہی نہیں۔ یہ محض تصنیفی زبان تھی اور عالموں اور درباریوں کے لئے محدود تھی۔ عورتوں اور بچوں کے لئے اور ان پڑھ طبقے میں یہ زبان مروج نہیں ہوئی اسی لئے کالیداس اپنے ناٹکوں میں عورتوں اور بچوں کا کردار جہاں پیش کرتا ہے۔ پراکرت زبان استعمال کرتا ہے

ملک کی فطری زبان ایک قدرتی چشمے کی طرح آگے بڑھ رہی تھی جس میں اِدھر اُدھر سے نالے ندیاں آکر مل رہی تھیں۔ غرض کنار و ساحل سبزہ و گیاہ کو سیراب کرتا ہوا یہ چشمہ ہر ایک کے اجزا اپنے اندر شامل کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اب چشمے نے دریا کا نام پایا یعنی زبانِ ہند نے تیسری چولی بدلی۔ اس جنم میں زبانِ ہند کا نام "اپ بھرنش" تھا۔ بار بار کی تبدیلیوں سے قدامت پسندی کی علامات خود بخود ماند اور مدھم پڑنے لگے۔ یہ "اپ بھرنش" زبان مکان کی تبدیلیوں سے مختلف لباسوں میں نظر آئی۔ ملک کا مرکزی حصہ جس طرح تمدن و آئین و تہذیب و شائستگی میں بڑھا ہوا تھا، اسی طرح وہاں کی اپ بھرنش بھی دوسری اپ بھرنشوں کے مقابلے میں زیادہ صاف تھی (۱)، مرکز ملک (میرٹھ اور نواحِ دہلی) (۲) اور برج کے علاقے میں زبان کا رنگ وغیرہ دیدہ زیب تھا۔ دیکھنے والوں نے جو انتخابی نظر ڈالی تو یہ بولیاں کچھ دل کو ایسی بھا گئیں کہ اس کی قسمت کا ستارہ گویا طلوع ہو گیا۔ یہ دیکھنے والے مسلمان تھے جنہوں نے فاتحانہ حیثیت سے ملک پر عمل دخل کیا۔ اور اپنا مرکز بھی اسی حلقے میں رکھا۔

مسلمانوں کا ورود زبانِ ہند پر ماحول کا سب سے زیادہ اور نمایاں اثر تھا حکومت مرکزی کے اہتمام نے دور و نزدیک کو سمیٹ کر ایک کر دیا، دہلی اور آگرہ کی بولیاں گنگا جمنی شان سے مل گئیں۔ جس کے نمونے خسرو کی پہیلیوں اور مکرنیوں میں ملتے ہیں۔ جوہر شناس اور قدر داں مسلم حکمرانوں نے اس جنسِ لطیف کی قدر کی۔ دوربیں خسرو کی دوربینی کو انہوں نے اپنی تائید سے دوسروں کے لئے راستہ کھول دیا۔ حکمرانوں کی زبان فارسی تھی۔ اس لئے انہوں نے تمیز کے لئے اس نئی صورت کو پہنچی ہوئی زبان کا نام ہندی رکھا اور وہ موقر بنا کر ہندوستان کی ہر چیز کو ہندی کی صنعت نسبتی سے مخصوص کرتے تھے، مثلاً تیغ ہندی، تال ہندی بزم ہندی . . . وغیرہ انشاء نے بھی اس زبان کو ہندی ہی لکھا ہے۔ •

مسلمانوں کا عہدِ حکومت بھی بہت وسیع تھا۔ تغیر و تبدل تو ہوتا ہی رہتا ہے چنانچہ مسلمانوں ہی کے عہدِ حکومت میں منجملہ دیگر معاشرتی تبدیلیوں کے زبان کی شان بھی بہت کچھ بدلتی اور بنتی گئی۔ عہدِ اکبر میں ہند کی حدیں وسیع ہوئیں، دکن، دہلی و آگرہ سے وابستہ ہو گیا۔ یہ زبان شاہانِ دکن کے درباروں میں بھی جا پہنچی وہاں ہندی کا نام مقامی نسبت سے دکنی ہو گیا۔ ملک الشعرا نصرتی سے لے کر ولی کے زمانے تک دکن میں رہی، اور شمالی ہند تو اس کا جنم بھوم ہی تھا۔ دوسری طرف وہ تمدنی سلسلے سے ہاتھ پیر نکالنے لگی اور گجرات جا پہنچی۔ یہاں کے لوگوں نے اسے گجراتی کہہ کر اپنایا۔ نرسی مہتا گجراتی زبان کا شاعر ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ یہاں دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ شمالی ہند میں دکنی اور میرٹھ کے نواح کی زبان کی مثالیں تو ہر خاص و عام کو ولی اور خسرو کے ناموں سے پیش نظر ہو جاتی ہیں۔ مگر اردو کی گجراتی شکل سے ابھی کم لوگ روشناس ہیں:-

ہر دم کرشن کہے ذکر شن ہے تو زباں میری
یہی مطلب خاطر کرتا ہوں خوشامد میں تیری

دہی اور دودھ شکر روز کھلاتا ہوں تجھے
تو بھی ہر روز نہ ہر نام سنا دے مجھے
کھوئی زندگانی ساری ہوئی گناہ معاف تیرا
دیا مت بھولے پربھو آخر وقت میرا

(ماخوذ از کبتا کومدی — بھوسکا مصنفہ پنڈت رام نریش ترپاٹھی)

لفظوں کی ترکیبیں، ادر خود الفاظ اور روزمرہ کے نمونے پر لائے گئے ہیں۔

اسی طرح پنجابی میں اسی مرکزی زبان کی شان جھلکتی ہے جو مختلف تغیرات کے بعد آج اردو کہلا رہی ہے۔ غرض اردو کی اصل صورت نواح دہلی سے اٹھ کر ہندوستان کے جنوبی حصے دکن کی زبان پر اور یہ ہمراہ ولی گجرات پہنچنے سے گجراتی پر اپنا نقش ڈال چکی ہے۔ نیز خود اس کے اندر دکنی و گجراتی و پنجابی عنصر بھی شامل ہو چکا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب عہدِ محمد شاہ میں شمالی ہند کے زبانیوں نے پھر دہلی کا رُخ کیا اور ان میں ولی بھی تھے تو ان کی زبان اور دہلی کی زبان میں بڑا فرق نظر آیا۔ مرکزی زبان جن ایام میں جنوبی ہند اور مضافات دہلی کا طواف کر رہی تھی، شمالی ہند کے پایۂ تخت دہلی میں وہ رُکی نہ بیٹھی تھی۔ قلعہ شاہجہاں آباد نے اس کا پرانا نام ہندی بھلا دیا تھا اور وہ زبان اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد کہلاتی تھی۔ یہ نام لشکر کے تعلق اور لشکری خلط ملط سے پیدا ہوا تھا اور اب اس میں عام فہمی کی صفت اور بھی ترقی کر چکی تھی۔ چنانچہ ولی نے اپنے دیوان پر نظرِ ثانی کی۔ جن اشعار میں دکنی کے الفاظ تھے اُن کو دیوان سے خارج کر کے ایک دوسرا دیوان ترتیب دیا۔ اس میں دکنی کے اسی قدر الفاظ تھے جو دہلی کی ترقی یافتہ زبان میں بے جوڑ نہ تھے۔ اس طرح ولی کی خدمت زبان کے سدھارنے اور سنوارنے میں کس قدر قابلِ قدر ہے۔ اس طور پر اب ایک ایسی زبان وجود میں آگئی جس کے سمجھنے والے ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ لوگ تھے اور اس کے مقابل دوسری زبانیں مقامی حیثیت سے بڑھتی اور ترقی کرتی رہیں۔ مسلمان فرمانرواؤں نے اس وقت کی مقامی زبانوں کے لئے پوری شاہ دلی برتی کیونکہ اردو نہ تو حکمران قوم کی زبان تھی اور نہ محض مسلمانوں کی۔ اس کے بولنے لکھنے اور پڑھنے والے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ چنانچہ قدما کے تلامذہ کی فہرست میں دیکھئے کہ کس قدر ہندو ہیں۔

اس وقت غریب اردو کا دامن علمی جواہرات سے خالی تھا۔ بس لے دے کر اس کی جھولی میں یا تو غزلوں کے دیوان تھے یا قصہ کہانیاں۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جب انگریزوں کی تجارت سارے ہندوستان کا احاطہ کرنے لگی تو انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں نو وارد انگریز گماشتوں کی تعلیم کی غرض سے اردو کو نصاب میں داخل کر دیا۔ ایسا کرنے میں انہیں یہ سہولت تھی کہ ملک کے ہر ایک حصہ کی مقامی بولی سیکھنے کے بجائے ایک عام ہندوستانی زبان مل گئی۔ اس لئے انہوں نے اسی کو سیکھا۔ اب اردو کی خوبیوں کو آشکارا ہونے کا یہ اچھا موقع آیا۔ غرض کالج نے باشندگان ہند سے ہندوستانی شکل میں اردو کا تعارف کرایا اور یہ ایسے ہی تسلیم ہوا جیسے ایک مسلمہ صداقت کی دوبارہ تائید ہو۔ خلاصہ یہ کہ ہندوستان کے باشندوں کی تو یہ زبان ہی ٹھہری غیر ملکیوں نے بھی اسے ہندوستانی سمجھ کر سیکھا۔ کالج کے لئے درسی کتابوں کی جو ہندوستانی زبان (اردو) میں ہوں ضرورت تھی اور تلاش کرنے سے دو ایک سے زیادہ نہ مل سکیں تو کالج کے پرنسپل مسٹر جان گلکرسٹ نے اردو دانوں کو تلاش کیا۔ ملک کے ہر حصے سے اچھے منشی و انشا پرداز کلکتہ میں جمع ہونے لگے۔ میر امن دہلوی۔ بہادر علی حسینی۔ کاظم علی جوان۔ شبیر علی افسوس۔ منشی سدا سکھ و بینل مصر، پنڈت للو لال جی نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ ان تمام مصنفین اور مولفین کے لئے ایک عام ہدایت تھی۔ وہ یہ کہ عبارت صاف ہو اور دقت آفرینی اور لفظی شکوہ سے احتراز و پرہیز کیا جائے۔ تکلف پسند مصنفین کو سخت دقتیں پیش آئیں مگر تا کیا نہ کرتا۔ چار و ناچار طبیعتوں کو سادگی پر مجبور کیا اور سادہ نگاری کی مثالیں بہت سی نظر آنے لگیں۔ اس عہد کی بعض کتابیں سادہ نگاری سے کوسوں دور ہیں۔ مثلاً پنڈت للو جی لال کی تصنیف پریم ساگر اور خزینہ دانش، اور اس کے مقابلہ میں منشی سدا سکھ اور میر امن کی تحریروں پر موجودہ عہد کی سادہ نویسی بھی قربان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مسٹر جان گلکرسٹ کو صیغہ تصنیف و تالیف کے جانچ پڑتال کا زیادہ موقع نہ تھا یا یہ حضرات بالطبع پیچیدہ لکھنے اور مسجع نویسی کے عادی ہو چکے تھے۔ اور باوجود کوشش راہ راست یا حد مقررہ تک نہ پہنچ سکے۔

یہاں تک زبان کے تعمیری پہلو کو آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا مگر تعمیر کے پیچھے پیچھے تخریب کا ڈنڈا بھی چلتا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین اس معاملے میں اور بھی زرخیز ہے۔ یہاں تعمیر کے ساتھ ساتھ تخریب فوراً جلوہ گر ہوتی ہے۔ کانگرس کے جواب میں اینٹی کانگرس، اسکاؤٹنگ کے جواب میں اینٹی اسکاؤٹنگ نمودار ہو چکی ہے۔ چنانچہ ملک کی فطری زبان کے مقابلے میں اسی وقت ایک غیر فطری اور مصنوعی زبان بھی ظہور میں آئی۔ جب فورٹ ولیم کالج میں اردو دانوں کی قدر ہوئی تو تنگ نظری نے حسد کی آگ کو بھڑکایا اور جس ذہنیت نے ہندوستان کو صدیوں غلام رکھا تھا۔ وہ ایک نیا روپ بھر کر نمایاں ہوئی۔ اردو کے مقابل ایک زبان وضع کی گئی اور

چن چن کر مروج فارسی و عربی الفاظ کے بدلے سنسکرت کے غیر مروج الفاظ رکھے گئے اور ذرا بھی نہ سوچا گیا کہ ایک مشترکہ زبان جو ہندو مسلم کی متفقہ کوششوں کا ثمر، اتحاد و یک جہتی کی جان اور قومیت و وطنیت کی شان ہے اُس کے گلے پر چھری پھر رہی ہے۔ آزادیٔ ہند کا دشمن درحقیقت اس سے بڑا کوئی نہیں جس نے زبان میں تفریق و تمیز کی۔ ہندی کی پیدائش اس طرح اردو کے مقابل میں ہوئی یہ زبان پہلے بھاشا کہلائی پھر ناگری اور آخر میں ہندی سے موسوم و معروف کی گئی۔ اس لئے اس جذبۂ رشک اور تنگ نظری کے ساتھ ہندی کی تاریخ پیدائش انیسویں صدی کا آغاز ہے۔ فورٹ ولیم کے مصنفین میں سے اکثر اس جذبہ کے شکار تھے۔ ورنہ زبان میں اس قدر چوڑی خلیج حائل نہ ہوتی۔

اس وقت سے اردو ہندی (قدیم ہندی) سے میری مراد نہیں ہے وہ تو اردو ہی کا ابتدائی نام تھا) دونوں پر نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ اب تک غیر فطری رجحانوں کی کوئی سوسائٹی یا انجمن نہ تھی۔ مروجہ زبان کے خلاف چیخ پکار ہوئی اور پھر اکثریت جب صداقت پر مائل ہوئی تو پرانی لکیر چھوٹ گئی۔ مگر اب حالات کچھ بدل چکے تھے۔ ملک میں ہندی اور اردو کی بحث اس وقت اور زور پکڑ گئی۔ جب انگریز رپورٹروں اور تحقیقاتی کمیشنوں نے فارسی کے بجائے اردو کو دفتری زبان بنانے اور ذریعہ تعلیم تسلیم کرانے کی سفارشیں کیں اردو جب عدالتوں میں اور مدرسوں میں رائج ہو گئی تھی تنگ نظروں کو یہ کھٹکنے لگا۔ عاشق ناشاد کی طرح اپنے ہی گریبانوں پر رشک کرنے لگے۔

اردو یا ہندوستانی کی بنیاد زبانِ عوام پر تھی اس لئے اس کے سمجھنے والے اور بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ملکی و فطری رجحان طبع نے تین تحریکیں نمایاں کیں جن سے اردو فرش سے عرش پر جا پہنچی ان تحریکوں میں فرقہ وارانہ تعصب کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ہر مذہب وملت کے لوگ شریک تھے۔ پہلی تحریک جو فورٹ ولیم کالج کے بعد پیدا ہوئی وہ دہلی کالج سے وابستہ تھی۔ یہ کالج دہلی میں وسیع پیمانے پر کھولا گیا تھا۔ اس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ علمی کتابوں کے ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے جاتے تھے اور اس کی تعلیم بھی ترجمے کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ کالج نے بڑا کام کیا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر بتروس اور اسپرنگر اور ان کے لائق پروفیسر رام چندر اور پیارے لال، مولوی ذکاءاللہ مولانا محمد حسین آزاد کی بدولت اردو علمی زبان بن گئی۔ ہندی کو اس کالج میں روادارانہ جگہ ملی اور ہر فارسی عربی پڑھنے والے طالب علم کا ہندی سیکھنا و نیز سنسکرت لینے والے طالب علم کا اردو سیکھنا ضروری تھا جس سے ہندی سے کالج کا ایک طالب علم بھی بیگانہ نہ تھا۔ یہ کالج موجودہ تعلیمی مسائل کے لئے ایک عمدہ نمونہ ہوتا افسوس کہ زمانے نے اس کو حرفِ غلط کی طرح مٹانا چاہا مگر عثمانیہ یونیورسٹی نے اس کی یاد تازہ کر دی ہے اور انہیں مقبول عام اصولوں پر سب کے لئے یکساں مفید ثابت ہو رہی ہے۔ اس کالج کی برکتیں ہندوستان کو کیا کیا نصیب ہوئیں پوری پوری جب معلوم ہوں گی۔ جب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کی پوری تصنیف "مرحوم دہلی کالج" کا مطالعہ کیا جائے۔

اس سلسلے میں ہندی کے حامیتوں نے کیا کیا، اس کی پوری تفصیل اس مضمون سے ہوتی ہے جو ہندی شبد ساگر کے خاص رکن پنڈت رام چندر شکل نے دیباچے میں ہندی ادب کی تاریخ کے عنوان سے لکھا ہے اور جو اب علیحدہ کتاب کی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ ہندی گد (نثر) کے بکاس (نشوونما) کے سلسلے میں آپ نے ان تمام کوششوں کو سراہا ہے جن کی بدولت ہندی کو اردو کے پہلو میں جگہ دی گئی۔ حکومت کے سامنے کتنے وفد، کتنے ڈپوٹیشن ناکام رہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے۔ حکومت ہند ہندی کو زبان کا مرتبہ اس لئے نہ دیتی تھی کہ نہ تو وہ عہد حاضر کی زبان تھی۔ اور نہ قرونِ وسطیٰ ہی میں کبھی بولی جاتی تھی۔ سرچارلس وڈ اور سر چارلس ٹریولین، جنہوں نے سارے ہندوستان کے دیہات اور قصبوں اور شہروں کا دورہ کیا تھا۔ اپنی سرکاری رپورٹوں میں ہندی کو دہقانی بولی اور اردو دکنی یا ریختہ کو ہندوستانی زبان تسلیم کیا تھا۔ ہندی کے ہنگاموں میں شورش اور جذبات دیکھ کر گورنمنٹ نے اُسے اکثر صوبوں میں جگہ دے دی۔ محکمہ تعلیم کے افسروں اور ڈائرکٹروں نے گورنمنٹ کی اس غلطی کو آشکارا کرنے میں کوئی سنکوچ نہ کیا۔ انہوں نے اپنی سالانہ رپورٹوں اور پرائیویٹ چٹھیوں میں اس پر تاسف کیا۔ مسٹر ہارول ڈائرکٹر صوبہ مغربی و شمالی۔ کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر صوبہ پنجاب، مسٹر کمسن نے اردو کے مقابل ہندی کی ترویج و اشاعت سے نہ صرف اختلاف رائے کا اظہار کیا بلکہ زبان کی اس تفریق سے انہیں کافی صدمہ پہنچا۔ ان مستند شہادتوں کو میں نے ایک دوسری جگہ "مستند شہادتیں" کے عنوان سے جمع کیا ہے۔ یہاں صرف مسٹر ہارول کا خط نقل کرتا ہوں جو انہوں نے موسیو گارساں دتاسی محقق مشرقی زبان کی خدمت میں لکھا تھا۔

"آپ نے اپنے خطبات میں جو خیال پیش کیا ہے میں اس سے بالکل متفق ہوں، اردو کو ہندی پر فوقیت حاصل ہے۔ اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں میں نے ہر ممکن موقع پر اردو کی توسیع و ترقی کی حمایت کی ہے اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں قومی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اس سے میری مراد اردو زبان ہے جو خاص و عام کی سمجھ میں آتی ہے۔ اس بارے میں مسٹر کسٹن جو صوبہ مغربی و شمالی کے سررشتہ تعلیم میں سب سے اعلیٰ عہدیدار ہیں، بڑی حد تک میرے ہم خیال ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ابتدائی مدارس میں یہ طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ اردو یا ہندی میں سے کسی ایک کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ چونکہ اکثریت ہندو طلبا کی ہے اس لئے ہندی کا استعمال بڑھ رہا ہے مسلمان اور بعض ہندو جن کی مادری زبان اردو ہے، اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ میرے خیال میں اردو ہندی کی تفریق قومی نقطۂ نظر سے سخت نقصان رساں ہے یہ زیادہ بہتر ہوتا اگر ہندو بچوں کو اردو سکھائی جاتی۔ بجائے اس کے کہ انہیں اس بولی میں اظہارِ خیال کی مشق کرائیں جو بالآخر ایک دن اردو کے آگے سرِ تسلیم خم کرے گی۔"

(از خطبات گارساں دی تاسی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن)

ہندی کے حامیوں میں اس وقت ایسی ہستیاں کم یاب تھیں جن کی نگاہ ہندو مسلم آمیز ہندوستانی کلچر پر ہو۔ تنگ نظری نے ان کا مقصد زمانہ قدیم کی تہذیب کا احیاء رکھا۔ اس لئے مروجہ زبان ان کی نظروں میں قابلِ قدر نہ تھی۔ انہوں نے اس کا روپ تو عہد فورٹ ولیم ہی میں بدلا تھا۔ اب اس کا ادب بھی ہندوستانی کہہ کر ہندوانی بنا دیا گیا اور ہندی کا ناتا دھرم سے جوڑ کر علانیہ اس خیال کی اشاعت کرنے لگے۔ اس وقت اس جماعت کا یہ عام مسلک تھا کہ ہندی نہیں جانے اُسے ہندو نہیں مانتے۔ معقول پسندوں اور معتدل راہ اختیار کرنے والوں کو جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے، اس تحریک سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ خاموش اپنا کام کر رہے تھے۔ رواداری اُن کا مسلک تھا۔ یہ قضیہ ہندی و اردو لکھتے لکھتے میں اپنے ضمیر کو پراگندہ اور غیر مطمئن پاتا ہوں مگر حیرت ان لوگوں پر ہے جو اردو کو ہندی کا جس کی بنا ہی ہندو نوازی پر پڑی) جواب اور مسلمانی زبان کہہ کر پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ "ہندی لٹریچر" مصنفہ ایف اے کے۔ سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

"جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں شمالی ہند میں ہندی کی بہت سی بولیاں بولی جاتی تھیں مگر ان لوگوں میں جو فارسی نہیں جانتے تھے، شائستہ گفتگو کا ذریعہ اُردو تھا اردو میں بہت سے الفاظ فارسی عربی سے مستعار لیئے گئے تھے جن کا تعلق اسلام سے تھا اس لئے ہندی بولنے والوں کے لئے ایک ادبی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جو زیادہ تر ہندوؤں کو مرغوب ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کو لے کر ایک زبان بنائی گئی اور اس میں سے عربی فارسی کے الفاظ خارج کر کے ان کی بجائے سنسکرت یا ہندی الاصل الفاظ داخل کئے گئے۔"

راجہ شیو پرشاد صاحب چونکہ محکمہ تعلیم میں ایک عرصے تک رہے۔ انہیں ہندی کے تصنع اور بناوٹ کا کچھ تو بذاتِ خود اندازہ ہوا۔ دوسرے چونکہ وہ ڈپٹی انسپکٹر ہونے کی حیثیت سے تعلیمی رپورٹوں اور تجویزوں سے زیادہ باخبر تھے۔ انہوں نے ہندی میں فارسی عربی لفظوں کو اس قدر جگہ دی کہ سوائے رسم الخط کے اُن کی تحریروں اور اُس عہد کی اردو اسلوب بیان و ترکیب الفاظ میں مطلق فرق نہیں معلوم نہیں ہوتا۔ اس طرح ہندی اپنی راہ بھول کر اردو سے جا ملی۔ مگر راجہ لکشمن سنگھ اور ہریش چندر نے سخت نکتہ چینی کی اور شدھ ہندی یعنی سنسکرت آمیز ہندی کے نمونے بکثرت دے کر ہندی کو اردو سے بہت دور کر دیا۔

اس عرصے میں اردو ایک رفتار سے برابر آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ سائنٹفک سوسائٹی ملکی، تمدنی اور خاص کر اقتصادی انجمنوں کو لے کر وجود میں آئی اور بعد کو علم و اخلاق بھی اس کا اعلیٰ مقصد ہو گیا۔ اس سوسائٹی کے بانی مبانی سر سید مرحوم تھے جن کی اعتدال پسندی، رواداری اور بے لاگ کوششوں سے ہندو، مسلمان، عیسائی اُن کے رفیق کار رہے۔ اس دوسری تحریک نے علم و ادب اور سیاست و اخلاق ہر موضوع پر اپنی توجہ صرف کی جس کی بدولت اردو علمی حیثیت سے آگے نکل کر سیاست کے لئے ایک عمدہ زبان بن گئی۔ ہندوستان کے ادب کا رنگ بدلا۔ وسعت پیدا ہوئی اور ایک خاص لیک پر چلنے کی عادت بھی کم ہوئی۔ سوسائٹی کے رسالے تہذیب الاخلاق کا اثر نہ صرف اس سوسائٹی کے ممبروں پر پڑا بلکہ دوسرے اخبارات اور رسالوں نے بھی وہی راستہ اختیار

کیا۔ سادگی عام مذاق کی حیثیت سے اس وقت کے ادب میں مسلم ہوئی اور مغربی علوم سے جو وحشت ہمارے سماج کو تھی قدرے کم ہوئی۔ اس طرح سائنٹفک سوسائٹی نے نہ صرف اردو زبان میں بلکہ اس زبان کے بولنے والے ہندو مسلمانوں میں روشن خیالی، آزادی رائے اور دوسروں کی خوبیوں پر نگاہ رکھنے اور اُسے قبول کرنے کے رجحانات پیدا کئے۔

تیسری تحریک اورنٹیل کالج لاہور سے متعلق ہے اس کالج کا مقصد محض تعلیم و تعلم نہ تھا۔ اس نے ایک صیغۂ تصنیف و تالیف بھی قایم کیا تھا۔ اس کی ابتدا سائنٹفک سوسائٹی کی طرح ایک ایسی انجمن سے ہوئی تھی جو علمی و تاریخی معلومات کو عام کرنا چاہتی تھی۔ اسی کی کوششوں سے یہ کالج قایم ہوا تھا۔ آگے چل کر انجمن کے مقاصد کالج نے اپنے سر لے لئے۔ سائنٹفک سوسائٹی کی طرح اس کے دائرہ عمل میں وسعت و ترقی تو نہ ہوئی مگر تصنیف و تالیف کے سلسلے میں عربی و فارسی و انگریزی کے ترجموں سے اردو کو بڑھایا۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے ہمدوش ہو گئی۔ اب وہ موجودہ صورت میں برابر بڑھتی ہوئی بہت آگے نکل چکی ہے۔

اردو کی ترقی اہلِ ملک کے لئے اسی طرح یکساں مفید تھی۔ جیسے سورج کی روشنی، ہوا اور پانی۔ مگر جو بیج انیسویں صدی میں بو یا گیا تھا۔ اس کی بھی ایک محدود حلقے میں پرورش ہو رہی تھی۔ اردو کی ترقیاں اس جماعت کو کھٹکتی رہیں ناگری پرچار کی ناٹک منڈلیاں، ناگری پرچار کی سبھائیں قایم ہوئیں۔ زور شور سے ہندی پرچار کے لئے اردو کی تخریب شروع ہو گئی۔ کسی نے کہا کچہریوں میں ہندی کو جگہ دلانے سے اس کی ترقی ہو گی۔ کسی نے کہا اردو جب تک رہے گی۔ یہ پنپ نہیں سکتی۔ کسی نے کہا بڑا غضب ہے کہ اردو تو ایسا ریڑھ مار رہی ہے کہ جس کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ ایک صاحب نے تو تفریباً ۳۰ صفحوں کی ایک کتاب لکھی اور رسم الخط پر آ ٹوٹے۔ مثلاً

ریل، ریل اردو میں ایک
ایک بات ہے ٹھیک اور ٹھیک

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اس عیب جوئی کو بُرا سمجھا اور ہندی کی سچی خدمت انہیں اردو والوں کی تقلید میں نظر آئی۔ پنڈت مہابیر پرشاد ویدی نے خواجہ الطاف حسین حالی و مولانا نذیر احمد صاحب کی کوششوں کی طرف ہندی کے طرف داروں کو توجہ دلائی اور مقدمہ شعر و شاعری اور آبِ حیات سے استفادہ کرنے کے لئے ہندی کے والنٹیروں سے اپیل کی اور اپنی تصنیف "رسگیہ رنجن" میں مقدمہ شعر و شاعری کے اکثر حصے ترجمہ کر کے پیش کئے زبان کو عام فہم بنانے کے خیال سے فارسی و عربی سے فیض حاصل کرنے لگے مگر بنیادی مقصد جو بھولتا نظر آیا تو پھر شدھ ہندی نویسی پر مائل ہو گئے اور کہیں اوسط راہ اختیار کی۔ اس طرح اس عہد کی ہندی تحریریں تین قسموں میں رکھنی پڑیں ہندی سدھار کا مجاہد اعظم یعنی مہابیر پرشاد دیویدی بھی اپنی ہندی تحریر کو اس تقسیم سے نہ بچا سکا یعنی یک رنگی کے بجائے ان کی ہندی بھی ترنگی نظر آنے لگی۔

پہلا رنگ:۔ جس میں ہندی الاصل الفاظ ہوں (مطابق پروگرام) اس کا نام شدھ ہندی رکھا گیا۔

دوسرا رنگ:۔ وہ ہندی جس پر اردو کا سایہ ہے۔ اس کا نام ہوا اشٹ ہندی۔

تیسرا رنگ:۔ وہ ہندی جو با وجود کوشش اور طبیعت پر زور ڈالنے کے بھی صاف نہ ہوئی۔ اور اردو سے مشابہ ہے۔

ہندی کو خالص ہندی الاصل بنانے کی کوشش شروع ہی سے ہندی والوں کے طبقہ میں معرضِ بحث میں پڑ گئی تھی۔ فارسی عربی لفظوں کا استعمال بول چال میں ہوتا ہی تھا۔ قلم اٹھاتے وقت بھی وہ فوراً حاضر ہوتے تھے۔ اس لئے پنڈت بھیم سین نے اس سے بہت پیشتر یہ تجویز پیش کی کہ ایسے لفظوں کو اب ہم لوگ سنسکرت کے ڈھانچے پر ڈھال سکتے ہیں۔ مروج فارسی و عربی لفظوں کی ایک لمبی فہرست مع اُس کے بدل الفاظ کے پیش کی۔ یہ جدت ہندی والوں کی ذہنیت کا پتہ دیتی ہے کہ وہ اپنی زبان کو اردو سے کیوں نہیں ملنے دیتے۔

آپ فرماتے ہیں کہ:۔

ا۔ چشمہ کو جو آنکھوں پر لگایا جاتا ہے اس آنکھ کی نسبت سے چکچار چکھ (آنکھ) کہا جائے۔

۲۔ سفارش کا ترجمہ نہیں تو ماہیت چھپرا اشنش سے کیا جائے

۳۔ انتقال کا بدل انت کال یعنی دم آخر ٹھہرایا جائے۔

مگر ہندی کے اس پر جوش حامی کی غیر معمولی اور نرالی سوجھ نہ تو قابل عمل ہو سکی اور نہ قابل قدر متصور ہوئی۔ کیوں؟ اس بارے میں اس وقت کے زبردست یورپین مستشرق کی رائے نقل کرتا ہوں جو نہایت ضبط و تحمل سے ان تماشوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے خطبہ ۱۸۶۶ء میں لکھتا ہے:۔

میرے خیال میں اردو کے مقابلے میں ہندی کی جانب توجہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے آج کل کی جدید یونانی کے بجائے قدیم یونانی کی

طرف توجہ کی جائے تعجب اس بات پر ہے کہ اردو کی مخالفت بھی ہے (ادبی چراغ علی) اردو کی تصانیف بھی دیوناگری رسم خط میں چھاپی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ابھی حال میں دیوان نظیر اور میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور دوسری تصانیف جن کی زبان خالص دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ دیوناگری کے رسم خط میں طبع کی جا رہی ہیں۔

. . . مسٹر جے۔ بیمز نے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی میں جو مضمون پڑھا ہے اس میں اس امر کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے . . . . موصوف اپنے سات سال کے تجربے کی بنا پر کہتے ہیں کہ اردو ہندوستانی کی مہذب ترین شکل ہے، اس میں اعجاز و فصاحت بدرجہ اتم موجود ہے۔ موصوف نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ دوآب گنگا کے رہنے والوں کی گھٹی میں یہ زبان شامل ہے۔ انہیں اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اردو سے عربی فارسی الفاظ کو خارج کرنا ایسا ہی ہے جیسے آپ انگریزی زبان سے لاطینی زبان نکالنے کی کوشش کریں اور چاہیں کہ اس میں صرف سکسن اصل کے الفاظ باقی رہیں — زبانیں اس طرح ارادہ کرنے سے نہیں بنائی جاتیں۔ زندگی کی ضروریات سے ان کی ساخت میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ سیاسی فتوحات تجارتی تعلقات، ادبی اور علمی ضرورت سے زبان میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور اس میں الفاظ داخل ہوتے ہیں۔ قابل مضمون نگار نے بڑی خوبی سے یہ بات بتائی ہے کہ جس طرح انگریزی میں المانی اور لاطینی عنصر موجود ہیں اسی طرح اردو میں آریا اور سامی یا اسلامی عنصر موجود ہیں . . . ایم بیمز کا خیال ہے کہ اردو میں عربی فارسی سے جو الفاظ مستعار لئے گئے ہیں۔ وہ مطالب کو بہ نسبت دیسی الفاظ کے زیادہ اچھی طرح واضح کرتے ہیں . . . اگر دوسری زبانوں کے الفاظ مستعار لے کر کام نکل سکتا ہے تو لمبے لمبے غیر مانوس الفاظ تراشنے سے کیا فائدہ بنگالی میں الفاظ تراشنے کا کام ہو رہا ہے لیکن اس سے اس زبان کو کوئی خاص ترقی حاصل نہ ہوئی۔ ہندوستانی (اردو) ہر جگہ بنگالی کے مقابلے میں کامیاب نظر آتی ہے۔"

حقیقت سات پردوں سے آشکار ہو کر رہتی ہے حقیقی اور زندہ زبان کی خوبیوں پر جتنا بھی پردہ ڈالا گیا وہ اور نمایاں ہو اٹھتی ہے۔ اس پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں وہ اُلٹ کر معترض پر پڑ جاتے ہیں۔ یہ زندہ زبان کا معجزہ ہے یہ ہے چپ کی داد۔

بہاری کا یہ دوہا اس موقع کے حسب حال ہے:۔

سلجے موہن موہ کو موں ہی کرت کچین
کہا کروں الٹو پرے ٹونے کو نے نین

مجہول مجہول

اپنی منقاروں سے خود کستے ہیں پھندا جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

زندہ زبان میں ایک کشش ہوتی ہے جو ذوق و نظر کو خود بخود دعوت دیتی ہے۔ اردو میں وہ کشش موجود ہے جن کی آنکھیں حقیقت کو دیکھ کر بند نہیں ہو جاتیں وہ اس کو اپنی پیاری زبان سمجھ کر اس کی تخریب نہیں کرتے اور اپنی وسعت کے اندر خدمت بھی کرتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بھی ہیں جن کی نگاہ محض عیبوں پر پڑتی ہے یا وہ خوبیوں کو پی جاتے ہیں عصبیت نفرت پیدا کر دیتی ہے تب آدمی دوسروں کی تو سنتا نہیں اپنی ہی تک سنائے جاتا ہے۔ ہمارے ملک کی ہوا کچھ ایسی بگڑ رہی ہے کہ بلا استثناء ہندو مسلمان اس قسم کے مرض میں گرفتار ہیں پھر وہ سچائی کے گھاٹ نہیں لگتے انہیں تصویر کا ایک ہی رُخ دکھائی دیتا ہے۔ اردو سے نفرت رکھ کر کتراتے پھرنے والے بھی اس مرض کے بُری طرح شکار ہیں۔ وہ ایسی عبارت کو جو اردو رسم خط میں ہو ہاتھ نہیں لگاتے بھلا حقیقت سے کیونکر آشنا ہو سکتے ہیں۔

جن لوگوں نے اردو ادب و لٹریچر کو پڑھا۔ دیکھا اور اس پر غور کیا وہ اُس کی سہولت اور سادگی کے مداح ہیں اور زندہ زبان کی اُن خوبیوں سے جس سے وہ زندہ ہے ہندی میں بھی روح پھونکنا چاہتے ہیں۔ پنڈت رام نریش ترپاٹھی اپنی "کبتا کومدی کی بھومکا (دیباچہ) میں لکھتے ہیں۔

ہندی بحروں میں اردو کی پیروی کرنے کی صلاح

ہندی کب کو ایسا سو بھاگ نہیں پراپت (حاصل) ہے۔ اس کے سامنے بڑا بندھن ہے جو روڑا جیسا ہے اُسے بلا کانٹ چھانٹ کئے ویسا ہی جانا پڑتا ہے اُسے ذرا بھی کانٹ چھانٹ کرنے کا ادھیکار نہیں ہے وہ آنند (اول نون مفتوح اور دوسرا ساکن ملفوظ) کو آنند (دوسرا نون غنہ) بھی نہیں کر سکتا اس کے پاس کی زمین بڑی کھاڑے۔ اسے ہو کر اسے کا سنکا

راستہ ہے اردو کویوں نے اس تکلیف کو سمجھا ہے انہوں نے کچھ اونڈ تاریجا تعرف) سے کام لیا ہے . . . (تقطیع میں حروف کے گر جانے پر بلا وجہ ناک بھوں سکیڑنے کے بعد) اب ایسا کرنے کے لئے ہندی کے کچھ کب اردو والوں ہی کا راستہ پکڑنا چاہتے ہیں۔

(ہندی ساہتیہ کا سنجھت الناس)

ہندی نثر میں اردو کے اسلوب بیان اختیار کرنے کی سفارش

"جب ہندو مسلمانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے تو ایک کو دوسرے کی بیش بھوشا (بھیس بھاؤ وضع قطع) سے نفرت کیوں (ہونی چاہئے۔ پرتیک (ہر ایک) ہندو کو اردو سیکھنی چاہیئے اور پرتیک (ہر ایک) مسلمان کو ہندی میری تو دوڑھ دھارنا (اٹل رائے) ہے کہ کوئی بھی ہکینت شخص (اردو جانے بنا ہندی کا سیلیکھک (اچھا انشاپرداز) نہیں ہوسکتا۔ اب تک اردو کی بھاشا شیلی (اسلوب بیان) کئی انشوں میں ہندی سے بڑھ کر ہے۔ اردو میں محاوروں کا جیسا سندر پریوگ (عمدہ استعمال) دیا ہی لیکھک کر سکتے ہیں جو اردو جانتے ہوں" اس لئے ثابت ہوا کہ ہندی اردو کو گلے ملنے کو لپکتی رہی ہے اور ایک ہی دور میں مختلف قسم کی نگارش کے نمونے ملتے ہیں۔ بیسویں صدی میں کچھ ادیب اس قسم کے ہوئے جن کا تعلق اردو ہندی دونوں سے رہا و نیز انگریزی ادب کا پرتو دونوں پر یکساں پڑنے لگا۔ اور ایک زبان عام بنانے کی فکر ہوئی۔ چندر شیکھر گولیری اور مرحوم پریم چند، سدرشن نے ہندی کی قدامت پسندی کی علانیہ عملی مخالفت کی بشن ناتھ در اور بالمکند گپت نے بہت کچھ ہندی کو اردو سے ہم آہنگ کر دیا مگر کاشی کی ناگری پرچارنی سبھا کے زاویہ نگاہ میں کچھ ایسی تبدیلی ہوئی کہ "شدھ ہندی نویسی" کا جذبہ طوفانی بن گیا۔ وہ تحریریں لفظوں سے گرگئیں۔ جس میں دوست کے بدلے متر، پاکے بدلے، انھوا، اگر کی جگہ یدی، لیکن کے بدلے کنتو، گاؤں کے بدلے گرام۔ شہر کے بدلے نگر، کام کے بدلے کاریہ اور بیٹھنے کے بدلے مرِد کا استعمال نہ ہو۔ ناگری پرچار کے سلسلے میں قدامت پرستی کی خوب خوب اشاعت ہوئی۔ آلو امریکہ سے آکر ہندوستان میں پھیل گیا۔ ہندی نے اقصائے ہند میں اپنی شاخیں کھول دیں۔ اپنے سٹور اس نے ہندی ساہتیہ سمیلن اور ناگری پرچارنی سبھا کے نام سے اسی طرح ان وراوڑی حلقوں میں بھی کھولے ہیں جہاں آریائی عنصر سے زیادہ اسلامی تہذیب کے عناصر نے نقش قایم کر دیا ہے۔ کاش کہ ان مجلسوں کا مقصد زندہ زبان کی اشاعت

ورد ارج ہوتا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ اردو ہی اصل ہندی ہے، ہندی آگے نکل چکی ہے۔ قدامت پسندی عہد طفولیت کو قایم رکھنے کی مضحکہ انگیز کوشش کر رہی ہے۔ قدامت پسندی ہی ہے جو کبھی ہندی سے دھرم کا ناتا جوڑتی ہے۔ قدامت پسندی ہی ہے جو ہندوستانی کے بدلے بھارت ساہتیہ پرشد میں ہندی۔ ہندوستانی کا بے معنی مرکب لفظ وضع کراتی ہے جو پچھ پنج سالہ سے بڑھ کر تیس سالہ جوانوں میں داخل ہو چکا ہے ناممکن ہے کہ اس کا بچپن واپس لایا جائے۔

نورنامے کی بحر متقارب کی مثنوی کا نام ہندی ہی تھا۔ اردو رسم الخط اور اردو بحر میں لکھا گیا تھا۔ اب بھی ان کی پرانی اردو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ خسرو کے تمام کارنامے جو فارسی زبان میں نہ تھے ہندی ہی سے موسوم ہیں جو اردو کی ابتدائی شکل ہے۔ مصحفی اور انشا نے بھی ہندوستانی زبان کو اکثر ہندی کہا۔ جب ہندی کی مختلف بولیوں میں اس ہندی کو فروغ ہوا اور وہ ممتاز ہوگئی۔ اس وقت اس کا نام بدلا۔ پہلا نام بھی ہماری زبان کا صفاتی تھا۔ ذاتی نہ تھا۔ اور دوسرا نام زبان ریختہ۔ زبان اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد تھا۔ جو مختصر ہونے ہوتے اردو ہو کر رہ گیا اور آخیر میں ہندوستانی کا نام بھی صفاتی ہی ہے۔ ہماری زبان نے ترقی کی منزلیں قدرت کے اٹل قانون کے مطابق طے کی ہیں۔ ہندی نام اگر ایک مخصوص معنی میں مشہور نہ ہو گیا ہوتا تو یہ لفظ ہندی ہندوستانی سے بہتر زبان ہند پر اشارہ کرتا۔ مگر سب سے عمدہ فیصلہ انڈین نیشنل کانگرس کا تھا کہ ہندوستان کی زبان ہندوستانی کے نام سے موسوم ہوگی خواہ ناگری رسم خط میں ہو یا فارسی خط میں، "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کا کانگرس کے فیصلے کو نہ ماننا صاف ظاہر کرتا ہے کہ ہندی، ہندوستانی کی کسوٹی پر صحیح نہیں اتر سکتی۔ جبھی تو باوجود اس کے جناب مولوی عبدالحق صاحب نے جب پرشد کے اس ریزولیوشن کی ترمیم کی معقول وجہیں پیش کر کے مہاتما گاندھی جی کو ریزولیشن میں زبان ہند کے مجوزہ نام کے نقص بتا کر لاجواب کر دیا تو انصاف کے بجائے انہیں طاقت کو کام میں لانا پڑا اور انہوں نے کہا۔

(۱) کانگرس کے ریزولیوشن میں نے بنائے تھے۔

(۲) میں نے اس کے (ہندی، یعنی ہندوستانی) کے معنی سمجھا دیئے ہیں جو آپ نے منشی کی تحریروں میں دیکھے۔

(۳) میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔

اور جب اس پر موصوف نے مہاتما جی سے کہا کہ آپ نیشنل کانگرس

کے فیصلہ کے ساتھ کیوں نہیں چلتے تو جواب میں فضا کی خاموشی تھی۔ حالانکہ وہاں کانگرس کے سینکڑوں افراد اور تین تین صدر موجود تھے۔ گاندھی کی خاموشی سے تو مجھے تعجب نہیں مگر دیش کے مایہ ناز سپوت جواہر لال کی خاموشی حیران اور ششدر کر دیتی ہے۔ گاندھی جی کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ یہ بھی ہے کہ اگر ریزولیوشن میں تنہا "ہندوستانی" کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اردو سمجھا جائے گا۔ اس سے ہندی کی کمزوری صاف ظاہر ہو رہی ہے اور یہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ اردو، ہندوستانی کی کسوٹی پر صحیح اترتی ہے۔ اسی خطرے نے ہندی ہندوستانی کا جد بد مرکب لفظ وضع کرایا ہے

اس طرح ہم دیکھ رہے ہیں ہر دور میں تعمیری اور تخریبی کوششیں ہندی کو ٹیڑھی میڑھی رفتار سے آگے بڑھا رہی ہیں اور اس کش مکش میں بازی قدرت کے ہاتھ رہی ہے اور انسانی کوششیں قدرتی زبان کے آگے جھک رہی ہیں۔ آخر اس ہندی کو ہندی ہندوستانی بنانے میں بھی قدامت پسندی کا زور کچھ نہ کچھ ٹوٹا ہی ہے۔ اخباروں میں "پرارمبھک شکشا" کے بدلے کا کا کالیکر کی وار دھا سکیم ہی کے ڈھلے ہوئے لفظوں میں سے "پارتھمک تعلیم" کا بدل سامنے آ چکا ہے۔ نئی سوجھ بوجھ کی نرالی ترکیبیں کم سے کم اتنا تو ضرور کریں گی کہ چار چار انگل کے ساسک مرکبات ہندی سے اڑ جائیں گے اور اگر ہاتھی کے دانتوں کی طرح محض دکھلانے کے لئے ہیں تو پھر ڈھول کی پول کھولنے والے ہندی حلقہ سے نمایاں ہوں گے اور در حقیقت زبان کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ وہ آلہ راز داری بنائی جائے۔ یہ راز داری زبان کو محدود اور خیالات کے میدان کو تنگ کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے ہندی زبان کی سچی خدمت کرنے والوں نے ایسے مصنفین اور انشا پردازوں کی کھری تنقیدیں کیں اور ان کی شان ادبی گناہ گار یا مجرم کی ہو گئی ہے۔

(۱) پنڈت راما کانت ایم اے مصنف گدیہ میمانسا نے للو جی لال کے بارے میں صاف صاف لکھ دیا کہ پنڈت جی نے فارسی عربی لفظوں سے تو پرہیز کیا ہی تھا سنسکرت میں ایسے لفظوں کو بھی چھوڑ گئے جو ٹھیٹ ہندی تھے اور ان کے بدلے یا تو ایک جملہ وضع کیا یا سنسکرت کے آگے ہاتھ جوڑے۔

(۲) بھیم سنگھ کے دماغ کی جدت ان کے لئے کلنک کا ٹیکا بن گئی آج چشمہ کے بدلے چکچھا اور سفارش کا دِپ چھپر اشش سنسکرت ہندی ادب کا مبتدی بھی ہنس دیتا ہے۔

(۳) پنڈت چندر شیکھر گولیری نے ہندی نثر و نظم کی بدلی ہوئی صورت کے خلاف اپنی سچی رائے پیش کر دی اور صاف لکھ دیا اردو نثر و نظم موجودہ ہندی کے گد (نثر) پد (نظم) سے پہلے معرض وجود میں آ چکی تھی۔

(۴) پنڈت پریم چند نے پنڈتاؤ بھاشا کے خلاف بنارس (جو ہندی کا مرکز بنایا گیا ہے اور ہے بھی) میں مجمع عام میں کھلے خزانے کہہ دیا کہ ہندی کو اردو پن سے جس قدر دور لے جائیے گا بھاشا مردہ ہو جائے گی۔ یہ لکچر غالباً اہنائے وطن کو بھولا نہ ہو گا۔

اردو سے کوئی ہزار کترائے مگر اس سے پرہیز مشکل ہے۔ ملک کی فطری زبان آب و ہوا اور پیداوار سے بالکل مشابہ ہے جس طرح ایک جگہ کے رہنے والوں کے لئے مختلف فضائیں نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح دو مختلف زبانیں بھی نہیں ہو سکتیں۔ اردو کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ اس لئے اس کی تازگی سب کو بھاتی ہے۔ ماحول کی خوشبو اس میں بس گئی ہے اس لئے اس کی طرف سب بڑھیں گے تہذیب حاضرہ سے وہ برابر مقابل رہی ہے اس لئے اس میں طاقت اور زور ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا دم خم ہر دل کو پر زور بناتا ہے۔ اس کے تیر و نشتر کی لذت کے لئے ہر دل مشتاق نظر آتا ہے۔

اردو کی شان میں وہ لوگ بھی تر زبان نظر آئیں گے جو آج اس سے کتراتے پھرتے ہیں۔ مگر وہ یہ کہتے ہوئے نظر آئیں گے۔

بدور گر دی من از غروری خندد
حریف سخت کمانے کہ در کمین و ارم

چراغ علی

"ساقی"

دُنیائے کاروبار

ہندوستان میں سیمنٹ سازی کا فروغ

ہندوستان کی جدید ترین صنعت

پچھلے چند سالوں میں ہندوستان کی جدید ترین صنعت یعنی سیمنٹ سازی نے تھوڑے ہی عرصے میں ترقی کی منازل طے کرکے ہندوستان کی قومی اور اقتصادی خوشحالی میں اس قدر نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور اس کی مدد سے دوسری گھریلو صنعتوں کی ترویج و ترقی کے لئے ایسے سامان بہم پہنچائے ہیں۔ کہ اس نے ہر ایسے روشن خیال انسان کی توجہ اپنی جانب منعطف کرلی ہے جس کے پیش نظر ملک کی موجودہ مشکلات تھیں اور وہ حیران ہے کہ یہ معجزہ کس طرح ظہور میں آیا۔

ہم چاہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل سطور کے ذریعے سے نہائت مختصر طور پر ہندوستان میں اس صنعت کی ترویج و ترقی پر کچھ روشنی ڈالیں اور بتائیں کہ اس صنعت کو منظم کرنے والی جماعت کس طرح ملک و قوم کی خدمات بجا لا رہی ہے۔ اور کس طرح ملک کی ترقی اور دیہات سدھار جیسے اہم امور میں ممد و معاون ہے۔

عام طور پر لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ سیمنٹ قدیم رومیوں کے عہد میں بھی بنایا جاتا تھا۔ اور موجودہ پورٹ لینڈ سیمنٹ کا موجد ایک انگریز معمار جیمز ایسپڈن تھا۔

عوام اس بات کو نہیں جانتے کہ سیمنٹ کوئی نئی ایجاد نہیں ہے۔ یہ صنعت کو نہ صرف قدیم رومی ہی جانتے تھے بلکہ قدیم ہندی بھی اس کی ساخت میں ماہر تھے۔ اس کا زندہ ثبوت برطانیہ میں پرانی سڑکیں اور قلعے ہیں۔ اور ہندوستان میں مشہور مصنف وراہ میہر کی کتاب برہت سمہتا کا وہ نسخہ ہے۔ جس میں ایک خاص پائدار اور مضبوط مسالہ تیار کرنے کی ترکیب درج ہے۔ کئی صدیوں تک یہ فن لوگوں نے بھلائے رکھا لیکن ایک مشہور انگریز انجینئر جان سمیٹن نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اسے پہلے سے کئی گنا بہتر صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے باوجود ہماری تحسین کا صحیح حقدار ایک انگریز معمار جیمز ایسپڈن ہے جس نے پورٹ لینڈ سیمنٹ کو اس کی موجودہ صورت میں ایجاد کیا اور سنہ ۱۸۲۵ء میں اس کا پہلا کارخانہ بھی قائم کیا۔

ہندوستان میں سب سے پہلے ساؤتھ انڈین انڈسٹریلز لمیٹڈ مدراس نے اپنی جرأت و ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے سنہ ۱۹۰۴ء میں مدراس میں سیمنٹ کا پہلا کارخانہ جاری کیا۔ اس کارخانے کی مشینیں بہت چھوٹی تھیں اور ان کا طریق کار فنی لحاظ سے موجودہ زمانے کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا چنانچہ انہیں خامیوں کی وجہ سے اور غالباً زیادہ لاگت اور حوصلہ افزائی کی کمی نے آخرکار اسے کاروبار بند کرنے پر مجبور کر دیا۔

چنانچہ صحیح معنوں میں اس صنعت کی بنیاد سنہ ۱۹۱۲ء میں رکھی گئی۔ کیونکہ اسی سال انڈین سیمنٹ کمپنی لمیٹڈ رجسٹر کرائی گئی اور اس نے پوربندر میں اپنا کام جاری کیا اس کے بعد آئندہ دو سال کے اندر اندر کٹنی اور بوندی کمپنیوں کا اجرا عمل میں آیا۔ شروع شروع میں ان کمپنیوں کا مال بھی نہائت محدود مقدار میں تھا۔ لیکن ابھی انہوں نے کام جاری ہی کیا تھا کہ جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ بدیشی مال آنا بند ہو گیا اور یہ بغیر کسی مقابلے کے تمام ہندوستان کی ضروریات کی واحد اجارہ دار بن گئیں۔ ان کارخانوں کی کامیابی نے قدرتی طور پر ملک کے سرمایہ داروں کی توجہ کو مرکوز کر لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۲۳ء تک ہندوستان میں ۹ بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے۔

ہندوستان کی قدامت پسندی

بدقسمتی سے ان صناعوں نے اپنے جوش و خروش اور بڑی بڑی امیدوں میں اس نکتہ کو پس پشت ڈال دیا کہ ہندوستان ایک قدامت پسند ملک ہے۔ اور اپنی

عادات وخصائل رواج اور تعمیر کے طریقوں کے بدلنے میں نہائت سست واقع ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ اول تو یہ ہوا کہ ان کارخانوں نے ضرورت سے زیادہ مال تیار کر ڈالا اور دوسری خرابی یہ ہوئی کہ بہت سے نئے کارخانے انہیں علاقوں میں قائم ہو گئے۔ جہاں پرانے کارخانے کام کر رہے تھے۔ اِن دو امور نے ان کو قدرتی طور پر قیمتوں کے مقابلتاً گھٹانے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے مال کی نکاسی کے لئے ہر قیمت قبول کر لی۔ اور دُور دراز علاقوں میں مال پہنچانے کے اخراجات قبول کر لئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو کارخانوں کا دیوالہ نکل گیا۔ اور باقیوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔

اب سیمنٹ سازوں کو موقعہ کی نزاکت کا احساس ہوا۔ انڈین سیمنٹ مینوفیکچررز ایسوسی ایشن کی بنیاد ۱۹۲۵ء میں رکھی گئی اور ان کی کوششیں ایک مناسب قیمت مقرر کرنے میں کامیاب ہوئیں۔

سیمنٹ سازوں کو اب ہوش آیا اور موقع کی نزاکت کو دیکھ کر وہ متحد ہو گئے اور سرکار سے بدیشی مال کے مقابلے سے تحفظ کی درخواست کی لیکن ٹیرف بورڈ کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یہ تمام بدنظمی ضرورت سے زیادہ مال کی تیاری کی وجہ سے ہے۔ جسے ناواجب مقابلے نے اور بھی بڑھا دیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں سرکار کی طرف سے انہیں کوئی امداد نہ دی گئی۔ ٹیرف بورڈ نے سرکار سے مالی امداد کی سفارش کی لیکن سرکار نے اسے بھی منظور نہ کیا۔ اب کارخانہ داروں کے لئے صرف ایک ہی نجات کا راستہ کھلا تھا۔ اور وہ یہ کہ اگر وہ اس تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو انہیں متحد ہو کر باہمی تعاون پر کاربند ہونا چاہیئے۔ اس دانشمندانہ فیصلے پر کاربند ہوتے ہوئے ۱۹۲۵ء میں انڈین سیمنٹ مینوفیکچررز ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس ایسوسی ایشن نے نہائت کامیابی کے ساتھ قیمتوں کو ایک اقتصادی سطح پر لانے کی کوشش کی جس نے اس صنعت کو نئے سرے سے زندگی بخشی۔

اس حقیقت کو اب ایک دنیا تسلیم کر چکی ہے کہ "اشتہار ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہے"۔ کنکریٹ ایسوسی ایشن کی بنیاد ۱۹۲۷ء میں رکھی گئی۔

اس کے بعد دوسرا قدم یوں اٹھایا گیا کہ ضرورت سے زیادہ مال کی کھپت کے لئے مانگ پیدا کی گئی۔ موجودہ زمانے میں کوئی تجارتی ادارہ خواہ اس کی تنظیم کیسی ہی عظیم الشان ہو اور خواہ اس کی بنیادیں کتنی ہی مضبوط ہوں۔ تجارتی مقابلوں کے موجودہ دور میں اپنی مصنوعات کی اشاعت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تجارتی ترقی کے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اپنی اشیاء کی غیر معمولی خوبیوں کو ہر وقت عوام کے پیش نظر رکھا جائے۔ اسی اصول کے پیش نظر ۱۹۲۷ء میں کنکریٹ ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی گئی جس کا اولین مقصد یہ تھا کہ پبلک کو سیمنٹ کے استعمال کے مختلف طریقے بتائیں جائیں۔ اور ہر معاملے میں ان کو فنی لحاظ سے مفت مشورہ دیا جائے۔ اس ایسوسی ایشن کا مفید کام بہت جلد پھل لے آیا۔ مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے رسالے چھپوا کر مفت تقسیم کئے گئے۔ جن میں بتایا گیا کہ عمارتی کام کے لئے سیمنٹ بہترین مصالحہ ہے۔ اور یہ کہ سیمنٹ کو کامیابی کے ساتھ کن کن کاموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر ساتھ ہی ساتھ "انڈین کنکریٹ جرنل" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا گیا جس میں کنکریٹ کی مدد سے تعمیر کرنے کے مختلف طریقے بتائے گئے جو عوام کے لئے اور انجینیروں کے لئے یکساں طور پر مفید تھے۔ یہ تمام کوششیں بار آور ہوئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو سیمنٹ پر اعتماد پیدا ہو گیا اور موجودہ نسل کے دلوں میں سیمنٹ کا سکہ بیٹھ گیا۔ چنانچہ قدرتی طور پر سیمنٹ کی کھپت بڑھ گئی اور آہستہ آہستہ اس صنعت نے فروغ حاصل کرنا شروع کر دیا۔

شاہراہ ترقی پر ایک اور قدم آگے بڑھایا گیا۔ اور ۱۹۳۰ء میں سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ کی بنیاد رکھی گئی۔

سیمنٹ کی بڑھتی ہوئی مانگ نے سیمنٹ سازوں کو باہمی تعاون میں ایک دوسرے سے اور قریب کر دیا چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جادۂ ترقی پر ایک اور قدم بڑھایا گیا اور سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ معرض وجود میں آئی۔ اس کمپنی کے ماتحت کارخانوں کے مال کی فروخت کا انتظام مجموعی طور پر کیا جانے لگا اور تمام کمپنیوں کی مال تیار کرنے کی مقدار مقرر کر دی گئی۔ مشترکہ سرمائے سے نشر و اشاعت کا کام بجائے کسی ایک کمپنی کے مخصوص مال کے مجموعی طور پر کیا گیا اور مال کی نکاسی کے لیے بہتر صورت حالات پیدا کی گئی۔ قیمتِ فروخت میں بھی کافی تخفیف کر دی گئی۔

سیمنٹ ایسوسی ایشن سے متحدہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں دفاتر کھولے گئے اور ان میں سیمنٹ کنکریٹ کے کام کے ماہر انجینیر مقرر کئے گئے۔

ہر ایک اہم مقام میں سیمنٹ کے تاجر کے پاس مال کا ذخیرہ رکھا گیا تاکہ عوام کو کم یا زیادہ مقدار میں ہر وقت سیمنٹ رعائتی قیمت پر مہیا ہو سکے اور انہی تاجروں کے ذریعے سے پبلک کو ان کی اپنی زبان میں سیمنٹ کو ہزاروں طریقوں پر استعمال کرنے کی ہدایات دیئے جانے کا انتظام کیا گیا۔

تعمیر کے لئے سیمنٹ کا استعمال مسلّمہ طور پر کفائت شعاری کا مترادف ہے۔

متعدد تجربوں کے بعد سیمنٹ کے لئے ایک ایسا پیکنگ تیار کیا گیا۔ جو سیمنٹ کو برسات کے دنوں میں یا دور دراز علاقوں میں بھیجنے یا زیادہ دیر تک ذخیرہ رکھنے پر بھی خراب نہیں ہونے دیتا۔ پیکنگ کا یہ طریقہ نہائت کامیاب رہا اس دانشمندانہ

طریقِ کار اور متواتر و مسلسل اشتہارات کی وجہ سے دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی سیمنٹ آہستہ آہستہ بطورِ بہترین عمارتی مسالہ کے اپنی جگہ بناتا گیا۔ اور اس طرح تعمیر کے جدید طریقے بہتر قسم کی عمارات کے بننے میں ممد و معاون ہوئے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی کو ملک کے طول و عرض میں مال فروخت کرنے میں نمایاں کامیابی ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی کمپنی کی راہ میں ایک بھاری رکاوٹ بھی تھی اور وہ یہ کہ محدود مال کی تیاری میں وہ ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات پر آسانی کے ساتھ قابو نہ پاسکتے تھے۔

اب یہ عقدہ آن پڑا کہ اگر اس صنعت کو اقتصادی طور پر کامیابی کے ساتھ بڑھانا یا کم از کم موجودہ خوشحالی کو قائم رکھنا ہے تو نہ صرف مال کی تقسیم کے سلسلے میں بلکہ ان علاقوں میں جہاں مال کی کھپت دوسرے علاقوں سے زیادہ تھی نئے کارخانوں کے اجرا کے سلسلے میں ایک نئے انتظام کا جاری کرنا لابدی تھا۔

اس مقصد کے حصول کے لئے ایک مرکزی کمپنی بنائی گئی جسے یہ کام تفویض ہوا کہ وہ سیمنٹ کے تمام کاروبار کو از سرِ نو منظم کرے۔ نہ صرف فروخت اور فروخت کی قیمت کے تقرر میں بلکہ سیمنٹ کی تحدید۔ تنظیم اور نئے کارخانوں کے لگانے کے ضمن میں بھی جہاں اور جب بھی ان کی ضرورت پڑے اور پھر ساتھ ہی اس کا اہم ترین فرض اقتصادی طور پر مناسب تقسیم بھی ہو۔

اس مرکزی کمپنی کے وجود سے ایک اور فائدہ بھی پیشِ نظر تھا مثلاً کوئلے اور تھیلوں وغیرہ کی تھوک خرید پر رعایت۔ اب مقررہ مقداریں مال تیار کرنے کا طریقہ بھی منسوخ کیا جاسکتا تھا۔ اور جن علاقوں میں لاگت زیادہ تھی ان علاقوں کے کارخانوں سے پورا کام لیا جاسکتا تھا اور جن علاقوں میں لاگت کم تھی وہاں کے کارخانوں کے مال کی مقدار محدود کی جاسکتی تھی۔

ہندوستان کے صنعتی بادشاہ مسٹر ایف۔ ای ڈنشا کی دور رس نگاہیں اس تجویز کی خوبیوں کو بھانپ گئیں اور انہوں نے اس پر صاد کر دیا۔

اس تجویز کے فوائد اور آئندہ کامیابی کے امکانات اس قدر زیادہ اور یقینی تھے کہ مسٹر ڈنشا مرحوم نے اسے بہت سراہا۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۶ء میں ایسوسی ایٹڈ سیمنٹ کمپنیز آف انڈیا لمیٹڈ کے نام سے یہ کمپنی بھی معرضِ وجود میں آئی۔

اب بمبئی اور مدراس میں کنکریٹ سکول قائم کئے گئے ہیں جہاں ملک کے مختلف حصوں کے نوجوانوں کو اس فن کی تعلیم دی جاتی ہے۔

نئے انتظامات کے ماتحت نشر و اشاعت کے کام پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں اخبارات کے ذریعے سے اشتہارات دینے کے علاوہ اس موضوع پر چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کئے جاتے ہیں۔ "انڈین کنکریٹ جرنل" میں مفید اور مفصل مضامین کا سلسلہ جاری رہتا ہے بمبئی اور مدراس میں کنکریٹ سکول قائم کئے گئے ہیں۔ جہاں ملک کے ہر حصہ سے نوجوان آکر مفت تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ انہیں کنکریٹ ملانے اور اس کے استعمال کرنے کے مختلف طریقوں کی عملی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ طریقِ عمل ملک کے لئے اور اس صنعت کے لئے نہایت مفید ثابت ہو رہا ہے۔

طلبا زیادہ تر سب اور سیر اور مستریوں کی جماعت سے ہیں۔ یہ سکول سیمنٹ کے استعمال کرنے کے مختلف طریقوں سے عوام کو آگاہ کرنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔ یہ سکول خاص طور پر اس لئے کھولے گئے تھے کہ نوجوانوں کو عملی طور پر ان طریقوں سے آگاہ کریں جن کا ذکر ایسوسی ایشن کے شائع کردہ رسالوں میں درج ہے۔ طلبا عام طور پر سب اور سیر اور مستریوں کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کی تعلیم تعمیر کے تمام ابتدائی اصولوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ مثلاً فرش بنانا۔ پلستر کرنا۔ رنگین سیمنٹ کا کام وغیرہ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں بنانا۔ مثلاً انگیٹھیاں، چولھے۔ گملے وغیرہ چنانچہ اسی قسم کے اور سکول تمام بڑے بڑے شہروں میں کھولے جائیں گے۔ یہ سکول ملک کے مختلف کالجوں اور انجینیری کے سکولوں کے لئے ایک آخری درسگاہ کا کام دیں گے۔ اور اگرچہ ان کا مقصد اولین ادنیٰ جماعتوں کو کام سے آگاہ کرنا ہوگا لیکن ان کے اسباق نوجوان انجینیروں کے لئے بھی کافی اہم اور ضروری ہوں گے تاکہ انہیں اپنے پیشے کے ابتدائی ایام میں دماغ کے علاوہ ہاتھ سے کام کرنا بھی آجائے۔

سیمنٹ کا استعمال عملی طور پر دکھانے کے لئے لاریاں جگہ جگہ دورہ کرتی رہتی ہیں۔

سیمنٹ کے استعمال کو مشتہر کرنے کے لئے ایک اور طریقہ نہایت کامیابی کے ساتھ برتا جا رہا ہے۔ لاریوں کی ایک خاص تعداد تمام اوزار اور مسالوں سے لدی ہوئیں اپنے اپنے مقررہ علاقوں میں دورہ کرتی رہتی ہیں۔ جن کے ساتھ کنکریٹ کے کام کے ماہر لوگوں کو عملی طور پر روزمرہ کی استعمال کی اشیاء بنا بنا کر دکھاتے ہیں کہ کس آسانی سے اور کتنی سستی اور مضبوط اشیاء سیمنٹ سے تیار ہوسکتی ہیں۔ اور وہ بتاتے ہیں کہ تمام تعمیری کاموں کے لئے سیمنٹ کا استعمال کتنا مفید اور کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ یہ لوگ دہقانوں کے گھروں میں پہنچ کر انہیں بتاتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے سیمنٹ کا استعمال ان کے لئے کتنا مفید اور ضروری ہے جس کے ذریعے سے نہ صرف ان کے گھروں میں صفائی حفظانِ صحت کا موجب ہوگی بلکہ ان کا گاؤں خوبصورتی اور صفائی کا مرقع پیش کرے گا۔ اس کے علاوہ یہ سفری نمائندہ مقامی

تاجر کو سیمنٹ کے جدید ترین استعمال کے طریقے بتاتا ہے۔ اور اس سے مقامی ضروریات کا اندازہ لیتا ہے۔ اسی طرح وہ مقامی میونسپل۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے افسروں سے ملتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ کس طرح ہر قسم کی تعمیر میں خواہ وہ سکول ہو۔ نالی ہو۔ لمپ کا کھمبا ہو یا پل یا سڑک ہو سیمنٹ کی مدد سے نہ صرف کم خرچ رہتا ہے۔ بلکہ زیادہ پائدار اور دیدہ زیب نظر آتا ہے۔ سیمنٹ کی تشہیر کا یہ طریقہ ایک پنتھ اور دو کاج کے مترادف ہے۔ یعنی ایک طرف تو عوام کو سیمنٹ کے استعمال کے نئے نئے طریقے بتا کر مانگ پیدا کی جاتی ہے۔ اور دوسری طرف پبلک کے لئے زیادہ پائدار اور مضبوط تعمیر کا سامان کم خرچ پر بہم پہنچایا جاتا ہے۔

سیمنٹ کے کارخانوں میں قریباً دس ہزار آدمی کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سن کے کارخانوں کو فروغ دیتے ہیں اور ریلوے کی گراں بہا آمدنی میں یہ صنعت بہت حد تک ممد و معاون ہے۔

عام طور پر اس بات کا علم نہیں ہے۔ کہ سیمنٹ سازی ملک کی خوشحالی میں نمایاں حصہ لے رہی ہے۔ یہ صنعت نہ صرف اپنے کارخانوں میں قریباً دس ہزار آدمیوں کی روزی کا سامان بہم پہنچا رہی ہے۔ بلکہ ہندوستانی کوئلہ کی کثیر مقدار میں کھپت کر رہی ہے۔ قریباً ساڑھے تین لاکھ ٹن کوئلہ ہر سال سیمنٹ کے کارخانوں میں خرچ ہوتا ہے۔ سن کی صنعت بھی کافی حد تک مستفید ہو رہی ہے۔ کیونکہ ایک کروڑ اسی لاکھ سن کے تھیلے سیمنٹ کے لئے ہر سال استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریلوے کی کرائے کی آمد ہے جس میں کوئلے۔ تھیلوں اور سیمنٹ کے کرایوں سے بیش بہا رقوم ادا کی جاتی ہیں۔ قریباً دس لاکھ ٹن سیمنٹ سالانہ ریلوے کے ذریعے سے منتقل کیا جاتا ہے۔

صرف سیمنٹ سازی ہی ایک ایسی صنعت ہے۔ جس کے ذریعے سے قومی خوشحالی کی چاروں اہم تجاویز پر عمل ہو سکتا ہے۔

سیمنٹ سازی اس لحاظ سے بھی کافی اہمیت رکھتی ہے کہ یہی ایک صنعت ہے جو قومی خوشحالی کی چاروں تجاویز پر حاوی ہے۔ یعنی دیہات سدھار۔ گھریلو صنعتوں کی ترویج۔ انسداد بیکاری اور مزدور طبقہ کے لئے مناسب مکانات کی تعمیر۔

دیہات سدھار کے سلسلے میں سب سے بڑی ضروریات یہی ہیں۔ کہ پختہ سڑکیں بنائی جائیں۔ کنوؤں کی منڈیریں اور ڈھکنے چشموں کو گندگی سے بچانے کے لئے بند۔ پانی پینے کے حوض اور کھاد کے گڑھے عمدہ طور پر تعمیر کئے جائیں۔ ان تمام ضروریات کے لئے سیمنٹ کا استعمال نہائت مفید ہے۔

سیمنٹ کے ذریعے گھریلو صنعتیں فروغ پا سکتی ہیں اور دیہات کے غریب اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

سیمنٹ کی انگیٹھیاں۔ چولھے اور گلدان وغیرہ بنانے کے چھوٹے چھوٹے کارخانے جاری کئے جا سکتے ہیں۔

وسیع پیمانے پر سیمنٹ کا استعمال کرنے سے مثلاً سڑکوں اور عمارتوں کی تعمیر میں خواہ وہ پبلک کے لئے ہوں یا ذاتی ملکیت ہوں۔ ہزارہا مزدوروں اور فن کاروں کو روزگار مل سکتا ہے۔ اور اس طرح بے روزگاری کا سد باب ہو سکتا ہے۔ دیہات میں غربا بہتر قسم کے مکانات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ جو آگ۔ نمی اور کیڑے مکوڑوں کی دستبرد سے محفوظ ہوں۔ زیادہ پائدار ہوں اور موسمی تغیرات کے نقصانات سے مامون رکھ سکیں۔

سیمنٹ کنکریٹ کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ لوہے کے ساتھ بغیر اسے زنگ آلود کرنے کے جوڑا جا سکتا ہے۔

سیمنٹ کی تعمیر مضبوطی میں پہاڑ کی طرح سخت اور وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط تر ہونے والی ہوتی ہے اور بخلاف چونے کے۔ لوہے کے ساتھ مل کر قائم رہتی ہے۔ بغیر اسے زنگ آلود کئے انہیں اوصاف کی وجہ سے سیمنٹ کو تعمیر کا بہترین مسالہ تسلیم کیا گیا ہے۔ کنکریٹ کو ہر مطلوبہ شکل دی جا سکتی ہے۔ سطح پر ہر قسم کا رنگ دیا جا سکتا ہے۔ اور جب یہ سخت ہو جاتا ہے۔ تو ہمیشہ کے لئے اپنی وضع اور رنگ کو قائم رکھتا ہے۔ ان تمام اوصاف نے سیمنٹ کی اہمیت کو ہر قسم کی تعمیر کے لئے بطور بنیادی مسالہ کے اہم تر کر دیا ہے۔

یہ صنعت ہر قدم پر ترقی کر رہی ہے اور اس کا مستقبل نہائت شاندار نظر آ رہا ہے۔

ان کے حقائق کی موجودگی میں کسے انکار ہو سکتا ہے۔ کہ ایک ایسی صنعت جو ہر قدم پر رو بہ ترقی ہے۔ اور جس کے انتظام کی باگ ڈور ایسے دانشمند منتظمین کے ہاتھوں میں ہے۔ اور جو قوم کی سرپرستی کی صحیح طور پر حقدار ہے۔ اس کا مستقبل نہائت شاندار ہوگا؟

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مئی ۳۸ ۱۹ء

جلد ۱۶ — نمبر ۵

تصویر:- ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مسٹر صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ روڈ لاہور سے شائع ہوا

بزمِ ادب

علامہ اقبال مرحوم

عمرہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

(غالب)

۲۱ اپریل ۳۸ء کو ساڑھے پانچ بجے صبح لاہور میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی صحت گزشتہ چار سال سے خراب چلی آ رہی تھی۔ اس عرصے میں ڈاکٹر رحمٰن (بھوپال) اور حکیم نابینا صاحب (دہلی) کے علاج سے کافی فایدہ ہوا۔ لیکن مرض کا کلیتہً ازالہ نہ ہو سکا۔ ان کی طبیعت میں آہستہ آہستہ ضعف بڑھتا گیا یہاں تک کہ موت سے چند ماہ پہلے وہ بالکل صاحبِ فراش ہو گئے تھے۔ لاہور میں حکیم قرشی صاحب کے علاوہ بہترین ڈاکٹروں کا ایک بورڈ محض اس غرض سے قایم کیا گیا کہ وہ مرحوم کا طبی معائنہ کر کے شافی اور موثر علاج تجویز کرے لیکن عوارض میں اس قدر پیچیدگی پیدا ہو چکی تھی کہ یہ تمام تدبیریں ناکام ثابت ہوئیں۔ امراض کے ہجوم اور جسمانی نقاہت کی شدت کے باوجود مرحوم کے دل و دماغ کی غیر معمولی طاقتیں آخری وقت تک اپنا کام کرتی رہیں۔ وفات سے پندرہ منٹ پہلے انہوں نے اپنے تیمارداروں میں راجہ حسن اختر کو مخاطب کر کے یہ رباعی پڑھی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

اور پھر نہایت اطمینان سے فرمایا "میں مسلمان ہوں۔ مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ میں خوشی سے موت کا خیر مقدم کرتا ہوں"۔ راجہ حسن اختر حکیم صاحب کو بلانے چلے گئے اور مرحوم کا دیرینہ وفادار خادم علی بخش ان کے پاؤں دبا رہا تھا کہ یکایک دل میں درد اٹھا اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اسی روز شام کے پانچ بجے جنازہ اٹھا جس میں حکومت پنجاب اور ہائی کورٹ کے اعلیٰ اراکین کے علاوہ پچیس ہزار انسانوں نے بلا امتیازِ مذہب و ملت، شرکت کی اور غروبِ آفتاب کے بعد علم و ادب کا یہ نادر الوجود دبیکر شاہی مسجد کے سبزہ زار میں پیوندِ خاک کر دیا گیا۔

اقبال کے علمی و ادبی کمالات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ وہ یقیناً اس دور میں دنیا کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ شاعری کے علاوہ وہ فلسفہ مذہب اور سیاستِ اسلامی کا ایک زبردست امام تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ زندگی کے خارجی حالات میں اُس وقت تک انقلاب رونما نہیں ہو سکتا جب تک نفس کے اندر انقلاب پیدا نہ ہو۔ اُس کی شاعری سراسر اس انقلاب کی مبلغ اور آئینہ دار ہے۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کی موجودہ بیداری اقبال کی تعلیم کی مرہونِ منت ہے۔ مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ فرمایا تھا۔ جہاں بیسیوں مرصع اور پرجوش تقریریں ناکام رہیں۔ وہاں اقبال کی ایک نظم اپنا کام کر جاتی ہے۔ اقبال نے یورپ کے مقابلے میں ایشیا کی سرنگونی کو نہایت بے تابی سے محسوس کیا تھا وہ زندگی بھر اپنے ہم وطنوں کو خود داری، آزادی اور بیداری کا درس دیتا رہا۔ وہ مغرب و مشرق کی موجودہ کشمکش میں مشرق کی سرفرازی و سربلندی کا آرزومند تھا۔ ہندوستان میں مغربیت کی آمد کے ساتھ جو الحاد کے آثار پیدا ہو رہے تھے اقبال نے مردانہ وار اُن کا مقابلہ کیا اور آج مغرب زدہ ہندوستانی اگر مذہب کی طرف واپس آ رہے ہیں تو یہ بھی اقبال کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اقبال نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ہمیں جگایا اور آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دکھا کر ہمارے پژمردہ اعصاب میں حیاتِ تازہ کی ایک لہر پیدا کر دی۔ یورپ نے اقبال کو ہمیشہ اپنا مدِمقابل اور حریف تصور کیا اور یہی وجہ تھی کہ مغربی طاقتوں نے جو ایشیا کی ذلت و پستی سے فایدہ اٹھانے کی عادی ہو چکی ہیں اقبال ایسے انقلاب انگیز اور آتش نفس شاعر کی قدر دانی میں بخل کیا۔ علم و فضل کے اس بلند ترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود اقبال ایک فقیر منش اور درویش صفت انسان تھا۔ اس کے مکان کے دروازے غریب سے غریب اور جاہل سے جاہل انسان کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ وہ تبختر اور نخوت کے نام سے ناواقف تھا۔ روزمرہ زندگی اور عام طرزِ بود و ماند میں وہ ایک بالکل معمولی انسان معلوم ہوتا تھا اور اس کی عظمت کا یہی راز ہے کہ اُس کے سامنے شاہ و گدا سب برابر

تھے۔ اقبال مشرق و مغرب کی تعلیم کا جامع تھا۔ اُس کا وجود دنیا میں ہندوستان کی علمی نضیلت و برتری کا ایک بیّن ثبوت تھا۔ افسوس کہ اجل کے وقت ناشناس و ارنے ہم سے ایک ایسا جوہرِ قابل چھین لیا جس کی نظیر کہیں صدیوں میں جا کر پیدا ہوتی ہے۔

دورِ حاضر کی اردو شاعری پر اقبال کے اثرات اس قدر نمایاں ہیں کہ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیغمبر سخن تھا۔ اردو کی موجودہ شاعری خیال اور زبان کے اعتبار سے سراسر اقبال کی شرمندۂ احسان ہے "بانگ درا" اور "بالِ جبریل" کی اشاعت سے شعر کی دنیا میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے۔ اس کے حیرت انگیز نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ مرحوم کے غیر مطبوعہ اردو اور فارسی کلام کا آخری مجموعہ "ارمغانِ حجاز" کے نام سے مرتب ہو چکا ہے۔ عنقریب شائع ہو جائے گا۔ خدا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور بدنصیب ہندوستان کو نعم البدل عطا کرے۔

آہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

علامہ اقبال کی وفات سے ہمارے دل و دماغ کو جو صدمہ پہنچا ہے اُس کے زخم سے ابھی خون کی تراوش جاری تھی کہ ہندوستان کے ایک اور فاضل اجل مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کی رحلت کی خبر نے ہمیں حواس باختہ کر دیا۔ اخبارات سے اب تک صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ مولانا نے ۱۰ مئی کی صبح کو جوالاپور میں جہاں وہ بغرض علاج تشریف فرما تھے، انتقال فرمایا۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا کرے اور اُن کے غمزدہ دوستوں، نیازمندوں، اور عزیزوں کو صبر کی توفیق دے۔

مولانا اکبر شاہ خاں صاحب اس بدبخت ملک کے اُن معدودے چند اشخاص میں تھے جنہوں نے حُبِ جاہ، حُبِ دنیا اور حُبِ زر سے قطعاً بے نیاز ہو کر اپنی تمام زندگی انتہائی بے نفسی و بے غرضی سے علم و ادب کی خدمت میں بسر کر دی۔ دنیا کی بڑی سے بڑی ترغیب بھی انہیں ایک لمحہ کے لئے اس جادۂ مستقیم سے منحرف نہ کر سکی جسے وہ بطیب خاطر اختیار کر چکے تھے۔ وہ حیرت انگیز پامردی اور مستقل مزاجی سے عمر بھر حق و صداقت کی اُس راہ پر گامزن رہے جو حق پرست و حق آگاہ لوگوں کا حصہ ہے۔ مولانا کی سب سے زیادہ شہرت ایک مورخ کی حیثیت سے تھی اور یقیناً وہ تاریخ دانی میں ایک اجتہادی حیثیت کے مالک تھے۔ اُن کی بالغ نظری، اُن کے تبحر اور اُن کی صداقت پسندی نے انہیں ہندوستان کے اسلامی دور کا سب سے قابل اعتبار مورخ بنا دیا تھا۔ ان کی تصانیف اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ وہ ہندوستان اور ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں کی خدمت ایک مورخ کی حیثیت سے کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے موجودہ مناقشات کی تہ میں غلط تاریخی روایات کام کر رہی ہیں۔ وہ آئینۂ حقیقت نما کے ذریعے سے ہمارے شاندار ماضی کی صحیح تصویر دکھا کر ان غلط تاریخی روایات کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر دورِ رفتہ کی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں تو ہمارا حال اور مستقبل بے حد خوشگوار بن جائے گا۔ اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے صبح و شام محنت کی اور یہی مقصد تھا جو وہ بلا تصنع لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو نہایت آسانی سے لاکھوں روپیہ پیدا کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دنیوی تموّل کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا اور خاموش علمی زندگی کے سامنے دولت کے بڑے سے بڑے لالچ کو ٹھکرا دیا۔ مولانا اردو کے ایک زبردست انشاپرداز اور ادیب تھے۔ وہ تاریخی حقائق و واقعات کو اپنے شگفتہ انداز میں بیان کرتے تھے کہ پڑھنے والا اُن کے اسلوب بیان سے مسحور ہو جاتا تھا۔ باتیں کرتے وقت ان کی زبان کی روانی اور ان کے موزوں و مرصع الفاظ کی نشست سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی بے تکلف گفتگو بھی ادبی تحریر سے کم دلآویز نہیں ہوتی۔

مولانائے مرحوم اور علامہ اقبال کے درمیان نہایت مخلصانہ و دوستانہ تعلقات قایم تھے اور دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کو محبت و اخوت سے لبریز خطوط بھیجتے رہتے تھے۔ یہ کس قدر دردناک اتفاق ہے کہ یہ دونوں عظیم المرتبت ہستیاں ایک مہینے کے اندر اندر دنیا سے اٹھ گئیں۔ راقم الحروف کو مولانا کی خدمت میں گزشتہ اٹھارہ برس سے نیاز حاصل تھا اور اس عرصے میں خلوص و نیازمندی کے یہ مراسم ترقی کر کے ایسے تعلق خاطر کی صورت اختیار کر گئے تھے جسے روحانی یگانگت سے تعبیر کرنا چاہئے۔ اُن کی موت سے راقم الحروف کو ذاتی طور پر اس قدر شدید اور المناک صدمہ پہنچا ہے کہ اُس کی تلافی کبھی نہ ہو سکے گی۔ ان کی موت ایک ایسے عزیز۔ مخلص بے ریا، ہمدرد اور قابلِ اعتماد دوست کی موت ہے جس کی نظیر موجودہ زمانے میں ملنا ممکن نہیں۔ آہ

روز و شب رو یا کئے شام و سحر رو یا کئے
کچھ نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رو یا کئے

"ع"

آئینۂ عالم

بحرالکاہل کا سیاسی مدوجزر

سالانہ مصنوعی جنگ کے موقعے پر دنیا کے سب سے بڑے سمندر میں دنیا کا سب سے بڑا جنگی بیڑہ اس ہفتے حرکت کرے گا۔ وقت کے لحاظ سے اس مصنوعی جنگ کی کارروائی چھ ہفتوں پر محیط ہوگی اور فاصلے کے لحاظ سے مغربی ساحل سے لے کر جزیرہ ویک تک، اور الاسکا اور الیوشین سے لے کر خطِ استوا اور اس سے پار تک۔ یہ جنگی بیڑہ امریکہ کی بحری طاقت کا مظہر ہوگا۔

کئی سال سے امریکہ کی بحری قوت کا رُخ مغربی جانب رہا ہے۔ اور ایک مدت سے اس کے جنگی کھیلوں کا مرکز بحرالکاہل ہے جو سیاسی نقطۂ نظر سے ایک اہم سمندر ہے۔ بحرالکاہل تقدیر کے مختلف امکانات کا حامل ہے۔ اس کی وسعت فتح کے ناقابل ہے۔ اس کے اطراف و جوانب پر کسی ایک حکومت کا جنگی بیڑہ نہیں چھا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود گزشتہ برسوں میں اس کے ساحلوں کے گرداگرد اور اس کے اُن جزائر کے قرب و جوار میں جو سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں، باہم مخالف مقاصد کی ایک دوسرے سے الجھی ہوئی پیچیدہ راہیں اہلِ سیاست و تدبر کی نظروں میں روشن ہوئی ہیں۔

تجارتی شاہراہوں کی سرگرمیاں بھی اس سمندر کے آرپار پھیلی ہوئی ہیں۔ مغرب کی سمت سے ریشم افیم اور چاول آتے ہیں اور مشرقی سمت سے اوزار مشینیں اور ہتھیار اور بارود وغیرہ جاتے ہیں لیکن اس وقت لوگوں کی نگاہیں تجارتی کارگزاریوں کی بجائے جنگی جہازوں پر ہیں۔ دنیا کی عظیم ترین بساط پر مختلف قومیں برتری حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ امریکن بیڑے کے جنگی کھیلوں کا علاقہ جنوب اور مغرب کی طرف گزشتہ زمانے کی بہ نسبت زیادہ فاصلے تک پھیلتا جائے گا۔ لیکن بحرالکاہل کی سیاسی حکمت عملی کے لحاظ سے امریکہ کی یہ کارگزاری اُس بڑے تماشے کے مقابلے میں بہت کم درجہ رکھتی ہے جسے گویا جنگ کی آزمائشی تیاری سمجھنا چاہئے۔

گزشتہ چند سال کے عرصے میں بحرالکاہل میں جو سیاسی چالیں اور اُن کی مدافعانہ روک تھام ظاہر ہوئی۔ اُن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے گویا وہ کسی بڑے طاقتور اور کینہ ور دیوتا کی کارفرمائیاں تھیں بے رحم تقدیر اس سمندر کی سطح پر ایک خاص نقشہ بنانے میں مصروف ہے۔ اس کی نال سے ایسے ان گنت ڈورے لٹک رہے ہیں۔ جن کے تانے بانے میں کسی روز بہت سی قوموں کا برا یا اچھا انجام منسلک ہوگا۔ کسی کا انجام ریشم کی طرح ملایم اور درخشاں اور کسی کا سوت کی طرح معمولی۔ تقدیر کے یہ ڈورے بحرالکاہل کے اندر باہر اور گرداور آرپار، ہر طرف بنتے چلے جارہے ہیں۔ کوئی ڈورا چین کے خون میں سرخ ہے۔ تو کوئی جزائر شرق الہند کے تیل سے سیاہ اور کسی کا سلسلہ آسٹریلیا کے روشن نیلے آسمان تک جا پہنچا ہے اور کئی اور بے شمار ڈورے اِدھر اُدھر لٹک رہے ہیں ——— تقدیر اپنا یہ تانا بانا بہت عرصے سے تیار کر رہی ہے۔ لیکن یہ کبھی مکمل نہ ہو سکے گا اور اس کا نامکمل رہنا ہی ضروری بھی ہے۔ لیکن ہم ماضی قریب پر نظر ڈالنے سے موجودہ صورت حال کا جائزہ لے سکتے ہیں اور شاید ہمیں اس جائزے کے دوران میں مستقبل قریب کی چند باتوں کی جھلک بھی دکھائی دے جائے۔

اگر ہم بحر الکاہل کے نقشے پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں اس کی وسعت اور عظمت کا اندازہ ہو سکے گا نو ہزار میل لمبائی، سی آٹیل سے یوکوہامہ تک چار ہزار نو سو میل کے پھیلاؤ میں نیلگوں پانی کا جلال چار براعظموں اور خشکی کے دو منجمد ٹکڑوں سے اتنے بڑے سمندر پر قابو نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے جیتنے کا ذریعہ صرف وہ لاتعداد جزیرے ہیں جو اس کے چھ کروڑ اسی لاکھ مربع میل رقبے پر جابجا بکھرے ہوئے ہیں یہی ایک ذریعہ ماضی میں تھا، یہی اب ہے۔ اور یہی آیندہ بھی ہو گا۔

حال کی طرح ماضی میں بھی یہی جزائر اس سمندر کے طوفانی خروش میں بنیادی پتھروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ سمندر کے ابتدائی سراغ رساں، "بادنی" جہاز کا مشہور سردار ملاح، کیپٹن کک اور اپنے سیدھے سادے مضبوط بجروں میں پولی نیسیہ کے ملاح۔ یہ سب اور ان کے بعد بحر جنوبی کے تاجر ان جزیروں کو اس طرح استعمال کرتے رہے جس طرح صحرا میں نخلستانوں سے فایدہ اٹھایا جاتا ہے ان کی پر سکون خالی جھیلوں کی تلاش میں، اور ان کے مونگے کے ختم نہ ہونے والے ساحلوں سے اپنے پانی اور خوراک کے سفری ذخیروں کو مکمل کرنے کے لئے ملاحوں کو تازہ دم ہونے کا موقعہ دینے کے لئے اور شاید کبھی کبھی اپنے جہازوں کی مرمت کے لئے اور جب جہاز رانی میں بھاپ نے بادبان کی جگہہ لے لی تو ان میں سے کئی جزیرے ایندھن کا مرکز بن گئے۔ آج بھی کئی جزیرے اسی مقصد کے لئے مستعمل ہیں۔ ان میں بہت سے جزیرے حقیقی یا امکانی طور پر بحری یا ہوائی مرکز یا اسٹیشن ہیں جن سے جنگی بیڑوں کی حرکات کا دائرہ وسیع ہو سکتا ہے۔

بحر الکاہل کے چند علاقوں میں، خصوصاً جنوبی اور مغربی حصوں میں یہ جزیرے اس انداز سے واقع ہیں کہ ان سے ایک سمندری کہکشاں سی بن جاتی ہے۔ لیکن اس وسیع خطے میں جو Midway اور الیوشین اور جاپان اور شمالی امریکہ کے مغربی ساحل کے درمیان واقع ہے۔ سطح سمندر کے نیچے چھپی ہوئی مونگے کی چٹانوں سے ٹکرا کر کوئی کف انگیز موج پیدا نہیں ہوتی۔ اس راستے کے سفر میں متواتر کئی دن تک بحر نیلگوں کا جلال ہی نظروں کو مرعوب کرنے کے لئے موجود ہوتا ہے یا سمندری پرندوں کی تند و تیز چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ یا سمندر کا مسلسل خروش نگاہوں میں سماتا ہے۔

اس بڑے علاقے کے بہت سے حصے پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی برتری منقوش ہے کیونکہ اس کے قبضے میں ہوائی کے خوبصورت سلسلۂ جزائر ہیں۔ نیز الیوشین اور مغربی ساحل کے محاذ بھی اس کے ماتحت ہیں۔

اس کے مقابلے میں جاپان کی سلطنت سخالین کی کہر والی، منجمد ویرانیوں سے شروع ہو کر جنوب میں خط استوا تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ مغربی بحر الکاہل میں سب سے بڑی طاقت ہے اور اس کے معاون کرائل سے فارموسا تک پھیلے ہوئے چودہ سو جزیرے اور مونگے کی گیارہ سو چٹانیں ہیں جو ایشیائی براعظم سے انتیس سو میل کے فاصلے میں ایک مضبوط بند کی طرح منتشر ہیں۔

مختلف طاقتوں کی سیاسی بساط پر جنوبی بحر الکاہل کی اہمیت ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ اس میں زیادہ تر آسٹریلیا اور بحر جنوبی کے برطانوی جزائر کا اقتدار قائم ہے۔

اس شاندار کھیل میں جس کا دار و مدار لانٹی اور کھینس کے مقوے پر ہے۔ جاپان دراز دستیاں کر رہا ہے۔

شمال مغربی بحر الکاہل میں جاپان کی جیت کی ناقابل تسلیم حیثیت کو ۱۹۲۲ء کے معاہدہ واشنگٹن سے امداد ملی۔ اس معاہدے نے دنیا کی بحری طاقتوں کی باہمی نسبت کو اس درجے پر لا کھڑا کیا کہ دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں (ریاستہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ) کے لئے شمالی مغربی بحر الکاہل میں مناسب مستقروں کے بغیر اپنی قوت کو بڑھانا ناممکن ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس معاہدے کی رو سے اس کے دوران میں (۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۶ء تک) کسی نئے مستقر کا قیام یا موجودہ آسانیوں کو مضبوط کرنا بھی ممنوع تھا۔ البتہ جاپان یا ایشیائی سواحل کے جاپانی مستقر اس عہد نامے سے مستثنیٰ تھے۔ اس وقت سے اب تک جاپان نے کون کون سی شاطرانہ چالیں چلی ہیں؟

ایشیا میں جاپانی حکومت کی فراخی کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ اس کشادگی سے بحر الکاہل کی بساط پر جو اثرات

ہوئے یا ہوسکتے ہیں وہ اس قدر عام نہیں ہیں۔ کوریا اور جزیرہ نما کو ان ننگ پر قبضے کی وجہ سے معاہدۂ واشنگٹن کے وقت بھی جاپان کو فوقیت حاصل تھی۔ بحیرۂ جاپان میں اس کا اقتدار تھا اور آبنائے سوشیما اس کے ہاتھوں میں تھی۔ مانچوکو پر جاپانی قبضے سے نہ صرف جاپان کے تیل اور دیگر خام مواد کے ذخائر میں اضافہ ہوا۔ بلکہ اس سے روس کے اُس خنجر کے کند ہو جانے سے جس کا مقصد جاپان کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جانا تھا۔ جاپان کو زیادہ اقتدار حاصل ہوگیا۔

ان سب باتوں کا نتیجہ ظاہر ہے اور وہ یہ کہ جاپان دراز دستیاں کر رہا ہے اور ہم بحرالکاہل اور اس کی حدود پر واقع ساحلوں کے نقشے کا مطالعہ کرنے سے اُن تمام شاطرانہ چالوں پر غور کرسکتے ہیں جن سے گزشتہ دس سال کے عرصے میں تاریخ عالم میں نہایت اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

دنیا کے سب سے بڑے سمندر کی بساط پر تین مختلف قومیں — ریاستہائے متحدہ امریکہ، جاپان اور روس — اپنے جہازوں اور طیاروں کے مہرے بڑھاتی رہیں۔ اور نئے محاذ، نئے مرکز اور نئے بنیادی پتھر قایم کرتی رہیں تین اور قومیں — برطانیہ، فرانس اور نیدرلینڈ ز اول اول تو چپ چاپ تماشا دیکھتی رہیں۔ لیکن کچھ عرصے سے انہوں نے بھی اس بڑی بازی کی کشمکش میں شدت سے حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ اب سنئے ان چالوں اور مدافعانہ انتظامات کا بیان جنہیں ارتقائی منازل ایک نامعلوم انجام کی طرف لئے جارہی ہیں۔

چال۔

مختلف بازیگروں کی شعبدہ بازی، چین کے قدیم مانچو تخت پر ایک ایسا شہنشاہ براجمان ہوتا ہے جو محض ایک کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بازی گر ٹوکیو کے ہیں۔ جاپان کی کوان تونگ فوج کا صدر مقام سنکنگ قرار پایا ہے اور یہ فوج خیلار کے مقام پر قلعہ بنا رہی ہے۔ اس کی قوت ترقی کرتی اور پھیلتی ہے اور دریائے آمور کی سمت بڑھتی ہوئی مغرب کی طرف منگولیا تک جا پہنچی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس وقت جاپان کی پانچ لاکھ فوج جو بہترین دستوں پر مشتمل ہے مانچوکو میں موجود ہے اور مانچوکو کی لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ تک کی دیسی فوج اس کے علاوہ ہے۔ تمام سرزمین پر ہوائی میدان پھیلے ہوئے ہیں، جنوب کی مانچوریئن ریلوے سیاسی نقطۂ نظر سے اہم شاخیں کھولتی ہے۔ ولاڈی واسٹک کے نزدیک راشین کے مقام پر ایک بحری مستقر قایم کیا جاتا ہے اور اُس کے قریب ہی سے شینن اور یوکی کے مقامات پر بحری مرکز تعمیر کیئے جاتے ہیں۔ جاپانی سمندر پر اب پہلے سے بھی زیادہ یقینی طور پر جاپان کا اقتدار ہے۔ اور مشرق کے ساتھ روس کے ذرائع گفت وشنید کے اطراف پر بھی جاپان موجود ہے۔

مدافعانہ اقدام

روس کی مشرق بعید کی فوج ہتھوڑے اور درانتی کا سرخ جھنڈا لہرا رہی ہے۔ اس کا صدر مقام خبراسک ہے اور اس کی قوت تین لاکھ افراد سے زاید ہے۔ سرحدی محافظ اور گن بوٹ دریائے آمور پر گشت کر رہے ہیں۔ مانچوکو اور کی سرحد پر جابجا مورچے اور طبی مرکز قایم ہیں۔ کسانوں کی کمک جو ابھی تک بھیڑ کی کھال کی فوجی وردی پہنتی ہے۔ امدادی علاقوں میں مجتمع ہے۔ ٹرانس سائبیرین ریلوے شاخیں قایم کر رہی ہے۔ ایک شاخ جھیل بیکال کے شمال کی طرف سے خم کھاتی ہوئی جاتی ہے اور یہ شاخ جاپانیوں کے آیندہ جارحانہ اقدام سے محفوظ رہے گی۔ برف توڑ جہاز برفانی سلوں کو چیرتے ہوئے بحر منجمد شمالی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اس طرح روس اور مشرق کے درمیان آمد ورفت کا ایک نیا راستہ قایم ہوگیا ہے۔ روس کے عظیم الشان جنگی طیارے اپنی مہلک پرواز سے بحیرۂ جاپان کو عبور کرتے ہوئے جاپان کی سرحد تک پہنچ سکتے ہیں اور ایسے بے شمار جہاز سائبیریا کے نئے تعمیر شدہ ہوائی مرکزوں میں ہر وقت عمل کے لئے تیار رہیں۔ کوموسمسک (جو دریائے آمور کے کنارے واقع ہے) اور نکولیسک (جو بحیرۂ اوکٹسک کے کنارے واقع ہے) کے مقامات پر جہاز سازی کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ مشرق سے جہازوں کے ٹکڑے چھکڑوں پر لادکر ولیڈی واسٹک کی بندرگاہ تک لائے جاتے ہیں اور یہاں سے بحر منجمد میں اُتارے جاتے ہیں۔ سمندر کے کنارے کے علاقے گویا فوجی کیمپ ہیں۔

ولیڈی واسٹک کے مخصوص مقامات پر توپیں چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور ملک کے اندرونی حصوں یعنی صحرائے گوبی میں منگول قوم کے تربیت یافتہ گھوڑسوار جنہیں روسی فن جنگ کی تربیت دی گئی ہے۔ سرحد پر گشت کرتے ہیں۔ اس طرح آؤلان بیٹر ماسکو کے نزدیک

ہوگیا ہے اور روسی طاقت جاپانی مانچوکو کے دونوں پہلوؤں پر مستحکم ہوگئی ہے۔

چال

ایک جاپانی نوآبادی دیوتو کے ارد گرد قایم ہو رہی ہے۔ جاپان کے پست قد باشندے امریکی فلپائن جزائر میں بھنگ کی تجارت پر قبضہ جما رہے ہیں۔ فارموسا کا جنوبی حصہ جو منیلا سے صرف پانچ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ سلطنت جاپان کے لئے اس سرحد پر ایک مضبوط قلعے کا کام دیتا ہے جس کا بحری محاذ باکو کے مقام پر ہے۔ جہاں پر جاپانی ہوائی مرکز ہے اور جاپانی افواج کی چھاؤنی ہے۔ یہ علاقہ اصلی جاپان کے ساتھ ساکش کی لڑی کے ذریعے سے ملحق ہے اور اس کا محاذ امامے اوشیمہ کے مقام پر ہے۔ جس کی قلعہ بندی اچھی طرح سے کی گئی ہے اور جو شمالی بحیرہ چین کی حفاظت کرتا ہے۔ جاپان نے انجمن جمعیتہ الاقوام کی پروا نہ کرتے ہوئے بحرالکاہل کے بہت سے منفعت بخش جزائر پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ جاپان نے میرینا کے علاقے، مارشل اور کیرولین کے جزائر پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ یہ جزائر نہ صرف تجارتی نقطۂ نگاہ سے ہی مفید ہیں بلکہ قدرتی ہوائی مرکز بھی ہیں جاپان کے بحری انجنیران لاتعداد جزائر کے راستوں میں جو مونگے کی چٹانیں آتی ہیں ان کی پیمایش کر رہے ہیں اور اپنے جہازوں کے لئے راستے تلاش کر رہے ہیں نیز جہاز سازی کے کارخانے قائم کر رہے ہیں اور اس کے علاوہ ہوائی بندر تعمیر کر رہے ہیں۔ جہازران اور طیارچی ان جزائر کو بحری اور ہوائی راستوں کے ذریعے سے آپس میں ملا رہے ہیں۔ ان جزائر میں سے مشہور جزیرے یہ ہیں۔ سیپان، یاپ، پناپ، اور ٹرک جزائر کا گروہ، اور پالاؤ جو نیدرلینڈ کے جزائر شرق الہند سے چار سو تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ لیکن فلپائن سے اس سے کچھ زیادہ فاصلے پر ہے اور جزیرہ جلوت جو سلطنت جاپان کا مشرق کی طرف مضبوط ترین قلعہ ہے۔

مدافعانہ اقدام

فضا میں اپنے طیاروں کو لئے ہوئے اور سطح سمندر پر آبی جہازوں کے ساتھ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا بیڑا مغرب کی طرف بلکہ اس سے بھی آگے اپنے جنگی کھیلوں میں حصہ لیتے ہوئے بڑھ رہا ہے۔ سمندری پرندے طیاروں کی آواز سے ڈر کر اپنے گھونسلوں سے اڑتے ہیں اور مشرقی سورج کی چندھیا دینے والی روشنی میں گردش کرتے ہیں۔ یہ پرندے مڈوے کے صحرائی علاقے سے اور فرانسیسی فرائی گیٹ کی مونگے کی چٹانوں کی چوٹیوں پر سے، ہیکر سے، اور کنگ مین ریف سے اڑتے ہیں۔ ساٹھ چھوٹے ہوائی میدان فلپائن جزائر کے آر پار قایم کئے گئے ہیں۔ اور ان کی حد لُبن تک ہے۔ لُبن کا مقام جاپانی فارموسا سے شمال کی طرف ایک سو تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اس کے جنوب کی طرف بورنیو ہے۔ فلپائن کے لوگ اپنی آزادی کو خطرے میں دیکھ کر جنرل ڈگلس میک آرتھر کی سرکردگی میں رفتہ رفتہ اپنی فوجی طاقت کو منظم کر رہے ہیں۔ نہر پانامہ کے سروں پر جو امریکہ کا اہم بحری راستہ ہے، امریکن فوجیں ہر وقت متعین رہتی ہیں پیشتر سے زیادہ قلعہ بندیاں کی جا رہی ہیں۔ اور غیر ملکی جاسوسوں کی پوری پوری نگرانی کی جاتی ہے۔

چال۔

جاپانی ملاح بحیرہ اوکٹسک میں مچھلیاں پکڑنے کی خاطر اپنے جال ڈالتے ہیں لیکن ان کی یہ تجارتی کارگزاریاں الیوشین تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کاواساکی بندرگاہیں نئے جہاز تیار ہو رہے ہیں۔ یہ جہاز سان پیڈرو اور سیٹل کے درمیان گشت لگاتے رہتے ہیں اور جاپان کے لئے ایندھن کا ذخیرہ جمع کرتے رہتے ہیں تاکہ جنگ میں کام آئے۔ جاپانی بحری بیڑہ اپنی نقلی جنگ کا مظاہرہ شمال میں کوریا سے آگے تک کرتا ہے۔

مدافعانہ اقدام

روس نے بحر منجمد شمالی میں دو نئی بندرگاہیں — ایان اور اوکٹسک — تیار کی ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے الیوشین میں ایک موسمی رصدگاہ قایم کی ہے اور پاس کے سمندروں کی بحری پیمائش بھی شروع کر دی ہے۔ یوں اس سیاسی کھیل کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی ہے ۱۹۳۶ء کے اختتام سے ڈرامے میں ایک تناؤ پیدا ہو رہا ہے۔ بحری پابندیوں کے متعلق معاہدے ختم ہو گئے ہیں۔ بحرالکاہل میں قلعہ بندیاں کرنے پر جو پابندیاں عاید کی گئی تھیں وہ اٹھا لی گئی ہیں۔ اور جاپان نے ۱۹۳۷ء کے درمیان سے ایک عظیم الشان فتح کی طرف قدم بڑھا دیا ہے۔

چال۔
پیکن کے نزدیک جو قدیم خاندانوں کا دار الخلافہ تھا اور جو قدیم شاندار روایات کا حامل تھا، ایک نئے اقدام کا آغاز ہوتا ہے اور یہ اقدام بھی خوفناک جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جاپان نے پیکن پر قبضہ کر لیا ہے اور تنان شین پر بھی قابو پا لیا ہے اور شانسی کی لوہے کی کانوں کو بھی اپنے ماتحت کر لیا ہے اور اپنا اقتدار نانکو کے درے اور کالگان تک بڑھا لیا ہے۔ منگولیا کے میدان کا راستہ بھی جاپان کی زیر نگرانی ہے۔ اور یوں روس کے مقابلے پر جاپان نے اپنی حفاظت کر لی ہے۔ جنوب میں شنگھائی کے علاقے پر بھی جاپانی پرچم لہرا رہا ہے۔ ان فتوحات کے باوجود جاپان کی کوششیں مزید علاقوں کے لئے پوری قوت سے جاری ہیں۔ جاپانی جہاز چین کے ساحل پر ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور فرانسیسیوں اور انگریزوں کے مفاد کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ جاپان نے برطانوی ہانگ کانگ پر بھی ہاتھ بڑھانے شروع کر دئے ہیں۔ جاپانی فتح کی وجہ سے اب چین کے زرخیز علاقوں میں دوسری اقوام کے لوگ جا کر فایدہ حاصل نہیں کر سکتے۔

مدافعانہ اقدامات۔

۱۔ برطانیہ۔
ہانگ کانگ کی شاہی نوآبادی کی بلند پہاڑیوں پر نئے مورچے قایم ہو رہے ہیں۔ سراوک کے ربڑ کے جنگلوں میں اور شمالی بورنیو کے کھیتوں میں نئے ہوائی میدان بنائے جا رہے ہیں۔ سنگاپور کے مشہور بین الاقوامی بحری مرکز کو ان پیش آنے والے خطرات کے پیش نظر زیادہ مستحکم کر دیا گیا ہے۔ پینانگ کے مقام پر توپخانے قایم کر دئے گئے ہیں اور بارکیں بنائی جانے لگی ہیں۔ برطانیہ نے بحیرۂ چین کی جنوبی شاہ راہ کو بند کر دیا ہے۔ اسی سلسلے میں برطانیہ نے آسٹریلیا کی حفاظت کے لئے ڈارون کی بندرگاہ کو بھی زیادہ مضبوط کر لیا ہے۔ آسٹریلیا روز بروز امریکہ سے بحری اور ہوائی جہاز خرید رہا ہے۔ برطانوی کولمبیا میں وین کوور کی حفاظت کے لئے ہوائی حملوں کی مدافعت میں نیا توپ خانہ حاصل کیا گیا ہے۔ بحرالکاہل میں برطانوی وقار کے برقرار رکھنے کے لئے اسکالٹ کے مقام پر قلعہ بنایا گیا ہے۔

۲۔ فرانس۔
فرانس کے نئے جہاز مشرقی سمندروں میں موجود ہیں۔ دھوئے انجنوں والی بم باز کشتیاں فرانسیسی ہندچینی میں کامرانہ خلیج کے اندر ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ اس فرانسیسی نوآبادی کی فوجی طاقت پچیس ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ لیکن دیسی فوج اس میں شامل نہیں۔ فرانس کی بحری کوششیں تیناآن کے مقابل جاری ہیں اور سیگون میں قلعہ بندیاں ہو رہی ہیں۔

۳۔ نیدرلینڈز
نیوگنی کے ساحل پر آبدوز جہازوں اور بحری ہوائی جہازوں کے مرکز قایم کئے گئے ہیں۔ نیدرلینڈز کے بورنیو کے تیل کے چشمے جن پر جاپان کی حریصانہ نگاہیں ہیں۔ ان کی حفاظت کا سامان مکمل کر لیا گیا ہے۔ امریکہ سے مارٹن بمباز جہاز اور جرمنی سے ڈورنیئر ہوائی جہاز خریدے گئے اور یہ جہاز ملکا اور بحیرۂ باندہ کی حفاظت کے لئے پرواز کرتے رہتے ہیں۔ نیدرلینڈز میں مختلف قسم کے نئے جہاز تعمیر کئے جا رہے ہیں اور یوں نیدرلینڈز والے اپنے مشرقی مقبوضات کی حفاظت کے لئے ہر طرح سے مستعد ہیں۔

۴۔ روس۔
روس چین کی خاموش مدد کر رہا ہے۔ روسی ہوائی جہاز سین کیانگ کے اوپر سے ایک طویل راستہ طے کرتے ہوئے چیانگ کیٹنگ کی مدد کے لئے پہنچتے ہیں جو جاپان کے پنجے سے اپنے ملک کو بچانے کی ناکام کوششیں کر رہا ہے۔

۵۔ ریاست ہائے متحدہ (امریکہ)
امریکہ کی متحدہ ریاستوں نے سیاسی لحاظ سے ایک اہم راستہ تعمیر کیا ہے جو درۂ کولی کو عبور کرتا ہوا گزرتا ہے۔ اسی قسم کے اور اہم راستے جزیرۂ ہوائی کے اناس کے کھیتوں پر سے گزرتے ہوئے مقرر کئے گئے ہیں۔ سولہ انچ کے دہانے والی توپیں بحرالکاہل کی حفاظت کے لئے متعین ہیں۔ مڈوے اور ویک کی مونگے کی چٹانیں بارود سے اڑائی جا رہی ہیں۔ سمندری راستے گھیرے کئے جا رہے ہیں۔ گام کے مقام پر گشت کرنے والے جہازوں کا مرکز بنایا گیا ہے۔ اسی طرح کا ایک اور مرکز الاسکا میں ستکا کے مقام پر قایم کیا گیا ہے۔ کوڈیک کو محاذ کی حیثیت دی جانے والی ہے۔ الیوشین کے چٹانوں والے علاقے میں زیادہ سے زیادہ جہاز مجتمع کئے جا رہے ہیں۔ خط استوا کے زیریں جزائر تک طیاروں کی پرواز جاری ہے یہاں تک کہ سے موا کے

جزیرے تک ان کارفرمائیوں کے اثرات پہنچ رہے ہیں۔ مصنوعی جنگ کے کھیلوں کے سلسلے میں امریکن بیڑہ مغرب ہی کا رُخ کرتا جا رہا ہے۔ اس وقت تمام چالیں پردہ راز میں رکھی جا رہی ہیں۔ جاپانی جہازوں کے کارخانوں کا راز پوشیدہ ہے "برطانیہ کو ٹوکیو کے جہازوں کا خدشہ" "تین بڑے جنگی جہاز جاپان میں" ——— ایسی سرخیاں اخباروں میں روزانہ دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن کوئی غیر ملکی شخص حقیقتِ حال سے واقف نہیں ہوسکتا۔ سیام کا ڈکٹیٹر کرنل بھایا سھول جاپانیوں کی مدد سے اپنی فوجی طاقت کو منظم کر رہا ہے اور جاپانی مزدور کرا کے علاقے میں کسی پُراسرار کام کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سیام کے آر پار ایک نہر کے تیار کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور یہ نہر جاپان کے لئے سنگاپور تک پہنچنے میں آسانی پیدا کر دے گی۔

امریکہ والے بھی اپنی چالوں کو خفیہ رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس مصنوعی جنگ کے دوران میں بیڑے کے ساتھ کسی بھی نامہ نگار کو جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ الاسکا اور دوسرے جزائر میں ایسی باتیں رونما ہو رہی ہیں جو سیاسی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ امریکہ کی کانگرس سے ایک عظیم الشان بحری پروگرام کے منظور کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ بحرالکاہل کے ساحل پر فوجی طاقت میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

لیکن ابھی یہ کھیل پورا نہیں ہوا۔ ادھورا ہی ہے۔ سب سے پہلے چین پر جاپانی حملے ہی کو لو۔ یہ بھی تا دمِ تحریر نامکمل ہے۔ جاپان کی طاقت مغربی بحرالکاہل میں ہنوز مسلم ہے۔ جنوب میں فارموسا سے لے کر شمال میں ہاکوڈیٹ تک جاپان کی طاقت پہلے سے زیادہ مضبوط ہے۔ لیکن اس سمت میں جاپان کا اقتدار اور جاپانی فتوحات کا امکان رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہالینڈ، انگلستان اور فرانس جنوب کی طرف جاپان کے راستے میں حائل ہیں۔ آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر امریکہ والے بھی ہوائی اور ریاستہائے متحدہ کی طرف سے بحرالکاہل میں اپنا اقتدار بڑھا رہے ہیں۔ "انکل سام" کا سایہ مغربی بحرالکاہل اور ایشیا کی طرف بڑھ رہا ہے۔ روس کے فوجی طاقت اس محاذ پر مضبوطی سے متعین ہے۔ اگرچہ وہ فی الحال اپنے آپ کو روکے ہوئے ہے۔

یہ کھیل یا سیاسی ناٹک اس طور پر جاری ہے۔ چالیں چلی جا رہی ہیں، اور ان کے مدافعانہ اقدامات کا بندوبست بھی مکمل ہو رہا ہے۔ یہ کھیل طرح طرح کی مشکلات اور خطروں کی وجہ سے غیر یقینی سا ہے۔ اگر کسی ملک کی طرف سے ایک بھی غلط قدم اٹھا لیا گیا تو اُس سے بہت سے غیر متوقع امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ لیکن فی الحال تمام سیاسی چالباز اس کوشش میں ہیں کہ پُرامن طریق سے اپنے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ مگر آخری فیصلہ قسمت کی اُسی دیوی کے ہاتھوں میں ہے جس نے سیاسی بساط پر مختلف ڈورے لٹکا رکھے ہیں۔

بسنت سہائے

رباعی

ہے یار سے آج رات پہلو آباد
وقف ہے یہ غلام زنجبیت سے خانہ زاد
ہے ہم کو کل عجیب تر سے سے
یا رب یہ لیکھ تا ابد زمن باد

سعید احمد اعجاز

حسن نظر

دل کو رہینِ بادۂ غم کر رہا ہوں میں
اک خوگرِ ستم پہ کرم کر رہا ہوں میں

افسانۂ حیات رقم کر رہا ہوں میں
تکمیلِ داستانِ الم کر رہا ہوں میں

رکھیں نہ باز دیر نشینی سے مجھ کو دوست
اس رنگ میں طوافِ حرم کر رہا ہوں میں

پابندِ رسمِ عشق کی مجبوریاں نہ پوچھ
خود کو حریفِ دستِ کرم کر رہا ہوں میں

کھویا گیا ہوں دشتِ محبت میں اس طرح
ہستی پر اعتبارِ عدم کر رہا ہوں میں

اے مرگِ ناگہاں تری غیرت کو کیا ہوا
کیوں انتظارِ تیغِ ستم کر رہا ہوں میں

ہوتا ہے حشر دیکھئے ہنگامِ نزع کیا
امید و یاس دونوں بہم کر رہا ہوں میں

گو اے نظر سرشت میں ہندی نژاد ہوں
پابندیٔ مذاقِ عجم کر رہا ہوں میں

قیوم نظر

اعجازِ بیان

شرما کے آپ خونِ تمنّا نہ کیجئے — اب آئیے بھی وعدۂ فردا نہ کیجئے

میں بھی گلو تو رکھتا ہوں اس کو نوازیئے — یہ التفات جانبِ مینا نہ کیجئے

میرے بھی لب ہیں صوتِ ساغرِ سرور خیز — چکھ لیجئے تو خواہشِ صہبا نہ کیجئے

مجروحِ زخمہ کیجئے میرا ربابِ دل — خوں نکلے جائے نغمہ تو پروا نہ کیجئے

کر لینے دیجئے مجھے آغوشِ شوق وا — بندِ نقابِ حُسن ابھی وا نہ کیجئے

رکھیئے نہ نرم ہات مرے بازوؤں پہ آپ — پھر مردہ آرزوؤں کو زندہ نہ کیجئے

لگ جائے اپنی ہی نہ کہیں آپ کو نظر — ہے ڈر کی بات آئنہ دیکھا نہ کیجئے

بیگانہ وار آکے چلے جائیے یونہی — کچھ التفات حال پہ اصلا نہ کیجئے

اعجازؔ نامرادیِ دل دے رہی ہے درس
مر جائیے، پر اُن کی تمنّا نہ کیجئے

سعید احمد اعجازؔ

عصرِ عبّاسی اوّل کی شاعری

(بلحاظ تاریخ ادب خلافت عباسیہ کے طویل زمانہ کو چار دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے —— اس میں سے پہلے دور کی شاعری کا مختصر حال یہاں پیش کیا جاتا ہے)

روایتِ شاعری اس دور کو اور دوروں پر ایک امتیازی حیثیت اس لئے حاصل ہے کہ اس میں چند ایسی مشہور و معروف ذہین ہستیاں پیدا ہوئیں جن کی زندگی کا مقصد جاہلیت اور اس کے بعد کے جتنے اشعار مل سکیں انہیں یاد کر کے اُن کی صحیح روایت کرنا اور ہزارہا شاعروں کے سوانح حیات بیان کرنا تھا۔ انہیں کے کارناموں کی وجہ سے آج قدیم عربی شاعری کا سرمایہ ہمیں اپنی اصلی حالت میں مل سکتا ہے۔

ابتدائے اسلام میں قرآن مجید کے معانی و تفسیر کے سلسلہ میں یوں بھی قدیم عربی شاعری سے کام لیا جاتا تھا اور دوسرے شاعری کے جوازات و استناد کے لئے اس کی قدر و قیمت میں مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا۔ انہیں وجوہات کی بنا پر "روائتِ شعری" نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر لی۔ سینکڑوں راوی پیدا ہو گئے لیکن ان تمام کو وہ تاریخی اہمیت حاصل نہ ہو سکی جتنی کہ ان میں سے بعض کو ہوئی جن کے حالات ہم ابھی پیش کریں گے۔

معانی و تفسیر کے بعد نحو، بلاغت، امثال و اقوال اور عام ضروریات کے لئے بھی قدیم عربی شاعری کے ذخیرہ کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کی جانب پہلا قدم عصرِ عباسی ہی میں اٹھایا گیا گو اس کے کچھ عرصہ کے بعد اسے باقاعدہ طور پر ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ اس دور کے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ عرب کے سب سے مشہور راویوں میں پہلا نام "حمّاد الراویہ" کا آتا ہے اس کے بعد ابو عمرو بن العلاء خلف الاحمر اور المفضل الضبی وغیرہ ہیں۔ ان کے حالات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

حمّاد الرّاوِیَہ

المتوفی ۱۵۶ھ

اس کا نام حمّاد بن میسرہ ہے۔ قبیلۂ بکر بن وائل سے اس کا تعلق تھا۔ کوفہ میں پیدا ہوا اور اس کی ابتدائی زندگی ڈاکوؤں اور قزاقوں میں نہایت بری حالت میں بسر ہوئی۔ ایک رات اس نے کسی شخص کے ہاں سرقہ کیا جس میں سامان کے علاوہ اسے چند کاغذات ملے جن پر انصار کے اشعار درج تھے۔ اسے یہ اشعار بہت پسند آئے اور انہیں اس نے حفظ کیا۔ اسی دن سے اس نے تہیہ کر لیا کہ ادب و شاعری کا جتنا سرمایہ اسے مل سکے وہ اس کا حافظ بن جائے۔ چنانچہ اس نے اتنا کچھ یاد کیا کہ اسے اوروں پر ممتاز کرنے کے لئے "راویہ" لقب دیا گیا جس کے معنی ہیں بہت زیادہ روایت کرنے والا (مبالغہ کا صیغہ ہے)

غضب کا حافظہ پایا تھا۔ ایامِ عرب اور ہزارہا شاعروں کے سوانح حیات کے علاوہ اسے لاکھوں اشعار نوکِ زبان تھے۔ بنو امیہ کے ہاں اس کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ خلفاء بنی امیہ صحیح روایت حاصل کرنے میں اکثر اسی سے مدد لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ خلیفہ ولید بن یزید نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کیوں "راویہ" کہلانے کا مستحق ہے اس نے جواب دیا "میں ان سب شاعروں کی روایت کر سکتا ہوں جنہیں آپ جانتے ہیں اور ان سب کی بھی جن کا ذکر آپ کے سننے میں آیا ہے اور ان تمام کی بھی جن کے متعلق آپ نے کسی سے کبھی کچھ نہیں سنا —— اور ہزاروں اشعار میں میں فوراً تمیز کر کے یہ دکھلا سکتا ہوں کہ قدیم شعراء کا کلام کونسا ہے اور جدید شعراء کا کونسا"

اسے حروفِ تہجی میں سے ہر حرف کی ردیف کے سو سو قصائد

صرف جاہلیت کے یاد تھے ان کے علاوہ متفرق اشعار، قطعات اور اسلامی شاعری کا سرمایہ الگ ہے۔ خلیفہ ولید بن یزید نے ایک مرتبہ اس کا امتحان لیا اس نے بغیر کسی وقفہ کے دو ہزار نو سو قصاید جاہلیت کے سنائے ولید نے تھک کر اسے خاموش رہنے کا حکم دیا اور انعام میں ایک لاکھ درہم عنایت کئے۔

حماد بنو امیہ کے بعد بنو عباس کے درباروں میں شریک رہا، منصور مہدی وغیرہ نے اس کی بڑی قدر کی۔ اس نے ایک ایک قصیدے کی روایت پر ان سے لاکھ لاکھ درہم و دینار وصول کئے۔ اگرچہ مفضل الضبی بھی خلفائے عباسیہ کے درباروں میں بڑا رسوخ رکھتا تھا لیکن صحت روایت کے لئے حماد کا قول مستند سمجھا جاتا تھا۔

حماد ہی وہ راوی ہے جس نے سبع المعلقات اور دوسرے مشہور قصاید جاہلیت کی صحیح روایت کرکے انہیں ادب عربی میں حیاتِ ابدی بخشی۔ اسی کی بدولت آج قدیم عربی شاعری کی روح صدیوں کے بعد بھی اسی ولولہ اور جوش کے ساتھ اہل عرب کے دل و دماغ پر اپنا اٹل اثر جمائے ہوئے ہے۔

المفضّل الضّبی

المتوفی سنہ ۱۶۸ھ

المفضل محمد بن الضبیؔ کوفہ کے مشاہیر میں سے ہے ابو زید الصاری جو روایت اور تحفظ ادب میں کافی شہرت رکھتا ہے، اسی کا شاگرد تھا۔ عباسیین کے خلیفہ مہدی نے اسے اپنے پاس رکھا تھا اور اسی کے ایماء پر اس نے مختلف شعرا کے کلام سے منتخبات جمع کئے تھے جس کا نام "المفضلیات" رکھا۔ مفضل بھی اپنے عہد میں بڑی شہرت کا مالک تھا۔ لیکن اسے وہ نام آوری حاصل نہ ہو سکی جو حماد کے حصہ میں آئی۔

خلف الاحمر

المتوفی سنہ ۱۸۰ھ

اس کا نام خلف بن حیان ہے۔ ابو بردہ کے غلاموں میں سے تھا اس کا وطن فرغانہ ہے لیکن اسے ادب عربی اور اس کی قدیم شاعری سے اتنی دلچسپی تھی کہ اس نے اپنی ساری زندگی اشعار کے حفظ کرنے اور ان کی روایت کرنے میں صرف کی۔

خلف الاحمر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ خود اشعار لکھ کر قدماء کے قصاید میں شامل کر دیتا تھا۔ اس خوبی سے کہ کوئی انہیں تمیز نہ کر سکے۔ اصمعی جیسا ماہر اس کا شاگرد تھا۔ حماد کی طرح قدیم و جدید اشعار کی تمیز کرنے میں اسے بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ حماد کے زمانے میں یہ چندے بصرہ میں رہا تھا اور اس کی روایتوں کو سن چکا تھا۔

محمد بن سلّام

المتوفی سنہ ۲۳۲ھ

ابو عبداللہ محمد بن سلّام اس کا نام ہے اور یہ "الجمحی" کی نسبت سے مشہور ہے بصرہ کا رہنے والا تھا۔ یہی سب سے پہلا شخص ہے جس نے جاہلیت اور اسلام کے شعرا کو علیٰحدہ علیٰحدہ طبقوں میں شمار کرکے ان کے حالات اور ان کا کلام علیٰحدہ علیٰحدہ جمع کیا۔ اس کی تقلید اس کے بعد بے شمار لوگوں نے کی۔ اس میں شک نہیں انہوں نے اس میں بے حد ترقی کی لیکن طبقات شاعری کو تمیز کرنے کا اقدام اسی نے کیا۔ جاہلیین کے طبقۂ شعرا کا اس نے ایک مجموعہ اور طبقۂ شعرا اسلام کا اس نے ایک علیحدہ مجموعہ تیار کیا۔ اس کے علاوہ اسے نقد شعر اور نحو میں بھی کافی دخل تھا۔

ابن ابی الخطّاب

صاحبؔ جمہرۃ اشعار العرب"

ابو زید محمد بن ابی الخطاب قریش کا ایک نام آور شخص ہے۔ اس کی زندگی کے متعلق بہت ہی کم حالات ہمیں مل سکے ہیں۔ جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے وسط میں گزرا ہے۔ اس کی وسعت نظر اور کمال تنقید کا اندازہ اس کی لازوال کتاب جمہرۃ اشعار العرب" کے دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

قدیم شاعری پر جتنی مستند اور محققانہ کتب آج تک لکھی گئی ہیں اُن میں اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس نے شعرا کو مختلف طبقوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کا تنقیدی روشنی میں مقابلہ و موازنہ بھی کیا ہے۔ لغت قرآن مجید اور شاعروں کے حالات اور کلام اس کی اس کی اس بے مثل کتاب میں پائے جاتے ہیں، شاعری کے قدیم سرمائے کے جمع کرنے میں اس کتاب نے بڑی مدد کی ہے۔"

ان کے علاوہ متعدد مشاہیر گزرے ہیں جن میں ابو عمرو الشیبانی المتوفی ۲۰۶ھ کا نام خاص طور پر لئے جانے کے قابل ہے۔ اس نے بھی روایت شعری اور ایام عرب کے جمع کرنے میں اپنی کئی تالیفات کے ذریعے مدد کی ہے۔

شاعری میں انقلاب ملک کی سیاست میں اتنی اہم تبدیلی اور حکومت کی کایا پلٹ کا اثر اس دور کی شاعری پر بے حد ہوا۔ کہاں وہ بادیہ نشین عرب کا تخیل کہ جس کے پیش نظر کھلا ہوا میدان، وسیع صحرا یا چراگاہیں —— چھوٹی سی کٹیا یا معمولی سا خیمہ جس کا ہمدرد رفیق سوائے اونٹنی یا گھوڑے کے اور کوئی نہیں۔ اوپر آسمان نیچے زمین لڑائیوں کا خوف، انتقام کا جوش، سادہ محبت کی خلش بیہم اور تحفظ عزت و وقار کا سوال بس جس کے کل محرکات شاعری یہی کچھ ہوں اور کہاں ایک امیر کی فکر رسا کہ جس کے تخیلات کی آمد بھی فرد دس بریں ہی سے ہوتی تھی۔

شاعر کیا کہے! امیر جیسا کہ ابھی ہم نے کہا ہے جس کی خدمت کے لئے گلستان فارس کی حسین و دلکش تیتریاں موجود ہوں —— عالیشان محلات، جن کی آرائش اور چمن بندی اور دلفریب حوضوں اور چشموں پر پھولوں پھلوں سے لدے پھندے درختوں کی بہار دیدہ زیب ہو جن حسین و خوش الحان طیور کو دیکھنے کی تمنا میں بردی اپنی زندگی گزارتا ہو ان کی کثرت یہاں "بے دماغی" کی محرک!! دیبا و حریر جن کے قدموں تلے روندے جانے کو باعث افتخار جانیں۔ سونے چاندی کے برتن جن کی غذا مہیا کرنے پر فخر کریں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ شراب جن کے فلک رس تخیل کو کائنات کے تمام تعلقات سے بیگانہ کر دے —— بھلا اس کی شاعری اور اس کے محرکات پر کیا بحث کی جائے!!!

لوازمات عیش و عشرت کی کثرت، عام معیار زندگی کی بلندی، مذہبی آزادی، معاشرتی بکھیڑوں سے نجات اور دوسروں کے خیالات و تہذیب کے اثرات نے عربی شاعری کی کائنات ہی بدل دی۔ اس نئی شاعری میں معانی میں جدت پیدا کرنے کی طرف عام رجحان پایا جاتا ہے اور وسعت خیال ان لوازمات کا لازمی نتیجہ تھا۔

حصول دولت و جاہ کے لئے پہلے تو مدح کی کثرت ہوئی اور پھر مدح میں مبالغہ کو اس کی آخری منازل تک پہنچا یا گیا۔ شراب کی تعریف میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا گیا اور پہلی مرتبہ عربی شاعری کے کان مدح کی ایک نئی صنف سے آشنا ہوئے وہ غلمان کی تعریف "توصیف" ہے۔ قدیم الخیال شعرا اور عوام اسے کتنا ہی باعث ذلت و رذالت سمجھا کئے مگر زمانے نے انہیں یہ دن بھی دکھا دیا!!

مذاحیہ اشعار اور ظرافت نگاری پر خاص توجہ کی جانے لگی اور اس کے ساتھ ہی باغوں اور پھولوں پھلوں کی توصیف میں بھی خوب گل کھلائے گئے۔

اس میں شک نہیں کہ عرب کی قدیم سادہ نگاری، اصلیت اور جوش تینوں بڑی حد تک اس شاعری سے معدوم ہو گئے۔ مگر انقلاب زمانے کے لحاظ سے یہ ادبی انقلابات بھی ناگزیر تھے اس وقت کے شاعر، بادشاہ، امرا اور عوام سبھی اس نہج کو پسند کرتے تھے اس لئے قدیم شاعری اور اس جدید شاعری میں ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہو گئی۔

اسی پس منظر کے ساتھ ہم اس عہد کے بعض جلیل القدر شعراء کے حالات پیش کرتے ہیں۔

بشار بن برد
المتوفی ۱۶۷ھ

بشار فارسی الاصل تھا جس کے آباؤ اجداد طخارستان کے رہنے والے تھے۔ مہلب بن ابی صفرہ کے ساتھ اس کا باپ عرصہ تک رہا۔ یہیں کسی عورت سے اس نے شادی کی اور اسی کے بطن سے بصرہ میں بشار پیدا ہوا۔ یہ پیدائش ہی سے بصارت سے محروم تھا۔ اس کے گالوں اور آنکھوں پر سرخ خوفناک نشانات تھے۔ بینائی سے محروم ہو کر اس نے قدرت سے اور قوتیں پائیں جن میں اس کا غیر معمولی حافظہ اور قوت تخیل ہے۔

دنیا کے مشہور عدیم البصر شاعروں میں بشار بھی ایک درجہ رکھتا ہے۔ جس طرح یونانی ادب میں ہومر اور انگریزی ادب میں ملٹن وغیرہ کی عزت کی جاتی ہے وہی عزت ادب عربی میں بشار اور ابوالعلا المعری کو حاصل ہے۔

فطری شاعر ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ دس سال کی عمر سے اس نے شعر کہنا شروع کیا اور بالکل قلیل عرصے میں اس عہد کے ہر شاعر کو نیچا دکھا دیا —— چنانچہ اپنے زمانے میں بغداد کے تمام شاعروں کا یہی امام مانا جاتا تھا۔

منصور کے زمانے میں یہ بغداد آیا۔ اس نے اپنے بچپن میں جریر و فرزدق کے مقابلوں کا مشاہدہ کیا۔ اسی زمانے میں ایک مرتبہ اس نے جریر کی ہجو کہی۔ جریر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ "یہ ابھی بچہ ہے"— بشار کو بڑی تمنا تھی کہ جریر بھی اس کی ہجو کرتا۔ آخر عمر تک یہی کہتا رہا کہ "اگر جریر میری ہجو کرتا تو مجھ سے بڑا شاعر سارے ملک میں کوئی نہ رہتا" لیکن جریر و فرزدق کے بعد اس کی شاعری کے مہر نیم روز کو آسمان شہرت پر جلوہ گر ہوتے دیر نہیں لگی۔

چونکہ بشار نے بنی عقیل کے بدویوں میں پرورش پائی تھی اور فصیح و بلیغ عربی کہنے والوں میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ اسی لئے اس کے تمام اشعار رکاکت نحوی غلطیوں اور روزمرہ کی لغزشوں سے مبرا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماہران لغت اور نحویین نے اسے بھی ان آخری شعرا میں شامل کیا ہے جن کے اشعار بطور اسناد و شواہد پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ رتبہ عربی شاعری اور ادب میں اچھے اچھوں کو نہیں ملا۔

جدت پسندی، نزاکت تخیل، تشبیہات و استعارات کی ندرت اور بلاغت معانی اس کی شاعری کے اجزائے اعظم ہیں۔ وہ نہایت پرگو شاعر تھا۔ اس نے متفرق ابیات قطعات وغیرہ کو چھوڑ کر صرف طویل قصائد بارہ ہزار کہے جن کے متعلق خود کہا کرتا "میرے ہر قصیدے سے صرف ایک عمدہ شعر بھی چن لو تو بارہ ہزار شعر ہوتے ہیں" لیکن یہ سب تلف ہو گئے! جاہلیت اور اسلام— دونوں زمانوں میں سب سے زیادہ شعر کہنے والے تین شاعروں میں یہ بھی شامل ہے اور وہ تین ہیں، ابو العتاہیہ، بشار اور السید الحمیری۔

اس کے اپنے زمانے میں اس کا کلام بہت زیادہ مقبول عوام ہوا۔ ہر مجلس اور ہر سوسائٹی میں اس کے تذکرے ہوتے۔ ملک کا ہر مشہور مغنی محفلوں میں اس کا کلام سناتا اور ہر حسین مطربہ مجلسوں میں اس کے اشعار سے اہل محفل کو وجد میں لاتی۔ جس طرح امرء القیس متقدمین کا امام مانا جاتا تھا۔ اسی طرح بشار اور ابو نواس بھی محدثین کے امام مانے گئے۔

اس نے ابتداءً انصار علی کی حمایت کی پھر صرف عباسیین ہی کی مدح میں عمر گزارنے لگا۔ ہزارہا درہم و دینار اسے عباسیوں کے دربار سے ملے۔ خالد بن برمک کی تعریف میں ایک قصیدہ کہنے پر خالد نے پانچ ہزار درہم اسے انعام میں دیئے۔

مختلف اصناف سخن میں بشار نے طبع آزمائی کی ہے لیکن قصاید و نسیب میں یہ سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ فلسفہ کے اثرات بھی اس کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ عورتیں اس کی شاعری پر فدا ہوتی تھیں کیونکہ نسیب میں عورتوں کی فطری خصوصیات کی جس انوکھے اور دلنشیں انداز میں یہ مصوری کرتا تھا وہ اپنی آپ نظیر ہے مالک بن دینار کہتا ہے کہ "اس شہر کے لوگوں کو فسق و فجور کی دعوت دینے میں اس اندھے ملحد کے اشعار سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں —"

اس کی مخرب اخلاق شاعری سے تنگ آ کر لوگوں نے خلیفہ مہدی سے اس کی شکایت کی۔ مہدی نے حکماً اس کی بے راہ روی کی روک تھام کی۔ بشار نے پہلے مہدی کی مدح کی لیکن اس نے کچھ التفات نہ کیا پھر اس نے ان اشعار میں اس کی ہجو کہی:۔

بنی اُمیۃ هبُّوا طال نومُکم ۔ إنّ الخلیفۃَ یعقوب بن داؤد
ضاعتْ خلافتکم یا قوم فالتمسُوا خلیفۃَ اللہ بین الزِّق والعود

مطلب:۔ اے بنی امیہ کے لوگو! خواب غفلت سے جاگو کیونکہ اب اصل خلیفہ یعقوب بن داؤد ہے (یہ مہدی کا وزیر اعظم تھا) تمہاری خلافت گم ہو چکی ہے — اور اگر اپنے خلیفہ کو ڈھونڈنا چاہو تو شراب کے خم اور چنگ و رباب کے درمیان تلاش کر سکتے ہو!!

اس پر مہدی نے غضب آلود ہو کر شہر کے کوتوال کو حکم دیا کہ بشار کو کوڑوں سے پٹوایا جائے — کوتوال نے اتنا پیٹا کہ بشار اسی صدمہ سے ہلاک ہو گیا۔ خلیفہ کے خوف سے عوام نے بشار کی قدر و منزلت میں کمی کی اسی وجہ سے اس کا نام پیچھے پڑ گیا اور اس کا بہت سا کلام یونہی ضائع ہو گیا۔

السیّد الحمیری

المتوفی ۱۷۳ھ

حمیری بصرہ میں پیدا ہوا۔ بلند پایہ فطری شاعر تھا اور اس کے ساتھ ہی بہترین مقرر بھی۔ عہد عباسی کے تین پرگو شعرا میں اس کا نام بھی شامل ہے جس کا ذکر آ چکا ہے۔ اس نے ڈھائی ہزار کے قریب قصائد لکھے جس میں اب بہت کم کلام دستیاب ہوتا ہے۔

چونکہ یہ شیعہ تھا اور شعرائے انصار علی میں شامل تھا۔ اسی لئے اوروں کی طرح اس نے بھی صحابہ کرام کو سب و شتم کرنے میں کمی نہیں کی

جس کے باعث ہمیشہ کے لئے کنج خمول میں پڑ گیا۔ ورنہ اس کا رنگ ایسا نہ تھا جسے آسانی سے فراموش کر دیا جائے۔

اس کے الفاظ شاندار اور شیریں ہوتے ہیں۔ اپنے زمانے کا یہ سحر بیان مقرر سمجھا جاتا تھا۔ اہل محفل کو اپنا لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لوگ یہ چاہتے تھے کہ جو وقت اپنی باتیں کرنے کا ہو وہ بھی اسی کو دے دیں کہ زیادہ دیر تک اس کی شیریں بیانی سے لطف اٹھایا جائے۔ بشار اس کو بہت بڑا شاعر خیال کرتا تھا۔ یہ نہایت منہ پھٹ اور بے باک شخص تھا۔ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے اس کے پاس ایک نہایت قیمتی تحفہ روانہ کیا لیکن اس نے اسے لینے سے انکار کیا اور واپس کر دیا۔

ابونواس

۱۴۵ھ تا ۱۹۹ھ

ابونواس احسن بن ہانی ۱۴۵ھ ہجری میں خلیفہ ابوجعفر المنصور کے عہد میں اہواز میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ دمشق کا رہنے والا تھا جو بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد کی فوج میں ملازم تھا اور جس نے اہواز کی ایک عورت سے شادی کر لی اور یہیں ابونواس پیدا ہوا۔ اس کا ایک اور بھائی ابو معاذ نامی تھا۔ ابونواس ابھی دو سال کا تھا کہ اس کے باپ نے بصرہ کی سکونت اختیار کر لی اسی لئے اس کی نشو و نما بصرہ کے علمی و ادبی ماحول میں ہوئی۔

باپ کے انتقال پر اس کی ماں نے ایک عطر فروش کے پاس اسے نوکر رکھا دیا۔ گو اس پیشے سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن چند دن مجبوراً وہاں رہا۔ شعر و سخن سے اسے فطری لگاؤ تھا۔ شاعری کی ہر محفل میں شریک رہتا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے شہر کے تمام شعرا سے اس نے جان پہچان پیدا کر لی۔

اس زمانے میں والبہ بن حباب نامی ایک اوسط درجہ کا شاعر کوفہ سے اہواز آیا کرتا تھا۔ اس نے ابونواس کی طبیعت سے اس کے رجحان کا اندازہ لگا لیا۔ اسی کی ہمت افزائی اور دعوت پر اس نے اہواز کو خیرباد کہا اور پہلے کوفہ اور بعد میں بغداد کا رخ کیا۔ والبہ بن حباب کی ایک جماعت تھی جس میں اکثر شاعر تھے۔ یہ سب روزانہ ایک جگہ جمع ہوتے اور شغل ناؤ نوش کے علاوہ سخن سنجی بھی کیا کرتے۔ یہیں ابونواس نے شاعری کے متعلق بہت کچھ اور تباہی اخلاق کے متعلق "سب کچھ" سیکھ لیا۔

والبہ بن حباب کی جماعت میں رہ کر ظرافت، شاعری، ہجو نگاری اور آوارہ گردی میں طاق ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے بعض علمائے لغت و نحو سے بھی استفادہ کیا۔ ابوزید انصاری سے اس نے لغت کے متعلق اور سیبویہ کی "کتاب" سے اس نے نحو کے بارے میں بہت کچھ جان لیا۔ یہی وجہ ہے اس کا کلام ہر قسم کے عیوب سے بالکل مبرا ہے۔

جاحظ اس کے متعلق رقمطراز ہے "بلحاظ نحو سب سے عمدہ فصیح اور غلطیوں سے مبرا اشعار لکھتا ہے"۔ معمر بن المثنی کا خیال ہے "محدثین میں ابونواس کی شخصیت متقدمین میں امرء القیس کی شخصیت کے ہم پلہ ہے۔"

ابن السکیت کا قول ہے "اگر تم قابل وثوق شعرا کی روایت کرنا چاہو تو جاہلیین سے امرء القیس اور اعشیٰ کو اسلامی شعرا سے جریر و فرزدق کو اور محدثین سے ابونواس کو لو۔ بس!" اور خود اس نے اپنے متعلق ایک مرتبہ کہا "میں اس وقت تک شعر نہیں کہتا جب تک کہ اپنے الفاظ کے متعلق صرف جاہلیت کی ساٹھ عورتوں سے، جن میں خنساؔ اور لیلیٰ بھی ہیں ثبوت حاصل نہ کر لوں ـــــ اب مردوں کے اشعار کا خود ہی اندازہ کر لو!"

یقیناً ادب میں اس شاعر کا پایہ بے حد بلند ہے!!!

متقدمین کے طرز بیان اور اسلوب شاعری میں اس نے ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ حقیقتاً شاعری کے قالب میں وہ ایک نئی روح پھونکنے والا تھا۔ ـــ لالہ گوں کی توصیف میں اس نے وسعت پیدا کی اور عربی شاعری میں سب سے پہلے اسی نے نسیب و تشبیب نگاری میں مونث کے علاوہ "مذکر" کو بھی داخل کیا۔

ہم عصروں میں ممتاز درجہ حاصل کرنے کے کچھ عرصہ بعد خلیفہ ہارون الرشید کی مدح کر کے اس نے دربار خلافت میں اپنی جگہ پیدا کر لی۔ اس کے بعد کچھ زمانے تک امین کے ندماء میں شامل رہا اسی کے حکم سے کچھ دن کے لئے قید کیا گیا جہاں سے رہائی پانے کے تھوڑے ہی دن کے بعد ۱۹۹ھ میں اس کا انتقال بغداد میں ہوا۔

بشار کی طرح اس کے اشعار بھی مقبول عوام و خواص تھے۔ اس کے اشعار میں ایک لوچ اور دلکشی ہے۔ معاملات کی سچی تصویر کھینچنے

میں اسے عجیب ملکہ حاصل تھا فحش گوئی اور زہریات میں بھی یہ پیچھے نہیں رہا مدح اس نے بہت کم کی ہے۔ جاحظ بشار اور ابونواس کے متعلق کہا کرتا تھا:

بشار و ابونواس معناهما واحد والعدة اثنان"

یعنی بشار اور ابونواس کے معنی ایک ہی ہیں اگرچہ گنتی میں یہ دو ہیں۔

اس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک رات میں قصیدہ کہہ ڈالتا پھر چند دن اس کی تنقیح و ترتیب میں صرف کرتا۔ اکثر اشعار کانٹ چھانٹ دیتا یہی وجہ ہے کہ اس کے قصاید عموماً اوروں کی طرح طویل ہونے کی بجائے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔

ابوالعتاہیہ

سنہ ۱۳۰ھ تا ۲۱۱ھ

اس بے مثال شاعر کا نام اسمٰعیل بن قاسم بن سوید بن کیسان کنیت ابواسحاق اور لقب ابوالعتاہیہ ہے۔ حجاز کے ایک معمولی قصبہ عین التمر میں پیدا ہوا اور کوفہ میں پرورش پائی کوزہ گری اس کا آبائی پیشہ تھا۔ یہ بھی بچپن سے اسی میں مشغول رہا۔ ہانڈی برتن بناتا اور اپنی پیٹھ پر لاد کر انہیں کوفہ کی گلیوں میں بیچتا پھرتا۔

شعر و سخن اس زمانے میں اتنی عام چیز تھی کہ بچے، بڑے، بوڑھے غرض بھی اس کی دلچسپیوں میں حصہ لیتے۔ ابوالعتاہیہ کی یہ کیفیت تھی کہ جہاں شاعری کے متعلق کوئی بحث چھڑی فوراً وہاں جا پہنچتا اور خود بھی شریک ہو جاتا۔ مشاعروں میں حصہ لیتا غرض اپنے فرصت کے لمحات یہ اسی مشغلہ میں گزارتا۔

اس کی شاعری کی شہرت بھی عجیب طور پر ہوئی۔ ایک دن یہ برتن لے کر بازار سے گزر رہا تھا دیکھا کہ چند لڑکے شعر و سخن پر بحث کرنے میں مصروف ہیں خود بھی جا پہنچا اور ان میں شریک ہونا چاہا۔ انہوں نے پہلے تو اس کا مضحکہ اڑایا پھر یہ شرط بدھی کہ وقت مقررہ کے اندر ابوالعتاہیہ کے ایک مصرعے پر وہ سب مل کر مصرعے لگائیں گے شکست کھانے والے فریق کے ذمے دس درہم کی ادائیگی بھی طے پائی۔ لڑکے ہار گئے ابوالعتاہیہ نے اسی ردیف اور قافیہ میں ارتجالاً چند بہترین اشعار کہے بہت تھوڑے عرصہ میں کوفہ کے ہر شخص کی زبان پر جاری ہو گئے۔

جب اس کی شہرت اطراف و اکناف میں پھیل گئی تو لوگ اس کے اشعار سننے کی خاطر اس کے پاس جمع ہوتے اور اس سے سن کر انہیں اس کے گھر کے قریب پڑی ہوئی ٹھیکریوں اور ٹوٹے پھوٹے برتنوں پر لکھ کر لے جاتے ہزار ہا شعر کہہ دینا اس کے نزدیک معمولی بات تھی۔ خود کہا کرتا تھا کہ "اگر میں چاہوں تو عمر تمام اشعار ہی میں بات چیت کیا کروں" واقعہ بھی یہی تھا کہ گفتگو میں اکثر اس کی زبان سے اشعار نکل جاتے لیکن لوگ اسے نثر ہی سمجھتے۔

خلافت مہدی کے ابتدائی زمانے میں اس نے بغداد کا رخ کیا اور اس کی مدح کر کے اس کے متوسلین میں شامل ہو گیا۔ مہدی کے بعد ہادی کے پاس بھی اس نے بہت رسوخ حاصل کیا۔ ہادی نے اس کی قدر و منزلت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس کے بعد اس نے رشید کے زمانے میں انتہائی عروج حاصل کیا۔

رشید اس کا بے حد شیدا تھا۔ سفر و حضر میں ابوالعتاہیہ کا اس کے قریب موجود رہنا لازمانہ سے تھا۔ اس نے اس کے لئے پچاس ہزار درہم سالانہ کا ایک گرانقدر وظیفہ بھی مقرر کیا تھا۔ یہ وظیفہ ان انعامات و عطایا کے علاوہ تھا جو عیش و مسرت کے مواقع پر قصاید اور نظموں کے ذریعے خلیفہ و امرا کو خوش کرنے میں ملا کرتے۔ ابوالعتاہیہ اب عمر کی آخری منزلیں طے کر رہا تھا۔ اسی لئے تقدس و زہد اختیار کرنے کے خیال سے اس نے ایک مرتبہ شعر کہنا بالکل ترک کر دیا۔ رشید نے اسے شعر کہنے پر مجبور کیا۔ جب بالکل ہی نہ مانا تو خلیفہ کے حکم سے اس کو ساٹھ کوڑے لگائے گئے تب کہیں جا کر اس نے شعر کہنے کا وعدہ کیا۔

رشید کے بعد اس نے مامون کا بھی کچھ زمانہ دیکھا اور اس کے عہد میں ۲۱۱ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مہدی کے زمانے میں اس نے عتبہ نامی اس کی ایک کنیز سے عشق بازی بھی کی۔ عتبہ سے اس کی پروانہ کی۔ غزلیات و تشبیب میں متعدد جگہ اس نے عتبہ کے حسن جہاں سوز کا تذکرہ کیا ہے۔ مہدی کے حکم سے اس نے عتبہ سے تشبیب کرنا ترک کیا آخری عمر میں یہ بالکل مذہبی آدمی بن کر رہ گیا تھا۔

ابوالعتاہیہ سوداوی مزاج کا تھا۔ مفکرین وقت میں اس کا نام بھی آ سکتا ہے۔ ابتدائی عمر میں دین کے معاملے میں بڑا متذبذب تھا کبھی مستقل

ارادہ اور عزم کا مالک ذہن رسا کو حقایق اسلام نے آخری عمر میں اپنے گہرے نقوش اس کے قلب پر مرتسم کر دیئے۔

اس کا کلام لطف معانی، سہل الفاظ، سلاست، نرمی اور روانی سے مملو ہے۔ اس کی شاعری میں ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں وزن سے گرے ہوئے اشعار بھی ملتے ہیں چنانچہ اس کے متعلق اصمعی کی رائے ہے کہ اس کا کلام سلاطین کے محالک کی طرح ہے کہ جن میں ہیرے جواہرات، سونا، چاندی، اینٹ پتھر، مٹی —— غرض سبھی کچھ رہتے ہیں"

ہمعصر شعرا کی صف اول میں آنے کا بڑا سبب اس کے سہل ممتنع اشعار ہیں۔ پند و نصائح کی بھی کثیر مثالیں اس کے کلام سے مل سکتی ہیں۔ اب بھی اس کے چار ہزار سے زاید قصاید موجود ہیں۔ عبداللہ بن معن کے سوا اس نے کسی کی ہجو نہ کی۔

شعر گوئی میں اس نے کسی اسلوب کی تقلید نہ کی۔ بڑا جدت پسند شاعر تھا اور ساتھ ہی پُرگو بھی اُس نے اسلوب شاعری میں بے انتہا وسعت پیدا کی اور اپنے ایک خاص انداز کی بنا پر سخن سنجی میں وہ ایک انقلاب کا پیغمبر تسلیم کیا جاتا ہے۔

مسلم بن الولید

المتوفی ۲۰۸ھ

مسلم بن ولید انصاری تھا۔ یہ زبردست مدح نگار تھا اور آج اپنی مدح نگاری کے باعث ہی مشہور ہے۔ اس نے یزید بن مزید، داؤد بن یزید مہلبی، خاندان برامکہ کے متعدد افراد اور ان کے سیکرٹری محمد بن منصور کی مدح کرنے ہی میں اپنا سارا زور قلم صرف کیا ہے۔

مامون نے اسے جرجان کا گورنر بنا دیا تھا —— اور یہیں اس کا خاتمہ ہوا۔ اس کی شاعری میں حسن و عشق کی جلوہ گری اپنے پورے شباب پر ہے۔ نزاکت، رقت اور لوچ کے اعتبار سے اس کا درجہ بلند ہے۔ مسلم کو اس کے عہد میں عموماً "صریع الغوانی" کے نام سے پکارا جاتا تھا جس کے معنی ہیں "مریض مہ وشاں"

ابو تمام

۱۸۸ھ تا ۲۳۱ھ

اس کا نام حبیب بن اوس ہے۔ اس کا تعلق قبیلہ طے سے تھا۔ دمشق کے ایک قصبۂ جاسم میں یہ پیدا ہوا۔ پہلے دمشق آیا اور صغر سنی ہی میں مصر جا پہنچا۔ یہاں یہ جامع عمرو میں لوگوں کو پانی پلایا کرتا تھا۔ یہیں ادیبوں اور عالموں کی صحبت میں رہ کر اس نے بہت کچھ سیکھ لیا۔

ابوتمام فطری شاعر تھا۔ خدا نے اسے غیر معمولی ذہانت اور بے نظیر حافظہ کا مالک بنایا تھا۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ علو خیالی اور جدت پسندی کے باعث بہت جلد عوام میں مقبول ہو گیا۔ اس کی شہرت تھوڑے ہی دنوں میں بغداد تک پہنچ گئی۔ جہاں خلیفہ احمد بن المعتصم نے اسے بلا کر اپنے حلقۂ شعرا میں شامل کر لیا۔

یہیں سے ابوتمام کی شخصیت کو چار چاند لگ جائے۔ اس نے مدح گوئی اور قصیدہ نگاری میں خوب خوب کمالات دکھلائے اور اپنی زندگی بھر اپنے آگے کسی شاعر کا رنگ جمنے نہ دیا۔ یہی وجہ تھی کہ حصول مال و دولت و عز و جاہ میں کوئی اس کی ہمسری نہ کرسکتا تھا۔ احمد بن المعتصم نے اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر موصل کے کسی علاقہ کی گورنری اسے عطا کی۔ یہاں دو سال بھی رہنے نہ پایا تھا کہ علم و ادب کا یہ گنجینہ عین جوانی میں سپرد خاک کیا گیا۔

ابوتمام حسین و جمیل آدمی تھا۔ شیریں بیانی اور دلچسپ انداز گفتگو کے باعث وہ سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ عمدہ شاعر ہونے کے علاوہ وہ زبردست راوی تھا۔ روایت شعری اور تالیفات کے میدان میں ابوتمام کی شخصیت آج بھی فقید النظیر مانی جاتی ہے۔

اگر ابوتمام سا شخص عربی نظم کے اس مایہ ناز سرمایہ کو جمع کرنے اور اسے بذریعہ تحریر محفوظ کرنے میں کوئی توجہ نہ برتتا تو ہم تک آج عربی کے اس عظیم ترین خزانہ سے بہت ہی کم حصہ آتا۔ شاعری سے قطع نظر اس کا یہی کارنامہ جسے ہم "حماسہ" اور "فحول الشعرا" کے ناموں سے یاد کرتے ہیں اتنا اہم اور مہتم بالشان ہے کہ اس کے نام کو حیات ابدی کا جامہ پہنا سکے۔

ابوتمام کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اپنے غیر معمولی حافظہ کے بھروسہ پر اس نے "حماسہ" کی تکمیل کا بیڑہ اٹھایا۔ اس کو قطعات، قصائد اور متفرق ابیات کے چودہ ہزار اُرجوزے علاوہ طویل قصائد حفظ تھے "حماسہ" "وحشیات" اور "فحول الشعرا" اس کی مشہور تالیفات صرف اس کے حافظہ اور عظیم الشان دماغی قوٰی کے نتائج ہیں۔

ابوتمام ایک بڑا مفکر، فلسفی اور حکیم بھی تھا چنانچہ کہا گیا ہے کہ "متنبی اور ابوتمام حکیم تھے اور شاعر صرف بحتری" —— بدیہہ گوئی اور ارتجال میں بھی وہ کافی شہرت رکھتا تھا —— انہیں خوبیوں کی وجہ سے وہ مولدین کے طبقۂ ثانی کا امام مانا جاتا ہے!!

اس کی جواںمرگی کے متعلق ابویوسف فلسفی کی پیشگوئی بالکل صحیح ہوئی جو احمد بن المعتصم کے سامنے اس کے ارتجال کو سن کر اس نے کی تھی کہ "یہ غیر معمولی شخص زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا۔"

یہ تو چند مشہور شعرا کا ذکر تھا۔ سچ پوچھئے تو سینکڑوں شعرا اس زمانے میں ایسے تھے جو اپنے وقت کے اساتذہ تسلیم کئے جاتے تھے خلفا و امرا کی نوازشات سے یہ سبھی بہرہ مند ہوتے اور نہایت عیش کی زندگی گزارتے۔ سماج کی درستی اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں جتنا ان شعرا نے حصہ لیا اتنا کسی اور ملک میں مصلحین نے بھی نہ لیا ہوگا۔ اب ہم ان بےشمار شعرا میں سے صرف چند کے نام پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

دعبل الخزاعی متوفی ۲۴۶ھ اس عہد کا بڑا مشہور ہجو نگار گزرا ہے۔ اس نے عوام سے لے کر خلفاء تک سب کی ہجو کر ڈالی خلفائے عباسیہ جن کے رعب و داب سے زمین اور آسمان کانپتے تھے ان کی ہجو کرنے میں بھی اس نے کمی نہ کی۔ مامون، امین، معتصم ابراہیم بن مہدی —— غرض اس نے سب کی ہجو کی —— اور اس عہد کے ادب نواز خلفاء کو دیکھئے کہ ان بدزبان شاعروں سے بازپرس تک نہ کرتے۔

ابودلامہ متوفی ۱۶۱ھ اپنی مدح نگاری اور ظرافت کے باعث بےحد مشہور رہے۔ خلفاء کے پاس یہ اکثر خوش مذاقی کے باعث انعام واکرام حاصل کیا کرتا تھا۔

حماد عجرد متوفی ۱۶۱ھ بھی ابودلامہ کی طرح نہایت ظریف اور مسخرہ تھا۔ یہ حماد الراویہ کی جماعت کا ایک رکن بھی تھا۔ بشار اور حماد عجرد کے درمیان عرصہ تک ہجو نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔

مروان بن ابی حفصہ متوفی ۱۸۱ھ بھی ایک عمدہ شاعر تھا۔ خلفاء عباسیہ کے متوسلین میں یہ بھی شامل تھا۔ مہدی نے اس کے ایک قصیدہ پر ایک لاکھ درہم عطا کئے تھے۔ متعدد بار اس نے ایسے ہی عطایا حاصل کئے۔ ہارون الرشید نے اپنی تعریف میں کہے ہوئے ایک قصیدہ کے ہر شعر پر اسے ایک ہزار درہم انعام دیئے تھے۔ اتنی کثیر دولت کے باوجود یہ بڑا بخیل تھا۔

سلم الخاسر متوفی ۱۸۶ھ منصور النمری، علی بن الجہم، حسین بن الضحاک متوفی ۲۴۹ھ بھی بہت مشہور شعرا گزرے ہیں۔

آل برامکہ کی سرپرستی میں پھولنے پھلنے والے شعرا میں ابان بن عبدالحمید، ابن مناذر (۱۹۹ھ)، الرقاشی (۲۰۰ھ) اور اشجع السلمی بہت اہم ہیں۔

شیعہ شعرا میں دیک الجن متوفی ۲۳۵ھ کا نام خاص طور پر لئے جانے کے قابل ہے مرثیہ نگاری اور اہل بیت کی مدح میں ہی اس نے اپنی زندگی گزار دی۔

دیگر شعرا میں مطیع بن الاحنف، محمد بن بشیر الریاشی، کلثوم بن عمرو العتابی اور ربیعۃ الرقی کے نام بہت ممتاز ہیں۔

سید ابوالفضل

قطعہ

محبت بےنیازِ آن و ایں ہے
محبت چشمۂ صدق و یقیں ہے
محبت سے سکوں بخشِ دل و جاں ہے
محبت حاصلِ دنیا و دیں ہے

جلال الدین اکبر

راحت کدہ

ایک خواب

سلام اے ساحرِ سحرِ حلال! اے خوابِ جاں پرور
ہزاروں ہوش اور بیداریاں قربان ہیں تجھ پر

مری تاریکیٔ شب کو درخشاں کر دیا تو نے
دلِ برباد کو رشکِ گلستاں کر دیا تو نے

کچھ ایسا سحر مجھ پر جسم اور جاں پر کیا تو نے
مجھے اک وادیٔ پرنور میں پہنچا دیا تو نے

وہ وادی جس میں نغمے پھوٹتے ہیں پھول بن بن کر
وہ وادی جس میں خوشبو تیرتی پھرتی ہے نغموں پر

جہاں پاکیزگی چھائی ہوئی ہے لالہ زاروں پر
جہاں تقدیس نغمے گا رہی ہے آبشاروں پر

جہاں ہر سو چھلکتی ہے شرابِ مشک بو گویا
جہاں موجِ صبا ہے کاروانِ رنگ و بو گویا

جہاں کا ذرّہ ذرّہ اخترِ تاباں سے تاباں تر
جہاں کا قطرہ قطرہ گوہرِ غلطاں سے غلطاں تر

جہاں لہرا رہے ہیں سرمدی نغمے ہواؤں میں
محبت بیخودی میں رقص فرما ہے فضاؤں میں

جہاں کا جلوہ جلوہ حسن کی کرنوں سے تاباں ہے
جہاں کا نغمہ نغمہ عشق کی مستی سے رقصاں ہے

جہاں معصومیت ہے حسن میں تقدیس الفت میں
جہاں ہر چیز ہے ڈوبی ہوئی نورِ محبت میں

جہاں پر حسن بھی اک عشق کی تصویر ہے گویا
جہاں پر عشق بھی اک حسن کی تفسیر ہے گویا

مری "راحت" ہے میں ہوں اور اک دنیائے نورانی
جمال و عشق پر چھایا ہوا ہے رنگ یزدانی!

اثر صہبائی

طلسمِ مجاز

(۱)

یہی نگاہ یہی "ساز باز" رہنے دے
مرے لئے تو "درِ فتنہ باز" رہنے دے
"بصیرتوں" سے مجھے بے نیاز رہنے دے
حقیقت اپنی "بہ حد مجاز" رہنے دے
مری نگاہ کو "نظارہ باز" رہنے دے

(۲)

جو عشق و حسن میں ہے امتیاز رہنے دے
یہی مشاہدہ اے دل نواز رہنے دے
بڑھائے جا یوں ہی کیفِ نظر بڑھائے جا
تو حلقہ ہائے "نگاہ ہوس پرست" میں آ
تصوراتِ "دلِ پاکباز" رہنے دے

(۳)

رہینِ حسرت "راز و نیاز" رہنے دے
انہیں حدوں میں مجھے سرفراز رہنے دے
میں چاہتا ہوں اسی طرح سے رہوں "ناکام"
متاعِ بلبل و پروانہ سے مجھے کیا کام
مرے لیے "ہوس" سوز و ساز رہنے دے

(۴)

مری نگاہ کا دامن دراز رہنے دے
"معاملہ" کی خوشی کو تو راز رہنے دے
ترے خیال سے لے جاؤں میں اگر "بازی"
گناہ میرے لئے کیوں ہو "نظر بازی"
کچھ اور دن ابھی حکمِ جواز رہنے دے

(۵)

فروغ دیدۂ آئینہ ساز رہنے دے
وہ اپنا جلوۂ بینش گداز رہنے دے
خدا گواہ نہ تھا میں تو سائلِ دیدار
بنا دیا تری شوخی نے مائلِ دیدار
مجھے قریبِ "حریمِ مجاز" رہنے دے

علی منظور حیدرآبادی

محبّت

محبّت کے ترانے گونجتے ہیں کوہساروں میں
محبّت نغمہ زن ہے وادیوں میں آبشاروں میں

محبّت کی تجلّی سے فضا پرنور رہتی ہے
محبّت کے تعطّر سے صبا مخمور رہتی ہے

محبّت پھول کی خاموشیوں میں مسکراتی ہے
محبّت بادلوں کے بھیس میں آنسو بہاتی ہے

محبّت چاندنی راتوں میں سایوں سے لپٹتی ہے
محبّت پردۂ ظلمت میں تاروں سے چمٹتی ہے

محبّت طفلکِ بے نوش کی معصوم باتوں میں
محبّت شاہدِ بے درد کی رنگین گھاتوں میں

محبّت کو جمالِ شعر کا ملبوس کہتے ہیں
محبّت کو ادب کی بزم کا فانوس کہتے ہیں

محبّت میں خدا کے نور کی تصویر رقصاں ہے
محبّت کا وجود انساں کی ہستی پہ احساں ہے

محبّت کو جہاں کی نعمتوں سے بے نیازی ہے
محبّت کے لئے پامال رہنا سرفرازی ہے

محبّت مخملی چادر میں خوش ہو ہو کے سوتی ہے
محبّت مخملیں قالین کو اشکوں سے دھوتی ہے

محبّت جھونپڑوں میں کیف سے مخمور رہتی ہے
محبّت اونچے اونچے مندروں سے دور رہتی ہے

محبت کھیلتی ہے نوجوانوں کی جوانی سے
محبت پرورش پاتی ہے تلواروں کے پانی سے

محبّت خون کی سرخی سے گلگونہ بناتی ہے
محبّت خندہ پیشانی سے جاں پر کھیل جاتی ہے

محبّت برق کا دامن بھی بڑھ کر تھام لیتی ہے
محبّت کشتیٔ جاں موت کے دھارے پہ کھیتی ہے

محبّت وقت کی تعزیر سے آزاد رہتی ہے
محبّت رنج کی پابندیوں میں شاد رہتی ہے

محبّت نے بشر کی بے خودی کو زندگی بخشی
محبت کو فریبِ آرزو نے تازگی بخشی

محبّت عقل کے ایوان کو مسمار کرتی ہے
محبّت دین کی تقدیس سے انکار کرتی ہے

محبّت حسن والوں کو سراپا ناز کرتی ہے
محبّت اہلِ دل کو آشنائے راز کرتی ہے

محبّت سا حسیں کوئی ترانہ ہو نہیں سکتا
محبت سا کوئی رنگیں فسانہ ہو نہیں سکتا

محبّت نے جہاں کی آنکھ میں بیگانگی بھر دی
محبّت نے سرِ انساں میں دیوانگی بھر دی

پرشوتم لال ضیا

بربط نواز

(عالمِ انتظار میں)

جان ہے اضطراب میں روح نہیں قرار میں
بیٹھی ہوئی ہوں دیر سے عالمِ انتظار میں
فرطِ الم میں انگلیاں چلتی ہیں کب ستار پر
یورشِ فوجِ غم ہے اب میرے دلِ فگار پر
تو نے مجھے بھلا دیا تجھ کو بھلاؤں کس طرح
دل میں وفا کا نقش ہے اس کو مٹاؤں کس طرح
گنج فریبِ شوق ہے عالمِ بیم و یاس ہے
پھر بھی مقامِ شکر ہے عہدِ وفا کا پاس ہے
آپ سے جاؤں کس طرح آپ میں آؤں کس طرح
آگ سی ہے لگی ہوئی اس کو بجھاؤں کس طرح

آ کہ سناؤں پھر تجھے نغمۂ جاں نواز میں
آ کہ جہاں میں چھیڑ دوں عشق کا ایک ساز میں
محفلِ سوز و ساز میں آ کہ تجھے بٹھاؤں پھر
بادۂ عشق غم ربا آ کہ تجھے پلاؤں پھر
آ کہ کروں میں پھر تجھے محوِ سرورِ بے خودی
آ کہ بتاؤں پھر تجھے راہ نشاط و عیش کی
آ کہ میں اپنی تان سے وجد میں لاؤں پھر تجھے
آ کہ میں اپنے پریم کا گیت سناؤں پھر تجھے
آ کہ تجھے پیام دوں عشق و وفا سرشت کا
آ کہ دکھاؤں در تجھے جلوہ گہ بہشت کا

آ کہ گزر رہا ہے اب عہدِ شباب ہجر میں
آ کہ سکوں کی نیند بھی ہو گئی خواب ہجر میں

روشن نکودری
ایم۔ ایس۔ سی

امریکہ کا ملک الشعرا

والٹ وٹمن

جب امریکہ کے شاعر والٹ وٹمن نے ۱۸۵۵ء میں اپنا مجموعۂ کلام، جس کا نام اس نے "گھاس کی پتیاں" رکھا، اپنے ہاتھوں سے چھاپ کر شائع کیا تو بحر اوقیانوس کے دونوں پہلوؤں پر ــــ امریکہ اور انگلستان میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ پرانی ادبی اور اخلاقی روایات کے پابندوں نے برانگیختہ ہو کر شاعر اور اس کے دیوان کو مطعون کیا اور بوسٹن میں اس کتاب کو جس کے لئے آئندہ زمانہ میں سرمایہ علم و ادب سمجھا جانا مقدر ہو چکا تھا۔ ضبط قرار دیا گیا۔

یہ نظموں کا مجموعہ انگریزی زبان کے علم ادب اور خصوصاً شاعری میں ایک ممتاز تحریکی حیثیت رکھتا ہے اور وٹمن کے تخریبی اور تعمیری نقادوں کے دونوں فرقوں نے اپنی مختلف راؤں اور دلیل و برہان سے موضوع اور زبان کے لحاظ سے اس کی اہمیت کو واضح تر کر دیا۔ مرزا غالب کے مختصر اردو دیوان کی طرح اس مختصر مجموعے نے (جو بعد میں رفتارِ زمانہ اور شاعر کے تخیلی ارتقا کے ساتھ ساتھ ضخیم تر ہوتا گیا) فنی اور موضوعی لحاظ سے شاعری کے نئے اصول اور ضابطے اہل ذوق کے پیشِ نظر کئے۔ انگلستان کو زبان و بیان کی جدت پر اعتراض تھے لیکن امریکہ والوں کی روائتی ذہنیت کو زبان و بیان کی بہ نسبت موضوع کے اچھوتے اور بے باک ہونے سے زیادہ دھچکہ لگا۔ اس کتاب کی اشاعت سے پیشتر شاعر کو عوام سے بالا تر ہستی، ایک لطیف اور روحانی کیفیات کا نغمہ سرا سمجھا جاتا تھا لیکن والٹ وٹمن لوگوں کی نگاہوں میں اچانک ایک ایسے شخص کی صورت میں نمودار ہوا جو ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عامی ہونے پر بھی فخر کرتا تھا اور اپنے اس اعتقاد یا نظریے میں اس قدر ثابت قدم تھا کہ اس میں اُس طبقۂ عوام کی خصوصیات زیادہ شدید نظر آرہی تھیں جو محض اپنی طبعی تحریکات کے مطابق زندگی بسر کرنے کو ہی ہر دو جہاں کا ماحصل سمجھتا ہے۔ جس طرح بڑھئی، معمار، ماہی گیر یا دوسرے مزدوری پیشہ انسان اپنی صاف اور سادہ بولی میں اعضائے جسمانی، بچے پیدا کرنے، اور دوسری روزمرہ کی باتوں کے متعلق گفتگو کرتے ہیں، یہ شاعر بھی اسی طرح باتیں کرتا تھا اور اپنی اُن باتوں کو ایک خاص فلسفیانہ انداز میں ڈھالنے کے بعد شاعری کہتا تھا۔ اس شاعر کے اعتقاد میں عمومیت ہی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ لیکن اس کے باوجود اپنے مہذب اور ذہنی طور پر ترقی یافتہ قارئین کے سامنے اپنے فصیح۔ بلیغ اور عجیب الہیت کلام کے ذریعے سے روحانیت اور جسمانیت کو یک جا کر کے پیش کرتا تھا۔ گویا روح اور جسم میں اہمیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ اپنے خیالات کو تمام امریکہ کی مکمل زندگی، جمہوریت اور مذہبی اعتقادات کا نمائندہ سمجھتا تھا لیکن تفصیلات کی طرف رجوع کئے بغیر پہلے ہمیں وٹمن کے سوانح حیات کا ایک مختصر سا خاکہ نظروں کے سامنے رکھ لینا چاہیئے تاکہ اُس کی شخصیت سے واقفیت ہونے کے بعد ہم اس کی شاعری اور فلسفے یا پیغام کے متعلق کچھ کہہ سکیں۔

والٹ وٹمن امریکہ کے لونگ آئیلینڈ میں ویسٹ ہلز کے مقام پر ۳۱ مئی ۱۸۱۹ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ اور دادا پردادا سب کسان تھے جو سترھویں صدی کے اوائل میں کونیکٹی کٹ کے علاقے میں یورپ سے آکر آباد ہوئے۔ وہ لوگ نسلی لحاظ سے پیوریٹن انگریزوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور انہیں سے احتیاط اور ضبط نفس کی خصوصیات وٹمن کے

حصے میں آئیں اور انہیں سے اُسے زندگی کے متعلق بلند اور افضل اندازِ نظر ورثے میں ملا جو اس کی شاعری کا ایک خاصہ ہے اور اس کے کلام کو ایک روحانی جلا دے دیتا ہے۔ اس کی ماں کا نام لوئیزا فان ویلسر تھا اور وہ ویلش اور ڈچ نسل سے تھی۔ روایات کے مطابق وہ ایک غیر معمولی عورت تھی۔ تقریباً غیر تعلیم یافتہ لیکن ایک ایسی پُر زور شخصیت کی مالک جس کے خصائص بیٹے میں پورے طور پر ظاہر ہوئے۔ گیارہ برس کی عمر میں وٹمن ابتدائی تعلیم کے بعد ایک وکیل کے دفتر میں معمولی کاموں کی بجا آوری کے لئے ملازم ہو گیا اور اس کے بعد ہی اس نے ایک اخبار کے دفتر میں طباعت کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ سترھویں سال میں وہ ملازمت حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنے والدین کے پاس دیہات میں چلا گیا۔ پانچ سال تک وہیں رہا۔ اس عرصے میں وہ کبھی "تو معلمی" کا کام کرتا رہا۔ اور کبھی ایک اخبار کے لئے طابع اور مدیر کے فرائض انجام دیتا رہا۔ بائیس سال کی عمر میں وٹمن نیویارک کو لوٹا۔ یہاں اُس نے صحافت کو اپنا پیشہ بنایا اور سات سال تک مختلف اخباروں میں کام کرتا رہا۔ نیز سیاسیات میں حصہ لیتا رہا۔ ان سات برس میں اُسے بہت سا تجربہ حاصل ہو گیا۔ نیویارک کے عظیم الشان شہر نے اپنے بازاروں، تھیٹروں، راگ گھروں، اور ریستورانوں کے ذریعے سے نوجوان وٹمن کو زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کر دیا اور وہ جذبات کی گہرائیوں کے اس سے پوری طرح واقف ہو گیا۔ نیویارک سے وہ ۱۸۴۸ء میں نیو اورلینز گیا تاکہ ایک اخبار کی ادارت کا بار اپنے ذمے لے۔ اس اخبار کے مالک نے اس سے پیشتر ہی معاہدہ کر لیا تھا۔ وٹمن اس نئے مقام پر صرف تین ماہ تک رہا۔ اس قیام کے اختصار اور وہاں سے اچانک روانگی نے وٹمن کے سوانح نگاروں کو خیال انگیزی کے لئے موقع دیا ہے۔ لیکن آج تک اصل بات کی تہ تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ کیا ان تین مہینوں میں شاعر کا تعلق کسی ایسی عورت سے ہو گیا جو سماجی لحاظ سے برتر تھی، اور جس کے بطن سے شاعر کی اولاد پیدا ہوئی لیکن قانون اور مذہب کی رو سے وہ اکٹھے نہ ہو سکے؟ یہ اس راز کا ایک ممکن حل ہے۔ جنوب کے وسیع علاقوں کی طرف نیو اورلینز کو جاتے ہوئے اُس نے چند ایسے اشعار لکھے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ شمال کے آدمی کو اس طرف رُخ کرتے ہوئے محتاط رہنا چاہیئے کیونکہ جنوب کی عیش افزا نازکی اور نور و شیرینیں اس کے لئے خطرات پنہاں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وٹمن کے یہ خطرات بے بنیاد نہ تھے۔ کیونکہ اگرچہ اس جگہ اس کا قیام نہایت مختصر رہا پھر بھی اُسے وہاں ایک ایسا تجربہ حاصل ہوا جس نے اس کی تمام زندگی پر ایک گہرا اثر کیا۔ اگرچہ اس تجربے کی اصل نوعیت نامعلوم اور مبہم سی ہے لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ اس جگہ اس کا تعلق کسی ایسی عورت سے ہو گیا جس کا سماجی درجہ اس کی اپنی حیثیت سے بلند تر تھا۔ نیز وہ وٹمن کے ایک بلکہ ایک سے زیادہ بچوں کی ماں بنی۔ شادی نہ ہو سکی۔ اور اس پہلو کے متعلق وٹمن کی انتہا سے زیادہ خاموشی اور اخفا جبکہ اسے اپنے متعلق کسی بات کے بھی چھپانے کی عادت نہ تھی، تجاہلِ عارفانہ کہی جا سکتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ اُس عورت کے مفاد کی خاطر یا اس کی آرزو کو پورا کرنے کے لئے یا اُس کے خاندان کے دباؤ کی وجہ سے نہ صرف شادی نہ ہو سکی بلکہ وٹمن سا صاف گو اور بے باک شخص بھی تمام معاملے کو ایک گہرے پردہ راز میں رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ بہرحال یہ بات یقینی جاننا چاہیئے کہ ۱۸۴۸ء میں نیو اورلینز میں وٹمن کو شدید احساساتِ محبت کا ایک تجربہ ہوا اور صورت حالات کی مجبوری سے اُسے اپنی محبوبہ سے جدا ہونا پڑا اور اس مجبوری کو وٹمن نے اپنی "زندگی کا المناک افسانہ" کہا ہے۔ وٹمن نے تمام عمر شادی نہیں کی اور اس کی وجہ بھی یہی افسانوی ناکامی قرار دی جا سکتی ہے۔

ہیولاک ایلیس کے خیال میں "وٹمن نے ایک نادر ترین امتیاز حاصل کیا ہے اور وہ یہ کہ اُسے اپنی زندگی ہی میں دنیا کے عظیم ترین اخلاقی معلموں ——— حضرت عیسیٰ اور سقراط کے پہلو بہ پہلو جگہ ملی ہے" لیکن اس امتیاز کے حصول کے لئے جن خصوصیات کی ضرورت ہے ان کی نشو و نما کیونکر ہوئی، اس کے مطالعہ کے لئے ہمیں وٹمن کی زندگی کی فضائے بعید کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی کے کچھ عرصے کے لئے صرف اپنی ذہنی اور جسمانی قابلیتوں پر گذارا کرنے کو علیحدہ کر دیا جائے تاکہ وہ قدرت کی تنہائیوں میں رہ کر اپنے نفس کے ساتھ ہم آہنگ تعلقات پیدا کرے اور اُسے خود اعتمادی کے امکانات کا مکمل احساس ہو جائے کیونکہ جس مرد یا عورت کو ایسا تجربہ حاصل نہ ہو سکے گا اس کے لئے دنیا میں بہت سے راز سربستہ رہیں گے۔ اور اُسے بہت سی فالتو مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ تیس سال کی عمر تک وٹمن نے دنیا کی ماہیت کو معلوم کرنے کی جستجو جاری رکھی۔ کیونکہ اس سے بہتر طریقۂ تعلیم اُس کے

لئے اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ استعداد و اخذ و قبولیت اس کی فطرت میں بےحد تھی اور اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں میں اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ اس نے یکے بعد دیگرے معلم، طابع، اخبار نویس، گورنمنٹ کلرک اور ان سب سے بڑھ کر آوارہ گردی کا پیشہ اختیار کیا۔ نیویارک میں وہ براڈوے اور فلٹن فیری کے علاقوں میں آوارہ گردی کیا کرتا۔ بسوں اور موٹر لاریوں کے ڈرائیوروں سے گفتگو کرتا اور کارخانہ داروں اور مزدوروں سے تبادلۂ خیالات کرتا رہتا۔ اس زمانے میں اس کی جسمانی صحت مکمل تھی۔ گزارے کے لئے آمدنی کافی تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور رذیل سے رذیل انسان کے ساتھ بھی وہ برابر کا ہو کر بات کر سکتا تھا۔ اس نے زندگی کی ندی کا پانی دونوں کناروں سے پیا اور رفتہ رفتہ جب ایک نئی شخصیت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں تو چھتیس سال کی عمر میں (۱۸۵۵ء) ایک چھوٹی سی کتاب اپنے ہاتھوں سے چھاپ کر شائع کی اور اس کے سرورق پر ایک غیر معمولی، عجیب اور سادہ سی سرخی چسپاں کر دی ——— "گھاس کی پتیاں"۔

۱۸۶۰ء میں امریکہ کی خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اس تین سال کے زمانۂ جنگ میں تقریباً ایک لاکھ زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال میں حصہ لیا۔ اور یوں ایک وسیع پیمانے پر انسانی دکھ درد سے گہری واقفیت حاصل کی۔ اس زمانے سے وٹمن کے دل میں ہر انسانی بات کے متعلق ایک گہری نزاکتِ احساس اور ایک بلند رحم و ہمدردی کا جذبہ ہمیشہ کے لئے پیدا ہو گیا۔ ۱۸۷۳ء میں وٹمن کے بائیں پہلو پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس مرض میں وہ تین سال تک مبتلا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ صحت عود کر آئی۔ اس نے یہ فالج کا سارا زمانہ زیادہ تر ٹہلنے یا کھلی فضا میں عریاں رہنے میں صرف کیا اور اس کا خیال ہے کہ اس کی صحت کی بحالی کی یہ ایک زبردست وجہ تھی۔ چنانچہ وہ خود لکھتا ہے "جس مرد یا عورت نے مناظرِ قدرت کے ماحول میں عریاں رہ کر حرکت کرنے کے آزاد کیف و بہجت کا احساس کبھی نہیں کیا، اُسے معلوم ہی نہیں کہ پاکیزگی، اعتقاد، آرٹ، یا صحت کی حقیقت کیا ہے"۔

اب ہم والٹ وٹمن کی شاعری اور اعتقاد کے نظریوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

انیسویں صدی میں سیاسیات اور سائنس میں جو ترقیاں ہوئیں۔ انہیں نے شاعر کے ذہن میں "فرد" کے لئے احساسِ تفاخر پیدا کیا اور اس تعلیم کا پرچار کرنے پر آمادہ کر دیا کہ گوشت اور پوست شریف ترین حقائق ہیں۔ ارتقا کے اصول میں شخصیت کے موضوع کو سائنس ہی نے زور دار کیا۔ وٹمن نے جو کچھ دیکھا اور سُنا، اُسے نغموں میں سُنا دیا اور اِس طبقۂ عوام کو، جن کا نمایندہ اور معترف وٹمن بنتا تھا، یہ نغمے اس لئے عجیب معلوم ہوئے کہ وہ اس قابل نہ تھا کہ اپنی عامیانہ اوسط قابلیت سے خیالات اور اعتقادات کے روائتی بندھنوں سے آزاد ہو کر اپنی حقیقت کو کسی دوسرے کے مُنہ سے سن کر سمجھ سکے۔ وٹمن کی یہ جمہوریت پسندی عموماً عجیب جنسی راستوں سے ہوتی ہوئی ظاہر ہوتی ہے مثلاً

اے رام جنی!

دل جمعی سے، بے خوف و خطر، سکھ چین سے رہ تو پاس مرے،
میں شاعر ہوں،
آزاد خیال اور آوارہ فطرت کی طرح،
اور زور آور قدرت کی طرح!
جب تک سورج اپنی کرنوں سے تیرے بوسے لیتا ہے،
میں بھی تیرے بوسے لوں گا!
جب تک پانی دھرتی پر رہ کر تیری پیاس بجھائیں گے،
میں تیری پیاس بجھاؤں گا!
جب تک پتّے ہل ہل کے ہولے سے جسم ترا سہلائیں گے،
میں جسم ترا سہلاؤں گا!
یہ تیری نفرت انگیز اور ذلت سے بھری جو حالت ہے،
مجھ کو اس سے نفرت ہی نہیں!
مجھ کو تیرے، تجھ کو میرے پہلو میں نہ دیکھے کوئی، مجھے یہ سوچ نہیں!
میں مرد ہوں اور تو عورت ہے،
دونوں کو بنایا قدرت نے!
دونوں نے خدا کا نام لیا!
دونوں جزو ہیں شہریت کے!
ہاں ہاں اے وہ کلی! جو وقت سے پہلے شگفتہ ہے
میں تجھ سے وقت مقرر کر کے کہتا ہوں،
آ، ہم تم باتوں باتوں میں کچھ کام کی باتیں بھی کر لیں!
کچھ پھولوں سے،

کچھ رنگ برنگے، ہلکے ڈھیلے، اور باریک لباسوں سے،
جا اپنا جسم سجانے کی تیاری کر!
اور ایسی ہی،
میں فطرت کی تکمیل کروں!
جا، آج ذرا، دل گرمانے والے اور من موہن سنگاروں کو اپنا
کرلے۔
اور میرے پہلو میں آجا، جب میں آؤں!
ہاں، اُس لمحے تک معنی خیز نگاہوں سے میں کچھ کو اشارے
کرتا ہوں!

یہ جمہوریت اور اخوت کی انتہا ہے اور اس کے اظہار کے لئے شاعر نے سراسر انفرادی اور غیر معمولی اندازِ بیان اختیار کیا ہے جس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم چند لمحوں کے لئے پرانی روایات کے بار کو اپنے کندھوں سے اتار دیں۔ اسی طرح مردوں کے شہری اور قومی یا ملکی تعلق کو پختہ بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے وٹمن جو صورت اختیار کرتا ہے۔ وہ بھی پرانے اخلاقی معیاروں کے لحاظ سے قابلِ اعتراض ہو جاتی ہے۔ لیکن ذیل کی نظم میں اس جمہوری تعلق کے علاوہ شاعر کا مقصد نوجوانی کی امنگوں اور اولوالعزمی سے لبریز زمانے کی کیفیات کا بیان بھی ہے۔

ہم دو لڑکے

ہر دم ساتھ اکٹھے رہتے،
ہم دونوں آپس میں لپٹتے۔
نئے نئے رستوں پر چلتے، پورب پچھم آتے جاتے،
اپنے بازوؤں کو پھیلاتے،
مٹھیاں بھینچتے، کھولتے جاتے، زور اور بل سے لطف اٹھاتے،
خوف وخطر کو دل میں نہ لاتے، عیش مناتے، سیریں کرتے،
کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، ہنستے گاتے، گلے لگاتے،
روٹھتے منتے، چومتے جاتے،
رسم ورواج کو دل سے بھلاتے، اپنی من مانی ہی کرتے!
موجوں میں ناؤ کو بہاتے، دریاؤں کے پار اترتے،
گاؤں میں دہشت پھیلاتے، کنجوسوں کا دل دہلاتے،
ڈاکو بن کر لوٹتے جاتے!
قانونوں کی ہنسی اڑاتے، فوجوں کو خاطر میں نہ لاتے،
ہر اک بستی ہر اک صحرا، درہم برہم کرتے جاتے،
ہر لمحے، ہر وقت ہمیشہ، یونہی چلتے پھرتے پھرتے،
اپنے کھیل کو پورا کرتے!

وٹمن اپنی شاعری میں دو طرح کی محبت کے گن گاتا ہے۔
اول عورت کے لئے مرد کی "گہری" محبت۔ جس میں مرد کو اپنی تقدیر کا ہمنوا بنانے کے لئے ایک رفیقِ حیات حاصل ہوتا ہے اور جو ہمیں انجام کار اپنی اولاد کے ذریعے سے ابدی ہونے کا موقعہ دیتی ہے۔
دوم، مرد کے لئے مرد کی "رفیقانہ" محبت۔ جو زندگی میں ایک غیر مرئی قوت کے طور پر موجود رہتی ہے اور اپنے اظہار کے طور پر اخوت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اس مردانہ محبت کی مثال اوپر کی نظم تھی لیکن عورت کی محبت والی مثال سے پہلے جسم اور اس کی کارفرمائی کے بارے میں شاعر کے اندازِ نظر سے آگاہی ضروری ہے۔ وٹمن کے خیال میں جسم ایک پاکیزہ اور متبرک چیز ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے روح بلکہ اپنی نظم "میں برقی جسم کے نغمے سناؤں گا" میں وہ کہتا ہے کہ "اگر جسم ہی روح نہیں، تو پھر روح کیا ہے؟" یعنی کچھ بھی نہیں۔
وٹمن کے لئے ہر معمولی سے معمولی چیز بھی زبردست اہمیت رکھتی ہے جوانی اور بڑھاپا اُس کے لئے یکساں طور پر کیف وانبساط سے لبریز ہے

چولی اور دامن کا ساتھ!

(۱)

اے عمرِ جوانی! دو لمحے، عیش وعشرت کے، چاہت کے!
ہاں دو لمحے زیب وزینت کے، نشوں والی طاقت کے!
جیسے دن ہو ہنستے چمکتے سورج والا، کاموں والا!
ہر دم نئی اُمنگیں ہی لاتا ہو جس کا اجیالا!

(۲)

وقتِ پیری، کچھ لمحے، سکھ چین، فراغت، فرصت کے،
کچھ لمحے روحانی خوشی کے، نیکی کے اور عظمت کے!
جیسے رات ستاروں کو اپنے نازک پہلو میں لئے،
راحت، تسکین لاتی ہو کچھ ہلکی گہری نیندوں سے!

اس کے علاوہ اس کے لئے ہر بات، ہر جنسی بات کارآمد اور

مفید ہے۔ اور اس لئے دل پسند۔ چنانچہ ذیل کی نظم میں وہ صاف طور پر جدید نفسیات کے اس نظریے کو ثابت کر رہا ہے کہ ہر انسانی تحریک اور عمل کی بنیاد جنس کا جذبہ ہے۔

رِستے، نکلتے، بہتے قطرو!

رِستے، نکلتے بہتے قطرو!
میرے پیارے، اچھے قطرو!
میری لال اور نیلی رگوں سے رِستے قطرو!
دھیرے دھیرے نکلتے قطرو!
اِن زخموں سے جن کے رستے کھلے ہوئے ہیں،
رِستے جاؤ، رِستے نکلتے قطرو!
اِن زخموں سے؛ زخم کہ جو بند بچانے ہیں۔
بہتے جاؤ، نکلتے جاؤ، ان ہونٹوں سے، پیشانی سے، اس چہرے سے!
اور سینے سے!
ایسی تہوں سے جن میں کبھی میں پوشیدہ تھا!
بہتے جاؤ، ہاں اے سُرخ لہو کے قطرو!
بھر دو، بھر دو ہر صفحے کو، ان گیتوں کو جو میں گاؤں،
ان لفظوں کو جو میں بولوں!
خونیں قطرو!
ان سب کو اپنی عنابی حرارت سے آگاہ بنا دو — اور چمکا دو!
ہاں ہاں، ان سب کو تم بھر دو، نم والے، شرماتے قطرو!
ہاں، چمکو اُس ہر شے میں جو میں نے لکھی ہے، یا میں۔
لکھوں گا!
ہاں ہاں بھڑکو، اپنی شعاعوں میں ہی میری ہر اک شے کو ظاہر کر دو!
اے شرماتے، لجاتے قطرو!

اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف جسم کا گوشت بلکہ رگوں میں دوڑتا ہوا لہو بھی شاعر کے خیال میں ایک عظیم الشان اور قابلِ تعریف شے ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے ہمیں گھن آئے یا جو ہمیں ناپسند ہو۔ عورت کی ہستی کو وٹمن ایک تخیلی رنگ دے دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس تعلق کی انتہا وہ فطری اور روزمرّہ کی سماجی زندگی کو ہی سمجھتا ہے۔ ذیل میں ہم اس کی دو مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جسم اور روح کے متعلق وٹمن کے خیالات کس قدر ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔

اے اجنبی!

اے اجنبی!
تجھ کو نہیں اس کی خبر،
دیکھا تجھے کن آرزوؤں سے ابھی،
بیشک وہی ہے تو
مجھے
تھی جس کی اب تک جستجو!
(یہ بات ایسے ہے کہ جیسے خواب ہو!)
ہمراز عشرت ہو کے تیرے ساتھ ہی،
میں نے گزاری ہے کہیں،
کچھ زندگی؛
اس راہ کے ہلکے تعلق سے ترے
ہر بات یاد آئی مجھے؛
دل گرم اور چاہت بھرے،
پاک اور سجے سنورے ہوئے،
یوں آج رستے میں ملے!
ہاں، عالم طفلی مرا
یک جا بسر ہوتا رہا!
میں نے گزاری زندگی،
ہمراز عشرت ہو کے تیرے ساتھ ہی،
اور ایک جا بیتی تھیں گھڑیاں رات کی —
تیرا بدن تیرا نہیں، میرا بھی ہے،
میرا بدن میرا نہیں، تیرا بھی ہے،
تجھ سے مجھے حاصل ہوئی،
آنکھوں کی، چہرے کی خوشی!
مجھ سے تجھے حاصل ہوئی،
ہاتھوں کی، سینے کی خوشی!
میں تجھ سے محوِ گفتگو
ہوں گا نہیں!
تیرا تصور آئے گا۔

راتوں کو، یا دن کو بھی،
اور تیری یادیں لائے گا!
اب راہ تکنا ہے مجھے۔
لیکن ہے اس دن کا یقیں،
دل کے قریں،
جب پھر سے ہم مل جائیں گے،
اے اجنبی!

جنون و مسرت کا ایک لمحہ

اک لمحہ جس میں جنون و مسرت میرے ہیں!
آشفتہ خیالی، درہم و برہم بے باکی!
ہاں! مت روکو، مت روکو، مجھے کیوں روکتے ہو؟
یہ کیا شے ہے جو مجھ کو یوں آزادی دے کر، طوفانوں میں چھپ جاتی ہے نگاہوں سے؟
برق و باراں میں، ہواؤں میں یہ میری آہیں اور چیخیں کیا کہتی ہیں؟
مجذوبانہ مدہوشی میں یوں ہونا، جیسے کوئی نہ ہوگا دنیا میں!
اک وحشی اور گداز اذیت، درد و کرب کی کیفیت!
(میرے بچو! اے دولھا اور دلھن! سن لو، یہ باتیں کام آجائیں گی!)
ہاں، خود کو ترے بس میں دینا (کیا اس سے غرض، تو جو بھی ہو!)
اور اپنے بس میں کرنا تجھے ہر شے کو بھلا کر یادوں سے!
اے شوخ نسائی پُتلی سی! جنت میں پھر سے پہنچ جانا!
ہاں، جب سینے سے سینہ ملے،
اک عزم راسخ دل میں لئے،
ہونٹوں سے ہونٹ ملا دینا!
اے بھول بھلیاں! پہیلی سی!
اے دوہری تہری گرہ جیسی!
اے پیچ! اے عقدے! اے الجھن!
اور گہری، اندھیری جھیلوں سی خاموشی بھی!
تجھ کو، ہاں تجھ کو نگاہوں سے چھلنی کرنا!
اور تیری چمکتی، چندھیاتی کرنوں سے نگاہوں کو بھرنا!
اور آہ! وسیع فضاؤں میں اڑتے رہنا!
اور تازہ ہوا سے سانسوں کا نغمہ کہنا!
اور پہیلی، پرانی رسموں کے بندھن کی عقدہ کشائی بھی!
اور قدرت کی سب سے اچھی خوبی کو اپنا بنا لینا!
اور اپنے خیالوں سے جو تسکین دور تھی، اس کو پا لینا۔
اور جوڑ کاوٹ باتوں پر تھی، بوجھ نہ پھر اس کا سہنا!
آہ! خودی میں شاکر رہنا، خود میں تسکیں سے ملنا!
یہ کیا شے ہے! یہ کیا شے ہے! جو میری سمجھ سے باہر ہے؟
جیسے اک عالم رؤیا ہو یا وجد کا گہرا حلقہ ہو!
آزادی میں چلنا پھرنا!
آزادی میں ہنسنا گانا!
آزادی میں چاہت کرنا!
آزادی، بے پروائی سے خطروں والے کاموں کو ہاتھوں میں لینا!
اپنی متوالی روح کو پہلو میں لے کر چاہت کی بلندی پر جانا!
اک لمحے کی تکمیل سے اور آزادی سے آئندہ کے سامان کرنا!
اور کھو جانا ہی لکھا ہو تو پھر کھو جانا۔
لیکن آہ! وہ لمحہ، جس میں جنون و مسرت میرے ہوں!!

ان مختلف نظریوں اور خیالوں کے علاوہ وٹمن کا ایک محبوب موضوع سمندر بھی ہے اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ سمندر میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور قدرت کی عظمت کا موثر اظہار ہوتا ہے اس سلسلے میں صرف ایک نظم پیش کریں گے۔

اے سمندر!

سمندر! اے سمندر! اپنی گمبھیر اور گھمنڈی سی صداؤں میں۔
ترے ہر دم انوکھے اور بے حد مختلف یہ مشورے
جب ذہن میں لیتا ہوا۔
ترے تھپیڑوں سے شکستہ ساحلوں پر میں گزرتا ہوں۔
تری باتیں سمجھتا ہوں!
اور ان پر غور کرتا ہوں!
یہ غصے میں کف انگیزی،
سفید اور ڈھیلے ڈھالے دامنوں میں دوڑتے آتے ہیں ہر لمحے
یہ دیوانے ہجوم، اک منزل مقصود کی جانب!
ترا چہرہ جو سورج کی شعاعوں سے چمکتا، مسکراتا ہے!

تری جبین جبیں اور تیرے ان بے باک طوفانوں کی جمعیت !
تری خود روائی، تیرا عزم راسخ، تیری خود بینی !
پھر اس عظمت کے ہوتے بھی ترے بے انتہا آنسو،
جو اس وسعت میں ابدیت نہ ہونے پر بہاتا ہے !
یہ تیری کشمکش، یہ لغزشیں اور شکستیں بھی،
یہی ہیں جو تری عظمت بڑھاتی ہیں !
یہ تنہائی، یہ تیری بے کسی، یہ سعی لاحاصل،
کہ جویا ہے کسی شے کا مگر وہ شے نہیں ملتی !
تری پھیلی ہوئی یکساں سی نیند و تیز سرخوشی،
یہ ہے آواز آزادی کے اک محبوس شہید اکی !
کہ جیسے ایک سیارے کی مانند اک بڑا سا دل،
اسی ساحل کی ترچھی اور ظالم سی چٹانوں میں ہی اپنا سر ٹپکتا ہو !
تری پھولی ہوئی سانسیں !
تری اینٹھی ہوئی موجیں !
یہ تیرے دل کی دھڑکن اور تری موجوں کی ساحل سے ہم آغوشی !
یہ ناگوں جیسی پھنکاریں !
بلند اور وحشیانہ قہقہوں کا ایک تواتر۔
دور سے آہستہ آہستہ چلی آتی یہ شبیروں سی گرج تیری !
اس اونچے آسمان کے بہرے کانوں کی طرف جاتی ہوئی !
اور پھر اچانک راہ میں رکتی ہوئی اسے یا لوٹ ہی آتی !
یہ سب کی خامشی میں مشورے تیرے !
زمیں کے دل کے خوابوں کی یہ تعبیریں !
یہ تیری روح کی گہرائیوں میں سے نکلتا جو سنائی دے رہا ہے ایک افسانہ،
یہ ہے اک کائناتی اور عالمگیر جذبے کا اک افسانہ، جو اپنے ہمنوا کو تو
سناتا ہے !

موت کا موضوع بھی وٹمن کا ایک عام خیال ہے۔ کیونکہ وہ موت کو بنفسہٖ شاندار اور انسانیت کی تکمیل نیز ایک نئی زندگی کی ابتدا تصور کرتا ہے لیکن اس موضوع کے متعلق اس کی نظمیں بہت لمبی ہیں اور یہاں بیان کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے ہم ایک الوداعی نظم پر سلسلۂ تحریر ختم کرتے ہیں۔ لیکن ایک ضروری بات باقی ہے اور وہ یہ کہ وٹمن کی شاعری انگریزی شاعری کے مقررہ اصولوں کے فنی پہلو سے بہت دور تھی۔ قافیئے کا تو ذکر ہی فالتو بات ہے۔ اُس کی آزاد نظم بھی صرف ایک موزوں روانی پر مبنی تھی۔ اور اُس میں بھی بسا اوقات خالص نثر کے ٹکڑے آجاتے تھے۔ میں نے ترجموں میں بھی اسی طرح کے شاعرانہ فنی اصول جائز رکھے ہیں۔ کیونکہ اصل مقصد وٹمن کے خیالات اور اندازِ بیان کا احساس دلانا ہے۔ یہ معذرت اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ اردو شاعری میں آزاد نظم ہی ابھی ذرا ڈرتے ڈرتے جائز سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ اکثر ملعون قرار دی جاتی ہے اور وٹمن کی نثر نما نظم کو تو آسانی سے نظم و نثر دونوں صنفوں سے خارج سمجھا جاسکتا ہے۔

الوداع اے طائرِ خیال !

الوداع ! ہاں الوداع اے طائرِ خیال !
الوداع اے یارِ غار !
الوداع محبوبِ من
جا رہا ہوں میں، نہیں معلوم لیکن کس جگہ۔
اور یہ خوبی ہے اس تقدیر کی !
اور دیکھوں گا تجھے میں پھر کبھی !
اس لئے اب
الوداع ! ہاں ! اے طائرِ خیال !
اور لو آخر کے لمحے آ گئے،
ڈالنے دو مجھ کو ماضی پر نظر !
اب مرے رقصاں، ولرزاں قلب کی رفتار دھیمی پڑ گئی !
آگیا ہے اب نکاس !
اور خاموشی اندھیری رات کی !
دیکھنا اب ہوگا یوں،
ایک پل میں دل کی لرزش تھم گئی !
دہر میں تو اور میں
اک زمانہ ساتھ تھے !
مل کے دیکھے ہم نے لمحے عیش کے !
خوب تھے، وہ سارے لمحے خوب تھے !
اور اب آئی جدائی، اس لئے

الوداع! ہاں الوداع اے طائرِ خیال!
لیکن اتنی جلد بازی کیوں کروں!
دہر میں تو اور میں
اک زمانہ ساتھ تھے!
ساتھ ہی جیتے رہے اور ساتھ ہی سوتے رہے؛
اس قدر مل کر کہ گویا ایک تھے!
اور اگر مر جائیں گے تو مل کے دونوں جائیں گے!
ہم رہیں گے ایک ہی!
ہاں، کہیں بھی جائیں ہم جائیں گے دونوں ساتھ ہی!
جو بھی ہو!
دور رہ کر تجربہ حاصل ہو کچھ!
ہاں، سبق حاصل ہوں کچھ ہم کو نئے!
شاید ایسے تو مجھے اکسا رہا ہو گیت گانے کے لئے!
شاید ایسے تو ہی عقدہ ہائے فانی توڑ دے۔
اس لئے
آخری اب الوداع!
الوداع! ہاں الوداع! اے طائرِ خیال!

میراجی

رباعی

ٹھنڈا کیا ہم نے پچھاڑا کیسا!
وہ شیشہ کو کیا کیسا کیسا!!
تھی شوخ بہت دخترِ رز اے ساقی
شیشے میں اسے آج اتارا کیسا!

سعید احمد اعجاز

شاعر کا خواب

خموشی کی روپہلی اوس میں بھیگی ہوئی فطرت
چراغِ صبحگاہی رات کے جاگے ہوئے تارے
سکوں کی گود میں سوئے ہوئے خوابوں کے نظارے
کلی کے سینہ میں انگڑائیاں لیتی ہوئی نکہت

شعاعوں کے سفینے چاندنی کا بحرِ بے پایاں
دیارِ کہکشاں کے نور میں ڈوبے ہوئے جلوے
سنہری بربطِ ناہید کے جادو اثر نغمے
شباب و شعر کے منظر، بہار و حسن کے طوفاں

تبسم پھول کا پاکیزگی حوروں کے سینوں کی
کلی کے دل کی دھڑکن دلکشی رنگیں جمالوں کی
فرشتوں کا تقدس سادگی فردوس والوں کی
جوانی ماہ پاروں کی، ادا زہرہ جبینوں کی

یہ ملتے ہیں تو اک خوابِ جواں بنتا ہے شاعر کا
یہی ذرے ہیں وہ جن سے جہاں بنتا ہے شاعر کا

تابش صدیقی

آہ! اقبال

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید (اقبال)

کوئی اقبال کا ثانی جہاں میں پس از عمرِ دراز آئے نہ آئے
حقیقت آشنائے عشق و مستی پھر اے بزمِ مجاز! آئے نہ آئے
شکستہ تار ہیں سازِ خودی کے وہ صوتِ دلنواز آئے نہ آئے
ہوا خاموش وہ دانائے راز اب کوئی دانائے راز آئے نہ آئے
فقیری میں بھی شانِ بادشاہی پھر ایسا بے نیاز آئے نہ آئے
گیا وہ چارہ سازِ دردِ ملت!
کوئی اب چارہ ساز آئے نہ آئے

حفیظ ہوشیارپوری

ماتمِ اقبال

اقبال کی موت پر بپا ماتم ہے ۔ اے اہلِ سخن! بہت بڑا ماتم ہے
نغموں سے کہو کہ آج نالے بن جائیں ۔ رضوانِ ریاضِ شعر کا ماتم ہے!

چمن را گلفشاں کردی و رفتی ۔ وطن را گلستاں کردی و رفتی!
ز طبعِ خود کہ بود ابرِ بقا بار ۔ سخن را جاوداں کردی و رفتی!

دہرِ فانی سے ہو گیا رخصت ۔ وہ دلِ اہلِ ہند کا محبوب!
وائے افسوس ہو گیا بے وقت ۔ شعر و حکمت کا آفتاب غروب!

ما کہ بودیم بدورِ اقبال ۔ شاد بودیم کہ ہم عصرِ وے ایم!
ساقی از بزم برفت و ماندیم ۔ وائے فریاد کہ بے جام و مے ایم!

تلوک چند محروم

آہ وحید العصر!

ارے ظالم ابطرز وحشتناک   کس قدر نطق ہے ترا بے باک   غم اقبال ہمکنار ہے آج   یوں دلِ قوم بے قرار ہے آج

دوستی کا بھی تجھ کو پاس نہیں   دوست اور دوست کے لئے سفاک   خوف ادبار ہو گیا طاری   ناموافق جو روزگار ہے آج

یک بیک تو نے کہہ دیا یہ کیا   ہو گئی سلب قوّتِ ادراک   اثر اقبال کا تھا عالمگیر   دیکھئے جس کو اشکبار ہے آج

باندھا اقبال نے بھی رختِ سفر!   اف یہ انجام گردشِ افلاک   آنے والوں کو کیا خبر اس کی   ملک کتنا جگر فگار ہے آج

ٹھیر جا ٹھیر جا سنبھلنے دے   ہم نے کی ہے زیارتِ اقبال

کچھ خیالات کو بدلنے دے   ہم کو ہے رنج رحلتِ اقبال

جب ہوئی ہو گی رحلتِ ہومر   اس کے ہمعصر ہوں گے سب مضطر   کیوں نہ ہو ایسے باخدا کا علم   علم سے جن کے ہو وفا کا علم

پا کے علمِ وفاتِ کالیداس   کیا تڑپتے نہ ہونگے اہلِ نظر   اس کے چہرہ پہ اتقیا کا نور   اس کے سینے میں اصفیا کا علم

ایک دن فرطِ غم میں سب انگریز   کہہ رہے ہوں گے آہ شکسپیر   سب اسے مانتے تھے علامہ   واہ اقبال باصفا کا علم

خبرِ انتقالِ فردوسی   ہو گی اُس وقت کتنی رنج اثر   نہیں واقف خدا نما سے ہم   ہے اسی اک خودی نما کا علم

آج ہم کو کسی کا رنج نہیں   تھے کبھی ہم بھی بدحواسوں میں

اُن کے رتبے فقط ہیں ذہن نشیں   اب ہیں شامل خودی شناسوں میں

سبق آموزِ ہمگناں اقبال — دینِ فطرت کا ترجماں اقبال
امتزاجِ سیاست و مذہب — جانتا تھا اصول داں اقبال
سب تھے جس کے خیال سے لرزاں — کر چکا طے وہ ہفت خواں اقبال
کوئی اقبال پر کرے کیوں رشک — یہ مقلد کہاں، کہاں اقبال
ہے عیاں شانِ اجتہاد اس کی
کام کرتی ہے دل میں یاد اس کی

رابطہ اس کو خاص و عام کے ساتھ — تھا مگر خاص اہتمام کے ساتھ
حضرت اور مدظلہ العالی — سب ہی لکھتے تھے اس کے نام کے ساتھ
مرجعِ خاص و عام تھا اقبال — اپنے جوشِ آفریں پیام کے ساتھ
خدمتِ قوم کر کے دنیا میں — چل دیا آخر احترام کے ساتھ
خوش نصیب ایسے کم ہوئے پیدا
قوم کی قوم اس پہ تھی شیدا

نظم کی حد میں شاہ خود مختار — نثر دیکھو تو منعمِ دربار
اس کے ذوقِ ادب پہ حسن فدا — اس کے حسنِ بیاں پہ ذوق نثار
دلکشا اس کی جانفزا باتیں — حرزِ جاں اس کے دل نشیں اشعار
مل گیا اس سے فلسفہ کو عروج — بڑھ گیا اس سے شاعری کا وقار
اپنا رہبر ہم اس کو مانتے ہیں
شاعرِ اعظم اس کو جانتے ہیں

مٹ گیا اپنی قوم پر آخر — اٹھ گیا چھوڑ کر اثر آخر
قوم کے درد سے تڑپتا تھا — سو گیا جاگ جاگ کر آخر
کر گیا ہم کو باخبر لیکن — ہو گیا ہم سے بے خبر آخر
لطفِ ختمِ رسل کے دامن میں — چھپ گیا یہ پیامبر آخر
اپنا قومی پیامبر، نہ رہا
قوم تھی جس سے معتبر نہ رہا

علی منظور حیدرآبادی

موٹر کار

کتنی ہلکی کس قدر خاموش کیسی تیز رو
میری موٹر کار ہے یا ہے طلسمِ عصرِ نو

کتنی آتش زیر پا ہے کس قدر طرّار ہے
بوئے گل ہے جوئے شیریں ہے صبا رفتار ہے

بھاپ کا اعجاز ہے افسونگری ہے کیا ہے یہ
دیو غزّاں ہے چھلاوہ ہے پری ہے کیا ہے یہ

پی کے اک مینائے آبِ آتشیں وقتِ سحر
شام تک رہتی ہے سورج کی طرح گرمِ سفر

رات کو مہتاب بن کر بادیہ پیما ہے یہ
برق ہے ابرِ سیہ ہے موجۂ دریا ہے یہ

ایک موجِ مضطرب ہے ایک جوئے تیز گام
اک ربڑ کی گیند ہے آہو صفت مست خرام

چل رہی ہے صورتِ ابرِ رواں برسات میں
دن کو جالندھر میں ہے اور رات کو گجرات میں

ٹھوکریں کھاتے ہیں اس کی رہگذر میں شاہسوار
چھوڑتی جاتی ہے پیچھے ابر کو مثلِ غبار

اس کا انجن کس قدر ہے گرم و کلفت آفریں
اس کا پہلو کس قدر ہے نرم و راحت آفریں

ایک ہی شے ہے جو مثلِ برق و باد آوارہ ہے
کار ہے فرشِ زمیں پر چرخ پر طیّارہ ہے

اصغر حسین خاں نظیر

ٹیپو سُلطان کی لائبریری

تاریخ عالم سے اس امر کے ثبوت ملتے ہیں کہ کتب خانے نہایت قدیم زمانے میں عالم وجود میں آئے تھے۔ قدیم آشوریا اور مصر میں شاہی لائبریریاں قائم ہوئی تھیں۔ اشوریا کے بادشاہ اشور بانی پال کی مشہور لائبریری اس وقت بھی برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ ہندوستان بھی بہت پرانے زمانے سے گہوارۂ علم کی حیثیت سے مشہور چلا آتا ہے۔ اس ملک میں بھی ایام سلف سے کتب کی فراہمی اور حفاظت کا کام جاری ہے۔ قدیم اور وسطی زمانے کے بادشاہ بڑے علم دوست اور ادب نواز تھے۔ اس سلسلے میں اُن کی حوصلہ افزا سرگرمیاں اور مساعی خاص طور پر قابل تحسین ہیں۔ پریس کی ایجاد سے پہلے کتابیں فرداً فرداً لکھی جایا کرتی تھیں۔ ہندو زمانے میں مٹھوں، مندروں اور شاہی محلات میں قلمی کتابیں جمع رہتی تھیں۔ مسلمانوں کے عہد میں بھی بادشاہوں اور امراء کی ذاتی کوششوں اور تعاون کی بدولت بے شمار کتب فراہم کی گئیں اور لکھوائی گئیں۔ نیز ایسے علمی خزائن محفوظ رکھے جانے کے لئے کتب خانے بھی قائم کئے گئے۔ اس ضمن میں مغل بادشاہوں کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ حرماں نصیب شاہ ہمایوں نے تو اپنے کتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر ہی زندگی سے ہاتھ دھوئے تھے۔ انگریزوں کی عملداری کے ابتدائی دور میں اس ملک کے آزاد حکمرانوں کی قائم کردہ لائبریریوں میں سے میسور کے آزاد فرمانروا ٹیپو سلطان کا بیش قیمت کتب خانہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

ٹیپو سلطان پر عام انگریز مورخین کے نقطۂ نگاہ سے یہاں بحث کرنا ہمیں مطلوب نہیں۔ وہ ٹیپو کی زندگی تاریک رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ہمیں اس مضمون میں اس متنازعہ فیہ امر پر بحث کرنے کی فرصت نہیں۔ تاہم اجمالی طور پر یہ امر واضح کیا جا سکتا ہے کہ ٹیپو سلطان کی زندگی پر تعصبات سے بالاتر ہو کر روشنی ڈالنے کا وقت آگیا ہے۔ اُن کے متعلق بلاخوف و رعایت یہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہئے کہ وہ بزدل اور ڈرپوک نہیں تھے۔ انگریزوں کی اطاعت قبول کر لینے کی نسبت وہ آزادی کی قربان گاہ پر شہید ہونا ہی بہتر سمجھتے تھے۔ اس زمانے کے ہندوستانی شاہی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں میں سے فقط ٹیپو سلطان نے شاہان فرانس و ترکی اور راجہ پیگو وغیرہ غیر ملکی حکمرانوں کے ساتھ سیاسی اور تجارتی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نظام سلطنت کی جانب بھی ان کی کڑی نظر رہتی تھی اور امور سلطنت میں وہ عرق ریزی سے کام لیا کرتے تھے اور وہ اپنے احکام اپنے ہاتھوں سے لکھ کر عمال دولت کے نام جاری کیا کرتے تھے۔ یہ امر بھی قابل قبول نہیں کہ وہ دوسرے مذاہب کے مخالف تھے۔ سرنگری مٹھ میسور کے منتظم جگت گورو شری شنکر اچاریہ کے نام ٹیپو سلطان کی طرف سے موصولہ چٹھیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹہ فوج کے افسروں کے ہاتھوں مٹھ کے لٹنے اور ناپاک کئے جانے پر ٹیپو نے مٹھ کی مورتیوں کی تجدید اور پوجا کا بندوبست کروایا تھا اور اس کام سے متعلقہ کل مصارف شاہی خزانہ سے ادا کئے گئے تھے۔ علاوہ ازیں شری شنکر اچاریہ سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اُن کی حکومت کی بہبودی اور ترقی کے لئے پوجا کریں۔

ٹیپو سلطان نے کئی مشرقی زبانوں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ فارسی اردو اور کناڑی زبان میں فصاحت کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے۔ انہیں تحصیل علم کا بہت شوق تھا۔ علم دوستی اور ادب نوازی اُن کا مرغوب شیوہ تھا۔ انہوں نے کثیر التعداد فارسی اور عربی کتب کے نسخے فراہم کر رکھے تھے۔ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ اپنی نجی لائبریری میں ہی گزارتے تھے۔ اُن کے مراسلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب وہ راجدھانی سے کہیں دوسری جگہ جاتے تو اپنے کتب خانے سے کتابیں ساتھ لے جاتے یا بعد ازاں منگوایا کرتے۔

ٹیپو سلطان ۱۷۹۹ء میں انگریزوں سے لڑتے لڑتے شہید ہوگئے اور میسور کی آزادی ہمیشہ کے لئے معدوم ہوگئی۔ ٹیپو کے دیگر مال و متاع کے ساتھ اُن کی لائبریری اور مراسلات انگریزوں کے ہاتھ آگئے تھے۔ انگریز عمال نے اس لائبریری کو حفاظت کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بطور تحفہ پیش کیا تھا۔ صوبہ بنگال میں مشہور فورٹ ولیم کالج انہیں دنوں (سنہ ۱۸۰۰ء میں) قایم ہوا تھا۔ اُس وقت کے گورنر جنرل ویلزلی کے حکم سے مذکورہ لائبریری فورٹ ولیم کالج میں منتقل کر دی گئی۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں چارلس سٹراٹ، ایک انگریز اس کالج میں فارسی کے نائب پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہ علم و ادب کے بہت دلدادہ تھے۔ ان کی نظر اس خزینۂ علم (لائبریری) پر پڑی اور انہوں نے فرصت کا وقت اس لائبریری کی کتب کے مطالعہ و جانچ پڑتال میں لگانا شروع کر دیا۔ خوش قسمتی سے کالج کونسل نے چارلس سٹراٹ کے کام کی اہمیت سمجھ کر انہیں مراعات بہم پہنچائے جانے کی سفارش گورنمنٹ سے کر دی۔ گورنمنٹ نے اس سفارش پر اپنی منظوری کی مہر ثبت کر دی اور چارلس کی امداد کے لئے فورٹ ولیم کالج میں چار مولویوں کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ لیکن انہیں دنوں ولایت سے مزید طلبا کے آجانے پر مولویوں کو پڑھانے کے کام پر لگا دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چارلس صاحب ان کی امداد سے محروم ہو گئے۔ فقط حسین علی نام کے ایک مولوی کی اعانت سے ہی انہوں نے ٹیپو لائبریری کے جملہ نسخہ جات کی ریسرچ جاری رکھی اور تمام کتب کی فہرست مرتب کر لی۔

عربی، فارسی اور ہندوستانی زبان کی ملی جلی کل کتابوں کی تعداد کل دو ہزار تھی۔ مسلم تہذیب و تمدن کے مختلف شعبوں کی کتب سے یہ لائبریری بھری پڑی تھی۔ تواریخ، سوانح حیات، مذہب و شریعت، سیاسیات، شعر و شاعری، حکایات و روایات، ریاضی، نجوم، فلسفہ، زبان دانی وغیرہ تمام موضوعات پر مشتمل کتب نے لائبریری کا دامن مالا مال کر رکھا تھا۔ جملہ کتب نہایت خوش خط، نستعلیق خط میں نقش و نگار اور دلکش قلمی موشگافیوں سے سجا کر بڑی محنت سے لکھی گئی تھیں۔ وسطی زمانہ میں خوشنویسی بہترین آرٹ میں شمار کی جاتی تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں یہ آرٹ عروجِ کمال پر پہنچا۔ پٹنہ کی خدابخش لائبریری میں اس کے بے شمار شاہکار موجود ہیں۔

ٹیپو لائبریری کی بیشتر کتب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے مال غنیمت کے ساتھ دیگر مقامات سے لائی گئی تھیں۔ بیجاپور، گولکنڈہ، کرناٹک کے علاقہ کے کئی مقامات سے بے شمار کتب اُن کے ہاتھ لگی تھیں۔ بعض کتب کے ابتدائی اور آخری اوراق نہ ہونے کی وجہ سے مصنفین کے ناموں کا پتہ نہیں چل سکا۔ ہر کتاب کے سرورق کے وسط میں ایک تمغہ کی شکل بنائی گئی تھی۔ اس میں خدا، حضرت محمدؐ، حضرت محمدؐ کی صاحبزادی فاطمہ، اُن کے فرزند حضرت حسن اور حسین کے نام تحریر کئے گئے تھے۔ سرورق کے چاروں کونوں میں پہلے چاروں خلفاء — ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کے نام دیئے گئے تھے۔ سرورق کی پیشانی پر سرکارِ خداداد' اور نچلے حصے پر اللہ کافی' کلمات لکھے ہوئے تھے۔ کسی کسی کتاب پر ٹیپو سلطان کے نام کی مہر ثبت تھی۔ ان کتب کے مقدم موضوع عام مذہبی مسائل، شریعت، اور 'صوفی مذہب' تھے۔ ان دو موضوعات کی کتب ہی ٹیپو سلطان کو زیادہ مرغوب تھیں۔ انہیں خود بھی تصنیف کتب کا بہت شوق تھا۔ مگر ان کا تصنیف کردہ کوئی بھی مکمل صحیفہ دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ اُن کی ذاتی مساعی اور اہتمام سے مختلف موضوعات پر پچاس کتب تصنیف اور دیگر زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی ملی ہیں۔

ٹیپو سلطان کی ان فراہم شدہ کتب سے ان کے زمانہ کے ذوقِ علم پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز فارسی زبان کی کئی ایک قرنوں کی رفتار ترقی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ یورپ جب جہالت اور لاعلمی کی تاریکی میں گم تھا، ایشیا اس وقت علم و حکمت کے لحاظ سے کس درجہ ترقی پر پہنچا ہوا تھا — یہ لائبریری اس امرِ واقعی کے ثبوت کی بھی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتب خانہ کی بہت سی کتابیں بعد میں انگلینڈ بھیج دی گئی تھیں۔ چند ایک معمولی کتب ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں موجود ہیں۔ ذیل میں اس لائبریری کی چیدہ چیدہ کتب کا مختصر تعارف درج ہے۔

اس لائبریری میں تاریخ اور سوانح عمریوں کے بے شمار قیمتی نسخے جمع کئے گئے تھے۔ اُس زمانے کے مسلمان علما نے تاریخ دانی میں شہرت حاصل کی تھی۔ ہندوستان، عرب، پارس وغیرہ کئی ممالک کی تاریخی کتب سے ٹیپو سلطان کی لائبریری سیر داماں تھی۔ اُن میں سے 'روضۃ الصفا' بہت مشہور ہے۔ مشرقی لٹریچر میں اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے مصنف 'محمد بن نواد شاہ بن محمد' ہیں۔ یہ عوام میں میرخند کے نام سے معروف تھے۔ ان کی یہ کتاب سات

حصص پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں اس کے ساتھ ایک دیباچہ اور ضمیمہ بھی شامل ہے۔ کتاب کی تمہید میں مطالعہ تواریخ کے متعلق عام بحث کی گئی ہے۔ اور حکمران طبقہ کے لئے اس کے فواید بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد آفرینش عالم سے شروع کر کے پارس کی قدیم تواریخ، سکندرِ اعظم کی سوانح حیات، حضرت محمدؐ، پہلے چار خلیفوں اور بارہ اماموں کی سوانح عمریاں، بنو امیہ، بنو عباس اور سلجوقی خاندان اور غزنی اور غور کے شاہی خاندانوں کے حالات اور چنگیز اور تیمور کی تاریخ دی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور مشہور تاریخ "خلاصۃ الاخبار" بھی ملتی ہے۔ یہ کتاب بھی ایشیا کی مستند تواریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ضخامت، بصیرت افروز دیباچہ، دس حصص اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا موضوع بھی، میرخوند کی اصلی تصنیف کا دوسرا چربہ ہے۔ مذکورہ دونوں کتب کے علاوہ ایشیا اور ہندوستان کی تواریخ سے متعلق جو دیگر کتابیں ٹیپو لائبریری کی زینت تھیں اُن میں سے صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) روضۃ الطاہرین (۲) تاریخ یہود (۳) ظفر نامہ ـــــ تیمور کے حملوں کا تذکرہ۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ترجمہ کی گئی تھی (۴) طبقات ناصری۔ یہ کتاب غلاماں خاندان کے بادشاہ ناصر الدین کے عہد میں لکھی گئی تھی اور مصنف کی طرف سے بادشاہ کے نام سے منسوب کر دی گئی تھی (۵) طبقاتِ اکبری ـــــ اس کتاب کے مصنف نظام الدین احمد تھے (۶) فرشتہ کی مشہور تواریخ، محمد قاسم فرشتہ نے یہ کتاب تصنیف کی تھی (۷) منتخب اللباب ـــــ مصنفہ مشہور تواریخ دان خافی خاں (۸) معاصر رحیمی (۹) اقبال نامہ جہانگیری (۱۰) شاہجہان نامہ (۱۱) عالمگیر نامہ (۱۲) لطائف الاخبار ـــ اس میں دارا کے حملہ قندھار کا تذکرہ ہے۔ کانڑی زبان میں تصنیف شدہ میسور راج ونش کی تواریخ کا فارسی ترجمہ ـــــ ٹیپو کی ہدایت کے مطابق اس کا ترجمہ کیا گیا تھا۔

شعروشاعری:- قدیم پارس بے شمار شاعروں کا وطن تھا فارسی زبان کا پرانا مجموعہ شعروشاعری آج بھی چار دانگ عالم میں خراجِ تحسین حاصل کر رہا ہے۔ ٹیپو سلطان کی لائبریری میں فارسی شاعری کے بیش قیمت نسخے فراہم کئے گئے تھے۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہاں دیئے جاتے ہیں ـــ (۱) جامی کی تصنیف کردہ یوسف و زلیخا (۲) دیوان انوری ـــ (۳) جلال الدین رومی کی مثنوی (۴) کلیاتِ سعدی ـــ سعدی کے کلام کا مجموعہ (۵) سعدی کی بوستاں (۶) امیر خسرو کے کلام کا مجموعہ (۷) شیریں فرہاد (۸) دیوانِ حافظ (۹) رامائن کا فارسی ترجمہ (۱۰) شاہ نامہ وغیرہ

حکایات:- (۱) انوار سہیلی (۲) ہندی سے ترجمہ شدہ نصیحت آموز کہانیاں (۳) داستانِ سلیمان۔

سائنس:- (۱) جامع العلوم ـــ اس کتاب میں سائنس کے مختلف موضوعات مثلاً نجوم، زراعت۔ طبیعات جغرافیہ وغیرہ پر خامہ فرسائی کی گئی ہے (۲) جواہر نامہ ـــ قیمتی پتھروں اور معدنیات کے متعلق سائنس (۳) خواص الحیوان ـــ یہ علم الحیوانات کی کتاب ہے (۴) علم نباتات اور علم طبعی کا باتصویر صحیفہ ـــ ٹیپو سلطان کی ہدایت سے انگریزی اور فارسی زبان سے ترجمہ کیا گیا تھا (۵) علم الخواب کی کتاب (۶) اقلیدس جیومیٹری کا گریک سے عربی میں ترجمہ (۷) ابو سینا کی تصنیف کردہ علمِ طب کی شہرہ آفاق کتاب "قانون فی الطب"

ان کے علاوہ جو نادر نسخے تھے۔ افسوس کہ وہ ہندوستان سے برٹش میوزیم میں منتقل کر دیئے گئے اور آج اس ملک کے اہلِ ذوق ان سے استفادہ بھی نہیں کر سکتے۔

جگن ناتھ شرما پربھاکر

کیسے پاؤں

کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

گھر سے نکلی چلی ڈھونڈھنے بھر جوگن کا بھیس   چلتے چلتے تھک گئی میں پر پایا نہ پی کا دیس
کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

گھر میں ڈھونڈا بن میں ڈھونڈا کھوج لیا سنسار   پربت پربت پر سر مارا پایا وار نہ پار
کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

تاروں سے بھی میں نے پوچھا پی کا پتہ نشان   وہ بھی رو کر لگے گرانے دل پر اگنی بان
کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

جن راہوں میں جا کے پڑی میں پایا نہ اُن کا انت   کس سے پوچھوں ہائے سکھی ری کوئی نہ سادھو سنت
کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

آنکھیں پھوٹیں پاؤں بھی ٹوٹے ہو گئی میں مجبور   چھپ کے بیٹھے پاس مرے وہ کر کے مجھ کو دور
کیسے پاؤں پی کو سکھی ری میں مورکھ اگیان
دیوانی ہوں پریم کے پیچھے گیان نہ مجھ کو دھیان

اندرجیت شرما

دنیائے ادب

اقبال کی منظر نگاری

(ذیل کا مقالہ یوم اقبال کی تقریب پر اس جلسہ میں پڑھا گیا جو ۱۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو ڈی اے وی کالج راولپنڈی کے ہال میں آنریبل شیخ سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل لندن کی صدارت میں منعقد ہوا)

جگن ناتھ آزاد بی اے سیکرٹری انجمن اردو راولپنڈی

ہمارے ملک کی تاریخ ادب میں یہ پہلی مثال ہے کہ کسی شاعر کی یادگار اس کی زندگی میں اس قدر اہتمام کے ساتھ ملک کے طول و عرض میں منائی گئی ہو۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو ان کی سالگرہ پر آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ادباء شعراء اور اصحاب ذوق ہدیۂ مبارکباد پیش کر رہے ہیں اور یہ اس شکر گزاری کا اظہار ہے جو ہم سب پر ان کی گراں قدر خدمت گزاری کے لئے لازم آتی ہے۔ دور حاضر میں ان کے سحر انگیز کلام نے اہل وطن کے جذبۂ عمل کو بیدار کرنے میں جو حصہ لیا ہے اس کے لئے علامہ اقبال کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

اقبال کا کلام صوری و معنوی خصوصیات کے لحاظ سے ایک بحر بے پایاں ہے۔ جس کی وسعت اور عمق کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے میں اس شاعر عالم کے کلام بلاغت نظام کی صرف ایک خصوصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا یعنی مجھے "اقبال کی منظر نگاری" کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اگرچہ اس ایک خصوصیت کا نامکمل بیان بھی میرے لئے چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔ لیکن کارفرمایان بزم کے ارشاد کی تعمیل میں وہ تاثرات جو مطالعۂ کلام اقبال کے دوران میں میرے دل نے قبول کئے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اردو کی موجودہ اصلاح یافتہ شاعری جس کی داغ بیل حالی اور آزاد نے ڈالی تھی اقبال کے میدان عمل میں آنے سے پہلے مروج اور مقبول ہو چکی تھی۔ اس شاعری کا جزو اعظم منظر نگاری تھا، ان کے ہمعصروں اور مقلدوں نے منظر نگاری میں خوب رنگ آمیزیاں کیں بعض شعراء نے اسی صنعت شاعری کو اپنا خاص مضمون بنا لیا بعض نے ملکی اور ملی مضامین میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے منظر نگاری کو ذریعۂ امداد کے طور پر استعمال کیا۔ اقبال کا تعلق صریحی طور پر دوسرے طبقے سے ہے۔ چنانچہ کلام اقبال میں جا بجا منظر نگاری کو واردات قلب جذبات ملت اور نکات فلسفہ وغیرہ کو دلکش اور موثر بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ان کی اولین نظموں میں "کوہ ہمالیہ" کے دوسرے ہی بند سے اس حقیقت کا ثبوت مل جاتا ہے کہ وہ ہمالیہ پر ایک بیانیہ نظم نہیں لکھ رہے بلکہ ان کا اصل موضوع اس عنوان کے پردے میں "حب وطن" ہے۔

باوجودیکہ منظر نگاری اقبال کے کلام کا خاص موضوع نہیں ہے لیکن جہاں جہاں کلام اقبال میں منظر نگاری موجود ہے۔ وہاں یہ ایک سحر انگیز منظر پیش کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی نظم میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلف رسا ✽ دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا ✽ وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پہ
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

"ماہ نو" پر چند اشعار لکھے ہیں۔ میں شروع کے تین اشعار پیش کرتا ہوں انہی سے کلام کی اس خصوصیت کے کمال کا اندازہ لگا لیجئے منظر نگاری کے تمام لوازمہ مثلاً قدرت زبان، ندرت تشبیہہ، علو تخئیل ان چھ مصرعوں میں انتہائی دلکشی کے ساتھ موجود ہیں ؎

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل ✽ ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل

طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

ایبٹ آباد کے پہاڑوں پر گھٹاؤں کے منظر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سرین کا
نہاں ہوا جو رُخِ مہر زیرِ دامنِ ابر
ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر
گرج کا شور نہیں ہے خموش ہے یہ گھٹا
عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا
ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل
اٹھی وہ کالی گھٹا، لو برس پڑا بادل

برسات کے موسم کی کتنی سچی تصویر ہے۔ ایک ایک مصرع پر فصاحت اور بلاغت نثار ہو رہی ہے۔ لفظ لفظ نظارے کی تصویر کھینچ رہا ہے۔ خاص کر ساکنان راولپنڈی جس قدر ان اشعار کی صداقت کا احساس کر سکتے ہیں اور اُن سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور مقام والوں کی قسمت نہیں۔

"ایک شام" جن جذبات کی مظہر ہے اُس کا احساس فقط حساس دل ہی کر سکتے ہیں۔ دریا کے کنارے شام ہو رہی ہے۔ سکوت ہر طرف اپنا تسلط جما رہا ہے۔ غیر ممکن ہے کہ اقبال اس خاموش کن اور غم انگیز منظر سے متاثر نہ ہو۔ کہتا ہے ؎

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت خاموش ہو گئی ہے
آغوش میں سب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

"گورستانِ شاہی" میں تو اقبال نے منظر کشی کے جادو کو اعجاز کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ شاندار اسلامی حکومتوں کے ویران کھنڈر شاعر کے سامنے ہیں۔ آنکھیں تباہ شدہ مناظر کو دیکھ رہی ہیں۔ حساس دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ قطب شاہی اور عماد شاہی حکومتوں کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لیکن آج اُن کے عظیم الشان شہنشاہ

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور

عالیجناب شیخ صاحب نے جو ہماری خوش قسمتی سے آج کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہیں اس بلند پایہ نظم کی تمہید میں جون ۱۹۱۰ء میں چند سطور زیب اوراقِ مخزن کی تھیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک قصیدہ کا ذکر کرنے کے بعد شیخ صاحب لکھتے ہیں:-

"دوسری نظم جو گورستان شاہی کے عنوان سے شائع کی جاتی ہے۔ ایسی لاجواب نظم ہے جو فی الحقیقت اقبال کے دیرینہ سکوت کی تلافی کرتی ہے، اس کا ایک ایک مصرعہ ایسا درد بھرا اور معنی خیز ہے کہ دل سے داد نکلتی ہے۔ . . . . سلاطین قطب شاہیہ کے مزار اُن کے قریب گولکنڈہ کا تاریخی حصار، شب ماہ مگر ایسی شب ماہ جس میں بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نور و ظلمت میں لڑائی ٹھن رہی تھی سچے شاعرانہ جذبات کے نشو و نما کے لئے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان کیا ہوگا۔ ان جذبات کا عکس خوبی اور صفائی سے جناب اقبال نے اتارا ہے۔ انہی کا حصہ ہے"۔

خود علامۂ اقبال نے اسی نظم کی تمہید میں لکھا:-

"حیدرآباد دکن میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی اے معتمد محکمۂ فینانس مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے جن میں سلاطینِ قطب شاہیہ سو رہے ہیں رات کی خاموشی ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم انہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے"۔

شہنشاہوں کے قبرستان کا المناک منظر، شبِ ماہتاب کا ابر آلود نظارہ اور اقبال کا دل حساس، اس اتفاق کو اردو شاعری کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے نظم کا آغاز دیکھئے، کس درجہ بلند پایہ منظر نگاری ہے ؎

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
کچھ مکدر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی
بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

باطنِ ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

یکایک شاعر کی توجہ اس یاس انگیز منظر سے ہٹ کر سامنے گولکنڈہ کے قلعہ کی جانب مبذول ہوتی ہے اور کہتا ہے ؎

آہ! جولانگاہِ عالمگیر یعنی وہ حصار — دوش پر اپنے اٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے — یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

بیان کیا جا چکا ہے کہ منظر نگاری اقبال کے کلام میں وارداتِ قلب جذباتِ ملت، نکاتِ فلسفہ اور حبِ وطن وغیرہ مضامین کو دلکش اور موثر بنانے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اس نظم میں یہ خصوصیت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے، ان اشعار کو لیجئے ؎

ابر کے روزن سے وہ بالائے بامِ آسماں — ناظرِ عالم ہے نجمِ سبز فامِ آسماں
خاکبازی وسعتِ دنیا کا ہے منظر اسے — داستاں ناکامیٔ انساں کی ہے ازبر اسے
ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا — آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا
گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لئے — فاتحہ خوانی کو یہ ٹھیرا ہے دم بھر کے لئے

یا

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل — جن کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال
رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری — ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی
بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

اور ؎

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے — اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

یا

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے — ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ آغاز سے شاعر کا مطلب فقط منظر نگاری نہ تھا بلکہ کچھ اور بھی۔ اگر حبِ ملی اور منظر نگاری کا کمال دیکھنا ہو تو "گورستانِ شاہی" اقبال کے اردو کلام میں بے نظیر چیز ہے۔

"نمودِ صبح" کے زیرِ عنوان ایک نظم ہے۔ یہ دراصل ایک قصیدہ کے ابتدائی اشعار ہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ منظر نگاری کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ وقت کی تنگ دامانی کی وجہ سے بعض لاجواب نظموں مثلاً "رات اور شاعر" اور "بزمِ انجم" کو مجبوراً نظر انداز کیا جاتا ہے۔

چونکہ شاعر نے اردو سے زیادہ فارسی میں طبع آزمائی کی ہے یہ مضمون تشنہ رہ جائے گا، اگر فارسی منظومات میں سے اقتباسات آپ کے سامنے پیش نہ کئے جائیں۔ سر اقبال کی فارسی تصنیفات میں "پیامِ مشرق" ایک ایسا چمنِ بے خزاں ہے جس میں اقبال کی منظر نگاری کے اچھوتے اور مکمل نمونے بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔

بہار کا موسم اپنے پورے شکوہ سے جلوہ گر ہے۔ شاعر دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔

خیز کہ در کوہ و دشت — خیمہ زد ابرِ بہار
مستِ ترنم ہزار
طوطی و درّاج و سار
بر طرفِ جوئبار
گلشنِ گل و لالہ زار
چشم تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت — خیمہ زد ابرِ بہار

شاعر کی عمیق نظر فقط بہار تک ہی محدود نہیں رہ جاتی بلکہ بہار کے تاثرات کا بھی مشاہدہ کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خیز کہ در باغ و راغ — قافلۂ گل رسید
بادِ بہاراں وزید
مرغِ نوا آفرید
لالہ گریباں درید
حسنِ گل تازہ چید
عشق غمِ نو خرید
خیز کہ در باغ و راغ — قافلۂ گل رسید

نسیمِ صبح کی زبان سے کتنے لطیف اشعار کہلائے ہیں ؎

ز روئے بحر و سرِ کوہسار می آیم — ولیک مے نہ شناسم کہ از کجا خیزم
بہ سبزہ غلطم و بر شاخِ لالہ می پیچم — کہ رنگ و بو ز مسامات او برانگیزم
خمیدہ تا نہ شود شاخ از گردشِ من — بہ برگِ لالہ و گل نرم نرمک آویزم

ساربانِ حجاز اپنے ناقہ پر سوار جا رہا تھا۔ صبح ہو رہی ہے اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

مہ ز سفر پا کشید — در پسِ تل آرمید
صبح ز مشرق دمید — جامۂ شب بر درید
بادِ بیاباں وزید
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

شاعر نشاط باغ کشمیر میں بیٹھا ہے۔ بہار پورے جوبن پر ہے، دل پر جو کیفیت طاری ہو رہی ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے کیجئے۔

زمیں از بہاراں چو بال تدروے | زفوارہ الماس بار آبشارے
بجز شیریں نوائے چہ دلکش صدائے | کہ می آید از خلوت شاخسارے
نواہائے مرغ بلند آشیانے | در آمیخت با نغمہ جوئبارے

تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را
نہاد است در دامن کوہسارے

ایک اور نظم میں کشمیر جنت نظیر کی تصویر کھینچی ہے فقط دو اشعار پیش کرتا ہوں

باد بہار موج موج، مرغ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بہ آب جو تپید
خاک شرر شرر بہ بیں آب شکن شکن نگر

اتنا وقت نہیں کہ علامہ اقبال کی تمام تصانیف سے اقتباسات آپ کے سامنے پیش کروں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم | کرشمہ دامن دل می‌کشد کہ جا ایں جاست

"ہمایوں"

جگن ناتھ شرما

مصنف کے حالات اس کی تصانیف سے

(مزاحیہ)

مغربی طرز تنقید نے جسے آج کل تنقید عالیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہمارے نقادوں کی ذہنیت میں ایک خطرناک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس انقلاب کا سب سے نمایاں پہلو کسی مصنف کے سوانح حیات اس کی تصانیف سے اخذ کرنے کا جنوں ہے۔ ہمارے نقادوں کی اس امر واقعہ پر نظر ہی نہیں کہ ہمارے مصنف بالخصوص شاعر آپ بیتی نہیں کہا کرتے بلکہ ایک علمی اور خیالی دنیا پیدا کر کے اس میں رہنے والے کسی فرضی شخص کے حالات اور جذبات اپنے نام سے بیان کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے کلام سے ان کی زندگی کے حالات اخذ کرنا حنظل میں سے عطر حنا نکالنے کی کوشش کے مترادف ہے لیکن مجھ ایسے کم مایہ شخص کے لئے ان بزرگوں کی روش کے خلاف بغاوت کرنا بھی ناممکن ہے۔ اس لئے مجبوراً ان کی پیروی کر رہا ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ دو تین شاعروں کے حالات ان کے کلام سے اخذ کر کے اس طرز تنقید کی لغویت پر کچھ روشنی ڈالوں۔ لیکن وقت بہت کم ہے۔ اس لئے صرف مرزا غالب کے حالات بیان کئے دیتا ہوں اور وہ بھی نہایت اختصار سے۔ مرزا کا نام تمام تذکرہ نویسوں نے اسد اللہ خاں لکھا ہے لیکن نئے تذکرہ نگاروں نے اس معاملے کو بھی خاص تحقیقات کا مستحق سمجھا اور بڑی کاوش اور تلاش کے بعد ثابت کر دکھایا ہے کہ غالب کا نام احمد شاہ ابدالی یا ہمیوں بقال نہیں بلکہ اسد اللہ خاں ہی تھا۔ ان محققوں کے اس خیال کی تائید مرزا کے دو شعروں سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

اسد اللہ خاں تمام ہوا | اے دریغا وہ رند شاہد باز

مرزا کا تخلص کئی غزلوں میں اسدؔ ہے اور اکثر میں غالبؔ۔ اس سے بعض لوگوں کو شک ہو چلا تھا کہ مرزا کا دیوان دو مختلف شاعروں کے زور طبع کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہمارے تذکرہ نویسوں نے ثابت کر دیا ہے کہ غالبؔ اور اسدؔ دراصل ایک ہی شخص کے تخلص ہیں۔ البتہ ان تذکرہ نگاروں کا یہ خیال درست نہیں کہ مرزا پہلے اسد تھے۔ پھر غالب بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا نے آخر تک اسدؔ تخلص نہیں چھوڑا فرماتے ہیں ؎

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ظاہر ہے کہ یہ شعر مرزا نے آخر عمر میں بھی نہیں بلکہ اپنی موت کے بعد لکھا تھا۔ پھر کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ آخر تک اسدؔ تخلص استعمال کرتے رہے۔

پیدائش:-

نام اور تخلص کا مسئلہ یوں حل ہو گیا۔ لیکن مرزا کی پیدائش اور عمر کے متعلق نئے اور پرانے تمام تذکرہ نویسوں نے بری طرح ٹھوکریں کھائی ہیں۔ سب نے غالب کا سن پیدائش ۱۲۱۲ھ لکھا ہے اور عمر ۷۳ سال لیکن یہ صریحاً غلط ہے۔ مرزا خود کہتے ہیں۔

فنا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

اس سے ظاہر ہے کہ مرزا غالبؔ نہ صرف قیس عامری کے زمانے میں زندہ تھے۔ بلکہ عمر میں بھی اس سے بڑے تھے۔

١٥ال ٢٠،

غالب کے والد کا نام تمام تذکروں میں عبداللہ بیگ خاں درج ہے۔ مرزا کے کلام سے اس معاملے پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ لیکن مرزا کے باپ کا کچھ نہ کچھ نام تھا ضرور۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اب سے کئی سو سال پہلے بھی ہندوستان میں باپوں کے نام ہوا کرتے تھے۔ مثلاً جہانگیر کے باپ کا نام ظہیر الدین بابر تھا۔ اس تاریخی انکشاف کے بعد اگر قافیہ کی رعایت سے اسداللہ کے باپ کا نام عبداللہ تسلیم کر لیا جائے تو میرے خیال میں کچھ حرج نہیں۔

مرزا کی والدہ ماجدہ کا نام کسی کو معلوم نہیں ہو سکا لیکن انہوں نے اپنے ایک خط میں اس امر کی شکایت کی ہے کہ ایک شخص نے ان کو بڑھاپے میں ماں کی گالی دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا کی کم از کم ایک ماں ضرور تھی۔

تعلیم

معلوم نہیں مرزا نے تعلیم کہاں پائی۔ مجنوں کے زمانے میں کوئی باقاعدہ سکول تو تھا نہیں۔ صرف ایک دبستاں تھا جس کی دیواروں پر مجنوں لام الف لکھا کرتا تھا۔ پس مرزا غالب گھر پر ہی پڑھے ہوں گے۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ وہ جاہل نہیں تھے۔ اگر ناخواندہ ہوتے تو شعر کیونکر لکھ سکتے اور اتنی تصانیف کہاں سے آجاتیں۔ انہوں نے اردو اور فارسی میں نظم و نثر لکھی ہے۔ پس وہ دونوں زبانیں جانتے تھے۔

پیشہ اور شغل۔

مرزا کا سب سے بڑا پیشہ تو ظاہر ہے۔ دوسرا کام یہ تھا کہ شعر چن چن کر رسوا ہوتے تھے۔ خود مانتے ہیں کہ

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس کے علاوہ بعض اور اشغال بھی تھے۔ مثلاً انہوں نے مصوری بھی سیکھی تھی۔ فرماتے ہیں۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

کچھ مدت یہ شیوہ بھی رہا کہ صبح سویرے کان پر قلم رکھ کر نکل پڑتے اور سارا دن لوگوں کے خط لکھتے پھرتے۔ اس لئے کہ

مگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

مختصر حالات۔

اب مرزا کے مختلف سوانح حیات سنئے۔ وقت کی تنگی کے باعث میں صرف چند ایک واقعات کے بیان پر اکتفا کروں گا۔

مرزا کی زندگی اگرچہ نسبتاً عسرت میں گزرتی تھی۔ لیکن اس کے لئے اللہ میاں ذمہ دار نہ تھے۔ خود مرزا کو اقرار ہے کہ خدا نے انہیں دونوں جہان دے دیئے تھے۔ سنیئے۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ دونوں جہان گئے کہاں؟ جواب مرزا کے اس شعر میں موجود ہے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پس دونوں جہان بھی گھر کے ساتھ ہی لٹا دیئے ہوں گے۔ مرزا غالب کا گھر نہ صرف ویران تھا۔ بلکہ اس میں ویرانی سی ویرانی تھی۔ چنانچہ

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

لیکن ان کا گھر وسیع نہ تھا اور مرزا کو ورزش کے لئے یا شاید کرکٹ کھیلنے کے لئے بہت وسیع جگہ کی ضرورت تھی۔ اس لئے جنگل میں جا بسے تھے۔ فرماتے ہیں۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

عادات و خصائل:۔

مرزا بڑے سادہ لوح اور صاف دل انسان تھے اکثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے تھے۔ جن کا نتیجہ نقصان یا تکلیف ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک دن محبوب کی گلی میں بیٹھے بیٹھے ذرا سی غلطی کے باعث دربان سے چندیا گنجی کرا لی۔ کہتے ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی۔
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ایک دن خود محبوب سے بھی مار کھائی۔ لیکن قصور اپنا تھا۔ اس لئے نہایت ایمان داری سے اس کا اعتراف بھی کر لیا ہے یعنی۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اسی سادہ لوحی کی بدولت ایک دن محبوب کی حد سے زیادہ تعریف

کر کے ایک غمخوار رازداں کو رقیب بنا لیا۔ ثبوت ملاحظہ ہو۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

لیکن دیوانہ بکار خویش ہشیار کبھی کبھی رقیب کو جُل بھی دے جاتے۔

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

مرزا نجوم اور جوتش کے نہ صرف قائل تھے بلکہ محبت کے معاملے میں بھی جوتشیوں سے پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے اسی لئے کہا ہے۔

دیکھئے پاتے ہیں کیا فیض بتوں سے عشاق
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

اگر کبھی محبوب آنے کا وعدہ کرے تو سارا دن بلکہ یوں کہئے کہ ساری رات اپنے دروازے پر بیٹھے رہتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر تنگ آکر کہتے ہیں۔

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

مرزا کا دل

غالب کا دل عام لوگوں کی طرح خون کا قطرہ یا گوشت کا لوتھڑا نہ تھا بلکہ آفت کا ٹکڑا تھا اور مرزا اس کی آوارگی کے شاکی تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

لیکن اللہ میاں نے فضل کیا اور مرزا کو جلد ہی اس سے رہائی مل گئی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے سوزِ نہاں کا دورہ ہوا اور سارے کا سارا دل بے محابا جل گیا۔ مرزا نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

غالب کے ناخن بہت جلد جلد بڑھتے تھے۔ چنانچہ زخم ابھی بھرنے بھی نہ پاتا تھا کہ ناخنوں کے کھرپے پھر کھدائی کے لئے تیز ہو جاتے فرماتے ہیں۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

محبت کے مریضوں کو عام طور پر سخت جانی کی شکایت ہوتی ہے، لیکن مرزا کی جان نہ تو سخت تھی اور نہ نرم بلکہ نہایت ہی خستہ تھی اور شاید بھربھری بھی۔ اس لئے کہا ہے۔

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اسی خستہ جانی کے باعث حضرت عیسیٰ کے لب ہلاتے ہی مرزا غریب لڑھک گئے۔

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

غالب کا زمانہ

غالب کے زمانے میں دلی میں غم الفت کا قحط پڑ گیا تھا۔ اب خدا جانے کیا حال ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی خوراک غم الفت تھی یا کم از کم غم الفت ان کی خوراک کا جزوِ عظیم تھا۔

لیکن اس قحط سالی میں ایک دو چیزوں کی ارزانی بھی تھی۔ مثلاً دل اور جاں بازار میں بکا کرتے تھے اور ہر شخص خرید سکتا تھا۔ مرزا کو اس کا اعتراف ہے۔

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

اس زمانہ میں پورے سات آسمان تھے اور سب کے سب دن رات گردش میں رہتے تھے۔ مرزا لکھتے ہیں۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مرزا کے زمانے کی ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ اگر کسی کو محبوب کا منہ معلوم نہ ہو سکے تو اس کی ہیچمدانی کھل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مرزا کی ہیچمدانی بھی کھل گئی جس کا اعتراف اس شعر میں موجود ہے۔

وہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچ مدانی میری

سب سے بڑی قباحت اس عہد کی یہ تھی کہ مجرموں کو سخت وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ مرزا غالب ایسے شخص کو بھی ایک مرتبہ کسی جرم

کی پاداش میں پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ لیکن زمانہ اس قدر خراب تھا کہ مرزا اس حالت کو بھی غنیمت سمجھتے تھے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

غالب کا محبوب:

مرزا کا محبوب بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا۔ اس کا نام سارے جہان کو معلوم تھا۔ لیکن کسی ملک کسی شہر کسی گاؤں میں کوئی شخص بھی اس کا نام ستمگر کہے بغیر نہ لیتا تھا مرزا کہتے ہیں۔

کام اس سے آ پڑا ہے جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

مرزا کا محبوب مرزا کی بات نہ سمجھتا۔ مرزا دعا کرتے ہیں۔

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اور لطف یہ ہے کہ مرزا بھی اس کی بات نہ سمجھتے تھے کہتے ہیں ع

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

اس محبوب کے عادات و خصائل بھی عجیب تھے۔ مثلاً گالیاں بہت دیا کرتا تھا۔ مرزا پوچھتے ہیں۔

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

اس طرح اگر کبھی مرزا شکوہ شکایت کریں تو وہ فوراً اٹھ بھاگتا اور سارے رقیبوں کو جمع کر لیتا۔ اسی لئے مرزا جھلاتے ہیں۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

جب وہ رقیب کی بغل میں سوتا تو مرزا کے خواب میں آ کر پنہاں تبسم کیا کرتا تھا۔ اسی لئے مرزا کہتے ہیں۔

بغل میں غیر کی آپ آج سوئے ہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

معشوق تھا تو ستمگر لیکن آخر میں بے طلب بوسے دینے لگا تھا۔ مرزا کی بدگمانی ملاحظہ ہو۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

اس کے مذہب کے متعلق صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم تھا جبھی تو مرزا کو کہنا پڑا کہ

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

چند متفرق واقعات

ایک دفعہ مرزا نے اڑنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز تو تھے نہیں کسی اور طریق سے اڑے ہوں گے۔ لیکن جال میں پھنس گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے کچھ مدت گھونسلے میں بھی گزاری۔

مرزا کا ایک درباں بھی تھا۔ جب مرزا کا گھر ویران ہو گیا تو اس کے لئے کوئی کام نہ رہا۔ مگر تھا وفادار۔ مرزا کا ساتھ نہ چھوڑا اور گھر میں سے گھاس کھود کر گزر اوقات کرتا رہا۔ مرزا فرماتے ہیں۔

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

بچپن میں ایک مرتبہ مرزا نے مجنوں پر پتھر اٹھایا تھا لیکن مارا نہیں آزاد مرحوم کو یہ واقعہ معلوم ہوتا تو فرماتے "اللہ اللہ کیسے رقیق القلب اور خدا ترس انسان تھے"۔ مرزا کا شعر سنئے ع

میں نے مجنوں پر لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

مرزا نے کئی مرتبہ بہشت کی سیر بھی کی۔ ایک مرتبہ بہشت سے واپس آ کر محبوب سے فرماتے ہیں۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

خواجہ خضر نے بھی مرزا کی اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ نصرت الملک کے قصیدے میں فرماتے ہیں۔

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

لیکن خضر کو رہنمائی کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے کہتے ہیں۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

ایک مرتبہ مرزا کو چوروں کا سامنا ہوا۔ دیکھتے ہی بھاگ نکلے لیکن دوڑ دھوپ کے باوجود پکڑے گئے۔ ایک ستم ظریف چور نے ڈانٹ کر کہا۔ کم بخت ہمیں اس قدر دوڑایا ہے۔ لے اب میرے پاؤں داب اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے۔

ع بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرزا اپنے رقیب کے دروازے پر کم نہ زیادہ پورے ایک ہزار مرتبہ گئے۔ شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب بھی عمر بھر میں ہزار بار ہی رقیب کے گھر گیا۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

مرزا نے مرنے کے بعد بھی بہت سے شعر کہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے شاگردوں تک پہنچا دیئے اور انہوں نے دیوان میں شامل کر دیئے ان میں سے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں
آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

مرزا کا محبوب کہیں کعبہ کے گرد و نواح میں سکونت پذیر تھا۔ چنانچہ جب کبھی مرزا کو محبوب کے دروازے پر دھکے پڑتے تو وہ کعبہ کی جانب چل دیتے فرماتے ہیں۔

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

مجنوں عمر میں تو مرزا سے چھوٹا تھا ہی۔ اس کا انتقال بھی مرزا سے پہلے ہی ہوا۔ مرزا کہتے ہیں۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

مرزا بیچارے کی موت بھی غریب الوطنی ہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں:۔

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

موت یوں ہوئی کہ آخر عمر میں وحشت کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ایک دن اسی حالت میں سر پھوڑ کر مر گئے۔ مرتے مرتے کہا۔

مر گیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

معشوق کو یہ حال معلوم ہوا تو مروت نے جوش مارا دوڑا آیا۔ لیکن مرزا غریب میں ایک نظر دیکھ لینے کی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ چنانچہ یہ شعر پڑھتے پڑھتے جاں بحق ہوئے۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

لیجئے صاحب یہ ہے ہمارے خدائے سخن کی وہ صورت جو "تنقید عالیہ" کے آئینے میں نظر آتی ہے۔

(شیرازہ) هرچند اختر

قطعہ

وہ لطف بھی گیا وہ مدارات بھی گئی
یعنی کبھی کبھی کی ملاقات بھی گئی
ہم چاہتے تھے اور فزوں لطف یار کو
تھا یہ کسے کا سراہو کہ وہ بات بھی گئی

جلال الدین اکبر

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۸ء

جلد ۱۶ — نمبر ۸

تصاویر (۱) ننھے میاں روٹھیے (۲) مسرت (۳) صبح طفلی

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مسٹر صلاح الدین پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر "ادبی دنیا" کمرشل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔)

بزمِ ادب

پھر پہلے سائز پر

ناظرین کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ادبی دنیا دو ماہ کے بعد پھر بڑے سائز پر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ بات ہمارے لئے ایک معمّے سے کم نہیں کہ جب اکثر ادبی رسائل ۱۰×۷½ کے موزوں سائز پر چھپ کر مقبولِ عام ہو رہے ہیں تو پھر ہمارے ناظرین ادبی دنیا کا اس معقول سائز پر چھپنا کیوں گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ پرچے کے اس سائز پر شائع ہونے سے انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچتا اور ادارہ کو ڈھائی سو روپے ماہوار کے خسارے سے نجات مل جاتی ہے۔

مگر انہیں اس سے کچھ غرض نہیں۔ انہیں تو جہازی سائز کا ادبی دنیا بھلا لگتا ہے اور بس۔ اچھا صاحب! لیجئے جہازی تقطیع دوبارہ حاضر ہے لیکن ایک لمحے کے لئے یہ بھی سوچئے کہ آخر یہ آپ کا اپنا عزیز پرچہ ہے۔ کب تک نقصان برداشت کرتا چلا جائے۔ اس کی قربانیوں کے مقابل میں آپ کا بھی کچھ فرض ہے اور آپ اس فرض سے نہایت آسانی سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ اگر ادبی دنیا کا ہر ناظر اپنے حلقۂ اثر میں سے ایک اور فقط ایک خریدار اسے دے دے تو پرچے کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتی ہیں اور موجودہ خسارہ بھی ایک حد تک پورا ہو سکتا ہے۔ کیا ہمارے قدر شناس ناظرین ایک لمحہ کے لئے اس گذارش کی طرف متوجہ ہوں گے۔ ماہِ آیندہ سے ہم اُن تمام اصحاب کے اسمائے گرامی نہایت شکریہ کے ساتھ شائع کیا کریں گے جو ہماری اس درخواست کو شرفِ قبولیت عطا فرمائیں گے۔

سالنامہ کے انعامات

گذشتہ سالنامہ کے انعامات کا فیصلہ ہو گیا۔ اگرچہ کچھ دیر سے ہوا۔ جن اصحاب کے مضامین نظم و نثر پر انعام دیا جانا قرار پایا ہے۔ اُن کے نام اور مضامین کی تفصیلات درج ذیل ہیں اور انعامات کی رقوم اُن کی خدمت میں روانہ کی جا رہی ہیں۔ یہ انعامات منصور گولڈ میڈل کے علاوہ ہیں جو منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کو اُن کے مضمون "گارڈنر خاندان کے اردو شعرا" پر دیا جا چکا ہے۔

صاحبِ مضمون	مضمون	انعام
	(نثر)	
کرشن چندر صاحب ایم اے	یرقان (افسانہ)	سات روپے آٹھ آنے
صاحبزادہ محمد عمر صاحب بی اے۔	برابر کی چوٹ (ڈرامہ)	سات روپے آٹھ آنے
اندر لال داس صاحب قمر۔	عزت اور رومان (ڈرامہ)	سات روپے آٹھ آنے
پروفیسر فیاض محمود صاحب ایم اے۔	دس سال (مکالمہ)	سات روپے آٹھ آنے
	حصۂ نظم	
اصغر حسین خاں صاحب نظیر	ساقی نامہ	پانچ روپے
جناب روش صدیقی	اے کشورِ ہندوستاں	پانچ روپے

آیندہ پرچے سے ہم مستقل عنوانات میں ایک عنوان کا اضافہ کر رہے ہیں اور وہ ہے "ریڈیو اور فلم"۔ از بسکہ دورِ حاضر کی یہ دونوں ایجادات متمدن انسان کے علمی اور تفریحی مشاغل میں بہت نمایاں حصہ لے رہی ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں کے مذاق کی تربیت اور ان کی معلومات کی ترقی کی ایک بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ اس لئے کسی علمی یا ادبی رسالے کا اُن کے حسن و قبح سے بحث نہ کرنا وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت سے غفلت برتنا ہے۔ چنانچہ ہم نے انتظام کر لیا ہے کہ اشاعت آیندہ سے "آئینۂ عالم" اور "دنیائے ادب" کی طرح "فلم اور ریڈیو" بھی ایک مستقل عنوان کی حیثیت رکھے گا اور اس کے تحت میں ان اصنافِ تمدن کے متعلق مفید اور پُر از معلومات مضامین شائع کئے جائیں گے۔ امید ہے کہ ہمارے قلمی معاونین جو ان موضوعات سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

عورتوں کی دنیا میں

پنڈت جواہر لال نہرو سے آئرلینڈ کے ایک اخبار نویس نے پوچھا تو پنڈت جی نے بیان کیا کہ "ہندوستان میں اہم ترین انقلاب عورتوں کی بیداری ہے" لیکن یہ بات کوئی ہندوستانی عورتوں سے ہی وابستہ نہیں۔ تمام دنیا میں صنفِ نازک کے متعلق یہی بیان دیا جا سکتا ہے۔

امریکہ میں جو دنیا کا امیر ترین ملک ہے عورتوں کی بیداری، آزادی اور ترقی کا ذکر کرنا تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی بے پایاں دولت کا سات بٹا آٹھ حصہ عورتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ جاپان، چین، روس، ترکی اور فرانس میں عورتیں زندگی کی تمام راہوں میں ایک اہم حصہ لے رہی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی کارگذاریاں روزمرہ کی باتوں سے گذر کر توپ و تفنگ اور ہوائی جہازوں تک جا پہنچی ہیں۔

آج ہم چند ایسی تازہ باتیں اور واقعات بیان کرنا چاہتے ہیں جن سے ہندوستانی عورتیں باقی دنیا میں اپنی ہم جنسوں کے متعلق اندازہ لگا کر جان لیں کہ اگر انہوں نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے کر اپنے وطن کے لئے جیلوں، جلسوں اور جلوسوں میں جانا شروع کر دیا ہے تو اس نئے دور میں صرف اسی ایک بات کو ترقی ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ بقول حضرت علامہ اقبال۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

گذشتہ ماہ بسلے میں نیشنل رائفل ایسوسی ایشن کی پچھترویں جمعیت میں عورتوں نے پہلے سے کہیں بڑھ کر حصہ لیا۔ سات عورتیں شاہی انعام حاصل کرنے کے مقابلے میں شریک ہوئیں۔ باقی جو اس میں حصہ نہ لے سکیں۔ انہوں نے تمام سلطنت برطانیہ کے بہترین نشانہ بازوں کے دوش بدوش کھلے مقابلے میں شمولیت کی۔ اِن مقابلوں میں شامل ہونے کے لئے آسٹریلیا، کینیڈا، جمیکا اور ہانگ کانگ جیسے مختلف اور دور دراز علاقوں سے صنفِ نازک کی اولوالعزم ہستیاں انگلستان پہنچی تھیں۔

ترکی کی سب سے مشہور ہوا باز خاتون صاحبہ خانم اتاترک کی بہت سی متبنٰی بیٹیوں میں سے ہے۔ یہ خاتون تئیس سال کی ایک صحت ور عورت ہے۔ گذشتہ سال اسے ہیروں سے مرصع ہوائی صلیب انعام میں دی گئی تھی۔ یہ انعام ترکی میں ہوا بازی کا سب سے بڑا انعام ہے۔

اتاترک نے پارلیمنٹ میں اپنے اس ارادے کا بذاتِ خود اعلان کیا تھا کہ وہ اُن افسران میں سے چند کی بیٹیوں کو متبنٰی بنانا چاہتے ہیں جو ترکی کی جنگ آزادی میں مارے گئے۔ اتاترک ایسی متبنٰی بیٹیوں کی تعلیم کا انتظام ختم ہونے کے بعد انہیں مناسب کاموں پر لگا دیتے ہیں اور جب کبھی حسب منشا کوئی شوہر مل جائے تو ان کی شادیاں بھی خود ہی کرا دیتے ہیں۔ غازی کی تمام ایسی بیٹیوں میں سے صاحبہ خانم ہی ایک ایسی ہے جس کا تعلق فوج سے ہے۔ انگورہ کی افواہ ہے کہ بہت ممکن ہے کہ صاحبہ خانم کو ایتھنز، بالگریڈ یا بخارسٹ میں کسی سفارتی عہدے پر فائز کر دیا جائے۔

انگلستان کی بے شمار عورتوں نے اپنے آپ کو ہوابازی کی تعلیم کے لئے پیش کیا ہے: تاکہ جنگ کی صورت میں وہ مادرِ وطن کی خدمت کر سکیں۔ انگلستان کی ہوائی فوجوں کے وزیر نے اعلان کیا ہے کہ ہم اس

مرد اور عورت کو جو جسمانی طور پر اس کام کے لائق سمجھا جائے، ایک شلنگ ہفتہ وار پر ہوا بازی کی تعلیم دی جائے گی۔ اس اعلان کے چوبیس گھنٹے کے اندر تمام ملک سے ہوائی کلبوں میں داخلے کے لئے دھڑا دھڑ لوگوں کی درخواستیں آنی شروع ہو گئیں۔ ہوائی وزارت کا مقصد یہ ہے کہ بے شمار مردوں اور عورتوں کو ہوا بازی کی باقاعدہ تعلیم دی جائے اور اٹھارہ سے پچاس سال کی عمر کا ہر شخص اس کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کر سکتا ہے۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ ہوا بازی کی تعلیم ہر خاص و عام کے لئے اتنی آسان ہوئی ہے۔ شوقیہ طیارچی کا لائسنس جس کی عام فیس پچیس سے لے کر پچاس پاؤنڈ تک تھی۔ اب اس نئی تجویز کے ماتحت صرف دو پاؤنڈ دو شلنگ اور چھ پنس کی بے نام رقم کے بدلے میں حاصل ہو سکے گا اور اس کی مدت ایک سال تک ہو گی۔

ہوائی وزارت کے اس اقدام سے ہوا بازی کی تعلیم اور طیارچی کا لائسنس صرف ایک شلنگ ہفتہ وار کی رقم سے حاصل ہو سکتا ہے عمر اور صحت کی قید کے علاوہ ایک شرط اور بھی ہے اور وہ یہ کہ درخواست کنندہ کو اس سلسلے میں کوئی مجبوری نہ ہو گی کہ وہ بحری، بری یا ہوائی فوج میں سے کسی ایک میں لازمی طور پر شامل ہو۔

ہوائی کلبوں میں جو استفسارات کے خطوط سب سے پہلے موصول ہوئے ان میں اچھی خاصی اکثریت عورتوں کی طرف سے تھی اور یہ ایسی عورتیں تھیں جو ہوائی تعلیم کے گراں مصارف کی متحمل نہ ہو سکنے کی وجہ سے اب تک اس طرف رجوع نہ ہو سکی تھیں۔ اس سلسلے میں ایک شرط یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ کسی فوری قومی ضرورت کی صورت میں سیکھنے والے یک دم اپنے آپ کو ملکی خدمت کے لئے پیش کر دیں گے۔ اس بات پر خاص زور دیا گیا ہے کہ یہ تحریک اس شرط کے علاوہ ہر طرح فوجی پابندیوں سے آزاد ہے اور ان نئے سیکھنے والوں کو کسی قسم کی وردی پہننی نہیں پڑے گی۔ ان کا لباس صرف ایک مٹیالی یا سفید عبا پر مشتمل ہو گا اور سینے پر ایک معمولی سا بلا لگانا ہو گا۔ ہر کلب میں پرواز کے اخراجات یکساں ہوں گے۔ ہفتے کے روز معیاری تعلیمی طیاروں کا خرچ دس شلنگ فی گھنٹہ ہو گا اور معمولی جہازوں کا پانچ شلنگ فی گھنٹہ۔ ہفتے کے باقی دنوں میں معیاری جہازوں کا پانچ شلنگ اور دوسرے جہازوں کا دو شلنگ چھ پنس نیز ان ہوائی کلبوں کی رکنیت کی فیس داخلہ دو شلنگ چھ پنس سالانہ سے زیادہ نہ ہو گی۔

لیڈی ریڈنگ نے عورتوں کی ہوائی تعلیم کے پہلے سکول کا افتتاح کرتے ہوئے لندن میں کہا کہ "اب تک ہم عورتیں ہر بات مردوں سے سیکھ سیکھ کر زندگی گذارتی آئی ہیں۔ لیکن اب وہ موقعہ آ گیا ہے کہ عورتیں بھی مردوں کو ایک آدھ ہنر سکھانے کے قابل بن سکیں۔" ان سکولوں میں ہوائی حملوں سے حفاظت کے لئے ہر قسم کی احتیاطی تدابیر بھی سکھائی جائیں گی عورتیں یہ محسوس کرتی ہیں کہ بہت سے ایسے کام ہیں جو ان کے حیطۂ امکان میں ہیں لیکن اب تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ وہ انہیں نہیں کر سکتیں اور اس موقعے پر وہ اپنے متعلق پہلے پرانے عام خیال کو غلط ثابت کر کے دکھا دیں گی۔ عورتیں یہ نہیں چاہتیں کہ وہ معلم بن کر مردوں کو ہر بات سکھانا شروع کر دیں۔ انہیں مردوں سے محبت ہے۔ ان کے دلوں میں مردوں کی جگہ ہے لیکن ایسے کام جنہیں کرنا مرد بھول جاتے ہیں، عورتیں کر سکتی ہیں، کیا کرتی ہیں اور کریں گی۔"

افتتاح کے عین بعد سے ہی تعلیم کا کام بھی جاری کر دیا گیا۔

جرمنی میں شرح پیدائش بے حد کم ہو چکی تھی۔ اس کے خلاف وہاں کی حکومت نے باقاعدہ تگ و دو شروع کی اور اس کام میں اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ حکومت کی طرف سے جہیز دینے سے شرح پیدائش کو بلند کرنے میں بہت مدد ملی۔ اور اس طریقے کے رواج کے بعد ۱۹۳۳ء میں شرح پیدائش نو لاکھ اکہتر ہزار سے ۱۹۳۷ء میں بارہ لاکھ چھہتر ہزار تک پہنچ گئی۔ لیکن یہ جنگ عظیم سے پہلے کی اوسط شرح سے اب بھی کم ہے۔ تب شرح پیدائش اٹھارہ لاکھ سالانہ تھی۔ حکام کو یقین ہے کہ وہ موجودہ شرح کو اور بلند کرنے میں بھی کامیاب ہوں گے۔ خصوصاً انہیں توقع ہے کہ آسٹریا میں ان کے ذرائع زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہوں گے۔

ہٹلر نے اپنے ملک میں اس سلسلے میں صرف ایک "سرکاری جہیز" کی تجویز ہی نافذ نہیں کی۔ اس نے بہت سے ایسے طریقے اختیار کئے ہیں جن سے جرمنوں کو اس بات کا احساس دلانا مقصود ہے کہ ان کے ملک کا مستقبل ملک کے بچوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس طریقے کے ذرائع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر وہ جوان عورت جو کہیں نہ کہیں ملازم ہے۔ اگر شادی کی وجہ سے اپنی ملازمت ترک کر دے تو اسے حکومت کی طرف سے ایک رقم قرض دی جائے گی جو اسی پاؤنڈ تک ہو سکتی ہے۔ اس قرض کا کچھ حصہ نقد دیا جاتا ہے اور باقی تمسکات کی صورت میں تاکہ ان سے نئی جوڑی

اپنے نئے گھر کا سازو سامان خرید سکے۔

حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق اگست ۱۹۳۳ء سے اب تک نو لاکھ پچیس ہزار چار سو پینتالیس ایسے قرضے دیئے گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ قریباً دس لاکھ نوجوان عورتوں نے جرمنی میں اپنی ملازمتیں اوروں کے لئے خالی کرکے اپنے لئے گھر گرہستی کا دھندا پسند بلکہ اختیار کیا۔ پہلے بچے کی پیدائش کے بعد قرض کو بہت حد تک کم کر دیا جاتا ہے اور اگر نئی جوڑی کے ہاں دس سال کے عرصے میں چار بچے پیدا ہو جائیں تو انہیں قرض کی ادائیگی کی کوئی پابندی ہی نہیں رہتی۔ ایسی نئی جوڑیوں کے ہاں جنہوں نے سرکاری قرض سے مناکحت کی زندگی شروع کی تھی۔ اب تک بچوں کی میزان سات لاکھ چوہتر ہزار ایک سو بیس ہے۔ قرض کی اوسط چالیس پاؤنڈ تک تھی۔

یہ چھوٹے چھوٹے قرض حکومت کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے کیونکہ اس طریقے سے ایک تو بیکاری کا انسداد ہوا دوسرے شرح پیدائش بڑھی۔

انہیں تجاویز کے سلسلے میں حکومت اُن کنواروں پر زبردست ٹیکس عاید کرتی ہے جو مناکحت کی زندگی سے احتراز کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایک شخص جس کی سالانہ آمدنی دو سو پچاس پاؤنڈ ہو، اگر وہ کنوارا ہو تو اُسے چھتیس پاؤنڈ سالانہ ٹیکس دینا ہوگا اور اگر شادی شدہ ہو تو صرف سترہ پاؤنڈ سالانہ آٹھ سو پاؤنڈ سالانہ کی آمدنی والا کنوارا مرد ایک سو ساٹھ پاؤنڈ سالانہ ٹیکس دیتا ہے اور اتنی ہی آمدنی والا بیاہا ہوا مرد صرف ایک سو پاؤنڈ سالانہ۔ اس کے علاوہ ہر بچے کی پیدائش پر ٹیکس کم کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اگر کسی گھر میں پانچ بچے ہوں تو اس گھر کو ٹیکس مطلق ادا نہیں کرنا ہوتا۔

غریب گھرانوں کو اپنے بچوں کی پرورش کے قابل بنانے کے لئے بھی حکومت نے قدم اٹھایا ہے۔ اگر کسی گھر کی آمدنی چھ سو چالیس پاؤنڈ سالانہ سے کم ہو تو وہ ہر تیسرے بچے کے لئے سولہ شلنگ ماہانہ اور ہر چوتھے بچے کے لئے ایک پاؤنڈ بارہ شلنگ ماہانہ وظیفہ طلب کر سکتا ہے۔ عوام الناس میں بچوں کے متعلق شعور اور بیداری پیدا کرنے کے لئے پروپاگنڈا کے طور پر برلن شہر کے سب سے زیادہ گنجان علاقے میں حکومت کی طرف سے ایک گھنٹہ آویزاں کیا گیا ہے اور یہ گھنٹہ ہر بارہ منٹ کے بعد گونجتا سنائی دیتا ہے کیونکہ اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ جرمنی میں ہر بارہ منٹ کے بعد ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔

لڑکیوں کو بلوغ سے پہلے ہی اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ زندگی میں ان کا مقصد وسیع گھرانوں کی مائیں بننا ہے۔ جرمن معلموں کے سرکاری آرگن کے تازہ ترین ایڈیشن میں معلموں کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ لڑکیوں کو اس بات کا شعور دلائیں کہ اُن کا فرض ہے کہ وہ بچے جننے کے کام کے لئے اپنے جسموں کو کسی قسم کی تخریب سے آلودہ نہ ہونے دیں اور صحت ور بنائے رکھیں۔ جرمنی میں لوگوں کے لباس اس انداز کے بنائے جاتے ہیں جن میں انسانی جسم بہت آسانی سے حرکت کر سکے اور بہتر سے بہتر لباسوں کے نمونے تیار کرنے کا کام فیشن کے نازی ماہرین کے ذمے ہے۔ ان کے مشوروں اور نصائح کے مطابق یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ جرمنوں کے لباس کس ڈھب کے ہونے چاہئیں۔ نیز وہ پیرس کے نمونوں کی مذمت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان نمونوں کو یہودیوں نے آلودہ کر دیا ہے اور یہ نمونے نسلی طور پر مضرت رساں ہیں۔ کیونکہ ان سے روحانی تنزل ہوتا ہے اور اُن کی نسلی اور قومی خصوصیات مجروح ہوتی ہیں۔

حکومتی پروپیگنڈا کے اثر سے تمام جرمنی کے قصبوں اور دیہات میں لوگ ایسے ذرائع اختیار کرتے ہیں جن سے وسیع گھرانوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ مثلاً ایک قصبے کی میونسپلٹی نے یہ قانون پاس کیا ہے کہ وہ گھرانے جن میں پانچ بچے ہوں اور کرائے کے مکانوں میں رہتے ہوں، صرف گیارہ ماہ کا کرایہ ادا کریں۔ ان کا بارھویں مہینے کا کرایہ میونسپلٹی ادا کرے گی۔ ایک انجمن جس کا نام "ماں اور بچہ" ہے اپنا تمام وقت اور کارگذاری گھرانوں کے بڑھانے میں صرف کرتی ہے۔ ایک اور انجمن نے جس کا نام "زیادہ بچوں والے گھرانوں کی انجمن" ہے ایک اعزازی رجسٹر بنا رکھا ہے جس میں وہ ان گھرانوں کے تمام افراد کے نام اعزاز کے طور پر درج کرتی ہے جن میں بچوں کی کثرت ہو۔ جرمنی کو ایک لازوال اور زبردست قوت والا ملک بنانے کے لئے روزانہ پروپیگنڈے کے نئے سے نئے ذرائع ایجاد کئے جاتے ہیں اور انہیں عمل میں لایا جاتا ہے۔

(باقی اگلے صفحے پر)

جاپان ملک گیری کی شاہراہ پر

ایک سال سے کچھ عرصہ اوپر ہوا کہ پیکن سے چند میل مغرب کی جانب مارکو پولو کے پل پر چینی اور جاپانی افواج کا مخالفانہ اجتماع عمل میں آیا۔ یہ ایک ایسے واقعے کا آغاز تھا جسے اب جاپان والے "چینی معاملہ" کہتے ہیں، اور چین والے "جاپانی حملہ" کہہ کر پکارتے ہیں۔

ٹوکیو کا وزیر اعظم اس بارے میں تو سر مہ در گلو ہے کہ اگر جاپان کی افواج چین میں نہ ہوتیں تو اس مخالفانہ اجتماع کی نوبت ہی نہ آتی، لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ جاپان کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے اس علاقے میں چیانگ کائی شیک نے امن کے راستے میں جو رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں، ان کو دور کیا جائے۔ نیز مشرق کو اشتراکیت کی لعنت سے محفوظ رکھا جائے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جاپان کے لئے امن کا تصور صورتِ حالات کی اُس کیفیت کا نام ہے جب شیر اور بھیڑ یک جا ہوں ——— بھیڑ شیر کے پیٹ میں — پہلے مانچوریا اور پھر پانچ شمالی صوبجات کے متعلق بھی یہی باتیں بنائی گئی تھیں اور کچھ عرصہ ہوا برلن اور روم میں سپین کے مسئلے میں بھی ایسی ہی باتیں سننے میں آئی ہیں جنہیں "بہانہ بسیار" کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہر مثال میں اشتراکیت کے خلاف ہاؤ ہو کے بعد جاپانی افواج کا مغرب کی طرف پیش قدمی کرنا ایک لازمی شرط کی حیثیت سے واقع ہونا رہا ہے۔

چیانگ کائی شیک کو کسی بات کے چھپانے کی ضرورت نہیں نہ کسی سے معذرت کرنے کی حاجت ہے اس نے ہنکاؤ میں اعلان کیا ہے۔ کہ جاپان نے ایک امن پسند قوم کو صبر اور بردانشت کی حد سے کہیں بڑھ کر برانگیختہ کیا ہے اور اُس وقت ہمیں جنگ میں اُلجھا لیا ہے۔ جب ہم اس کام کے لئے قطعی طور پر تیار نہ تھے۔ اب ہم فتح یا اور کسی فائدے کے لئے جنگ نہیں کر رہے بلکہ اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے برسرِ پیکار ہیں۔"

ایک سال کی جنگ کے بعد شمالی چین کے تمام علاقے، منگولیا کے اندرونی علاقے کے بہت سے حصے اور فوچاؤ، سوویٹاؤ اور کینٹن کے علاوہ تمام بڑی بڑی بندرگاہوں پر جاپان کا برائے نام قبضہ ہو گیا ہے اور سوویٹاؤ اور کینٹن کو صفحۂ دنیا سے مٹا دینے پر وہ ایک بہیمانہ تندی سے تلا ہوا ہے۔

اس کے آگے کا علاقہ جس پر جاپان کا قبضہ ہے۔ ہینکو تک دریائے ینگ سی کیانگ کے محیط میں ہے اور چین کے عارضی دارالخلافے (ہنکاؤ) سے ایک سو پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ چھ ہزار میل ریلوے لائن میں سے چار ہزار میل جاپانی قبضے میں ہے۔ کینٹن سے ہنکاؤ اور یُن نان سے ہند چینی تک کی صوبجاتی شاہراہوں کے علاوہ یہ تمام لائنیں ریلوے کی بڑی بڑی اور مرکزی شاخیں ہیں۔

جاپان کو توقع ہے کہ چھ ماہ تک یہ قضیہ ختم ہو جائے گا اور وہ چاہتا ہے کہ جس قدر علاقہ اب تک حاصل کیا ہے۔ فی الحال وہی کافی ہے۔ آئندہ جب از سر نو تیاری ہولے گی تو باقی ماندہ علاقہ بھی حاصل کر لیا جائے گا۔ گذشتہ دو ماہ کے عرصے میں اس مقصد برآری کے لئے لندن، برلن، اور پیرس میں بہت سی پوشیدہ ریشہ دوانیاں کی گئی ہیں۔

اگرچہ اکثر انکار کی نوبت ہی آتی رہی ہے لیکن اب بیقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی، فرانسیسی، جرمن، سویڈن اور سوئیزرلینڈ کے نمایندے صلح کے لئے گفت و شنید کر رہے ہیں اور چینیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لینے میں کوشاں ہیں۔ اور اس تگ و دو کی وجہ یہ ہے کہ برطانیہ، فرانس اور جرمنی بعد از وقت یہ جان چکے ہیں کہ چین میں تجارتی آزادی سے جاپان کا مقصد صرف اپنے لئے تجارتی آزادی ہے۔ کسی اور کے لئے نہیں۔

برطانیہ خصوصاً جاپان کی اس روش سے کلّی طور پر آگاہ ہو چکا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں مانچوریا پر جاپانی قبضے سے اب تک برطانیہ کو اس علاقے میں چھ کروڑ پاؤنڈ کا نقصان ہوا ہے۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ کی آنکھیں کھولنے والے سر ہیو نیچ بل ہیگس ہیں جو چین سے زخمی ہو کر آنے کے بعد سے لے کر اب تک برطانوی وزارت

خارجہ کے ایک ممتاز رکن ہیں۔

صلح کی شرائط پر کافی غور و خوض ہو چکا ہے اور ٹوکیو میں ان شرائط کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔ جاپان کا ارادہ ہے کہ اس ستمبر میں ان شرائط کو ہر خاص و عام پر ظاہر کر دیا جائے کیونکہ اس وقت تک جاپان اپنے خیال کے مطابق ہانکو پر قبضہ پا لے گا۔

لیکن چانگ کائی شیک کا صلح کے بارے میں کچھ اور ہی خیال ہے وہ یہ کہتا ہے کہ چینی اپنے مدافعانہ اقدامات اس وقت تک ختم نہیں کر سکتے۔ جب تک جاپانی افواج ان تمام علاقوں سے دست بردار نہ ہو لیں جن پر انہوں نے گذشتہ ۷ جولائی سے آج تک قبضہ کیا ہے۔ مگر خاص ذرائع سے چانگ کائی شیک کو اس بات پر آمادہ کیا گیا ہے کہ وہ صلح کی ان شرائط پر دوبارہ غور و خوض کرے اور اس پر یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر اُس نے اس معاملے کو دیر تک ملتوی کئے رکھا تو برطانیہ، جرمنی اور فرانس اس معاملے کے متعلق ایک غیر جانبدارانہ کمیٹی مقرر کر دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ان تمام کارفرمائیوں کے پردے میں برطانیہ اور فرانس کی یہ خواہش ہے کہ آہستہ آہستہ چین پر غیر اقوام کا اتنا قبضہ ہو جائے جس سے جرمنی کے نوآبادیات کے مطالبے کا کسی حد تک فیصلہ ہو سکے لیکن ستمبر میں ان شرائط کو طے کرتے ہوئے اس خواہش کو صیغۂ راز میں رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ انہی وجوہات کی بنا پر جاپان نے پچھلے مہینے جرمن مشیر افسروں کو ہانکو سے نکل جانے کے احکام صادر کئے تھے۔

اگر حالات ایسے ہی رہے تو برطانیہ جب بھی مناسب سمجھے گا ان ارادوں کے متعلق ایک انکاری اعلان جاری کر دے گا اور اُس کا یہ اعلان فنی نقطۂ نظر سے درست ہوگا۔ کیونکہ اس وقت صلح کی گفت و شنید کا معاملہ اسی طرح اُن چند ممتاز لوگوں کے ہاتھ میں ہے جس طرح برطانیہ اور اٹلی کے معاہدے کے وقت بھی چند مخصوص لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔

جاپان کی صلح کی طرف اس اشتیاق کے ساتھ مائل ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ جنگ نے غیر متوقع طول پکڑ لیا ہے۔ جس بات کو جاپان ایک معمولی سا قضیہ تصور کرتا تھا اور جسے سر کرنے کے لئے وہ صرف چند فوجی دستوں کو کافی خیال کرتا تھا وہی بات اب اس قدر وسعت اختیار کر چکی ہے کہ اس وقت تک چین کی سرزمین پر جاپان کے دس لاکھ سپاہی مصروف پیکار ہیں اور جنگ کے ختم ہونے سے پہلے اَن گنت اور سپاہیوں کی ضرورت بھی درپیش آئے گی۔

اگرچہ جاپان کے وزیر اعظم نے اپنے ملک کو جنگ کی ضروریات کے مطابق بنا لیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ اگر چانگ کائی شیک صلح پر راضی نہ ہوا تو یہ جنگ کم از کم دس سال اور جاری رہے گی۔ لیکن وہ یہ کہنے سے گریز کرتا ہے کہ جاپان اتنا عرصہ اس جنگ کو جاری نہیں رکھ سکتا ہے۔

جاپانی فوجی مصارف روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ اور اب ان کا اندازہ دس لاکھ پاونڈز روزانہ سے زیادہ ہے۔ لیکن ایک ہی سال کے عرصے میں یہ اخراجات اب سے دُگنے ہو جائیں گے۔

معتبر مفکروں کی رائے ہیں جن میں جرمنی کے جاپان سے نکالے ہوئے مشیر بھی شامل ہیں، اگر چین اسی طرح گوریلا انداز کی لڑائی سے مقابلہ کرتا رہا اور اگر اسلحہ کی درآمد پر کوئی پابندی نہ عاید کی گئی تو دو سال کے اندر اندر جاپانی طاقت ہار ماننے پر مجبور ہو جائے گی۔ گذشتہ سال میں چینیوں کو شکستیں ہوئیں لیکن پچھلے سال کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ چین نے تیر چوانگ کے مقام پر جاپان کی جدید فوج کو ایک عظیم الشان شکست دی۔

چین اور جاپان کی اس جنگ نے قضیہ سپین سے کہیں بڑھ چڑھ کر دنیا کو جنگ کے نئے طریقوں کی وسعت سے روشناس کرا دیا ہے۔ دو سال کے قلیل عرصے میں شنگھائی کا عظیم الشان شہر جس کی آبادی پینتیس لاکھ سے زیادہ تھی خس و خاشاک کا ڈھیر بن کر رہ گیا ہے۔ سابق دارالخلافہ نانکن کی تباہی بمباری اور آتش زدگی کے لحاظ سے ایک بے نظیر حادثہ تھی۔ اور اُس پر جاپانی قبضے کے بعد جو قتل و غارت گری کے منظر دیکھے گئے وہ موجودہ زمانے میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔

جنوبی دارالخلافہ کینٹن میں، جس کی آبادی پندرہ لاکھ تھی صرف تین ہفتوں کی بمباری میں پانچ ہزار شہری موت کے گھاٹ اتار دئے گئے اور اب اس شہر کے غریب محلوں میں زیادہ تر اپاہج اور محتاج لوگوں کی کثرت ہے جن میں بیشتر تعداد بچوں کی ہے۔ دوسرے شہر بھی اسی قسم کے مظالم کا شکار ہوئے ہیں۔

ان مظالم کا چین نے جو جواب دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

چینی طیاروں نے جاپانی علاقوں میں دو بار پرواز کی ہے۔ پہلے فارموسا کے جزیرے پر وہاں انہوں نے دارالخلافہ تھکو پر بمباری کی اور اس سے

صرف آٹھ جانیں ضائع ہوئیں۔ دوسری پرواز میں اتنا خون بھی نہ بہا۔ یہ پرواز جاپان کے مغربی شہروں پر کی گئی۔ جہاں وہ صرف پمفلٹ پھینک کر آ گئے۔

جاپانیوں کے حملوں سے چین کے علاوہ دوسری اقوام کو جو نقصان پہنچا ہے۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔ امریکہ کا اگن بوٹ جس کا نام "پینے" تھا۔ اُسے جاپان نے غرقاب کر دیا اور اُس کے علاوہ تیل سے چلنے والے تین سٹیمر بھی تہ آب کر دیئے جن کی غرقابی میں چھ ملاحوں کی جانیں بھی ضائع ہوئیں۔

بحری کشتی لیڈی برڈ پر ایک برطانوی جہاز ران کو "بیپ" مشین گن سے ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک برطانوی فوجی لاری کو راستے میں تباہ کر دیا گیا۔ برطانوی سفیر زخمی ہوا۔ تجارت کے سلسلے میں غیر اقوام کو جو نقصانات اب تک برداشت کرنے پڑے ہیں ان کا اندازہ بیس کروڑ پاؤنڈ کیا جاتا ہے۔

اگرچہ جاپان کو فتح پر فتح نصیب ہوئی ہے۔ لیکن اس سے چینیوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے کیونکہ چین کے پاس بیش بہا زرخیز زرعی علاقے ہیں اور انہیں تعداد کے لحاظ سے بھی فوقیت حاصل ہے بلکہ جاپانی حملوں سے چین کی پینتالیس کروڑ کی آبادی جو زیادہ تر جنوب اور وسطی علاقوں میں ہے اب وقت کی ضرورت کے لحاظ سے اس قدر متحد ہو گئی ہے جس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی اور اشتراکی اور قومی فوجیں جو پہلے آپس میں برسر جنگ رہتی تھیں۔ اب مل کر دشمن کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

جاپان کا فوجی نقصان پچھلے ہفتے کے اعلان کے مطابق سینتیس ہزار سات سو انتیس مردہ اور ایک لاکھ زخمیوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ زخمیوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا۔ اس کے مقابلے میں ڈیڑھ لاکھ چینی قتل اور مجروح ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اعداد و شمار محض پروپیگنڈے کے نقطۂ نظر سے نشر کئے گئے ہیں۔ حقیقتاً جاپان کا نقصان اس اعلان شدہ نقصان سے زیادہ اور چین کا نقصان کم ہے۔ دوسرے ممالک کے شاہدوں کی رائے میں جاپان کا نقصان جان دو لاکھ سے کسی صورت بھی کم نہیں۔

گذشتہ سال میں جاپان نے چار لاکھ بیاسی ہزار مربع میل علاقہ اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ یہ جاپان کے رقبے سے دگنا ہے۔ اور اس کی آبادی بارہ کروڑ ہے۔ اس علاقے کی لمبان جس میں اس وقت جنگی کارگذاریاں جاری ہیں نیرہ سو میل ہے۔

بسنت سہائے

اردو کے لئے لاطینی رسم الخط

خدا کا شکر ہے کہ اردو زبان باوجود طرح طرح کی مخالفتوں اور ہر ہر قدم پر رکاوٹوں کے روز افزوں ترقی کرتی جاتی ہے۔ اچھے سوچنے اور سمجھنے والے بزرگانِ قوم اس کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں خامیاں اور کمزوریاں چن چن کر دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم سوال اردو کی طباعت کا ہے۔ طباعت کی ترقی میں جو چیز سب سے زبردست رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے وہ لیتھوگرافی یعنی پتھر کی طباعت ہے دنیا میں فنِ طباعت نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہم ان تمام جدید ترین آسانیوں سے فایدہ اٹھائے بغیر اپنی زبان کو ترقی یافتہ زبانوں کی سطح تک نہیں لا سکتے روٹری پریس اور سلف کمپوزنگ مشینوں نے تو گویا پریس کی دنیا میں انقلاب کر دیا اور ہم پتھر کی طباعت کو خیرباد کہے بغیر ان مشینوں سے کسی طرح فایدہ نہیں اٹھا سکتے۔

پتھر کی طباعت میں جو دقتیں ہیں ان کا بار غلط فہمی کی وجہ سے رسم الخط کے سر تھوپ دیا گیا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض لوگوں نے اردو رسم الخط کو بدل دینے کا مشورہ پیش کیا کسی نے ناگری کی مدح سرائی کی اور کوئی لاطینی کی تجویز پیش کرنے لگا۔ میں نے ۱۹۳۱ء میں رسم الخط کے متعلق ایک تفصیلی مضمون رسالہ ندیم میں لکھا تھا اس کے بعد سے سات آٹھ سال کی طویل و عریض مدت میں ناگری، اردو اور لاطینی خطوں پر مختلف حیثیتوں سے غور کرتا رہا۔ رومن رسم الخط میں چھپی ہوئی کئی پرانی کتابیں کتب فروشوں سے حاصل کیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی ابتدا میں کچھ کتابیں رومن رسم الخط میں شائع کی تھیں۔ خوش قسمتی سے یہ کتابیں بھی مجھے مل گئیں۔ اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ اردو کا موجودہ رسم الخط بدل دینے کے بعد ہمارا اب تک کا سارا سرمایۂ ادب عجائب خانوں کی زینت ہو جائے گا۔ میں اپنے غور و فکر کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اردو زبان یہی زبان ہے جو ہندوستان میں رائج ہے تو اس کے لئے موجودہ رسم الخط سے زیادہ بہتر کوئی دوسرا رسم الخط نہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ اردو کا موجودہ رسم الخط اپنے اندر اصلاح کی گنجائش رکھتا ہے لیکن اسے چھوڑ کر ہم دوسرا رسم الخط اختیار کر لیں تو ہماری دقتیں کئی گونہ زیادہ ہو جائینگی کسی زبان کا رسم الخط کبھی اتنا مکمل نہیں ہو سکتا جتنا کہ کوئی مفکر سوچ سکتا ہے۔ اپنے رسم الخط کے ناقص ہونے کی شکایت دنیا کی ہر ایک زبان کو ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کا ہر رسم الخط ناقص ہے۔ بلکہ اردو رسم الخط کی بہ نسبت ناقص تر ہے۔ اگر کوئی شخص ٹھنڈے دل سے غور کرے تو میری طرح اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اردو رسم الخط اصلاح پذیر ہونے کے باوجود دنیا کا سب سے زیادہ مکمل رسم الخط ہے۔

کچھ دن ہوئے کہ میں نے ناگری رسم الخط کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ یہ مضمون جب شائع ہوا تو اربابِ نظر نے اسے پسند کیا اور ۲۰-۲۵ اخبارات و رسائل نے اپنے موقر صفحات میں اسے نقل فرما کر میری قدر افزائی فرمائی۔ ابھی حال ہی میں اس مضمون کو مخدوم و محترم مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے اپنے اخبار صدق میں شائع فرمایا تو ایک ذیلی سرخی میں لاطینی رسم الخط کا ذکر کر دیا اس لئے خیال ہوا کہ لاطینی رسم الخط کے متعلق بھی میں اپنے خیالات کا اظہار کر دوں۔ پچھلے دنوں ہری پورہ کانگرس کے خطبہ صدارت میں بابو سوباش چندر بوس صدر کانگرس نے ہندوستانی زبان کے لئے لاطینی رسم الخط تجویز فرمایا تھا۔ مجھے اس وقت بھی خیال ہوا تھا کہ لاطینی رسم الخط کے متعلق کچھ عرض کر دوں لیکن نہ کر سکا اب اس مضمون میں چاہتا ہوں کہ لاطینی رسم الخط کے بارے میں جو کچھ سمجھ چکا ہوں وہ بہت ہی اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دوں۔ خود ملاحظہ فرما لیجئے کہ اردو کے لئے لاطینی رسم الخط بہتر ہوگا یا نہیں۔

آواز و حروف

خط لاطینی جب کہا جاتا ہے تو اس سے مراد یورپین زبانوں کا

موجودہ رسم الخط ہوتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ لاطینی زبان مدت ہوئی کہ ختم ہوگئی۔ آج دنیا کے کسی حصے میں کہیں بولی نہیں جاتی۔ کہتے ہیں کہ روما کے گرد و نواح میں کوئی قبیلہ لاطین نام کا آباد تھا۔ یہ زبان اصل میں اسی قبیلہ کی زبان تھی۔ رومن سلطنت کی ترقی اور وسعت کے ساتھ پھیلی پھلی اور پھولی۔ رومن شہنشاہیت کے پارہ پارہ ہو جانے کے ساتھ ہی زبان بھی پارہ پارہ ہوگئی اور آج براعظم یورپ کی تمام زبانوں میں لاطینی کے الفاظ پلنے جاتے ہیں۔ لاطینی زبان ختم ہوگئی اب رہی سہی جو کچھ ہیں اس زبان میں رہ گئی ہیں، ان کا یہ حال ہے کہ انگریز انگریزی تلفظ میں پڑھتے ہیں اور فرانسیسی فرینچ تلفظ میں اطالیہ کو اصرار ہے کہ ان حروف کا صحیح تلفظ اطالوی زبان میں ہے اور یونان مدعی ہے کہ صحیح ہم ادا کرتے ہیں۔ ایک حرف علت "O" کو لیجئے۔ انگریز گولائی لئے ہوئے بلند آواز نکالتے ہیں کبھی محض زبر کی اور کبھی ان دونوں سے مختلف محض واؤ ماقبل ضمہ کی لیکن اطالوی کہتے ہیں کہ اس کی صحیح آواز الف مقصورہ کی ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں اس کی یہی آواز رائج ہے اسی طرح حرف V انگریزی میں حرف واؤ کی آواز دیتا ہے۔ اور جرمن میں ف کی۔ H انگریزی زبان میں کبھی ھ کے آواز دیتا ہے اور کبھی بے آواز رہتا ہے مگر اطالوی زبان میں یہ حرف کاف کی ذرا پُر آواز دیتا ہے اس لئے یہ کہنا کہ لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا جائے اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک یہ واضح نہ کر دیا جائے کہ یورپ کی موجودہ زبانوں میں سے آواز کے بارے میں کس کا طریقہ اختیار کیا جائے اور اگر ایسا نہیں تو یہ طے کر دینا چاہیئے کہ ہم اپنی زبان کے لئے حروف کی آوازیں خود متعین کریں گے۔ اس بارے میں کسی زبان کی اتباع نہیں کی جائے گی کیوں کہ لاطینی رسم الخط لاطینی زبان کی آوازیں کھو چکا ہے اور ایک ہی حرف مختلف بولیوں میں مختلف آوازیں دیتا ہے۔

میں سب سے پہلے، پہلی شکل کو لیتا ہوں یعنی اردو کے لئے لاطینی رسم الخط اختیار کرتے ہوئے ہم انگریزی، اطالوی، فرانسیسی، جرمن، اسپینش یا یونانی زبانوں میں سے آواز کے بارے میں کسی ایک کی اتباع کریں۔ مثلاً انگریزی زبان کو نمونہ بنائیں اور اسی پابندی کے ساتھ اردو زبان کو لکھا جائے تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ حروف اور آواز کے درمیان صحیح انطباق بھی رہتا ہے یا نہیں کیونکہ انگریزی زبان میں جتنی آوازیں ہیں اردو زبان میں اس سے کہیں زیادہ آوازیں پائی جاتی ہیں۔ انگریزی زبان میں حروف صحیح کل اکیس ہیں مگر آوازیں چھتیس ہیں۔ باقی تیرہ آوازوں کے لئے مختلف قسم کے مرکبات سے کام لیا جاتا ہے مثلاً ch چ sh ش th ث یا د وغیرہ اور پانچ حروف علت ہیں جن سے سولہ آوازیں پیدا کی جاتی ہیں ان کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہے بلکہ تلفظ کے بارے میں صرف سماعیات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جیسے A، Father، Fan اور Day میں E، Me، Mend اور Here میں I، Tide، Pin اور Machine میں O، Pot، Bold اور Storm میں U، Tube، Put، Tub اور Burn میں، ان آوازوں کو ممتاز کرنے کے لئے تین طرح کے نشانات ڈکشنریوں میں رائج ہیں لیکن U پر چوتھی طرح کا نشان بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ حرف مختلف الفاظ میں چار آوازیں دیتا ہے۔

انگریزی کے تین حروف C، X اور V کی ہمیں ضرورت نہیں لیکن چ کی آواز کے لئے C کو رکھنا پڑے گا۔ اس طرح کل چوبیس حروف ہم کو ملیں گے۔ ان میں غ، خ، ت، ڈ اور د کے لئے پانچ حروف کا اور اضافہ فرمائیے کل (۲۹) حروف ہوتے ہیں ان (۲۹) حروف سے اردو زبان کی تمام آوازیں ادا نہیں ہو سکتیں۔ اردو زبان میں (۸۲) آوازیں ہیں جو ہمارے موجودہ رسم الخط سے مفرد اور مرکب صورتوں میں ادا کی جاتی ہیں اور بعض میں حرکات سے کام لیا جاتا ہے۔ مفرد جیسے با مرکب جیسے بھا اور حرکات سے جیسے آ، بھ، پھ وغیرہ کے لئے تو انگریزی حروف میں بھی H ملا کر مرکب تیار کیا جائے گا۔ مگر حرکات کے لئے رومن تحریر کے نشانات کے بغیر کام نہیں چل سکتا اور اس صورت میں ہم اردو حروف پر اعراب لگانے سے کم دِقت میں نہیں۔ پھر رسم الخط بدلنے سے ہمارا کیا فایدہ ہوا ہم لکھنے پڑھنے اور طباعت میں اس سے کم ٹکڑوں سے کام نہیں لے سکتے۔

اگر رسم الخط بدل کر ٹھیک اسی طرح لکھا گیا جیسا کہ آج رومن تحریر میں لکھا جاتا ہے تو موجودہ رسم الخط کی بہ نسبت زیادہ مشتبہ اور دقت طلب ہے۔ اگر آپ اس کا نمونہ دیکھنا چاہیں تو لاطینی رسم الخط میں چھپی ہوئی کوئی کتاب ملاحظہ فرمائیں ۱۹۲۳ء میں ایک کتاب Animal Management کے نام سے شائع ہوئی تھی اس کا ایک نسخہ اس وقت میرے سامنے ہے اس کتاب کے ص۳۳ پر ایک عبارت اس طرح لکھی ہوئی ہے:۔

Yeh bara chhota bedaul Ya madham hota hai

یہ بڑا چھوٹا بے ڈول یا مدھم ہوتا ہے

اسی کتاب میں مندرجہ ذیل الفاظ اس طرح لکھے ہوئے ہیں:-

Ghaur Khub Chhub Abdulhai

غور خوب چھب عبدالحی

Zakham Kharab Ghora

زخم خراب گھوڑا

اس سے قطع نظر کرکے کہ مندرجہ بالا تحریر میں جگہہ، محنت اور وقت زیادہ صرف ہوا ہے صرف اس بات پر غور فرمائیے، کہ آوازیں تمام ادا ہوگئیں یا نہیں؟ اور التباس لفظی کی کتنی گنجائش رہتی ہے۔ ت ٹ، د ڈ، ر ڑ، کھ خ، واؤ ماقبل ضمہ اور صرف ضمہ سب ایک دوسرے سے مل گئے۔ نام عبدالحی کو اس طرح لکھا گیا کہ جملہ خبریہ "عبدل ہے" اور نام عبدالحی میں کوئی فرق باقی نہ رہ سکا۔

اگر اردو کے لئے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کا یہی مطلب ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا پڑھنا تو غیر اردو داں، بلکہ اچھے اردو داں کے سوا دوسروں کے لئے بہت زیادہ مشکل ہے۔ مندرجہ بالا کتاب ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر ہر صفحہ بلکہ ہر سطر پڑھنے کے لئے اردو کے الفاظ و معنی کا یاد رہنا ضروری ہے

دوسری مشکل یہ ہے کہ حروف و آواز میں تطابق ہم خود قایم کریں کسی دوسری زبان کی آوازوں کا خیال ہی نہ آنے دیں تو اس کے لئے لاطینی رسم الخط کی ہی کیا تخصیص ہے۔ چینی و جاپانی عبری و سریانی خطوں سے بھی یہی کام لیا جاسکتا ہے جن میں لاطینی حروف کی طرح التباسات نہ ہوں۔ لیکن واضح رہے کہ ہم جو خط بھی بنائیں گے۔ ان کے حروف کی تعداد ۸۲ سے کم نہیں ہوسکتی۔ اس کے بعد تعلیم و تحریر وغیرہ میں جو دقتیں ہوں گی وہ ظاہر ہیں۔

دنیا کی کسی زبان کی آوازوں پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ آوازوں کی ابتدائی اور بڑی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو حروف صحیحہ کی آواز کہلاتی ہے جیسے ب، پ یا B ، P وغیرہ کی آوازیں دوسری وہ آوازیں جو جوف دہن سے نکالی جاتی ہیں اور حروف علت کی آوازیں کہلاتی ہیں۔ جیسے اَو، اُو، اِی، اَے، آ وغیرہ حروف صحیحہ کی آوازیں مخرج کی کسی نہ کسی جگہہ سے شروع ہوتی ہیں لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ان کو دوسری قسم کی آوازوں سے ملائے بغیر ادا کیا جاسکے۔ ان کی ادائی دو طرح پر ہوتی ہے اول حرف علت کی آواز سے شروع ہوکر حرف صحیح پر ختم ہوتی ہے جیسے اَب، آب وغیرہ دوسری طرح حرف صحیح سے شروع ہوکر حرف علت پر ختم ہوتی ہے۔ جیسے بَ، با وغیرہ

اب ذرا غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ مختلف زبانیں صحیح حروف کی آوازوں میں بہت زیادہ اختلاف رکھتی ہیں مثلاً ع، ح، ض، ظ وغیرہ آپ کو آرین گروپ کی زبانوں میں نہیں ملتے اسی طرح پ، چ، ژ، گ، ٹ، ڈ، ڑ آپ سامی زبانوں میں نہیں پاسکتے مگر جوف دہن سے پیدا ہونے والی آوازوں یعنی حروف علت کے معاملے میں کم و بیش تمام زبانیں برابر ہیں۔ سب کے ہاں معمولی اختلاف کے ساتھ یہ آوازیں پائی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ رسم الخط کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے حروف صحیحہ کی کمی بیشی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ کوئی زبان اپنے ان حروف میں اختصار نہیں کرسکتی، چار و ناچار ان حروف کو رکھنا ہی پڑے گا۔ مثلاً اردو کے لئے اگر آپ لاطینی رسم الخط اختیار کرلیں تو بھی نون غنہ کے لئے آپ کوئی نہ کوئی نشان بنانے پر مجبور ہیں رسم الخط میں تمام تر اہمیت ان ہی حروف علت اور ان کی آوازوں کو دی جاتی ہے کہ تمام دوسرے حروف کی آوازوں کی ادائی کا دارومدار ان حروف کی آوازوں پر ہے۔

ان حروف کے لئے مختلف خطوں میں مختلف قاعدے بنائے گئے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے کسی زبان کا قاعدہ بھی پوری طرح مکمل و درست نہیں بعضوں نے اس کے لئے حروف مقرر کئے ہیں جیسے لاطینی رسم الخط میں پانچ واولز (VOWELS) لیکن دقت یہ پڑتی ہے کہ ان حروف سے ہر ایک سے کئی کئی آوازیں پیدا کئے بغیر کام نہیں چلتا بلکہ بڑی حد تک سماعیات اور تقالید پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ حرف (U) Tube، Put اور Barn میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف آوازیں دیتا ہے اور اس اختلاف کے لئے کوئی کلی قاعدہ موجود نہیں بعض خطوں میں ان کے لئے نشانات مقرر کئے گئے ہیں جیسا کہ ناگری میں ہے لیکن ان میں بھی وہی دقت پیدا ہوتی ہے۔ نقوش آواز کا اور آواز نقوش کا ساتھ نہیں دیتی۔ تلنگی۔ کنڑی، ملیالم اور برمی میں بھی یہی۔ اور سب سے کم بری شکل یہی رہ جاتی ہے کہ ان آوازوں میں سے موٹے موٹے فرق کے لئے تو نشانات مقرر کرلئے جائیں اور اس کی پابندی کی جائے کہ نقوش اور آواز کی ترتیب میں فرق نہ ہونے پائے۔ باقی اختلافات کے لئے کسی حد تک سماعیات پر بھروسہ کیا جائے اس میں کئی طرح کے فایدے ہیں۔ لکھنے اور پڑھنے میں محنت کم صرف ہوتی ہے۔ کاغذ اور قلم کی خدمت بھی

نسبتہً کم رہ جاتی ہے۔ اس وقت یہی طریقہ تمام ان زبانوں میں رائج ہے جو سامی خط میں لکھی جاتی ہیں مثلاً عبری، آرامی، سریانی، عربی، اردو، فارسی پشتو، کمک، کردی، ملائی۔ نوبین وغیرہ۔

تعلیم

بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاطینی حروف مفرد صورت میں لکھے جاتے ہیں۔ اس لئے اس کی تعلیم اردو حروف کی تعلیم سے زیادہ آسان ہوگی۔ اور یہ آسانی ہوگی کہ بچوں کو بہت ہی کم شکلیں یاد کرنی پڑیں گی حالانکہ واقعہ اس کے بالکل برخلاف ہے اگر اردو کے لئے لاطینی رسم الخط اختیار کرلیا گیا تو بچوں کو اردو مفرد حروف اور جوڑوں سے کہیں زیادہ اشکال یاد کرنی پڑیں گی۔ اس وقت لاطینی حروف کی تعداد (۲۶) ہے ان میں کم سے کم غ، خ، ح، ت، ڑ، د، ش سات حروفوں کا اضافہ کیجئے تو ان کی تعداد (۳۳) ہوگی تین حروف v، c اور x ہمارے لئے بے کار ہیں ان کو نکال دیجئے باقی رہ گئے (۳۰) ان میں حروف علت کے (۱۴) نشانات کا اضافہ کیجئے، کل (۴۴) اشکال ہوئیں۔ ہر ایک کے چھوٹے Small اور بڑے Capital حروف ہوں گے (۹۲) شکلیں ہوگئیں، اس کے بعد لکھنے کے حروف اور ہوں گے اور طباعت کے اور، تو یہ تعداد (۱۸۴) ہوتی ہے۔ ہر ہندوستانی بچے کو ۱۸۴ شکلیں حروف کی یاد کرنی پڑیں گی۔ پھر یہ شکلیں ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوں گی کہ آپ یکسانی کا خیال بھی نہیں کرسکتے D اور d، G اور g میں جو اختلاف ہے وہ دیکھ لیجئے۔

آپ کسی بچہ کو اردو قاعدہ پڑھادیں اس کے بعد کوئی خوش خط لکھی تحریر دے دیں، صاف پڑھ دیگا لیکن اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہیں عمروں کے تفاوت کو خیال میں رکھنا چاہئے کہ بڑی عمر کے افراد انگریزی حروف اگر آسانی سے سیکھ سکتے ہیں، اردو حروف اس سے کہیں زیادہ آسانی سے سیکھ لیتے ہیں، اردو کے حروف کے جو جوڑ استعمال ہوتے ہیں ان میں شاید ہی کوئی ایسا جوڑ ہو جو اپنے اصل مفرد حرف سے بہت زیادہ مشابہت نہ رکھتا ہو۔ اس کی وجہ سے یاد کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ اس کے ماسوا اردو حروف کی شکلوں میں نمایاں یکسانی پائی جاتی ہے، ج، ح، خ، ب، پ، ت، ٹ، ث وغیرہ میں دیکھ لیجئے۔ یہ یکسانی تعلیمی نقطۂ نظر سے بڑی گراں قدر چیز ہے، حافظہ پر بہت ہی کم بار ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے اور بچہ آسانی سے حروف کی شکلیں یاد کرلیتا ہے۔ اس کے برخلاف لاطینی رسم الخط میں اس قسم کی یکسانی آپ نہیں پاسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے اردو حروف کو انگریزی حروف کی بہ نسبت جلدی اور آسانی سے یاد کرلیتے ہیں۔

میں نے کچھ دنوں خوشنویسی کی مشق کی ہے اور اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں انہیں بھی دیکھا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ صرف چار طرح کی متناسب لکیروں اور تین قسم کے نقطوں سے اردو کے سارے حروف بن جاتے ہیں۔ مسٹر ایشور چندر او دیا ساگر مشہور بنگالی معلم نے اپنی کتاب میں انگریزی حروف کی مشق کے لئے اسی طرح کے خطوط سے کام لینا چاہا مگر کامیاب نہ ہوسکے (۱۹) قسم کے خطوط قائم کرنا پڑے مگر پھر بھی اس کے ذریعے انگریزی کے تمام حروف کی مشق ممکن نہ ہوسکی۔

لاطینی حروف میں ایک بات یہ بھی تعلیمی اعتبار سے قابل لحاظ ہے کہ ان کی شکلیں اردو حروف کی بہ نسبت زیادہ الجھی ہوئی ہیں، جو یاد رکھنے میں خاصی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔ ش اور sh، ز z، گ اور g میں جو فرق اس اعتبار سے ہے، ملاحظہ فرمالیجئے۔

طباعت

طباعت کی آسانیوں کا خیال کرکے لاطینی رسم الخط اختیار کرلئے جانے کی تجویز جب پیش کی جاتی ہے تو پیش کرنے والے احباب کی نیتیں خیر کی ہوتی ہیں، اور وہ دل سے چاہتے ہیں کہ انگریزی طباعت کی طرح اردو میں بھی طباعت کا کام آسان ہوجائے اور اردو زبان کی ترقی میں اس کا جو ہاتھ ہوگا وہ ظاہر ہے، لیکن اس مسئلے پر بھی غور کرلینا چاہئے کہ حروف کی تعداد اردو کے لئے اتنی ہی نہیں رہے گی جتنی انگریزی زبان کے لئے مستعمل ہے۔

اردو کا پریس بلاشبہ بہت ہی بری حالت میں ہے۔ جدید ترین آلات طباعت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ اردو کا رسم الخط نہیں بلکہ لیتھو کی طباعت ہے۔ پتھر کی طباعت کو چھوڑ دیجئے۔ نسخ ٹائپ خوبصورت سے خوبصورت ہر طرح کے دنیا میں تیار ملتے ہیں خود ہندوستان میں بھی بیسیوں جگہ تیار ہوتے ہیں ان سے فائدہ اٹھائیے ساری دقتیں ختم ہوجائیں گی، لینوٹائپ، انٹرٹائپ، روٹری پریس سب کچھ آسانی سے تیار ہوسکتے ہیں، اس کے لئے رسم الخط بدلنے کی ضرورت نہیں، مصر کو دیکھئے پریس نے کس قدر ترقی کرلی ہے۔ مصور اخبارات و رسائل، ۱۲، بلکہ ۱۸ بڑے بڑے صفحات کے روزنامے ہزاروں سے متجاوز تعداد میں چھپتے ہیں۔ اسی عربی رسم الخط میں تمام جدید سے جدید آلات طباعت سے کام لیا

جارہا ہے۔ اسی طرح جاپانی پریس کی حالت پر غور فرمائیے۔ غور! ایشیا ہے۔ رسم الخط ناقص ترین۔ مگر لاطینی رسم الخط اختیار کئے بغیر فنِ طباعت نے وہاں اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایشیا تو ایشیا یورپ کے بھی کم ممالک مقابلہ میں پیش کئے جاسکیں گے۔

اردو طباعت کے متعلق شکایت ہے کہ دو چار ہزار فرمے نکالنے کے بعد حروف چھن جاتے ہیں۔ بڑی تعداد میں کچھ چھاپنا ممکن نہیں، تصحیح اچھی طرح نہیں ہوسکتی، کہیں پر سے کوئی سطر یا پیراگراف نکالنا ہو تو آسانی کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ تصاویر مضامین کے ساتھ نہیں چھپ سکتیں۔ جلد کتابت نہیں ہوتی۔ کتابت میں یکسانی نہیں رہتی۔ سلف کمپوزنگ مشینوں سے فایدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، ان شکایتوں پر غور فرمائیے۔ شکایتیں بالکل درست ہیں لیکن ان کا بار پتھر کی چھپائی پر پڑنا چاہیئے نہ کہ رسم الخط پر، رسم الخط کا اس میں کوئی قصور نہیں، اگر لاطینی رسم الخط کو بھی آپ لیتھو سے چھاپیں تو یہی دقتیں رہیں گی اگر اردو کے لئے نسخ اردو ٹائپ کی طباعت اختیار کر لی جائے تو لاطینی حروف کی بہ نسبت زیادہ کارآمد اور مفید ہوگی، نسبتہً سستی بھی پڑے گی، کاغذ کم صرف ہوگا، کمپوزیٹر کو کام کم کرنا پڑے گا، مثلاً ایک لفظ "بشیر" کو دیکھیے اس کے لئے اردو میں کمپوزیٹر کو چار مرتبہ ہاتھ چلانا پڑے گا

د. | شد | ید | و

مگر لاطینی میں سات بار حروف اٹھانا ہوگا

B | A | S | H | E | E | R

ظاہر ہے کہ محنت اور کاغذ زیادہ صرف ہوگا۔ اور کتاب گراں پڑے گی۔

میں نے ایک مشہور پریس سے ایک رسالہ کی طباعت کے متعلق اخراجات کا تخمینہ طلب کیا تھا اور لکھا تھا کہ رسالہ اردو ٹائپ میں طبع کیا جائے تو اخراجات کیا ہوں گے اور اگر اسی لاطینی (رومن) میں چھاپا جائے تو کیا خرچ ہوگا؟ معلوم ہوا کہ اردو ٹائپ کی بہ نسبت رومن میں ۳۷ فی صدی اخراجات بڑھ جائیں گے۔ کچھ تو کاغذ زیادہ صرف ہوگا، اور کچھ اجرت تسطیر حروف (کمپوزنگ) زیادہ ہوگی۔ تسطیر کی اجرت کارندہ کی کارگزاری پر ہوتی ہے، اور جو عبارت اردو کے ایک صفحہ میں آتی ہے، وہ رومن کے تقریباً دو صفحات میں آئے گی۔ چونکہ انگریزی حروف کی اجرت تسطیر نسبتہً کم ہوتی ہے اور یہ اردو کی زیادہ اس لئے اضافہ صرف ۳۷ فی صدی ہوا ورنہ کہیں اجرتیں اگر برابر ہوتیں تو لاگت تقریباً ۷۵ فی صدی بڑھ جاتی۔ اس کمی بیشی کا خیال رکھتے ہوئے غور فرمائیے کہ ہمارے لئے تجارتی حیثیت سے کونسا رسم الخط مفید ثابت ہوگا اور کس میں کتابیں سستی تیار ہوسکیں گی؟

عام ضروریات

عام ضروریات تمدن کا لحاظ کرتے ہوئے بھی کسی رسم الخط پر غور کیا جانا چاہیئے۔ مثلاً رسم الخط میں یہ ضرور دیکھنا چاہیئے کہ تیزی کے ساتھ لکھا اور پڑھا جاسکتا ہے یا نہیں، آپ کو معلوم ہے کہ مختصر نویسی کی ابتدا صرف اسی ضرورت کی بنا پر ہوئی۔

کسی خط کے لکھتے وقت قلم کو جتنا زیادہ کام کرنا پڑے گا، اتنا ہی زیادہ وقت، محنت اور کاغذ صرف ہوگا۔ دنیا میں مختصر نویسی کی بنیاد اسی اصول پر ہے اور ہمیشہ مختصر نویسی میں بڑے بڑے الفاظ تک کے لئے چھوٹے سے چھوٹے نقوش بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو اور لاطینی رسم الخط کا اس حیثیت سے مقابلہ کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، ہر وہ شخص جو دونوں رسوم الخط سے واقف ہے اچھی طرح جانتا ہے کہ لاطینی حروف زیادہ جگہ، زیادہ محنت اور زیادہ وقت لیتے ہیں اس لئے کہ اردو کی بہ نسبت لاطینی حروف لکھنے میں قلم کو دوگونہ خدمت انجام دینی پڑتی ہے مثال کے طور پر رسالہ "ادبی دنیا" کے نام کو دیکھیے۔ "ادبی دنیا" ADABI DUNYA

عام ضروریات کے سلسلہ میں ایک سوال ہندوستان کے ہمسایہ ممالک سے تعلقات کا بھی آتا ہے۔ ہندوستان کے ہمسایہ ممالک میں سے اکثر میں عربی رسم الخط رائج ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ بابو سوبھاش چندر بوس صدر کانگرس نے اپنے خطبہ صدارت میں اسی بات کو لاطینی رسم الخط اختیار کئے جانے کی دلیل میں پیش فرمایا، آپ نے ہری پورہ کانگرس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں بہرحال اپنے گرد و پیش کے ممالک سے تعلقات قایم کرنا ہے۔ اس لئے لاطینی رسم الخط اختیار کرلینا چاہیئے۔

مجھے اس سے اتفاق ہے کہ ہمسایہ ممالک سے مادی و معنوی، تجارتی و اقتصادی تعلقات کو ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ بہرحال ہمیں ایک زندہ قوم کی طرح زندہ رہنا ہے، اور زندہ قومیں دوسرے ممالک سے ہر زمانہ میں بہت کچھ لیتی دیتی رہتی ہیں۔ سینکڑوں الفاظ، بیسیوں قواعد، ہزاروں عادات اور لاکھوں قسم کی اشیاء تجارت اسی طرح منتقل ہوتی رہتی ہیں، کوئی قوم اپنے ہمسایہ ممالک سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ غرض یہ ہے کہ ہندوستان کے گرد و پیش کے وہ کونسے ممالک ہیں جہاں لاطینی رسم الخط رائج ہے، شام میں، عراق میں، لبنان میں، ایران میں، افغانستان میں، سواحل خلیج فارس میں، تبت میں، چین و جاپان میں، یہی وہ ممالک ہیں ہندوستان کے قریب ترین ممالک کہے جاسکتے ہیں، ان میں سے کہیں بھی لاطینی رسم الخط رائج نہیں بلکہ اکثر جگہ عربی رسم الخط جاری ہے۔

بلاشبہ اس وقت تمدن کا مرکز یورپ ہے، اور یورپ کا رسم الخط

لاطینی ہے، لیکن افریقہ و ایشیا کے آزاد و نیم آزاد ممالک میں وطنی احساسات جس تیزی کے ساتھ انقلابات پیدا کر رہے ہیں وہ سب جانتے ہیں۔ ایران نے فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں کا استعمال قلمرو میں ممنوع قرار دیا۔ مصر میں دوسری زبانوں کا استعمال دفاتر میں ممنوع ہے۔ حتیٰ کہ نہر سوئز کے دفتر کو بھی عربی میں مراسلات کرنے پر مجبور کیا گیا۔ عراق میں دفاتر سے دوسرے حروف و زبان رخصت کر دی گئی، شام و لبنان میں عربی کے علاوہ دوسری زبان کو تسلیم نہیں کیا جاتا، یہی حال افغانستان کا ہے کہ سرکاری طور پر فارسی کے سوا دوسری زبان مسلّم نہیں۔ حبشہ کی سرکاری زبان عربی قرار پائی طرابلس برقہ، سمالی لینڈ میں پہلے ہی سے تھی غرض کہ تمام وہ ممالک جہاں عربی رسم الخط رائج ہے۔ لاطینی کو ید کر رہے ہیں، ہم سے قریب ترین بر اعظم افریقہ ہے۔ جہاں کا عمومی رسم الخط عربی ہے۔ ایشیا میں شمالی مشرق ایشیا کے علاوہ تمام عربی رسم الخط رائج ہے، روس کے ایشیائی مقبوضات کے بڑے حصے میں یہی رسم الخط ہے۔ اس وقت مندرجہ ذیل زبانیں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔

عربی، فارسی، اردو، پشتو، بلوچی، سندھی، امہری، کریمی، ہوسنہ، جاوی، قازانی (روس)، کمک، کردی، ملائی، بینڈنیگو، نوبین اور نوگائی۔

ان میں سے ایک عربی ہی لیجئے، مغربی ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ پر چھائی ہوئی ہے۔ ان ممالک میں یوروپین کمپنیاں بھی ہیں لیکن اشتہارات اور مقامی کاروبار عربی میں کرتی ہیں۔ اس لئے ہمارا یہ خیال صحیح نہیں ہو سکتا کہ لاطینی حروف اختیار کر لینے سے ہمسایہ ممالک سے تعلقات قایم کرنے میں ہمیں آسانی ہو گی۔ بلکہ اس حیثیت سے تو موجودہ اردو رسم الخط کا باقی رکھنا ہی سب سے بڑی دانائی ہو گی۔

عبدالقدوس ہاشمی ندوی

غزل

یاد آتا ہے وہ جانِ تمنا کئی دن سے
رہتا ہوں میں افسردہ و تنہا کئی دن سے

دامانِ نظر رشکِ گلستانِ اِرم ہے
آنکھوں میں ہے وہ چہرۂ زیبا کئی دن سے

ہم خاک تسلی دلِ مہجور کو دیں گے
اُس نے تو کوئی خط بھی نہ بھیجا کئی دن سے

وہ بھولے ہوئے قصے، وہ راتیں۔ وہ جوانی
ہے دل میں مرے حشر سا برپا کئی دن سے

پھر میرے تخیل کی فضائیں ہیں منوّر
یاد آتا ہے وہ شاہدِ رعنا کئی دن سے

...ادہ دلی تیری نسیم اُف رے قیام...
ہے منتظرِ وعدۂ فردا کئی دن سے

نسیم

او میرے پردیسی پریتم!

او میرے پردیسی پریتم!
کیا پھر وہ شام نہ آئے گی!

جس شام کے مست دھندلکوں کے آغوش میں ہم تم ملتے تھے
بستی سے پرے ویرانے میں دو پھول دلوں کے کھلتے تھے
ایک ایک نظر کی جنبش پر سر جھکتے تھے، دل ہلتے تھے
کچھ زخموں کے منہ سلتے تھے کچھ تازہ چھالے چھلتے تھے

او میرے پردیسی پریتم!
کیا پھر وہ شام نہ آئے گی؟

جس شام کے کالے دامن سے پُرنور فوارے گرتے تھے
آنکھوں سے شراب چھلکتی تھی نظروں سے تارے گرتے تھے
سینوں میں قصر امیدوں کے بن بن کر سارے گرتے تھے

او میرے پردیسی پریتم!
کیا پھر وہ شام نہ آئے گی

وہ شام، کہ جس کے نشہ میں ہم دونوں چُور سے رہتے تھے
نظریں سرشار سی رہتی تھیں سینے مخمور سے رہتے تھے
روحیں شاداب سی ہوتی تھیں چہرے پُرنور سے رہتے تھے

ماتھوں پر چاند چمکتے تھے اور دل مغرور سے رہتے تھے

او میرے پردیسی پیتم!
کیا پھر وہ شام نہ آئے گی؟

وہ شام کہ جس کا نظارہ پلکوں کے تلے ہی رہتا تھا
کچھ نجمہ مجھ سے کہتی تھی کچھ میں نجمہ سے کہتا تھا
اس کی شرمیلی باتوں سے ہاں، جیون امرت بہتا تھا

او، میرے پردیسی پیتم!
کیا پھر وہ شام نہ آئے گی

دیہات کے حسن مکمل کی اک دیوی بن کر آتی تھی
کچھ پیارے پیارے بول تھے جو وہ ہولے ہولے گاتی تھی
میں اس کے نغمے گاتا تھا وہ میرے گیت سناتی تھی
اور اپنے میٹھے گیتوں سے وہ مجھ پر چھائی جاتی تھی

او، میرے پردیسی پیتم!
کیا پھر وہ شام نہ آئے گی

کیا اب پردیس نہ چھوٹے گا کیا اب تم دیس نہ آؤ گی؟
جہلم کی ٹھنڈی ریتوں پر پھر پریت کے گیت نہ گاؤ گی؟
نجمہ کیا دیس نہ آؤ گی نجمہ کیا دیس نہ آؤ گی؟

او، میرے پردیسی پیتم!
کیا پھر وہ شام نہ آئے گی؟

سید ضمیر جعفری

یادِ ایام

بسر کرتے تھے مل کر زندگی عیش و مسرت میں
خدنگِ کینہ و جورِ فلک سے بے خطر دونوں

خمستانِ محبت میں رہینِ سرگرانی تھے
جوانی کے سرابستان میں تھے آشفتہ سر دونوں

سرورِ سرمدی میں ہوش تن من کا نہ تھا باقی
نشاطِ بے خودی میں محو تھے ہم اس قدر دونوں

بہک جاتا تھا میں جب مدھ بھری آنکھوں کی مستی سے
ہنسا کرتے تھے فرطِ شوق سے دل کھول کر دونوں

ہمارا ہر نفس تجدید تھا عہدِ محبت کی
جدائی کی مصیبت سے مگر تھے بے خبر دونوں

یہی دل اور جگر تھے ایک دن راحت کے گہوارے
مگر خوں ہو چکے ہیں آہ اب دل اور جگر دونوں

مری آنکھوں کی ویرانی کا باعث پوچھتے کیا ہو
کسی کی موت نے برباد کر ڈالے ہیں گھر دونوں

اِدھر برگشتہ قسمت میں اُدھر وہ جانِ محبوبی
جہانِ آب و گل سے کاش کرتے ہم سفر دونوں

نذیر احمد خاں غوری ایم اے

روس کا ملک الشعرا

پشکن

روس کے گزشتہ سیاسی انقلاب نے پرانے نظام کو بے طرح درہم برہم کر دیا۔ نہ صرف حکومت اور سماج میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہو گئی بلکہ ادب پر بھی اس کا ایک گہرا اثر پڑا۔ ظاہر ہے کہ جب زندگی کے ہر شعبے میں پہلی بات نہ رہی تو شاعری اس سے مستثنےٰ کیونکر رہتی۔ چنانچہ جدید رجحانات کے لحاظ سے مقبول ترین شاعر الگزانڈر بلاک ہے۔ لیکن اس سے یہ ہرگز نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ شعرا میں پشکن کا درجہ کچھ کم ہو گیا۔ وہ بھی اپنے زمانے کا ایک زبردست باغی اور انتہا پسند تھا۔ روسی ادب کے دوسرے سنہری دور میں جو نئی روح اس نے پھونکی اس کی وجہ سے اس کا رتبہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ پشکن کی شاعری کا ستارہ افق ادب پر انقلاب فرانس کے بعد نمودار ہوا۔ روسی شاعری کے اس وقت دو گروہ تھے۔ ایک قدامت پسند اور دوسرا انتہا پسند۔ پشکن بہت جلد ہی نئی تحریکات کا علمبردار بن گیا۔ پشکن کی ادبی تخلیق کے تین بڑے پہلو ہیں۔ شاعری۔ ڈرامہ اور مکتوب نویسی۔ لیکن اس وقت ہم اس کی شاعری سے ہی بحث کریں گے اور شاعری بھی صرف بزمیہ۔ مگر سب سے پہلے ضروری ہے کہ اس پرجوش، سرکش اور رومانوی شخصیت کے سوانح پر ایک چھچلتی ہوئی نظر ڈال لی جائے

پشکن ۲۶ مئی ۱۷۹۹ء کو ماسکو میں پیدا ہوا وہ ایک قدیم گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اسے افریقہ کا حبشی خون ورثے میں ملا تھا۔ کیونکہ اس کی پرنانی پیٹر اعظم کے حبشی ملازم ہنی بال کی بیٹی تھی۔ نو سال کی عمر تک اس میں ہونہار بروا والی کوئی بات نظر نہ آئی۔ لیکن اس کے بعد سے اسے مطالعے کا ایک ایسا زبردست شوق پیدا ہوا جو تمام عمر اس کا دامنگیر رہا۔ پشکن کا حافظہ غضب کا تھا کیمرے کی طرح اس کا ذہن ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو اپنی گرفت میں لے آتا۔ اس لئے جو کچھ بھی وہ پڑھتا اس کے ذہن پر ایک مستقل نقش کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ شروع شروع میں وہ فرانسیسی میں لکھے ہوئے ناٹک ڈرامے اپنی بہنوں کو پڑھ کر سناتا رہا۔ یہی اس کی اولیں ادبی کارگزاری تھی۔ سنہ ۱۸۱۱ء میں اسے سینٹ پیٹرسبرگ کے نواح میں زار سکو سیلو کے سکول میں بھیجا گیا۔ سکول کا زمانہ اس کی ذہانت کے لحاظ سے کوئی قابل ذکر دور نہیں ہے۔ مدرسے کے سرٹیفکیٹ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ لیکن اس زمانہ تعلیم میں اس نے اپنے مطالعے کا شوق پوری شدت کے ساتھ جاری رکھا۔ اس زمانے میں اس کا محبوب شاعر مشہور فرانسیسی ادیب والٹیر تھا۔ اس نے اپنی شاعری کا آغاز پہلے فرانسیسی اور پھر روسی زبان میں کیا اور اپنی زمانہ طالب علمی میں لکھی ہوئی نظموں کو بعد میں کلیات میں بھی شامل کر لیا۔ یہ ابتدائی کلام اگرچہ کوئی خاص درجہ نہیں رکھتا، اس کے باوجود اس سے ایک نئے اور قابل توجہ انداز کا اظہار ہوتا ہے۔ نہ صرف اس کے ہمعصروں بلکہ اس زمانے کے مشہور روسی ادیبوں نے بھی اس کی ذہانت اور جودت طبع کو پہچانا۔ انہوں نے گلستان ادب کے اس نئے رنگیں نوا طائر کا پرجوش استقبال کیا اور اس لئے پشکن کو نہایت آسانی کے ساتھ شہرت حاصل ہو گئی۔ سنہ ۱۸۲۰ء میں اس نے اپنی نظم "رسلان اور لڈمیلا" شائع کی اور یہ خاص و عام میں یکساں مقبول ہوئی لیکن عوام کی قبولیت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اسے اپنے زمانے کے چوٹی کے ادبا کی پسندیدگی حاصل تھی۔ طالب علمی کی زندگی کو خیرباد کہنے کے ساتھ ہی پشکن کو ادبی حلقوں میں ایک امتیازی رتبہ حاصل ہو گیا

۱۸۱۷ء میں سکول چھوڑنے کے بعد سے ۱۸۲۰ء تک پشکن سینٹ پیٹرسبرگ کی عشرت پرست زندگی میں ڈوب گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ فوج میں شہسواری کا عہدہ حاصل کرے لیکن اس کے لئے اس کا باپ

تیار نہ تھا۔ اس لئے اُس نے اپنا تقرر وزارتِ خارجہ کے دفتر میں کرالیا لیکن اس نے اپنے احباب کے انتخاب میں ناعاقبت اندیشی سے کام لیا۔ وہ اپنے وقت کے آزاد سیاسی خیالات رکھنے والوں سے ملتا رہا۔ ایسی صحبت کا نتیجہ اس کے حق میں بہت بُرا ثابت ہوتا لیکن روسی ادب کی خوش قسمتی ہے ۱۸۲۰ء میں وزارت خارجہ کے دفتر سے اُس کا تبادلہ جنوبی روس کی طرف کر دیا گیا یوں چھ سال تک اُسے حکومت کی طرف سے مختلف مقامات پر رہنا پڑا۔ آخر ۱۸۲۴ء میں اُسے سکوف کے مقام پر جو اس کی جاگیر میں شامل تھا، بھیج دیا گیا۔ یہ جبری نظربندی شاعر کے ذہنی ارتقا کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی۔ اسی کی وجہ سے وہ انتہا پسندوں کی سازش کے جھگڑے میں پھنسنے سے بچ گیا۔ اسی کی وجہ سے اُس کا دماغ پختہ ہوا۔ کیونکہ یہیں سے وہ کوہ قاف اور کریمیا کی سیاحت کو گیا، جہاں سے اُسے اپنی ادبی تخلیقات کے لئے نیا مواد حاصل ہوا۔ اسی زمانے میں اس نے اطالوی اور انگریزی زبانوں پر قدرت حاصل کی۔ پیٹرسبرگ سے دور اُس کے اپنے علاقے میں اس چھ سال کی نظربندی نے پشکن پر شاعر کی حیثیت سے اس کی حقیقت اور اہمیت کا انکشاف کیا اور اس کی خداداد قابلیت کی قوت اور وسعت کو ظاہر کر دیا۔ اسی زمانے میں اُس نے تغزل کے لحاظ سے چند بہترین چیزیں لکھیں۔ اس زمانے میں اُس کی ادبی تخلیق کی زرخیزی، تنوع اور بلند معیار ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ بہت جلد اس کی طبیعت پر بائرن کی جگہ شکسپیئر کا اثر ہونے لگا۔ اور شکسپیئر کے مطالعے نے روسی شاعر کے سامنے ایک زیادہ وسیع میدانِ تخیل پیش کر دیا۔ ۱۸۲۶ء میں یہ نظربندی ختم ہوئی۔ اُسے ماسکو جانے کی اجازت ملی اور ۱۸۲۷ء میں وہ پیٹرسبرگ پہنچا۔ وہ اپنی نظموں کی ایک جلد شائع کرنے کے بعد ۱۸۲۹ء میں دوبارہ کوہ قاف کی سیر کو گیا اور اس سفر سے بھی بہت سی نظمیں حاصل ہوئیں۔ اسی سیر کے اثرات کو ظاہر کرتی ہوئی ایک نظم ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اکیلی سندری

طوفانوں کا دن بیتا،
طوفانوں کی اندھی رات!
کالا، کاجل سا گھونگٹ!
گھونگٹ اوٹ چھپا آکاش!
دھندلے جھنڈ درختوں کے،
پتلی، سوکھی ہر ٹہنی،
جیسے بازو بھوتوں کے!
دھندلے جھنڈ کے پردے سے،
نکلا چاند مسافر سا!
ہر شے، ہر منظر میری روح میں لائے تاریکی!
دور ہی دُور دھندلکے میں چاند بکھیرے کرنوں کو!
اور ہوا میں ساری ہے شام کی گرمی لہروں میں!
اونچے پربت کا دامن،
پہلو میں اک وادی ہے!
وادی میں اک ندی ہے،
نیلے منڈل کے نیچے،
ہلکے ہلکے بہتی ہے!
اور ندی کے کنارے پر
بیٹھی ہے اک سندرتا!
سندرتا سی اک دیوی!
چنچل چنچل، کھوئی سی!
محزوں اور اکیلی ہے!
کوئی نہیں ساتھی اُس کا،
کوئی نہیں پریمی اُس کا،
جو اس کا دل بہلائے،
اپنے دل کی باتوں کو نغموں میں کہتا جائے
کوئی نہیں ہے پریمی جو
چھوٹے ننھے ننھے پاؤں!
دھیرے دھیرے پھر پھر کر،
رس کی مستی میں کھو کر،
چومے ننھے ننھے پاؤں
کوئی نہیں جو شانوں پر
بکھری زلفوں کو چھیڑے!
چومے پھول محبت کے
اور جوانی سے سرشار
ہونٹوں کے رس میں کھوئے!

ننھے ننھے آہوں کے مدھ مستی میں جھولے لے!

. . . .

. . . .

کوئی نہیں پریمی اس کا،
اس کو حاصل کوئی نہیں!
کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں،
اس کے قابل کوئی نہیں!
لیکن گریوں ہو، گریوں، . . .
دھیکے چپکے میں جاؤں!

پشکن کی نظموں میں کہیں کوئی ناہموار بات کبھی دکھائی نہ دے گی۔ میدانی علاقے میں سطح دریا کی یکساں روانی کی کیفیت اس کی نظموں میں پائی جاتی ہے۔ خواہ ہم تمام نظم کو پڑھیں یا کچھ ٹکڑے چھوڑ کر غور کریں سطح دریا کی یکسانیت ان میں بہرصورت موجود رہے گی۔ وجہ یہ ہے کہ پشکن ہیئت اور اظہار کے لحاظ سے ایک مکمل فن کار تھا۔

۱۸۳۲ء کے موسم سرما میں پشکن نے اپنی کارگذاریوں کے لئے ایک نیا میدانِ عمل تلاش کیا۔ اسے تاریخی تحقیق و تجسس کا خیال آیا اور تین چار مہینوں کے وقفے میں ہی اس نے نہ صرف کیتھرین ثانی کے عہد کے سرکش کاسک پگاچیف کے متعلق تمام مواد اکٹھا کر لیا بلکہ اُس نے اسی موضوع کے متعلق نثر میں ایک لمبے افسانے کا خاکہ بھی تیار کر لیا اور اس کے علاوہ اس نے اور بہت سی چیزیں بھی تصنیف کیں پشکن نے اپنی نظم کی طرح نثر بھی بہت صاف اور رواں لکھی۔ نثر میں بھی اُس کے کردار نظم اور ڈرامائی مناظر کے کرداروں کی ہی طرح زوردار اور حقیقت کے مطابق ہیں اور اگر اُس کی عمر وفا کرتی تو ممکن تھا کہ پشکن ایک زبردست ناول نگار بھی بن سکتا۔

اس نے اپنے ڈرامے رسالکا کا موضوع اور بنیادی مواد روس کے دیہاتی ادب اور روائتی قصے کہانیوں سے لیا تھا لیکن ادب کے اس پہلو کی طرف وہ صرف اس ایک ڈرامے کے لئے ہی رجوع نہ ہوا۔ اس دیہاتی اور روائتی ادب نے اس کے لئے مستقبل میں بہت سازخیز مواد بہم پہنچایا۔ یہ تمام قصے کہانیاں پشکن کو اپنی اناآیناروڈیونا سے حاصل ہوئے۔ پشکن اپنی انا کو اپنا آخری معلم کہا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ابتدائی فرانسیسی تعلیم کے اثرات کو مٹانے میں جو کام اُس کی انا نے کیا ہے اس کے احسان سے وہ کسی صورت سبکدوش نہیں ہو سکتا

عمر کے آخری سال میں وہ پیٹر اعظم کی تاریخ کے لئے مواد فراہم کرنے میں مصروف رہا۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً اس کا کام غیر متعلقہ باتوں اور اس کے دوستوں کی وجہ سے رکتا رہا لیکن سکول چھوڑنے کے بعد سے آخر دم تک اُس کی تخلیقی قوت میں کبھی ایک ذرہ بھر کمی بھی واقع نہ ہوئی۔ ابھی تک ہم نے پشکن کی صرف بڑی بڑی تصنیفات کا ہی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس تمام عرصے میں وہ مختلف نظموں اور دیگر چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تیار کرتا رہا اور ان میں سے اکثر اس کی بہترین ادبی تخلیقات میں شمار کی جانے والی چیزیں ہیں۔ اس کے موضوع کا تنوع اور وسعت مضامین بہت حیران کن ہے۔ کئی چیزوں کا حسن اور فنی تکمیل اس کی چابکدستی کا ثبوت ہے۔ اس کی بعض نظموں کی شدتِ احساس اور نزاکت جذبات بے ساختہ داد طلب ہوتی ہیں کبھی وہ ہمیں برف کے طوفان میں لے جاتا ہے، کبھی وہ بہت ہی محدود لفظوں میں کوہ قاف کا بیان کرتا ہے اور اس کے منتخب مصرعے ترجمانی کے لحاظ سے زوردار اور کنایہ کے لحاظ سے ایک زبردست وسعت کے حامل ہوتے ہیں۔ کبھی وہ صبح کے منظر کو اس نفاست کے ساتھ بیان کرتا ہے، کہ ہمیں خزاں کے سویرے کے کہرے اور دھند کی بھینی بھینی بو کا احساس ہونے لگتا ہے اور کبھی وہ وطنی جذبات سے لبریز کوئی پُر جوش نظم لکھ ڈالتا ہے۔ کبھی وہ کوئی دعا تصنیف کرتا ہے جس کے بیان کی بلندی اور رقت اور کیفیت کی عاجزی کو پرانی لاطینی مناجاتیں بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ کبھی وہ نرم و نازک اور شوخ احساسات سے لبریز کوئی نغمۂ محبت چھیڑ دیتا ہے۔ پشکن کی ایک نظم جس میں زندگی کے متعلق اس نے اپنا نظریہ ظاہر کیا ہے۔ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

زندگی

خمارِ بادۂ دوشیں کی تلخیاں لے کر،
مرے دماغ میں ہے یادِ عشرتِ ماضی!
مگر شراب کہن سال ہو کے رہتی ہے،
یوں ہی ہیں عمر کے ہمراہ تلخیاں گہری!
ہے راستہ مرا تاریک، اور مستقبل،
بس ایک بڑھتا ہوا فکر کا سمند رہے!
مگر اذیتیں سہہ کر ہوں نقش نو تخلیق
یہ اک اکیلی تمنا ہی دل کے اندر ہے!

مجھے تو زندگیٔ جاوداں سے رغبت ہے ،
گریز موت سے ہے مجھ کو، اور نفرت ہے !
میں جانتا ہوں مسرت وہیں نہاں ہوگی،
ہزار غم ہوں، اذیت ہو اور اندیشے !
سنوں گا نغمہ میں پھر ساز آسمانی کا ،
اثر سے آنسو نکل آئیں گے تخیل سے !
یہاں تک، آخری غمناک لمحہ آئے گا ،
اجالا پھیلے گا اک عشق کے تبسم کا !

لیکن مشہور انگریزی نقاد سر مورس بیرنگ کے خیال میں پشکن کی مختصر نظموں میں "پیغمبر" بہترین ہے۔ اس نظم میں ایک بلندی ہے جس کو شاعر صرف ایک بار ہی حاصل کر سکا۔ اس نظم کا تصور بائبل کے انداز کا ہے۔ اور اس کی ترجمانی دانتے کے رنگ میں ہے۔ یہ نظم اپنی ہیئت کے اختصار اور تخیل کی وسعت کے لحاظ سے ایک جامع چیز ہے۔ اگرچہ نثر کا ترجمہ اصل کی تخیلی شان کا اندازہ نہیں دلا سکتا۔ لیکن چونکہ منظوم ترجمہ ناممکنات سے ہے، اس لئے ہم ذیل میں منثور صورت ہی پیش کرتے ہیں۔

پیغمبر

میری روح پژمردہ تھی اور تشنہ اور تاریک ویرانی میں میں راہ سے بھٹک گیا اور دوراہے پر مجھے چھ پروں والا ایک فرشتہ دکھائی دیا اور اس نے میرے پپوٹوں کو چھوا اور اس کی انگلیاں نیند کی طرح ملائم تھیں اور کسی گھبرائے ہوئے عقاب کی مانند میری آنکھیں کھل گئیں اور فرشتے نے میرے کانوں کو چھوا اور انہیں شور اور آواز سے لبریز کر دیا اور میں نے عرش اعظم کو تھرتھراتے ہوئے سنا۔ اور بلندیوں پر فرشتوں کے اڑنے کی آوازیں بھی میں نے سنیں۔ اور زیر آب حیوانوں کی حرکت مجھے سنائی دی۔ اور وادی میں اگتی ہوئی انگور کی بیلوں کی آہٹ میرے کانوں میں آئی۔ وہ فرشتہ مجھ پر جھکا اور اس نے میرے ہونٹوں کو دیکھا۔ اور اس نے میری گناہوں سے آلودہ زبان کو اکھیڑ پھینکا۔ اور اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے تمام بیکار باتوں اور برائی کو دور کر دیا۔ اور اس کا دایاں ہاتھ خون سے بھر گیا۔ اور اس نے میرے زخمی ہونٹوں کے درمیان سانپ کی دانا زبان لگا دی۔ اور اس نے تلوار سے میرا سینہ چیر ڈالا۔ اور اس نے میرے لرزاں قلب کو نوچ لیا، اور میرے سینے میں ایک بھڑکتی ہوئی آگ رکھ دی۔ میں صحرا میں کسی نعش کی طرح لیٹا ہوا تھا۔

اور پھر مجھے صدائے ربانی نے پکارا۔ اور مجھ سے کہا "پیغمبر! اٹھ اور ہوشیار ہو جا۔ اور سن! میری رضا کو دل میں لے کر بحر و بر پہ جا اور میرے کلام سے لوگوں کے دلوں میں اجالا پھیلا!"

۱۸۳۷ء میں وہ حادثہ وقوع میں آیا جس کی وجہ سے پشکن کو موت کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس حادثہ فاجعہ کی علت غائی بدبینوں اور حاسدوں کی بدگفتاری اور افواہ بازی تھی۔ ہیکرن ڈینٹس شاہی فوج کا ایک عہدیدار تھا۔ وہ پشکن کی بیوی پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ اس دوران میں پشکن کو ایک گمنام خط موصول ہوا۔ پشکن نے غلطی سے یہ سمجھا کہ ہیکرن ہی اس خط کا بھیجنے والا ہے۔ چونکہ پشکن طبعاً تیز مزاج تھا۔ اس لئے اس نے جواب میں ایک آتشیں خط لکھ بھیجا اور اس وجہ سے دونوں کا مبارزت کرنا ضروری ہو گیا۔ ۲۷ فروری ۱۸۳۷ء کو مجادلہ ہوا۔ اور پشکن بری طرح زخمی ہوا۔ اور پینتالیس گھنٹے کی اذیت کے بعد ۲۹ فروری کو راہی ملک عدم ہوا۔ مرتے ہوئے اس نے اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا اور کہا کہ کوئی بھی اس کا انتقام لینے کی کوشش نہ کرے۔ اس وقت اس کی عمر سینتیس سال اور آٹھ ماہ تھی۔

پشکن کے عرصۂ حیات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں تیس سال سے پہلے کی زندگی اور تیس سال سے بعد کی زندگی۔ پشکن نے کارزار حیات میں آزاد آرزوؤں اور امنگوں کے ساتھ قدم رکھا۔ اور اس لئے جب اس نے بعد ازاں اپنے رویّے سے حکومت، مذہب، شہنشاہیت اور مقررہ قدیم قواعد و ضوابط سے عملاً اپنی وابستگی اور وفاداری ظاہر کی تو بہت سے لوگ اس سے ناامید ہو گئے۔ اس کا مذہب کی طرف رجوع ہونا، اس کا حکومت کی ملازمت اختیار کئے رہنا اور وطنی نظمیں لکھنا سطحی نظر سے دیکھنے والوں کو پسند نہ آیا۔ لیکن اگر ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ پشکن نے زر کے بدلے ضمیر کو فروخت کر دیا تو سخت ناانصافی ہو گی۔ اس وقت کے اونچے طبقے میں آزاد امنگیں ایک فیشن کا درجہ رکھتی تھیں۔ پشکن ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا اور وہ ہوا بھی۔ لیکن وہ اس وقت باغی نہ تھا جیسے کہ آیندہ چل کر جب ہر طرف معتدل قومی خیالات کا چرچا ہوا تو اس نے قدامت پرستی بھی کبھی اختیار نہ کی۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس حقیقت پر افسوس کا اظہار کریں۔ لیکن یہ حقیقت بہر صورت وہیں رہے گی۔ نکولس اول کے عہد میں کوئی آزاد فضا نہ تھی اور

اسی لئے انتہا پسندوں کی قبل از وقت کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ جب تک بغاوت کے اسباب وعلل اور مناسب موقعہ مہیا نہ ہو، انقلاب کی کوشش بے کار ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے انتہا پسندوں نے اپنی قبل از وقت ناکام کوشش سے روس کی سیاسی ترقی کو بہت پیچھے ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نکولس اول کے عہد میں پرجوش، امنگوں بھرے اور ذہین لوگوں کو اپنے احساسات کے نکاس کے لئے سیاسیات کی بجائے دوسرا میدانِ عمل تلاش کرنا پڑا۔

لیکن حقیقت سے قطع نظر نہیں اس میں شک ہے کہ اگر موقع مہیا ہوتا بھی تو کیا پشکن اس انتہا پسندوں کی تگ ودو میں حصہ لیتا؛ پشکن، افق شہرت پر اصلاح عالم کا جذبہ دل میں لئے ہوئے نہیں آیا تھا۔ وہ نہ باغی تھا نہ مصلح۔ نہ آزاد خیال تھا اور نہ قدامت پسند۔ تمام روس اور اس کے باشندوں کے لئے اس کی محبت ظاہر کرتی ہے کہ وہ جمہوریت پسند انسان تھا۔ وہ اپنے وطن کی محبت کے لحاظ سے ایک محبِّ وطن تھا۔

زندگی کے پہلے دور میں وہ ہمہ تن عیش وعشرت میں ڈوب گیا۔ اُسے نفس پرستی کے سوا اور کسی بات سے گویا کچھ تعلق ہی نہ تھا۔ اس کی اس زمانے کی آئینہ دار کئی نظمیں ہیں جس کی ایک دو مثالیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

سنجوگ

مست عشرت کا کوئی مول نہیں،
میرے قریں!
نفس کی بہجت مستانہ، غضب، سرجوشی،
ان کی قیمت ہی نہیں!
بازوؤں میں مرے اک سانپ کی مانند کوئی
جسم حسیں
اینٹھتے اینٹھتے بل کھاتا ہوا اک الجھن میں،
اس کی قیمت ہی نہیں
میرے قریں!
تیز تر ہاتھوں کے سہلانے سے
زخم کے خوف سے اور ہونٹوں کے چھو جانے سے
ایسی تحریک سے وہ پاس ہی سے آتی ہے
کھیل کی آخری پیچیدگیوں کے لمحے!
اس جھجک سے مجھے تم اور رجھا لیتی ہو،
درد انگیز مسرت کا مجھے
جلوہ دکھا دیتی ہو!
ایک خوں ریز خوشی ہوتی ہے پہلو میں تمہارے حاصل!
کئی لمحے مرے جاری ہی رہے عرض ونیاز
آخرِ کار تمہارے دل میں
جاگ اٹھا نغمۂ راز
بجھ گیا شعلۂ ناز
اور تم مان گئیں، مان گئیں، مان گئیں!
ایک نرمی سے تھے لبریز وہ تسلیم و رضا،
شائبہ ان میں کوئی مست مسرت کا نہ تھا!
سرد مہری تھی حیا کی دل میں،
تم کو پروانہ تھی اس کی کوئی،
ہے مرا کیف جلی ایک سوال!
تم کو لازم ہے کہ دو اس کا جواب!
تم کو پروانہ تھی اس کی کوئی،
سرد مہری تھی حیا کی دل میں!
لیکن اک بار اٹھا شعلۂ جوالہ تمہارے دل میں!
ایک تیزی سے بغل گیر وہ پھر ہو ہی گیا،
مرے شعلے سے!

(۲)

اختلاط

حریفِ نگہ بیرہن جسم سیمیں کے پسپا ہوئے ہیں،
اور اب مسلا مسلا، سہا تا سا اک ڈھیر ہے فرش مخمل پہ ظاہر!
کسی نے سنی ہلکی ہلکی صدا خامشی میں؟
صدا میٹھی باتوں کی سرگوشیوں کی،
صدا لب کی گل چینیوں کی۔
ادھوری سی اک گنگناہٹ
تھی احساس کی ایک خاموش آہٹ!

حجابِ معطر کی گم گشتہ لہریں
نہیں رقص کی شوخیوں میں!
سنو! تم سنو تو!
یہ دو دل ملے ہیں۔
کہ بجلی کے طوفان گہری فراموشیوں سے اٹھے ہیں؟!

(۳)

بے اعتمادی

اپنی باہوں کا حلقہ، سندر انگ پہ جب ڈالا،
اور منہ سے بولی باتیں، دریم کی میٹھی برساتیں،
خاموشی کے نغمے ہیں، تو اس نازک لمحے ہیں،
ہٹ کر میرے پہلو سے، توڑ کے بندھن حلقے کے،
کلیاں پیارے گالوں کی، سنبل کالے بالوں کی،
مجھ سے دور ہٹا کر، یوں بولی اس، "کیوں ہے مجبور؟"
مرد، وفا؟ یہ ناممکن! ناممکن یہ باتیں ہیں،
یہ سب تیری گھاتیں ہیں! تو بھولا! یہ ناممکن!

لیکن تیس سال کی عمر ہو جانے پر یہ جوانی کے ہنگاموں سے لبریز نغمے شاعر کی ذہانت کے لئے اتنے دلچسپ اور قابلِ توجہ نہ رہے۔ اُس کا ذہن اور اہم باتوں کی طرف رجوع ہو گیا۔ یہ نہیں کہ وہ ہمہ تن مذہبی رنگ میں ڈوب گیا۔ البتہ اس کی فطرت ہی چونکہ مذہب کی طرف مائل تھی اس لئے بہت جلد اس نے بے اعتقادی کو خیر باد کہہ دیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ جذبات کا غلام ہی رہا۔ اُسے عیش و عشرت کی دلکشی سے پوری نجات حاصل نہ ہو سکی۔ روسی فلسفی سولوفیف لکھتا ہے۔ "پشکن ہی کی رائے میں اس کی شخصیت کے دو مختلف اور علیحدہ پہلو تھے۔ ایک راہبانہ پہلو اور دوسرا عیاشانہ" شاعر کی آخری زندگی میں یہ راہبانہ پہلو ہی نمایاں رہا لیکن دوسرے پہلو کا یکسر قلع قمع کبھی نہ ہو سکا اس سلسلے میں ایک بات خاص اہمیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ جوں جوں پشکن کا ذہن سنجیدہ انداز نظر اختیار کرتا گیا۔ اسی لحاظ سے اس کی ادبی تخلیق میں زیادہ خارجی رنگ، زیادہ پاکیزگی اور زیادہ زور پیدا ہوتا گیا۔ اور اسی نسبت سے اس کی عام قبولیت میں فرق آتا گیا۔ کیونکہ پبلک کو اُس کی جوانی کی شاعری پسند تھی اس کا پختہ رنگ ناگوار تھا خواہ وہ فنی لحاظ سے کتنا ہی زیادہ مکمل اور بلند کیوں نہ ہو۔ پبلک اس کی جوانی کی نظموں کے رومانوی ماحول اور مستانہ محبت و عشرت کے تصورات کی دلدادہ تھی۔

پشکن روسیوں کا قومی شاعر ہے۔ جس نے غیر ملکی مواد سے ایک نئی، قومی اور روسی شاعری کی تخلیق کی اور جو آئندہ نسلوں کے لئے ان مٹ نمونے اور مشعلِ راہ چھوڑ گیا اُس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی ذہانت کا ہمہ گیر ہونا ہے۔ کوئی بات ایسی نہ تھی جسے وہ اپنی گرفت میں نہ لا سکے۔ اور یہ ہر شے پر چھا جانے والی انسانیت اور ہر چیز اور ہر بات کو گرفت میں لانے والی خاصیت ہی تھی جو اس میں ایک گہرا خالص روسی رنگ نمایاں کر دیتی ہے۔ وہ روزمرہ زندگی کا شاعر ہے ایک حقیقت پرست اور سب سے بڑھ کر ایک غزلخواں۔ وہ ڈرامہ نگار نہیں ہے۔ اس کی رزمیہ نگاری باوجود اعلیٰ فنی تکمیل کے کوئی خاص درجہ نہیں رکھتی۔ اس نے روسیوں پر ان کے وطن کے کھلے میدانوں کا حسن آشکار کیا۔ اپنے ملک کی شعریت کو نمایاں کیا۔ لیکن اس کے نغموں کو سننے والے پرانے نقوش کو دیکھنے کے عادی تھے۔ وہ اُسے پوری طرح سمجھ نہ سکے۔ پشکن نے اپنے نئے خیالات کی ترویج کی۔ وہ وقت کی ندی کے بہاؤ کے خلاف پیرنے کی جدوجہد کرتا رہا اور آخر تھک کر مناسب وقت سے بہت پہلے اسے اپنی ہستی کو کھلے سمندر کے آغوش میں دے دینا پڑا۔ لیکن انجام کار ایک دن ایسا آیا جب اس کے ہم وطنوں نے اس کی باتوں کو پوری طرح سمجھا۔

پشکن نے روسی زبان کو روایتی بندھنوں سے آزاد کیا۔ اور تمام عمر وہ اپنی زبان کی باریکیوں پر زیادہ سے زیادہ عبور حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ پیٹر اعظم کی طرح اس نے بھی اپنی تمام زندگی طالبعلمانہ حیثیت میں گزاری اور اپنی تمام قوتوں کو اپنے فن کی تکمیل میں صرف کر دیا۔ وہ ایک زبردست فن کار تھا۔ اس کا فن صاف ستھرا، سجھا ہوا، لچکدار اور پاکیزہ ہے۔ کہیں بھی اس کی تخلیق میں دھندلی اور مشکوک کیفیت نہیں ہوتی۔ کوئی داغ دھبہ نہیں۔ اس کے نغموں کا کوئی سُر جھجکتا یا رکتا ہوا نہیں ہوتا۔ اس کے نغمے گویا سنگین بت ہیں جو فن کار کی چابکدستی کا واضح ثبوت ہیں۔ اس کے بیان میں الفاظ اور تخیل میں ذرا سا تفاوت بھی باقی نہیں رہتا۔ اس کے الفاظ سنتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم شاعر کو سوچتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ روانی اور بے ساختگی اس کی خداداد خصوصیات تھیں۔ اس کی روح میں اخلاص تھا۔ متلون مزاجی کے باوجود اُس میں ایک وسعت اور نجابت تھی۔ اُس کا تلون اس کو دنیوی باتوں کی طرف لے

جاتا تھا لیکن اس دنیا کی طرف رجوع ہونے کی وجہ سے ہی وہ انسانیت کے قریب تھا۔ وہ دنیا کا رہنے والا تھا لیکن اُس کی فطرت طفلانہ تھی اور یہی بات اُسے روس کے شعرا میں ممتاز ترین بناتی ہے۔ اُسے اپنے عیش وعشرت میں بھی ایک ملال انگیز کیفیت کا احساس ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی نظموں میں عموماً عشرت کی شدت کے ساتھ ایک حزن بھی پایا جاتا ہے مثلاً۔

انجام

شبِ عشرت کے آخری دم تھے !
ہم جدائی کو ہو گئے تیار !
دورِ جامِ شراب ختم ہوا !
آہ ! مثلِ حباب ختم ہوا!
رات کی بات خواب ہونے لگی !
اور عدم کا جواب ہونے لگی !
کھویا خاموشیوں میں نغمہ زار ،
پھر بھی لب حاملِ تبسم تھے !
رُخ پہ دونوں کے اجنبی سے نقاب
چھائے ، لیکن تھا بے قرار شباب !
ہم نے مل جل کے شب میں گائے گیت،
(آہ ! وہ لمحے ! مختصر سی پریت !)
اپنی ذہنی فضا میں دہرائے !
ہار تھی وہ دلوں کی یا تھی جیت،
جس نے دامِ خیال پھیلائے،
رات کی یاد رہ گئی باقی ،
اب نہ وہ مے ہے اور نہ وہ ساقی !

لیکن نظموں کے عشرت کی اس قدر آئینہ دار ہونے کے باوجود اُس کی زندگی رومانوی نہ تھی۔ اسی مادی دنیا کے علائق سے ہی اس کا واسطہ تھا۔ اونچے گھرانے میں پیدا ہوا، حکومت کے اونچے عہدے پر فائز رہا اور سماج کے تکلفات کی دلدادگی اس کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک سچا فن کار تھا۔ اُسے حسن کی تلاش تھی اور اس تلاش میں وہ نہایت تندہی اور وفاداری سے منہمک رہا۔ بلکہ حسن کی تلاش میں اس کی دلبستگی اور وفاداری حد سے بڑھ گئی تھی۔ اس کے کلام میں ہمیں میر اور غالب کی قنوطیت اور یاس پسندی کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسے لہجے کے باوجود جس سے ملال مترشح ہے۔ اس میں میر کی غم پرستی اور کاہلی نہیں ہے نہ مرزا غالب کی سی مشیت سے بغاوت ہے۔ مدافعانہ طوفان بھی نہیں۔ آسمانی تخریب کی برق جانسوز بھی نہیں۔ اُسے دانتے کی طرح دوزخ کی اذیتوں سے کوئی واسطہ نہیں مشاہیر میں سے جسے بھی دیکھا جائے وہ یا تو فن کارانہ انداز نظر کا مالک ہوگا یا اجتہادی افتادِ طبع کا۔ مغرب کے اکثر شعرا اجتہادی طبیعت کے مالک تھے مثلاً شیلے، بائرن، اور ہائنے وغیرہ۔ لیکن پشکن کی شخصیت ان کے خلاف تھی وہ صرف ایک فن کار تھا۔ داغ کے بادہ وساغر اور نغمہ ومعشوق کے ساتھ اُسے جوش کے انقلابی نعروں سے کوئی تعلق نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کی محبت کی نظموں میں بھی گرم جوشی کے لحاظ سے ایک کمی نظر آتی ہے خصوصاً ذیل کی نظموں میں آپ دیکھیں گے کہ محبت کی خالص پکار کی بجائے گریز اور واسوخت کا رنگ پیدا ہے اور دوسری نظم کا تو موضوع ہی محبت کی بجائے حیات بعد الممات کی قسم سے ہو گیا ہے۔

تیاگ

چل دے ، چل دے ، چل دے دوست۔
میں تیار ہوں چل دے دوست !

جس بستی کو جی چاہے — تیرا، مجھ کو لے جائے !
میں تیار ہوں چلنے کو، — تیرا ساتھی بننے کو !
پیچھے پیچھے چل دوں گا، — اس بستی کو چھوڑ دوں گا!
چھوڑوں گا یہ تنہائی، — بن جاؤں گا ہرجائی !
چھوڑ دوں گا اس خلوت کو — اک دیوی کی مورت کو !
چاہے اُتّر کو جائے — خون جماتی سردی میں،
چاہے پورب کو جائے — نین لبھاتی زردی میں!
جس بستی کو چل دے گا، — میں بھی ساتھ ہی چل دونگا!
میں تیار رہوں جاؤں گا، — اس بستی کو چھوڑ دوں گا!
چھوڑوں گا اس بستی کو، — اپنے دل کی دیوی کو !
لیکن اتنی بات بتا، — اس نکتے کو تو سلجھا،
یوں پردیسی ہونے سے — یوں دوری میں رہنے سے
بوجھل دل ہلکا ہوگا؟ — اور دیوی کو بھولے گا؟
یا لوٹے گا رستے سے، — رک کر آگے جانے سے؟
واپس پھر اُن قدموں میں — جن کو چھوڑ رہا ہے یوں،

اور گر گر کر سجدوں میں   ہو جائے گا پھر مجنوں!

سپنا

اب ہیں پیارے! اب ہیں لمحے!

دل کہتا ہے کلفت جائے   سکھ کی رت ہو سکھ لوٹ آئے!
دن کے پیچھے دن آتا ہے   پہلا دن چلتا جاتا ہے!
ہستی کا اک ذرہ لے کر   جیون کا اک پارہ لے کر!
میں اور تو کہتے ہیں، آؤ،   جیون کا نقشہ تو بناؤ،
دیکھو! لو کھے، نیارے بھاؤ   جیون مدھ سے مستی لاؤ!
لیکن یہ سب تو مایا ہے،   اک چلتا پھرتا سایا ہے!
جگ میں کیوں جینے پر بھروسہ   جینے کے ہے ساتھ ہی مرنا!
جگ میں خوشیاں کس نے دیکھیں!   سکھ کی گھڑیاں کس نے دیکھیں؟
کتنی سکھ آنند کے جلوے،   مر جانے پر ہی دیکھو گے!
بیتے سالوں اور جنموں سے   ذہنی خلوت کے سپنوں سے،
میں نے سن رکھا ہے نغمہ،   سکھ کی من موہن گھڑیوں کا!
میں نے دیکھ لیا ہے رستہ،   سکھ سندر نا کی بستی کا!

سکھ کی مے کے جام وہاں ہیں
راحت اور آرام وہاں ہیں!

اگرچہ پشکن پہلا شخص تھا جس نے رومانوی تحریک کو شروع کیا، اور اپنی سخن گوئی کے ابتدائی دور میں وہ کم و بیش رومانوی انداز میں رومانوی موضوعات پر ہی قلم اٹھاتا رہا، اس کے باوجود بنیادی طور پر وہ اپنے تخیل اور فن کاری کے لحاظ سے ایک حقیقت نگار تھا اور بہت جلد ہی اس نے اپنے ابتدائی زمانے کے رومانوی انداز بیان سے کنارہ کشی بھی اختیار کر لی تھی، اور حقیقت اور اصلیت کے نقش قدم پر چلنے لگ گیا تھا۔ جب تک اُسے قبولیت عامہ حاصل رہی وہ زمانے کی رو کے ساتھ بہتا رہا اور جب عوام نے اس کی حقیقت پرستی اور سنجیدگی پر اظہار ناراضگی کیا تو وہ سب سے علیحدہ اپنی دھن میں لگا رہا۔ اور گویا حسن کے مندر کی تنہائی میں ان مٹ چیزیں تخلیق کرتا رہا کیونکہ اُسے فطرت سے محبت تھی، اُسے فن سے دل بستگی تھی، اُسے اپنے وطن سے عقیدت تھی اور وہ ان تمام باتوں کو اپنے لاثانی نغموں میں بیان کرتا رہا۔

بہت عرصے تک روسی نقاد بانو پشکن کی کارگزاریوں سے بے اعتنائی برتتے رہے اور بےجا ناانصافی کرتے رہے کیونکہ اس نغماتی شاعر کا کلام اس نسل کو ورثے میں ہاتھ لگا جسے ایک سماجی اور سیاسی طوفان سے سامنا تھا۔ لیکن جب ۱۸۹۱ء میں روس کے مشہور ناول نگار ڈوسٹوئوسکی نے ماسکو میں پشکن کی یادگار کی نقاب کشائی کی اور شاعر کی شخصیت کو خراج تحسین ادا کیا تو اس وقت اس کی آواز تمام روس کی آواز تھی اور اب سب نے مان لیا ہے کہ پشکن کا کلام نقادوں کے تعصبات سے بالا ہے کیونکہ اس کی جگہ روس کے باشندوں کے دلوں میں ہے۔ اور خصوصاً نوجوانوں کے ہونٹوں پر اس کے نغمے رقصاں ہیں۔

ذیل میں ہم اس کا ایک نغمۂ محبت درج کرنے کے بعد آپ سے رخصت ہوتے ہیں۔

محبت

تجھے اک المناک جذبے سے رغبت ہوئی ہے؛
تجھے چشم خوں ریز کیسے پسند آگئی ہے!
اگر تجھ پر چاہت کی دیوانگی کی
گھٹا چھا چکی ہے،
اگر زہر غم تیرے خوں کے ہر اک ذرۂ بے ثمر سے لپٹ کر جدا
ہو چکا ہے،
اگر ذہن فانی میں فرقت کی راتوں کے بے رنگ، لاانتہا، تلخ
لمحے گزر کر چکے ہیں۔
کبھی سونی سیجوں سے پہلو ملا ہے،
تمناؤں کا بوجھ دل نے اٹھایا ہوا ہے۔
فریب مسرت نے دھوکے دئیے ہیں۔
محبت کی بوندوں سے لبریز آنکھیں
یوں ہی رو کے مدہوش ہوتی رہی ہیں،
یوں ہی بستر غم کی بے کیف سی سلوٹوں میں۔
تمنائے ناکام الجھن سے آلودہ ہو کر، سلجھتی رہی ہے،
اگر ایسی حالت سے صحبت رہی ہے،
تو پھر غم کے خوابوں میں تسکین کیسی؟
تجھے چشم خوں ریز کیسے پسند آگئی ہے؟
بہانے ہیں بے کار افسردہ دل سے،
یہ سن لے یہ سن لے، میں کہتا ہوں تجھ سے،

نہیں تیرے دل میں محبت کا نشہ!
تجھے اک المناک جذبے سے رغبت ہوئی ہے!
اگر ایسی حالت میں مدہوش ہو کر گزارے گا لمحے،
یہ انجام ہوگا،
کہ تو اپنی ہے مہر، محبوب ہستی کے قدموں کو چھو کر،
یونہی اپنی خوں رنگ شبنم بہا کر،
یوں ہی تھرتھراتے ہوئے زرد، پژمردہ ہونٹوں سے، تو
دلدوز آہوں سے فریاد، نالے، پکاریں کرے گا
مجھے میری وہ مندلی بصیرت ہی دے دو!
مرے سر سے بے مہر، ظالم تصوّر ہٹا دو!
بہت سال چھائی محبت کی وادی
مگر پھول آرام کے میرے دل نے نہ پائے!
مجھے میرے بچھڑے ہوئے چین سے پھر ملا دو!
مگر آہ! تاریک یادیں،
محبت کے بے رنگ نقشے،
ہمیشہ ترے سونے پہلو میں ہوں گے!
اور آزادیاں خواب ہوں گی!

میراجی

رباعی

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اقبال

غزل

وہ لطف دیتے ہیں غم ہائے زندگی مجھ کو
حقیر تر نظر آتی ہے ہر خوشی مجھ کو

تری تلاش نہ ہوتی نہ کیوں جنوں ہوتا
سکھائے تو نے ہی اندازِ گمرہی مجھ کو

جنوں نے کر دیا اس درجہ دل کو صدمہ نواز
کہ موت بھی نظر آتی ہے دل لگی مجھ کو

چمن میں آکے جنوں میرا تیز ہوتا ہے
چٹک کے سینہ دکھاتی ہے ہر کلی مجھ کو

کبھی خوشی کی تمنا کبھی الم کی تلاش
فریب دیتی ہے پیہم یہ زندگی مجھ کو

رہی نہ منزلِ موہوم کی خلش باقیؔ
میں گمرہی کو پسند اور گمرہی مجھ کو

باقیؔ

فیروزپور سے جالندھر تک

کیا نشاط افزا سماں تھا، کیا سرور افزا ہوا
کر رہی تھی رات کا رِ ساغر و صہبا ہوا

ہو چکے خاموش جب دم چنگ و طاؤس و رباب
اُن کی باتیں سنتے سنتے ہو گیا میں محوِ خواب

بے خبر ایّام سے ناآشنا آلام سے
سو رہے تھے بسترِ راحت پہ ہم آرام سے

نیند کی فرماں روائی تھی جہاں خاموش تھا
یعنی دنیا اور مافیہا کا کس کو ہوش تھا

آخرِ شب یک بیک جاگے وہ خوابِ ناز سے
ہاتھ رکھا میرے سینے پر عجب انداز سے

اور کہا اٹھیئے کہ اعلانِ سحر ہونے کو ہے
گنبدِ افلاک پر پنہاں قمر ہونے کو ہے

چھاؤں میں تاروں کی ہم دونوں ہوئے گھر سے رواں
چاند کا رُخ زرد، کیواں گم، ثریّا بے نشاں

صبح کا ہنگام، بادل کی گرج ٹھنڈی ہوا
انبساط و کیف سے معمور تھی ساری فضا

سازِ ہستی بے صدا اہلِ سخن خاموش تھے
تھی شفق ناپید، مرغانِ چمن خاموش تھے

راہ کے پانی سے بچتے کھیتیوں کے ساتھ ساتھ
دونوں رہ پیما تھے میرے ہاتھ میں تھا اُن کا ہاتھ

گھیرتے جاتے تھے اُس جنگل کے نظّارے ہمیں
جھانکتے تھے آسماں سے چار سو تارے ہمیں

ان مناظر پر نظر کرتے ہوئے دیوانہ وار ہو گئے ہم جا کے جالندھر کی گاڑی پر سوار
دم زدن میں ہو گئی گاڑی ہمیں لے کر رواں چھین کر عاشق کا دل جس طرح چل دے دلستاں
وہ سحر کا آسماں، آئینۂ حسن و جمال وہ زمیں کی تابنا کی عالمِ شعر و خیال
ریل کے دونوں طرف دریائے بے پایاں رواں یا ہماری جستجو میں تھی حیاتِ جاوداں
سر بسر کالی گھٹاؤں سے فضا ظلمت فروش پے بہ پے دریا کی ہیبت ناک موجوں کا خروش
وہ سکوں افزا ہوا، وہ غم ربا رنگِ شفق اُن کی باہیں میری گردن میں نظر سوئے افق
آ رہی تھی پہلوئے انساں میں بائے حیات داستانِ حسن کا دلکش ورق تھی کائنات
لے رہا تھا آستانِ حسن کے بوسے شباب چھن رہا تھا چادرِ مشرق سے نورِ آفتاب
مجھ سے فرمایا کہاں ہیں ہم خبر ہے یا نہیں ان بہشت آرا مناظر پر نظر ہے یا نہیں
تابِ گویائی نہ تھی میرے لبِ خاموش میں از رہِ الطاف مجھ کو لے لیا آغوش میں

اور کہا اے کاش ہم ہر بند سے آزاد ہوں
اور ان جاں بخش نظاروں میں ہم آباد ہوں

اصغر حسین خاں نظیر

ابرِ باراں

آسماں سے ابرِ باراں کیف برسانے لگا ۔۔۔ خاک کا ایک ایک ذرّہ وجد میں آنے لگا

سازِ فطرت کی فلک پر نغمہ پیرائی ہوئی ۔۔۔ مطربِ نوخیز بزمِ زیست گرمانے لگا

ہر رگِ افسردہ میں دوڑی جو برقِ انبساط ۔۔۔ قطرہ قطرہ خون کا ہیجان میں آنے لگا

تھرتھرائی مرغزاروں میں نمودِ زندگی ۔۔۔ بےخودی کا جام پی کر سبزہ لہرانے لگا

ذرّہ ذرّہ جگمگا اٹھا فروغِ حسن سے ۔۔۔ برق بن بن کر دلِ محزوں کو تڑپانے لگا

تازگیٔ حسن نے بخشی حیاتِ جاوداں ۔۔۔ ساقیٔ مدہوش جامِ زندگی لانے لگا

نغمہ ہائے جانفزا کی آبشاروں میں ہے گونج ۔۔۔ شاخ میں جوشِ نمو بھی لرزشیں کھانے لگا

جلوۂ حسنِ ازل موجوں میں کیا رقصاں ہوا ۔۔۔ عالمِ ادراک پر اک سحر سا چھانے لگا

مسکرا کر ابر کے پردے میں شوخی سے شباب ۔۔۔ چپکے چپکے دلبری کی شان دکھلانے لگا

چادرِ عیش و طرب کی وسعتوں کو دیکھ کر ۔۔۔ پیکرِ حرصِ مسرّت پاؤں پھیلانے لگا

آگیا انوار کا بادل خوشی سے دھر میں ۔۔۔ ہر طرف صحنِ چمن میں نور برسانے لگا

تارِ بارش میں پرو کر خوشنما موتی کوئی ۔۔۔ نوعروسانِ چمن کو ہار پہنانے لگا

ہے کسی کی اشک ریزی کے کرشموں کا ظہور
کیف بن کر عالمِ اجسام پر چھانے لگا

اندرجیت شرما

طلسمِ جاوداں

مری آنکھوں پہ پھر چھائی ہوئی رنگیں گھٹائیں ہیں
سکوت و سحر سے لبریز کیف آور فضائیں ہیں
تری رنگینیاں پھر رقص کرتی ہیں بہاروں میں
تری موجِ تبسم تیرتی ہے آبشاروں میں

مری دنیا، ترے شیریں تکلم کی فضاؤں میں!
مرا جینا، تری سرمست خواب آور اداؤں میں
کیا سیراب تو نے پھر مری تشنہ نگاہوں کو
پس از مدت اثر بخشا گیا فرسودہ آہوں کو

ترے دم سے ہے ذوق و شوق کا دریا رواں عذرا!
سرابِ زیست پر ہے پھر حقیقت کا گماں، عذرا!
مری عذرا! مری تخلیق کا رنگیں نشاں تو ہے
مرے پُر جوش بوسوں کی امینِ جاوداں تو ہے
جہانِ شوق کی تخریب اور تعمیر ہے تجھ سے
طلسمِ خواب تجھ سے، خواب کی تعبیر ہے تجھ سے

دھرا کیا ہے تمہارے حال و ماضی کے فسانے میں
کہاں احساس گزرے وقت کا اپنے زمانے میں
وہی پہلا تبسم ہے وہی رنگیں ادائیں ہیں
تری آنکھیں، وہی اٹھتی جوانی کی گھٹائیں ہیں
وہ دیکھو ابر پارے تیرتے ہیں کوہساروں پر،
وہ دیکھو عکس ہے میرا تمہارا آبشاروں پر

جھلک ہے جاوداں اپنے سرابِ نوجوانی کی
یہ دنیا ابتدا ہے بس اسی رنگیں کہانی کی

حمید عرفانی ایم اے

مصر کی سیاسی تحریک

اٹھارھویں صدی مشرقی ممالک کے لئے از حد خطرناک ثابت ہوئی یورپی طاقتوں نے اسی صدی میں یکے بعد دیگرے مشرقی ممالک کی آزادی چھین لی اور ان کو غلامی کی زنجیروں میں اس بری طرح جکڑ دیا کہ بہت کچھ کوشش کرنے پر بھی آج اس بندش کو توڑنا دشوار معلوم ہو رہا ہے۔ ایک بے حد تعجب اور دلچسپی کی بات تو یہ ہے کہ آپ اگر ان ممالک کی غلامی قبول کرنے کی تاریخ پڑھئے تو ان میں تعجب انگیز یکسانی پائیں گے۔ ہندوستان، فارس، مصر اور چین سبھی ممالک کی کہانی قریب قریب ایک سی ہی ہے۔ ملک کے اندرونی جھگڑوں میں دخل اندازی کرنا۔ ظالم حکمرانوں کو امداد دے کر عوام کو کچل ڈالنا اور ملک میں امن وامان اور انتظام کرنے کے بہانے اس پر اپنا قبضہ کر لینا ان گوری قوموں کی خالص پالیسی رہی ہے۔

مصر بھی ان سلطنتوں کے بھوکے ممالک کی تیز اور بھوکی نظروں سے بچ نہیں سکا۔ ۱۷۹۸ء میں نپولین نے مصر کی زمین پر قدم رکھا۔ نپولین نے مصر پہنچتے پر یہ اعلان کیا کہ وہ مصر پر ترکی سلطان کا پھر سے دبدبہ قایم کرنے آیا ہے۔ مصر میں ترکی حکومت کا خاتمہ مالیک سرداروں نے کر دیا تھا اور وہ دراصل مصر کے حکمران بن گئے تھے۔ نپولین کی دلی خواہش کچھ اور رہی تھی۔ وہ مصر کو فرانس کی حکومت میں لانا چاہتا تھا اور مستقبل میں انگریزوں سے ہندوستان میں لڑنے کے لئے وہاں فوجی مستقر قایم کرنے کی تجویز کر رہا تھا مگر اس کی چال پوشیدہ نہ رہ سکی۔ ترکی کے سلطان نے مصر میں فرانسیسی فوج پر حملہ کر دیا۔ انگریز بھی نپولین جیسے طاقتور دشمن کو مشرق کی جانب بڑھنے دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے حتی الامکان سلطان کی مدد کی اسی دن سے مصر کے سوال پر فرانس اور انگلستان میں ایک دوسرے کے خلاف مقابلہ شروع ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر اسی سال تک اپنی آزادی کو محفوظ رکھ سکا۔

نپولین مصر میں زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکا۔ اُسے اور ضروری مہمات کے باعث مصر چھوڑنا پڑا لیکن وہ اپنی فوج یہیں چھوڑ گیا۔ کچھ عرصے کے بعد فرانس نے مصر کو اپنی ماتحت حکومت قرار دے دیا جس سے مصر نے بغاوت کر دی اور انگریزوں نے یہ موقع مناسب سمجھ فرانسیسی فوج کو شکست دے کر مصر سے بھگا دیا۔ فرانسیسی فوج کو مصر سے باہر نکال کر انگریزی فوج نے مستقل طور پر وہاں اپنا مرکز قایم کر لیا۔ شروع میں انگریزوں نے بھی یہی اعلان کیا کہ وہ مصر میں امن وامان قایم کرنے کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ مگر مصر والوں نے تعجب کے ساتھ محسوس کیا کہ جو لوگ ہمارے دوست اور مددگار ہونے کا دعوےٰ کرتے تھے وہی مصر کی دولت اور آزادی چھیننے پر آمادہ ہیں۔ مصر اس وقت کمزور اور بے جان سا ہو رہا تھا۔ اس لئے اپنی آزادی کا پامال ہونا خاموشی سے دیکھتا رہا۔ مصر کے سیاسی آسمان پر تاریکی چھا رہی تھی۔ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ آزادی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ کہیں ہمیشہ کے لئے بجھ نہ جائے۔ ایسے ڈراونے وقت میں مصر والوں کو روشنی کی ایک شعاع دکھائی دی جس نے مصر کی تقدیر کو تبدیل کر دیا۔ ملک کی آزادی ایک بار پھر بچ گئی۔ محمد علی کی شکل میں ملک کو ایک بہادر سپہ سالار اور ایک قابل ماہر سیاسیات مل گیا۔ ملک کی آزادی کو بچانے کے لئے اس بہادر نے ملک کی طاقت کو یکجا کیا اور انگریزوں سے لڑا۔ اس جنگ میں انگریزوں کو ایسی ذلیل شکست ہوئی جیسی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

محمد علی کے وارثوں کے دوران حکومت میں سعید تک مصر کی حالت بہت عمدہ رہی لیکن سعید کا وارث اسمٰعیل بے حد عیاشی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ عیاش درباریوں سے گھرے رہنے کے باعث اپنی ناجائز خواہشات کی پیاس بجھانے کے لئے وہ دولت کو پانی کے مانند بہانے لگا۔ اسمٰعیل نے فرانس اور انگلستان سے قرض لیا اور نہر سوئز کے اپنے کل حصّے چالیس لاکھ پونڈ میں انگلستان کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔ جب اسمٰعیل کی مالی حالت بے حد افسوسناک ہو گئی تو فرانس

اور انگلستان نے مصر پر اپنا مالی دبدبہ قایم کرلیا اور اسمٰعیل کو تخت چھوڑنا پڑا اس کے بعد اسمٰعیل کا لڑکا تخت پر بیٹھا لیکن وہ محض نام کا حکمران تھا کیونکہ ملک کے مقروض ہونے کے باعث انگلستان کی گورنمنٹ نے "میجر ایبی لین بیرنگ" کو وزیر مالیات مقرر کردیا جو رفتہ رفتہ اندرونی معاملات میں بھی دخل انداز ہونے لگا۔ مصر کے نوجوانوں اور کسانوں کو ملک کی آزادی کا اس طرح چھینا جانا بہت ناگوار گذرا اور انہوں نے عربی پاشا کی نگرانی میں مصر کی آزادی کی تحریک شروع کردی۔ مصر کے کسان باغی ہوگئے اور مادر وطن کو آزاد کرانے کے لئے وہ اپنی زندگی کی بازی لگا دینے کے لئے تیار ہوگئے۔ ملک میں بجلی کی رفتار سے آزادی کے خیال کی لہر پھیل گئی اور عربی پاشا کی نگرانی میں مصر کے کسان آزادی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے۔ یہ مصر کی پہلی تحریک آزادی تھی۔

جب اسمٰعیل کا لڑکا توفیق تخت نشین ہوا اور انگریزوں کا مصر پر دبدبہ قایم ہوگیا تو اس نے وزیر اعظم کی رائے سے ایک جدید نظام بنانا چاہا مگر انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اُس کو روک دیا۔ وزیر اعظم شریف پاشا نے مجلس قانون ساز کا اجلاس کرنے کا اہتمام کیا تو فرانس اور انگلستان کے ایلچیوں نے اُسے مجبور کیا کہ وہ مجلس کو بجٹ پر نہ تو رائے زنی کرنے کی اجازت دے اور نہ ووٹ لے۔ شریف پاشا نے وزیر اعظم کے عہدہ سے استعفٰے دے دیا۔ جدید وزارت قایم کی گئی۔ وزیر اعظم کا عہدہ محمد پاشا کو دیا گیا اور عربی پاشا وزیر فوج مقرر ہوا۔ انگریز ماہرین سیاسیات نے اخباروں کے ذریعہ عربی پاشا کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کیا۔ مئی ۱۸۸۲ء میں انگریزی اور فرانسیسی جہازی بیڑے سکندریہ (Alexandria) کی بندرگاہ کے قریب آگئے اور انہوں نے دھمکی دی کہ موجودہ وزارت مستعفی ہو جائے۔ وزارت نے استعفٰے دے دیا لیکن قاہرہ کی آبادی نے توفیق کو مجبور کردیا کہ وہ عربی پاشا کو پھر وزیر فوج مقرر کرے۔ خدیو مصر کا حکمران توفیق نے دیکھا کہ عوام اس کے خلاف ہیں اور مستقبل میں اس کے اختیارات کم کردیئے جائیں گے اس لئے وہ انگریزوں سے مل گیا ۱۱ر جولائی کو انگریزی بیڑے نے سکندریہ پر گولے برسائے۔ مصر کے پایہ تخت قاہرہ میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا گیا اور عربی پاشا کو سپہ سالار اعظم مقرر کیا گیا مگر عربی پاشا قابل سپہ سالا ثابت نہ ہوا جس کے باعث مصر کی آزادی حاصل کرنے کی پہلی کوشش ناکامیاب رہی۔

مصر اب بالکل انگریزوں کے ہاتھ میں آگیا۔ چالاک انگریزوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ مصر والوں کو اپنے ملک کی حکومت کرنے کے قابل بنا دینے کے بعد ہم مصر سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ ہمارا مقصد تو محض ان کو ترقی یافتہ بنانا ہے۔ اب تو مصر کی دولت و ثروت سر جھکائے انگریزوں کے سامنے کھڑی تھی۔ لارڈ ڈفرن وہاں کے حکمران بناکر بھیج دیئے گئے۔ لارڈ ڈفرن نے بہت میٹھے الفاظ میں مصر والوں کو پچکارا اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ لوگ خود اپنے ملک پر حکومت کریں۔ اس مقصد سے ایک قانونی مسودہ تیار کیا گیا خدیو کے سب اختیاراتِ حکومت چھن گئے اور برطانیہ کا نمایندہ ہی مصر کا حکمران بن گیا۔

مصر کی وزارت ہٹائی نہیں گئی۔ مگر ہر ایک وزیر کے ساتھ ایک انگریز افسر مقرر کردیا گیا جو دراصل وزیر کا کام انجام دیتا تھا۔ سب بڑے بڑے عہدوں پر انگریز افسر مقرر کردئیے گئے۔ صوبوں کے گورنر اور وزیر انگریز افسروں کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ اس طرح حکومت کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا گویا آزادی کا خیال و گمان بالکل غائب ہوگیا ہے۔ دس سال تک اسی طرح خاموشی طاری رہی۔

اسی وقت مصر کے سیاسی پلیٹ فارم پر آزادی کے پوجاری مصطفٰی کامل ظہور میں آئے۔ آزادی کے خیالات کی لہریں بڑی تیزی سے اس کے دل میں موج زن ہو رہی تھیں۔ جب مصطفٰی مصر میں پہنچا اس وقت انگلستان سوڈان کو فتح کرنے کی تیاریاں کررہا تھا۔ مصطفٰی نے سوڈان کی مہم میں مصر کی دولت اور فوج کے استعمال سے سخت اختلاف کیا۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود انگریزوں نے مصری خزانہ خالی کرکے مصر کے باشندوں کا خون بہا کر سوڈان اپنے فایدہ کے لئے فتح کرلیا۔ بعد ازاں مصطفٰی مصری تحریکِ آزادی کی بارہ برس تک کامیابی کے ساتھ رہنمائی کرتا رہا۔ اس نے مصر کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ پر اپنی شخصیت کا ایسا اثر ڈالا کہ وہ نوجوان مصر کا سب سے بڑا رہنما بن گیا۔ انگریزوں کے خلاف لیکچر دیتے ہوئے وہ کہا کرتا تھا کہ وہ تار ٹیلیفون اور موٹر ہمارے کس کام کے ہیں جو ہماری غلامی کو اور بھی مضبوط بناتے ہیں۔ ایک بار آمد و رفت کے ذرائع پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اُس نے بڑے رعب سے کہا کہ میں ریگستان میں ایک ہزار میل گھوڑے کی پیٹھ پر آزاد طریقے سے سفر کرنا ایک غلام ملک میں موٹر کار میں سوار ہوکر سفر کرنے سے کہیں بہتر سمجھوں گا۔ دنیائے اسلام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اُس نے ترکی کے سلطان و خلیفہ کی طرفداری کی اور پان اسلام تحریک کا بھی استعمال مصر کے لئے کیا ۱۰ر فروری ۱۹۰۸ء کو مصطفٰے فوت ہوگیا۔ تمام مصر غم میں ڈوب گیا۔

اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے باعث مصر کے باشندوں میں خودداری ر Self Respect کا وہ جذبہ جو دبا پڑا تھا ابل پڑا۔ بات یہ تھی کہ کچھ افسر دہانہ نیل میں واقع دینشادی گاؤں میں کبوتروں کا شکار کھیلنے گئے۔ گاؤں والوں نے اس طرح کبوتروں کے مارے جانے کے خلاف آواز اٹھائی۔ ادھر افسروں کی گولی سے ایک عورت گھائل ہو گئی اور انہوں نے ایک گھر میں آگ لگا دی۔ اس پر کسانوں اور افسروں میں جھگڑا ہو گیا اور تین افسروں کے چوٹیں آئیں۔ ایک گھائل افسر امداد کے لئے آدمیوں کو بلانے گیا۔ لیکن ناقابل برداشت گرمی کے باعث کچھ دور جاکر گر پڑا اور مر گیا۔ لارڈ کرومر نے اس کا بدلا لینے کے لئے اور مصری باشندوں پر انگریزوں کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے تین انگریزوں اور دو خوشامدی مصریوں کی ایک خاص عدالت قائم کی اور محض نام کی اس عدالت نے چار کو پھانسی۔ دو کو تاحیات قید خانہ اور پچاسوں کو کوڑوں سے پیٹے جانے کا حکم دیا۔

لارڈ کرومر کے بعد ایلڈن گورسٹ انگلستان کے نمایندہ ہو کر آئے۔ انہوں نے بھی ظلم وستم سے ہی کام لیا۔ بطرس پاشا جو دینشادی دفعہ کا فیصلہ کرنے والی عدالت کا صدر تھا۔ وزیر اعظم بنایا گیا۔ اب ظلم وستم کی چکی خوب زور سے چلائی گئی۔ سیاسی جماعتوں کے لوگوں کو یا تو جلاوطن کر دیا گیا یا انہیں قید خانوں میں بند کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بطرس پاشا کو ابراہیم بردانی نام کے ایک طالب علم نے قتل کر دیا۔

۱۹۱۱ء میں لارڈ کچنر مصر میں انگلستان کے نمایندہ ہو کر آئے۔

۱۹۱۳ء میں جدید قانونی مسودہ تیار ہوا۔ اسمبلی میں سیاسی جماعتوں کے لوگوں کی تعداد بڑھی اور اپنے معزز رہنما زغلول پاشا کی رہنمائی میں اسمبلی میں سرکار کے خلاف آواز اٹھاتی رہی۔

اسی وقت یورپ کی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جنگ کا آغاز ہوتے ہی انگریزوں نے مصری اسمبلی کو ایک غیر معین وقت تک کے لئے معطل کر دیا۔ ملک بھر میں مارشل لا یعنی فوجی قانون جاری کر دیا گیا۔ جلسہ وغیرہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور مصر کو سرکاری طور پر انگلستان کی حکومت میں آجانے والا ملک سمجھا جانے لگا۔ خدیو جو جنگ شروع ہونے کے وقت قسطنطنیہ میں تھا تخت سے اتار دیا گیا اور اس کے چچا حسین کو مصر کا سلطان بنایا گیا۔ سیاسی خیالات کے لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے آسٹریلیا اور ہندوستان کی فوجیں مصر میں لاکر رکھی گئیں جن کے خراب سلوک سے مصر والے بہت ناراض ہو گئے۔ اس طرح خود بخود کسان اور درمیانی طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگ ملک کی آزادی کے لئے مل کر ایک ہو گئے جس سے ۱۹۱۹ء کی تحریک کامیاب ہو گئی۔

۱۹۱۸ء میں مصر کے وزیر اعظم حسین رشدی پاشا کی درخواست پر ایک کمیشن مصر کے لئے ایک نیا قانونی مسودہ بنانے کے لئے مقرر کیا گیا۔

کمیشن کے ایک نمایندہ کی غلطی سے کمیشن کا بنایا ہوا قانونی مسودہ اخباروں میں شائع ہو گیا۔ حکومت کرنے کا قانونی مسودہ کیا تھا گویا مصر کے ساتھ مذاق کیا گیا تھا۔ مصر والے اس برائے نام حکومت کے قانونی مسودہ کو دیکھ کر بگڑ اٹھے۔ ۱۳ نومبر ۱۹۱۸ء کو زغلول پاشا نے برطانوی ہائی کمشنر سر ریجنالڈ ونگیٹ سے ملاقات کی اور انگلستان کے باشندوں کو مصر کے مطالبات سے واقف کرانے کے لئے ایک ڈیپوٹیشن لے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ساتھ ہی ایک اعلان اس مدعا کا شائع کیا گیا کہ ہم مصر والے زغلول پاشا اور ان کے ہمراہ جانے والے ڈیپوٹیشن کو اپنا نمایندہ مقرر کرتے ہیں۔ اس اعلان پر ہزاروں تعلیم یافتہ مصریوں نے دستخط کر دئیے لیکن انگریزوں نے اس فہرست کو ضبط کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ زغلول کو انگلستان جانے کے لئے اجازت بھی نہ ملی۔ زغلول پاشا نے وفد (سیاسی جماعت) کو منظم کیا اور مصر کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو زغلول پاشا اور اس کے ساتھی گرفتار کر لئے گئے اور جزیرہ مالٹا میں لے جاکر قید کر دیئے گئے۔

مصری وزارت نے استعفیٰ دے دیا۔ فوجی قانون جاری کر دیا گیا۔ اخباروں کی آزادی چھین لی گئی۔ مصر کے باشندے بے ہتھیار تھے ہتھیار رکھنے والوں کو پھانسی تک کی سزا دی جاتی تھی۔ اپنے سیاسی لیڈر کے گرفتار ہونے پر تمام ملک ناراض اور بے چین ہوا تھا۔ الازہر دار العلوم اور دیگر کالجوں کے طلبا نے جلوس نکالنے شروع کئے سینکڑوں طالب علموں کو قید کر دیا گیا۔ ۱۰ مارچ کو پھر جلوس نکالا گیا۔ گولی چلی اور بہت سے طلبا مارے گئے اور زخمی ہوئے ۱۱ مارچ کو سرکاری ملازموں نے کام کرنا بند کر دیا۔ وکیلوں نے کچہریاں چھوڑ دیں اور ٹراموں کا چلنا بند ہو گیا۔ انگریزی فوج نے گولیاں چلائیں اور مصر کے وطن پرست باشندے بہت بڑی تعداد میں مارے گئے۔ زغلول پاشا کے قید ہو جانے پر ان کی بہادر بیگم نے سیاسی تحریک کی رہنمائی کی۔ اپنے خاوند کی جاری کی ہوئی تحریک کو چلانے کے لئے یہ بہادر عورت میدان میں کود پڑی اور تمام مصریوں کو اس تحریک میں شامل ہونے کے لئے کہا

دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ تمام ملک میں پھیل گئی۔ بہت سے مقامات پر قومی حکومت قایم کر دی گئی۔ کئی دنوں تک پایہ تخت قاہرہ پر سیاسی جماعتوں کے لوگوں کا قبضہ رہا۔ بعد میں اُن پر غضب کا ظلم و ستم کیا گیا۔ فوجی طاقت سے بغاوت فرو کی گئی لیکن مصر کے باشندوں نے ستیہ گرہ کرنا شروع کیا۔ طلبا، وکیلوں اور سرکاری نوکروں نے کام کرنا ترک کر دیا۔

مئی ۱۹۱۹ء میں لارڈ ملنر کی صدارت میں ایک کمیشن مصر کی سیاسی حالت سے واقفیت پیدا کرنے اور امن و امان قایم کرنے کے ذرائع بتلانے کے لئے مصر بھیجا گیا۔ کمیشن میں ایک بھی مصری نمایندہ کو جگہ نہیں دی گئی۔ تمام ملک نے اِس کے خلاف آواز اٹھائی اور مصر کی وزارت مستعفی ہو گئی۔ ملنر کمیشن مصر میں آیا اور انگریزوں نے تعجب سے دیکھا کہ کسی مصری کا تعاون حاصل کرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ جس کسی کسان سے کوئی سوال کیا جاتا تو صرف ایک ہی جواب دیتا کہ "زاغلول سے پوچھیے"۔ ملنر کمیشن مارچ ۱۹۲۰ء میں واپس لوٹ گیا۔ لندن لوٹ کر ملنر کمیشن نے زاغلول پاشا اور عدلی پاشا سے مصر کی آیندہ حکومت کے قانونی مسودہ کے بارے میں بات چیت کی۔ ملنر کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی۔ مصر کو آزاد ملک قبول کر کے ایک مستقل صلح نامہ کی بابت ذکر کیا گیا۔ لیکن مصر کا سوڈان پر قبضہ۔ انگریزی فوج کا ملک میں رہنا۔ مالی اور قانونی وزیروں کے انگریز مشیروں کے اختیارات اور غیر ملکی پالیسی پر انگریزوں کا قبضہ اِن چار سوالوں پر زاغلول اور حکومت انگلشیہ میں اختلاف رہا۔ اس لئے سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

زاغلول نے وفد کے جلسے کا اہتمام کیا لیکن گورنمنٹ نے اُسے روک دیا۔ مارشل لا یعنی فوجی قانون جاری کیا گیا۔ زاغلول اور اُن کے ساتھی پھر گرفتار کئے گئے اور عدن بھیج دئے گئے۔ گولی چلی۔ مصر کی عورتوں نے بیگم زاغلول کی رہنمائی میں پھر ستیہ گرہ کیا۔ ۲۸ر فروری کو انگریزوں نے مصر کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ لیکن وہ آزادی محض فرضی تھی۔ تمام اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں ہی تھے۔ اس کے بعد سلطان نے "کنگ" کا خطاب استعمال کیا اور ثروت پاشا نے وزارت بنائی۔ عوام نے زاغلول پاشا کے رہا کئے جانے کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۲۳ء میں زاغلول قید سے رہا ہو کر مصر میں آ گئے۔ ۱۹۲۴ء میں عام انتخابات ہوئے۔ وفد کو ان میں مکمل کامیابی حاصل ہوئی۔ زاغلول پاشا وزیر اعظم مقرر ہوئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ میری پالیسی مصر کو مکمل طور پر آزاد کرنا ہے۔ زاغلول نے انگریزی فوج کا صرفہ دینا نامنظور کر دیا۔ اور مطالبہ کیا کہ نہر سویز مجلس اقوام کے قبضہ میں دے دی جائے۔ ادھر انگلستان کی عنان حکومت ٹوری جماعت کے ہاتھ میں آ گئی اور اُنہیں دنوں مصر میں مقیم انگریزی فوج کے سپہ سالار کو کسی نے قتل کر دیا۔ انگلستان کی حکومت نے پانچ لاکھ پونڈ بطور ہرجانہ اور سوڈان سے مصری فوج کے اخراج اور مصری وزرا کے انگریز مشیروں کے اختیارات کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ زاغلول نے یہ مطالبات نامنظور کر دیئے اور اہل وطن کا خون بہانا مناسب نہ سمجھا اور استعفیٰ دے دیا۔

ایک بار پھر مصر میں بغاوت برپا ہو گئی۔ سلطان فواد اور ان کے خوشامدی درباریوں کا راج ہو گیا اور انگریزوں کا غلبہ قایم رہا۔ اس بار وفد اور دیگر جماعتیں متحد ہو گئیں اور درباریوں کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ جدید انتخاب ہوا۔ وفد کی جماعت کو پھر کامیابی ہوئی اور زاغلول پھر وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ لیکن مذکورہ بالا چار مسائل پھر بھی طے نہ ہو سکے۔ سلطان فواد انگلینڈ گئے لیکن ان چار سوالات پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس کے بعد زاغلول کا انتقال ہو گیا۔ اُس قابل تقلید رہنما نے مصر کو نئی زندگی دی لیکن اپنے ایام زندگی میں مصر کو مکمل طور پر آزاد نہ دیکھ سکا۔ تب سے سلطان اور وطن پرست جماعتوں میں برابر جھگڑا ہوتا چلا آ رہا ہے۔

۱۹۳۵ء میں اٹلی نے ابی سینا پر حملہ کر دیا اور ابی سینا کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس لئے برطانیہ کی طاقت بحر روم اور بحر قلزم و سوئز نہر میں بہت کمزور ہو گئی۔ جماعت وفد کے اراکین اس موقع سے فایدہ اٹھا کر مصر کے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل کرنے کی تجاویز سوچ رہے تھے۔ اور انہیں امید تھی کہ مصر کی حکومت اس موقع پر انگریزوں پر دباؤ ڈال کر کوئی فایدہ مند معاہدہ کر سکے گی لیکن ولی عہد فاروق کو بغرض تعلیم برطانیہ بھیجے جانے سے انہیں مایوسی ہوئی۔ اسی وقت ۹ر نومبر کو وزیر خارجہ سر سیموئل ہور نے اس بات کا اعلان کیا کہ برطانیہ کی گورنمنٹ اس وقت مصر میں حکومت کا کوئی جدید قانونی مسودہ نافذ نہیں کرنا چاہتی۔ اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف طلبا اور کسانوں اور مزدوروں نے جلوس نکال کر اور جلسے کر کے اپنی مخالفت کا اظہار کیا۔ اس طرف سے خوب تشدد ہوا۔ بہت سے آدمی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ اس وقت تمام سیاسی جماعتیں متحد ہو گئیں۔ وفد لبرل جماعت نوجوان نیشنلسٹ اور آزاد جماعت سبھی نے مل کر ایک متحدہ جماعت بنائی

اور نحاس پاشا اس کے رہنما منتخب ہوئے۔ وطن پرستوں کی اس زبردست جماعت کو دیکھ کر سلطان فواد جھکے اور انگریزوں نے بھی مصر کی خطرناک حالت کو محسوس کیا۔ مصر کے ہائی کمشنر نے اس مدعا و مطلب کا اعلان شائع کیا کہ اگر مصر میں ایسی حکومت قایم ہو جائے جس میں سب جماعتوں کی نمایندگی ہو تو انگلستان مصر سے صلح کرنے کو تیار ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نسیم پاشا کو اپنا مرتبہ چھوڑنا پڑا اور سب سیاسی جماعتوں نے انگلستان سے صلح کرنے کے لئے ایک نمایندہ جماعت قایم کی۔ نحاس پاشا اس کے لیڈر یا صدر منتخب ہوئے۔ یہ نمایندے مارچ میں صلح کرنے کے لئے انگلستان گئے اور ادھر مصر کی پارلیمنٹ کا انتخاب ہوا اور وفد جماعت کے لوگوں کی اس میں کثرت ہو گئی۔ بہت مہینوں کی محنت کے بعد صلح ہو گئی جس کی شرطیں حسب ذیل ہیں:-

مصر پر سے فوجی قبضہ ہٹا دیا جاوے گا اور دونوں ملکوں میں دوستی سمجھی جائے گی۔ یہ صلح صرف بیس سال تک کے لئے ہوگی اور پھر اس میں ردوبدل ہو سکتا ہے۔ کسی تیسرے ملک سے جنگ ہونے پر فریقین ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ جنگ کے وقت برطانیہ کی حکومت مصر کی تمام فوج و ریلوے لائن اور بندرگاہوں وغیرہ کا استعمال کر سکے گی۔ یہاں تک کہ مصر کی حکومت کو بھی اپنے اقتدار میں لے سکے گی اور ضرورت پڑنے پر مارشل لا بھی جاری کر سکے گی۔ سوئز نہر کے علاقے میں حکومت برطانیہ کو دس ہزار برطانی سپاہی اور چار سو طیارہ بازرکھنے کا اختیار رہے گا۔ یہ فوج وہاں تبھی تک رہ سکے گی جب تک کہ مصر کی فوجیں نہر کی حفاظت کے قابل نہیں ہو جاتیں۔ قابلیت کا تصفیہ یا تو مجلس اقوام یا کوئی ایسا پنچ کرے گا جسے دونوں ملک قبول کر لیں۔ مصر کی فوجوں کے انگریز افسر ہٹا دیئے جائیں گے۔ لیکن حکومتِ مصر ایک برطانوی فوجی مشن کا مشورہ لیا کرے گی۔ سوڈان کی حکومت پہلے کی سی ہی ہوگی۔ صلح کے ذریعے یہ طے ہو گیا کہ سوڈان کی حکومت کا منشا سوڈان کے باشندوں کی ترقی ہوگا۔ مصر میں غیر ملکیوں کو جو قانونی اور مالی سہولتیں ملی ہوئی ہیں ان کو باہمی تصفیہ سے حکومت برطانیہ ختم کروانے کی کوشش کرے گی۔ آیندہ مصر کی حکومت پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اور غیر ملکیوں کے بارے میں قانون بنانے میں کوئی دخل اندازی نہیں ہوگی لیکن مصر کی سرکار کو یہ تسلی دینی ہوگی کہ وہ غیر ملکیوں کے لئے غیر منصفانہ نہ ہوں گے۔

ان شرائط کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصر ابھی آزادی سے بہت دور ہے ۱۹۳۰ء کی صلح کا مسودہ تقریباً یہی تھا لیکن مصر والوں نے اسے اس وقت قبول نہیں کیا تھا۔ دو وجوہات سے نحاس پاشا نے اس صلح کو قبول کر لیا۔ ایک تو بڑے خاندان سرمایہ دار اور شاہی خاندان کے لوگ اور خود سلطان بھی وطن پرست لوگوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ دوسرے اٹلی کا ابی سینیا پر قبضہ ہو جانے سے مصر کو بھی اٹلی کی جانب سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

صلح کے کچھ ہی دنوں بعد سلطان فواد کی موت ہو گئی۔ ولیعہد فاروق تخت نشین ہوئے۔ نوجوان سلطان اور نحاس پاشا میں کچھ اختلاف تھا نحاس پاشا رفتہ رفتہ پارلیمنٹ کی طاقت کو بڑھانا چاہتے تھے لیکن مشرقی ممالک میں جہاں ابھی تک شخصی حکومت کا رواج رہا ہے عوام کی حکومت دھیرے دھیرے ہی قایم ہو سکتی ہے۔ جیسے جیسے شخصی حکومتوں کی طاقت ختم ہوتی جائے گی عوام کی حکومت ترقی کی طرف بڑھتی جائے گی۔ اور مصر کی آزادی کا وقت قریب آتا جائے گا۔

تازہ ترین حالت یہ ہے کہ نحاس پاشا کو شاہ فاروق سے اختلاف کی بنا پر وزارت سے دست کشی کرنی پڑی اور اب ایک ایسی وزارت برسر اقتدار ہے جس کے عناصر میں شاہ پرستی اور برطانیہ کی دوستی دونوں شامل ہیں۔

شنکر سہائے سکسینہ ایم اے ایم کام

دنیائے ادب

منشی خیرات علی نے ریڈیو خریدا

منشی خیرات علی یادش بخیر، بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ گو شکل سے لوم ہوتا ہے کہ غدر سے پہلے کی پیداوار، یا فرنگی محل کے آس پاس کی پود ہیں مگر آنکھیں رکھتے ہیں۔ ان سے کام لیتے ہیں۔ علوم مروجہ کے نظریات و مشاہدات کے قائل ہی نہیں بلکہ عامل بھی ہیں اور محض اخلاق جلالی اور مثنوی مولانا روم کے زور پر ہی دنیا کو آگے لگائے نہیں پھرتے۔ اکثر بایں ریش و فش بیسویں صدی کی رنگینیوں میں یوں کود پڑتے ہیں کہ دیکھنے والے مایوس ہو جاتے ہیں کہ اب تو لاش ہی ہاتھ آئے گی۔ مگر تھوڑی دیر میں کنارے کھڑے خشک دامنی کا دعوے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

منشی خیرات علی اترنے کو تو دلی کے سٹیشن پر اتر گئے مگر نہ کسی نے پوچھا اور نہ انہوں نے بتایا کہ کیوں اترے اور کس تقریب سے۔ خیر سٹیشن پر اترے سسرال میں پہنچے نسبتی بھائی کے بیٹے کی شادی میں شریک ہوئے۔ خوش دامن کو سلام کیا۔ اس نے بلائیں لیں، دیوان خانے میں آئے۔ بھائی بندوں سے مصافحہ کیا۔ بغل گیر ہوئے اور بیٹھ گئے۔

شادی کی تقریب اور برات کے ہنگامے تھے۔ گھر اور باہر کے سب خوشیاں منا رہے تھے۔ گراموفون بج رہا تھا۔ "یاد نہ کر دلِ حزیں" والا ریکارڈ چڑھا تھا۔ اہل دل سر ہلا رہے تھے۔ لڑکے بالوں کا جمگھٹا تھا۔ مگر منشی خیرات علی کو کہاں گوارا کہ اس خوشی کی محفل میں زندگی کی بے ثباتی کا راگ الاپا جائے فوراً بول اٹھے۔

"میاں عیدو! یہ کیا لگا رکھا ہے۔ اگر کوئی چیز ہے تو سناؤ ورنہ یہ کھڑاگ اٹھاؤ۔ یہاں محفل شادی ہے اما م باڑہ تو نہیں۔

عیدو۔ بہت اچھا دولہا بھائی! میرا خیال تھا کہ آپ موٹر لاری سے سفر کرتے آرہے ہیں۔ جہاں قدم قدم پر دنیا فانی نظر آتی ہے۔ آپ ہی کی خاطر یہ ریکارڈ چڑھا دیا تھا اور لیجئے۔

منشی جی۔ ارے میاں ہم نے زندگی کا بیمہ نہیں کرا رکھا کہ لاری سے سفر کریں۔ ریل سے آیا ہوں، پھول کی طرح پہنچا ہوں۔ ہاں "پریم نے آگ لگا دی من میں"۔ دیکھو تو کوئی بات تو ہوئی یہ اور بات ہے کہ آج ہندوستان کو پریم کا بھوت بے ڈھب ہو کر لپٹا ہے۔ خدا ہی بچائے گا اس پریم کہانی سے کہو، کوئی حقانی چیز بھی ہے۔

منوں۔ (منشی جی کا صاحبزادہ) ابا! امی جان بلاتی ہیں۔ اس پیغام نے منشی جی کا لطف کر کرا کر دیا۔ اٹھ کر زنانخانے کو چل دیئے۔

بیوی۔ اے باہر سے آئے باہر ہی بیٹھ گئے۔ اندر آکر بچوں کے سر پہ ہاتھ تو پھیرتے۔ گلنار آپا نے بھی کہا کہ بھائی کیسے سخت دل ہیں۔

منشی جی۔ بچوں اور گلنار کی تو خیر، آپ اپنی کہیئے کہ یہ گل خیرو آپ کی مزاج پرسی کے لئے کیوں حاضر نہ ہوا۔ کہئے کیا ارشاد ہے۔

بیوی۔ میں کہنا چاہتی تھی کہ یہ بچے گراموفون کے لئے سر ہو رہے ہیں۔

منشی جی۔ کیا مضائقہ ہے لیتے چلیں گے۔ "ہز ماسٹرز وائس" اچھا رہے گا۔

بیوی۔ نہیں وہ "کتے" والے کے لئے کہتے ہیں۔

منشی جی۔ ہاں ہاں کتا ہی تو اپنے مالک کی آواز پر کان لگائے ہے۔

بیوی۔ ہاں، وہی۔ لو اب چلے، آرام تو کر لیتے۔

منشی جی۔ اچھا دیکھا جائے گا۔

منشی خیرات علی حسب معمول بیٹھک میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے حقے کے کش اڑا رہے تھے کہ مرزا علمدار آوارد ہوئے گراموفون کی خرید

کے بعد منشی جی کی بیٹھک خوش فکروں کا ٹھکانہ بن گئی تھی۔

منشی جی۔ آئیے مرزا صاحب، کدھر رہے۔

علمدار۔ کئی روز سے گراموفون کی آواز نہیں آئی۔ کل ہی بنارسی کباڑی کی دُکان پر ایک بے بس سا گراموفون دیکھا۔ قطع وضع سے بالکل آپ کا سا تھا مگر شکل و شباہت نہ تھی۔ میں نے خیال کیا کہ پوچھوں گا۔

منشی جی۔ ارے صاحب چھوڑئیے اس مخمصے کو۔ یہ گراموفون بھی ہماری زندگی کا ایک رنگین حادثہ ہے۔ شکر ہے اس سے نجات ملی۔ گراموفون کیا تھا۔ ایک آفت تھی۔ ہر وقت بجا۔ دن رات بجا۔ گلی گلی، محلہ محلہ بجا۔ بجتا ہوا چھوڑ کر دفتر جاتے اور جب واپس آتے بجتا پاتے۔ جب کسی اپنے پرائے نے مانگا معہ ریکارڈوں کے دے ڈالا۔ سوئیاں بھی گھر سے دیتے کہ کہیں لوگ جاپانی سوئیوں سے کام لے کر ریکارڈ بے کار نہ کر دیں۔ مگر معلوم نہیں ظالم مانگنے والے سوئی کے بجائے کیا کچھ استعمال کرتے کہ ریکارڈ تیسرے دن بے کار ہو جاتے۔ پھر کہیں کمپنیوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم نے گراموفون خریدا ہے۔ پھر کیا تھا۔ ہر ڈاک سے ریکارڈوں کی فہرستیں آنے لگیں اور ہر روز ایک دو نئے اور تازہ ریکارڈوں کے لئے بیوی کی فرمائش ہونے لگی۔ لیکن غنیمت ہے جلد ہی مشین کا چرخا ڈھیلا ہو گیا ایک روز آ کر دیکھا کہ منّوں میاں گراموفون کی انتڑیاں نکالے پوسٹ مارٹم میں مصروف ہیں۔ ریکارڈ تو ہر روز ٹوٹتے تھے۔ مگر اس دن ننھی نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ ہم نے یہ منظر دیکھ کر بنارسی کباڑی کو بلا بھیجا۔

علمدار۔ صاحب یہ تو ناقابلِ تلافی حادثہ ہے۔ میں کبھی ایسے فیصلے کی تائید نہ کرتا۔ مل بیٹھنے کا ایک سلسلہ بنا تھا سو جاتا رہا۔

منشی جی۔ بے شک ملال تو ہوتا ہے۔ مگر مفت کے شوقینوں کا کیا علاج۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لوگوں کو پرائی چیز برتنے کا سلیقہ نہیں۔

علمدار۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ انہیں اب قدر معلوم ہو جائے گی۔ لیکن کہنا پڑتا ہے۔ ہمارے بھائیوں کی ترقی و تعلیم کے معاملے میں ایسی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔

منشی جی۔ میں خدانخواستہ شکایت نہیں کرتا محض تجربے کا اظہار ہے۔ دل بستگی کی کوئی اور صورت پیدا ہو جائے گی۔ ادھر اپنی عافیت خطرے میں ہے کیونکہ بیگم صاحبہ بھی ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہیں، گھر والیوں کے لئے اب اور تو کوئی کام ہی نہیں رہا۔ سینا پرونا۔ کوٹنا پیسنا مدت ہوئی جاتا رہا۔ کیا گانا بجانا بھی نہ ہو۔ اب بتلائیے۔ یہ بے چاریاں کریں تو کیا کریں۔ کھانا پکانا اور بچوں کی پرورش بھی ان کے بس کا روگ نہیں۔ باورچی اور نرسیں عام ہیں۔ اگرچہ ان کاموں کے متعلق ہمیں اس غریب سے کوئی شکایت نہیں۔ تاہم بے وقت کی سماع خراشی سے مہلت مل سکتی ہے۔ یہ تجربہ گراموفون سے حاصل ہوا ہے۔ میں خود فکر میں ہوں تفریح کی کوئی اور صورت نکل آئے گی۔

مرزا علمدار گئے تھے کہ میر باقر آپہنچے۔ گراموفون تقریب ملاقات تھی۔

میر باقر۔ کہئے حضرت۔ کیا دھن چھیڑ رکھی ہے۔ وہ نیا ریکارڈ کیسا رہا؟

منشی جی۔ آں قدح بشکست۔

میر باقر۔ اللہ ساقی کو سلامت رکھے۔ خیریت تو ہے۔

منشی جی۔ آپ کو تو معلوم ہے۔ وہ گراموفون مدت سے ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ ختم ہو گیا۔

میر باقر۔ واہ صاحب غضب کیا۔ خیر ہم سناتے ہیں رات سیٹھ خوش بخت رائے کے ہاں دعوت تھی۔ آپ جانتے ہیں سیٹھ جی کا دم غنیمت ہے۔ اس محفل میں شیخ و برہمن میں امتیاز ہی نہیں محفل گرم تھی۔ رہ رہ کر آپ کا ذکر آیا۔ آپ نے تو سنا ہے۔ ریڈیو کس کیفیت کی چیز ہے۔ آپ جانتے ہیں سیٹھ خوش بخت تو دوستوں کے دوست ہیں۔ انہوں نے ریڈیو لگوا لیا ہے۔ بڑی تاکید کر رہے تھے۔ آج ضرور تشریف لائیں ورنہ انہیں شکوہ ہو گا۔

منشی جی۔ خوب لیجئے۔ چلیں گے میں نے ریڈیو سنا ہے۔ اچھی چیز ہے۔ مگر بڑے تردد کا آلہ ہے اور پھر اپنا گھر منّوں اور رحالی موالی اس کے علاوہ غیر ممالک کا پروگرام اپنے لئے بے سود ہے۔ ساتھ بجلی کا خرچ اور آپ سے کیا چھپانا۔ اس گراموفون کا تجربہ تلخ رہا۔

میر باقر۔ گراموفون تو ریڈیو کے مقابلے میں گرد ہو گیا۔ اسے بھول ہی جائیے۔ ہمارا تو اپنا ارادہ ہے کہ ریڈیو لگوا لیا جائے۔ مگر ابھی بجلی کا انتظار ہے بجلی کمپنی کو روز تقاضا کیا جاتا ہے سارا محلہ چلا رہا ہے۔ اندھیر پڑا ہے۔ کوئی نہیں سنتا۔ آپ کے ہاں تو ماشاءاللہ بجلی کی آسانی ہے پھر تردد کیا ہے۔

منشی جی۔ مگر یہ مفت کی فرمائش کون پوری کرے گا کہ خالو ابا ذرا ریڈیو سننا چاہئے اور خالہ ریڈیو سننا چاہتی ہیں کب فرصت ہو گی"۔ گویا ریڈیو

کیا لگو ایا ہم نے محلہ بھر کے جہانوں کی تفریح کا ذمہ لے لیا ہے اور سنئیے۔ آئے گئے اور ایسے جہانوں کی اگر کچھ تواضع نہ کی جائے تو شکل فوراً کہہ دیں گے کہ شربت تو درکنار پان تک کے لئے نہ پوچھا۔

میر باقر۔ آپ تو بہت دور پہنچ گئے۔ اگر اسی کا خیال کیا جائے تو زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ دنیا کے کام کاج بند ہو جائیں گے۔ آپ مذاق نہ کیجئے ذکر۔ ریڈیو کا ہے۔ نہ ریکارڈ کی ضرورت۔ نہ سوئی کی کسی چیز کا تردد ہی نہیں۔ شہر شہر کا نمبر علیحدہ علیحدہ۔ پروگرام جدا جدا اور گانے والے کیا کہنا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں سٹیشن قائم ہیں۔ جس شہر کا گانا سننا چاہیں۔ سوئی گھما دیں۔ بس پھر کیا ہے۔ آسمان سے نغمے آنے لگتے ہیں۔ بچوں والے گھر ہیں یہ چیز ضرور ہونی چاہئے گھر کی رونق کے لئے یہ ہنگامہ لازم ہے۔

منشی جی۔ بہت خوب۔ میں گھر میں بات کروں گا۔

میر باقر۔ زیادہ غور کی تو چنداں ضرورت نہیں۔ سیٹھ جی کے ہاں تو آج شام تشریف لائیے گا۔

منشی جی۔ میاں ہم جانتے ہیں کہ ریڈیو اچھی ایجاد ہے۔ مگر بیوی سے بھی تو مشورہ کرلیں۔ خیر شام کو ملاقات ہوگی۔

بانو۔ یہ دفتر سے آنے کا وقت ہے۔ کچھ اپنی تندرستی کا بھی خیال ہے۔

منشی جی۔ لو ایک خوشخبری سناتے ہیں۔ بھلا بتاؤ تو۔

بانو۔ مجھے ان پہیلیوں کا کیا پتہ ہے۔ کپڑے بدلئے۔ تولیا صابن رکھا ہے۔ ہاتھ منہ دھوئیے۔ چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

منشی جی۔ بس ہار گئیں سنئیے۔ ہم نے ریڈیو خرید لیا ہے۔

بانو۔ وہی جس کا ذکر تھا بھلا یہ کیا وحشت ہے۔ گراموفون سے نجات ملی تھی ایک اور نیا ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔

منشی جی۔ بانو! اس میں زیادہ ہنگامہ نہیں۔ ریڈیو والے خود آکر ہر ایک چیز کیل کانٹے سے درست کر جائیں گے۔ ہمیں صرف سوئی گھمانی ہوگی اور بس پھر کیا ہے۔ ع

مطرب بنغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

بانو۔ یہ تو گھر پھونک تماشا ہے۔ گانا سناؤ اور باتیں سنو۔

منشی جی۔ اب تو ہم سودا کر آئے ہیں اور شکوے تو تمہاری سہیلیاں ہی کرتی ہوں گی۔

بانو۔ زیادہ بحث نہ کیجئے کپڑے بدلئے۔ چلئے تیار ہے۔

اتوار کا دن تھا منشی خیرات علی کو فرصت تھی۔ ریڈیو اور ریڈیو لگانے والے پہنچ گئے۔ منشی جی کبھی اندر جاتے کبھی باہر جاتے۔ باتوں باتوں میں خبر اڑ گئی کہ منشی خیرات علی نے ریڈیو خرید لیا۔ ایک ہنگامہ بنا محلے کے لڑکے بانس لگتے دیکھ خوشی سے بلیوں اچھلنے لگے۔ مرزا علمدار پہنچے۔ میر باقر بھی آمودار ہوئے۔ تو چل، میں چل، تانتا بندھ گیا

علمدار۔ منشی جی یہ کیا قصہ ہے۔

منشی جی۔ مرزا قصہ کیا ہونا تھا۔ بس ہم نے ریڈیو خرید لیا ہے یہ بانس کے کھمبے لگنے کی دیر ہے۔

علمدار۔ خوب۔ یہ تو واقعی مزے کی چیز ہے۔ میں نے خوش بخت رائے سیٹھ کے ہاں سنا طبیعت خوش ہو گئی۔

منشی جی۔ کیوں نہ ہو۔ مغرب والوں کی جدت طرازیاں ہیں (میر باقر کو دیکھ کر) میر صاحب کے اندازِ بیان کا اثر ہے۔ ورنہ اپنی طبیعت سے آپ واقف ہیں۔

میر باقر۔ خوب۔ آپ ذرا اپنے دل سے تو پوچھئے سیٹھ صاحب کے ہاں کیسے محو ہو رہے تھے۔

منشی جی۔ چلئے یوں ہی سہی۔

علمدار۔ فرمائیے۔ کب تک مکمل ہو جائے گا۔

منشی جی۔ آج شام کا پروگرام سن لیجئے۔

میر باقر۔ واقعی کلکتہ اور اور دہلی میں پانچ چار چیزیں سننے کے لائق ہیں۔

علمدار۔ پانچ چار چیزیں واقعی؟

منشی جی۔ عجیب لطف رہے گا!

میر باقر۔ اس میں کیا شک ہے؟

. . . .

علمدار۔ تو پھر جلدی کیجئے۔

منشی جی۔ میاں سچ پوچھو تو عجیب چیز ہے۔ پریوں کا شیشے میں اترنا تو سنتے آئے تھے لیکن آواز کو باندھ کر پر لگا دینا ریڈیو کا حصہ ہے۔

میر باقر۔ فرمائیے۔ ارباب بزم کو تو معلوم ہو گیا ہوگا۔

منشی جی۔ ابھی باقاعدہ اطلاع تو نہیں دی۔ بھائی علمدار دوست احباب کو مطلع کر دینا۔

علمدار۔ کیوں نہیں۔ ضرور۔ اطمینان رکھئے ابھی گھر گھر خبر جائے گی۔

میر باقر۔ ایک غیر رسمی سو افتتاح کا اعلان کیوں نہ کر دیا جائے۔ ایک تقریب ہے محض چائے وائے کا تردد ہوگا۔

منشی جی۔ خیال اچھا ہے۔ کیا مضائقہ ہے۔ بھائی علمدار اسی طریق سے اطلاع کر دیجئے۔ آخر اپنے دوست احباب تو ہیں۔ چھ بجے شام کا وقت مناسب ہوگا۔

علمدار۔ بالکل درست ہے۔

ریڈیو کا قائم کر دینا بات ہی کیا تھی۔ بانس کھڑے کر کے تاریں پھیلا دی گئیں اور بجلی کے تار جوڑنے کی دیر تھی کہ ریڈیو چلنے لگا پھر بھی ریڈیو والوں کی چستی کی داد دینی چاہئے کہ دیکھتے دیکھتے ہزاروں میل سے مطلب کی آوازیں آنا نے لگے اور دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ منشی جی کو خوب معلوم تھا کہ ریڈیو کی خرید کے متعلق بیوی کا اعتراض رسمی کارروائی ہے جو خالص اتفاق رائے کی سند ہے۔ واقعی بیوی کا شوق میاں سے دو قدم آگے تھا۔ میاں نے تو بعد میں سوچا تھا مگر بیوی نے پہلے ہی سے اپنی سہیلیوں کو رقعے جاری کر رکھے تھے۔ شربت پان الائچی کا انتظام تھا اور میاں کے دوستوں کے لئے چائے بسکٹ کی ترکیب تھی۔ نوکر چاکر مشغول تھے۔ آمد و استقبال کی تیاریاں تھیں۔ ڈولی اور تانگے آنے لگے۔ میاں منو اور ان کے دوست زنانے مردانے میں ہر جگہہ ادھم مچا رہے تھے۔

خیر منشی جی کے احباب پہنچے۔ گھر والی کی سہیلیاں اور بے شمار خالائیں پہنچ گئیں۔ بیوی پھولی نہ سماتی تھی۔ باہر مردان خانے کا انتظام و استقبال مرزا علمدار اور میر باقر کے ذمے تھا۔ منشی جی یہ رکھ کر وہ دھر ہر جگہہ مصروف تھے۔ دوست احباب کی آمد تھی۔ منشی جی نے وہ شیروانی پہن رکھی تھی جو کبھی کبھی ایسے موقعوں پر نمودار ہو کر پھر غائب ہو جاتی تھی۔ چھ بجنے والے تھے۔ افتتاح کی رسم کا وقت آرہا تھا۔ مگر بعض لوگوں کو اپنی روحانی ذمے داری کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ مغرب کی نماز کا وقت بھی قریب تھا۔ چنانچہ فوراً قرار پایا کہ نماز سے فارغ ہو کر افتتاح کی رسم ادا کی جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ پاس ہی مسجد تھی۔ اس غریب کے نصیب جاگ اٹھے۔ چھوٹے صحن میں جمعتہ الوداع کا نظارہ دکھائی دینے لگا۔ مہمان نماز سے فارغ ہو۔ دعائیں مانگ منشی جی کے دیوان خانے میں آ دھمکے لمبی دعائیں مانگنے والوں کو آواز دی گئی۔ زنان خانے کی کیفیت کچھ سو تعلق رکھتی تھی۔ مستورات چھوٹی چھوٹی جماعت پسند کرتی ہیں۔ کونے کونے میں خطبہ ہو رہا تھا۔ بات سننے کا کوئی امکان نہ تھا۔

افتتاح دہلی کے پروگرام سے ہوئی۔ کیوں نہ ہوتی۔ بیوی کے میکے اور میاں کے سسرال کا شہر تھا۔ لیکن لوگوں پر یہی ظاہر کیا گیا کہ دارالحکومت کا پروگرام ہے۔ سلطنت کی عظمت کا لحاظ لازم ہے۔ افتتاح سے پہلے میر باقر نے ایک مختصر مگر جامع تقریر کی۔ جسے مقامی ایڈیٹروں نے پرمغز قرار دیا اس میں منشی جی کے وسیع النظر اور مہمان نواز ہونے کا اعتراف کیا گیا۔ اس کے جواب میں منشی جی نے چند الفاظ میں ریڈیو کی اختراع اور اس کی تعلیمی برکتوں اور خوبیوں کی تشریح کر کے میر باقر سے افتتاح کرا دیا۔ اب کیا تھا۔ اندر باہر سناٹا چھا گیا۔ ریڈیو کے بکس پر سب کی نگاہیں لگی تھیں۔ گڑ ڑ۔ گڑ ڑ۔ ٹڑ ٹڑ گڑ پڑ۔ سائیں سائیں وغیرہ آوازوں کے بعد سریلی آواز نکلی۔ غزل شروع ہوئی "قرار ہو تو کہوں بے قرار کس سے کہوں"۔ واہ وا۔ خوب کیا کہنا۔ اک نظر ادھر بھی۔ سو اللہ بے قراری! اس قسم کی داد کے چھینٹے پھوٹ پڑے۔ مگر میر باقر نے خاموشی کے لئے تاکید کی اور کہا کہ ریڈیو کے معاملے میں داد تنقید کے حقوق صرف اخباروں اور رسالوں کے لئے محفوظ ہیں اور سامعین کا کام خاموشی سے سنتے رہنا ہے۔ یہ مشفقانہ ہدایت موثر ثابت ہوئی۔ افتتاحی غزل کے بعد اور چیزیں سنی گئیں۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ لاہور۔ پشاور کی چیدہ چیدہ چیزوں کا لطف اٹھایا گیا۔ دنیا کی خبریں۔ دیہات سدھار کی رفتار۔ ڈرامے۔ افسانے ہر ایک کے نمونے سنے گئے۔ حاضرین عش عش پکار اٹھے۔

زنان خانے میں کچھ اور رنگ تھا۔ بوڑھی بیبیاں حیرت میں تھیں۔ بال بچے والیاں غیر جانبدار اور نئی روشنی والیاں اپنے اپنے انداز و مذاق کے مطابق لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ مگر میر باقر کی ہدایت کے باوجود کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

افتتاحی پہلی نشست کے بعد چائے بسکٹ سے حاضرین کی تواضع کی گئی اور پان سگرٹ کا دور تو پروگرام کے دوران میں ہی جاری رہا۔ پان کھانے والوں سے دم بدم دیواروں کا رنگ بدل رہا تھا اور منشی جی دیکھ دیکھ کر کباب ہوتے جاتے تھے۔ بیوی کے ہاں تو کوئی کہنے والا ہی نہ تھا کہ پرایا گھر ہے۔

پروگرام بخیر و خوبی ختم ہوا۔ مہمان اپنے اپنے گھر سدھارے۔ بعض کھانا کھا کر رخصت ہوئے۔ بہت واہ وا ہوئی۔ آئندہ کے لئے وعدے ہوئے۔ یہ بزم نشاط بہت کامیاب رہی۔ میر باقر نے مبارکباد دی اور مرزا علمدار نے بعض مہمانوں کی بے شعوری کا شکوہ کیا۔ مگر منشی جی نے یہ کہہ کر

کہاں ملک ہے رفتہ رفتہ شعور آ جائے گا۔ بات ختم کر دی اور انہیں شکریے کے ساتھ رخصت کیا۔ پھر گھر میں گئے بانو کو خوش دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ دن بھر کی کوفت مٹا دی۔ رکھ رکھاؤ سے فرصت ملی۔ آرام کیا۔ منوں میاں کی باتیں سنیں۔ سو رہے۔

منشی جی۔ کہئے بانو! رات ریڈیو کا کیسا لطف رہا؟

بیوی۔ کیا بتاؤں گلنار آپا اور نگہت کو تو یقین نہیں آتا کہ گانے والیاں کلکتہ اور بمبئی میں تھیں۔ البتہ ایک بات ضرور ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کچھ ہونے کو ہے۔

منشی جی۔ سنتی جاؤ۔ دیکھتی رہو۔ یہ نہ پوچھو کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے کو ہے۔ ایک سیلاب ہے۔ اس تہذیب کی کشتی دیکھئے کون سے کنارے لگتی ہے اور کون کون پار اترتا ہے۔ اچھا اور سنئے گا۔ ریڈیو کا آلہ بہت نازک ہے بغیر سمجھے نہ چلانا اور منوں سے تو بہت بچا کر رکھنا اور آئے گئے کو بھی چند روز دور ہی رکھنا۔

بیوی۔ میری جانب سے اطمینان رکھئے مگر میں منوں کا ذمہ نہیں لیتی۔

منشی جی۔ خیر میں نے کہہ دیا ہے۔

منشی جی نے ریڈیو کیا خریدا دوست آشناؤں کے لئے ایک تماشا ہو گیا اور ساتھ ہی حلقہ احباب وسیع ہو گیا۔ بیوی کی نئی سہیلیاں پیدا ہو گئیں پان چھالیا کا خرچ بڑھ گیا۔ صبح و شام چائے بسکٹ کے دور چلنے لگے ایک ہنگامہ رہنے لگا۔ کبھی کبھی میاں اور بیوی کے مہمانوں کا شوق حریفانہ کیفیت پیدا کر دیتا۔ ایسی صورت میں ریڈیو زنانخانے اور بیٹھک کی درمیانی محراب میں رکھ دیا جاتا۔ مگر اکثر اوقات ادھر ریڈیو چلتا ادھر بیوی کی سہیلیاں اپنے اپنے ریڈیو شروع کر دیتیں۔ اس رقیبانہ فضا میں بچارا ریڈیو مدھم پڑ جاتا۔ کبھی کبھی منوں کی مہربانی اور احباب کی بے احتیاطی سے غریب ریڈیو کی کل بگڑ جاتی تو منشی جی کو دس پانچ روپے کی زائد چپت لگتی۔ بہر حال ایسی کیفیت کچھ عرصہ جاری رہی۔ مگر کب تک۔

علمدار۔ اخبار دکھا کر منشی جی یہ ریڈیو سیٹ کی فروخت کا آپ نے اشتہار دیا ہے۔ کیا طبیعت سیر ہو گئی۔

منشی جی۔ بیشک نئی چیز ہے مگر بعض دفعہ جہاں سنو زبردستی کا گانا ہو رہا ہے اور ہم مجبور ہیں۔ پھر دوست کچھ سننا چاہتے ہیں اور ہم کچھ اور بیوی اور ان کی سہیلیاں اپنی فرمائش کرتی ہیں ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہٹاؤ اس خرخشے کو۔

علمدار۔ یہ تو قیامت ہو گئی۔ تمام بزم کا سرور و سوز جاتا رہا۔ کیا سیٹ مکمل ہے؟

منشی جی۔ ہاں یہ ڈبہ اور اوپر دو بانس اور تار ہیں۔

علمدار۔ اور باقی ٹھاٹھ؟

منشی جی۔ وہ سب منوں نے سیکھنے کے لئے رکھ لیا ہے۔

علمدار۔ یہ کون لے گا۔؟

منشی جی۔ ڈبہ لیٹر بکس کے کام آ سکتا ہے اور بانس کبوتروں کی چھتری کے لئے موزوں ہے۔

علمدار۔ تو بھیجوں شبراتی کبوتر باز کو؟

منشی جی۔ ضرور۔

(از شیخ) عباد اللہ

ادب لطیف

رباعی

اے آنکہ توئی خلاصۂ کون و مکاں
گنجینۂ رموز و سعود و زیاں
سے جام ہے از ازل تمی تابی ستاں
تا باز رہی تو ز غم ہر دو جہاں

خیام

مکالمۂ ساقی و ساغر

(در بابِ رحلتِ علامۂ اقبال)

ساغر:-

کیا ہوا رندِ بلانوش تمام اے ساقی
کیوں کھنکتے نہیں اب ساغر و جام اے ساقی

عرق آگیں ہے یہ کیوں وقت سحر کا مکھڑا
خاک آلودہ ہیں کیوں گیسوئے شام اے ساقی

نہ ہے پیمانے میں پرتو نہ مرے ساغر میں
کیا ہوا آج ترا ماہِ تمام اے ساقی

جیسے رہرو کسی کھوئی ہوئی شے کو ڈھونڈے
ہے کچھ ایسا ترا اندازِ خرام اے ساقی

خمِ مشرق میں سہی بادۂ رنگیں باقی
مے اقبال تھی پھر حاصلِ جام اے ساقی

روحِ اقبال تھی سرشارِ مے کیفِ ازل
مجھ سے کافر کو نہیں اس میں کلام اے ساقی

مدفنِ شب ہے سحر مقبرۂ روز ہے شام
کیا یہی ہے تری دنیا کا نظام اے ساقی

یہی انجام ہے گر میکشی و مستی کا
تیرے میخانے کو میرا بھی سلام اے ساقی

صبحِ محشر سے ادھر کھل نہ سکے گا گویا
اس طرح بند ہے دروازۂ عام اے ساقی

رہ گیا تھا یہی اک رند سبوکش باقی
نامۂ مرگ نہ آیا ترے نام اے ساقی

کیا ہے عالم کی تباہی میں کلام اے ساقی
کردے خمزار کو غرق مے و جام اے ساقی

خام ہے خام ہے قدرت کا نظام اے ساقی

جوابِ ساقی:-

جوشِ غم میں یہ ترا طرزِ کلام اے ساغر
مرحبا، لے یہ چھلکتا ہوا جام اے ساغر

پھر تخلیق ہو یا مرحلۂ مرگِ حیات
مجھ سے پوشیدہ نہیں کوئی مقام اے ساغر

چشمِ مُردہ میں حیاتِ ابدی نیستی ہے
مرگ میخانہ تو ہے عمرِ دوام اے ساغر

نغمۂ قلقلِ مینا ہے فضا میں محفوظ
کہیں مرتے ہیں کلیم اور کلام اے ساغر

جس کی پرواز تخیل تھی فضا بوسِ فلک
اب وہی عرش پہ ہے محوِ خرام اے ساغر

خاکِ اقبال کا ہر ذرّہ ہے میخانہ بدوش
خم پہ خم، بادہ چکاں، جام بہ جام اے ساغر

شعر اس کا ہے زمانے کو پیامِ ابدی
اس نے قایم کیا شاعر کا مقامِ ابدی

جاوداں ہے مرے ہستوں کا امام اے ساغر

جواب الجواب

جسے کہتے ہیں ابد تیرے عوام اے ساقی
ہے وہ اقبال کی دُردِ تہِ جام اے ساقی

لاصراحی و سبو و مے و جام اے ساقی
آج ڈھانا ہے مشیّت کا نظام اے ساقی

تلخ تر موت سے بھی ہاں کوئی جام اے ساقی
موت بھی اصل میں ہے بادۂ خام اے ساقی

گر پڑی آج کلیدِ درِ میخانہ کہیں
تیز تر ہے ترا اندازِ خرام اے ساقی

ڈھالتا جا مگر اتنا تو بتا دے مجھ کو
کن عناصر سے ہے ہستی کا قوام اے ساقی

سقفِ میخانہ سے عالم میں منادی کر دے
غمِ اقبال میں پینا ہے حرام اے ساقی

تجھے معلوم نہیں اس کا مقام اے ساقی
دو جہاں کیف میں تھے اس کے غلام اے ساقی

طائرِ قدس تھا مرغِ تہِ دام اے ساقی

"ساقی"

ساغر نظامی

ترانۂ بہار

پھر دامنِ صبا میں ہے مے خانہ آج کل
پھر ہر نفس ہے گردشِ پیمانہ آج کل

پھر عقل میں ہے عنصرِ وحشت کی خواجگی
پھر فقر میں ہے شوکتِ شاہانہ آج کل

پھر جوش پہ ہے موسمِ برنائیِ جمال
پھر باڑھ پہ ہے عشوۂ ترکانہ آج کل

پھر صدرِ بزمِ حسن ہے عشقِ زمانہ سوز
پھر کارسازِ شمع ہے پروانہ آج کل

پھر لائقِ سجود ہے مینائے زرنگار
پھر قابلِ طواف ہے خمخانہ آج کل

پھر فرش پہ ہے جلوۂ افلاک ان دنوں
پھر عرش پر ہے نعرۂ مستانہ آج کل

پھر زندگی زمان و مکاں پر ہے حکمراں
پھر وقت میں ہے خوئے غلامانہ آج کل

پھر ہر خدا پرست ہے آوارۂ بتاں
پھر ہر خرد فروش ہے دیوانہ آج کل

پھر ہر روش ہے ایک گلستانِ زلف و رخ
پھر ہر کلی ہے ایک صنم خانہ آج کل

پھر ہر کلہ ہے تاجِ ملوکانہ ان دنوں
ہر ہر خذف ہے گوہرِ یکدانہ آج کل

پھر ہر غلامِ دہر ہے آقائے بحر و بر
پھر ہر کنیزِ شہر ہے سلطانہ آج کل

پھر شادماں ہے جذبۂ گستاخ ان دنوں
پھر کامراں ہے جرأتِ رندانہ آج کل

جس پر نثار کون و مکاں کی حقیقتیں
پھر کہہ رہا ہے جوش وہ افسانہ آج کل

"جوش" (کلیم)

بزم ادب

ادبی دنیا کا سالنامہ حسب معمول دسمبر کے وسط میں شائع ہو کر دلدادگان ادب کے لئے تسکینِ ذوق کا سامان بہم پہنچائے گا۔ ادبی دنیا کے سالنامے ہمارے صحافتی ادب میں جو امتیازی درجہ رکھتے ہیں اسے نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ بلند تر کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی اور ہمیں اپنے قلمی معاونین سے پوری توقع ہے کہ وہ حسبِ سابق اپنے بیش قیمت مضامینِ نظم و نثر سے اس سالانہ محفل کی رونق افزائی فرمائیں گے۔

سالنامہ کا غالباً سب سے بیش قیمت مضمون ہمارے فاضل دوست پروفیسر حمید احمد خاں ایم اے لکھ رہے ہیں۔ فاضل موصوف گذشتہ تعطیلاتِ گرما میں غالبِ مرحوم کے کلام۔ سوانح۔ مکتوبات و تصانیف کے متعلق جدید معلومات حاصل کرنے کے لئے پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ایک تحقیقی سفر پر گئے تھے اور اس سلسلہ میں آپ نے دہلی۔ رام پور۔ پٹنہ۔ کلکتہ۔ حیدر آباد دکن اور دیگر مقامات کے ان علم دوست مشاہیر سے ملاقاتیں کیں جن کے کتب خانوں میں غالب کے متعلق کوئی کتاب یا تحریر موجود تھی اور ان مقامات کے سرکاری کتب خانوں کے نوادر سے بھی استفادہ فرمایا اور بہت سی بیش قیمت معلومات حاصل کیں۔ ان سب کا ایک مجمل سا خاکہ آپ ادبی دنیا کے سالنامے کے لئے مرتب فرما رہے ہیں۔ ناظرین دیکھیں گے کہ یہ ایک نہایت قابلِ قدر مضمون ہو گا۔

ہمارے عزیز دوست اندر لال داس صاحب آفرؔ جو "سوسائٹی" کے ڈرامہ نویس کی حیثیت سے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ آج کل اپنے تعلیمی مشاغل کے سلسلہ میں لندن میں مقیم ہیں۔ لیکن سات سمندر پار ہونے پر بھی ادبی دنیا ان کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہوا۔ اپنے ایک گرامی نامہ میں انہوں نے ہمیں ایک نئے ڈرامے کی نوید سے مسرور فرمایا ہے جو سالنامہ کی زینت بنے گا۔

ہمارے مکرم مضمون نگار میرا جی مشہور بنگالی شاعر ودیاپتی اور اس کے کلام کے متعلق ایک نہایت فاضلانہ مضمون تیار کر رہے ہیں۔ ہمارے ناظرین میرا جی کے دلکش طرزِ نگارش اور ان کے رس بھرے گیتوں سے بارہا کیف اندوز ہو چکے ہیں۔ اس لئے سالنامے کے اس مضمون کے لئے جو اپنے اندر نشہ آور شیرینی کے بہت سے وعدے پنہاں رکھتا ہے انہیں اپنے کام و دہن کو تیار کر لینا چاہئے۔

ان مضامین کے علاوہ ہر صبح کی ڈاک اپنے دامن میں گلہائے نظم و نثر کے تازہ بتازہ انبار لا رہی ہے۔ دستِ گلچیں ان کے انتخاب میں مصروف ہے اور وقت آنے پر چشمِ تماشا دیکھے گی کہ اس کے لئے کس کس طور سے تسکینِ ذوق کا سامان کیا گیا ہے۔

انعامی مضامین

پہلے کی مانند اس دفعہ بھی انعامی مضامین کا ایک علیحدہ سلسلہ قائم کیا جا رہا ہے جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

منصور گولڈ میڈل۔ (دوسرا سال)

ہمارے مکرم دوست ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے اردو ادبیات سے جو والہانہ دلبستگی رکھتے ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں۔ پچھلے سال منصور احمد مرحوم کی یاد میں آپ نے سالنامے کے بہترین علمی مضمون پر منصور گولڈ میڈل عطا فرمایا تھا۔ آپ ادب نوازی کا یہ سلسلہ مستقل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس سال بھی آپ کی طرف سے منصور گولڈ میڈل سالنامہ کے بہترین علمی مضمون کے لئے دیا جائے گا۔ اس میڈل کے علاوہ ادارہ ادبی دنیا کی طرف سے مندرجہ ذیل انعامات دیئے جائیں گے۔

(۱) بہترین ادبی مضمون — پندرہ روپے
(۲) بہترین افسانہ (طبعزاد) — دس روپے
(۳) بہترین افسانہ (ترجمہ شدہ) — آٹھ روپے
(۴) بہترین ڈرامہ — دس روپے
(۵) بہترین مزاحیہ مضمون یا افسانہ — آٹھ روپے
(۶) بہترین نظم سات روپے۔ بہترین غزل پانچ روپے

سالنامہ کے متعلق آخری تفصیلات نومبر کی اشاعت میں دی جائیں گی اس وقت ہم اپنے قلمی معاونین کی خدمت میں فقط یہی عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے قیمتی مضامین جس قدر جلد بھیجیں گے اسی قدر بہتر ہو گا۔ کیونکہ مضامین کی ترتیب و تزئین کا کام ایک مستقل فرصت کا طالب ہوتا ہے۔ اور یہ فرصت سالنامہ کی اشاعت تک ہر روز کمتر ہوتی چلی جائے گی۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

دنیا کی شفیق ترین ماں ـــــ مادرِ روس

بچوں کے ساتھ ہر کوئی محبت کرتا ہے لیکن بدقسمتی سے سرمایہ پرست ملکوں میں صرف انہیں بچوں کا بچپن پُرمسرت ہوتا ہے جو سونے کے کھلونے اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اس کلیہ سے صرف ایک ملک مستثنیٰ ہے جہاں بچوں کے لئے یہ تفریق روا نہیں رکھی جاتی اور جہاں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ہر بچے کے لئے پیدائش کے دن سے ہی یکساں غور و پرداخت اور نگہداشت عمل میں آئے۔ یہ ملک سوویٹ روس ہے جس کے بدترین مخالف بھی ان حقائق کو جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتے۔

سوویٹ روس میں ہزاروں زچہ خانے (Maternity homes) حکومت کی طرف سے قائم کئے گئے ہیں۔ ان زچہ خانوں میں جو حصہ بچوں کے لئے مخصوص ہے وہاں علاوہ ماہرین تولید کے، بچوں کے امراض کے خاص ماہر ڈاکٹر مقرر کئے گئے ہیں۔ بچوں کے نشو و نما اور صحت کے لئے ان ڈاکٹروں کا وجود اشد ضروری ہے کیونکہ بچے اپنی پیدائش کے اولین ایام یہیں گذارتے ہیں جو اُن کی ساری زندگی میں سب سے زیادہ پُرخطر ہوتے ہیں۔

بچوں کے لئے طبی مشورے کے مراکز ماں جب اپنے بچے کو لے کر زچہ خانے سے رخصت ہوتی ہے تو فوراً دفتر مشورہ میں اطلاع کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی وقت ایک نرس متعلقہ حلقے کے مرکز سے نومولود کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ نرس بچے کا معائنہ کرتی ہے، گھر والوں کی معاشرتی حالت کا موازنہ کرتی ہے اور ماں بچے کی نگہداشت اور رکھ رکھاؤ کے متعلق ضروری ہدایات دیتی ہے۔

بچہ مستقل طور پر مرکز والوں کے زیرِ نگاہ رہتا ہے یہاں تک کہ وہ چار سال کا ہو جاتا ہے۔ اس مرکز کے ڈاکٹر نہ صرف بیمار بچوں کا علاج معالجہ کرتے ہیں بلکہ وہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ تندرست بچوں کا معائنہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ ہر بچے کی نشو و نما پر اُن کی نگاہ ہوتی ہے اور اُن کے وزن اور تمام جسمانی تبدیلیوں پر ان کی نظر رہتی ہے۔ اسی دقّتِ نظری کا نتیجہ ہے کہ وہ تمام جسمانی عیوب کو بروقت بھانپ لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ ڈاکٹر جو مستقل طور پر بچوں کی ایک مقررہ تعداد پر متعین ہوتے ہیں (جو اُن کے اپنے مرکز سے متعلق ہوتی ہے) نہ صرف حفظ ماتقدم کے قابل ہوتے ہیں بلکہ کُبڑے پن اور تپ دق جیسے خطرناک امراض کا دفعیہ کر لیتے ہیں۔

ہر مرکز میں ایک آلہ دافع امراض عضوی (Physio-therapeutic Cabinet) موجود رہتا ہے جس میں بلور کے لیمپ نصب ہوتے ہیں۔ اسی کے ذریعے سے کبڑے پن جیسی امراض کے دفعیہ اور ان عوارض کے روک تھام کا کام لیا جاتا ہے۔

دُود رسوئیاں علاوہ ازیں انہیں مراکز کے ساتھ خوراکی دوا خانے بھی ملحق ہوتے ہیں جنہیں دود رسوئیاں کہتے ہیں۔ چنانچہ جن بچوں کو طبی مشورے کے مطابق کسی خاص خوراک کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہاں سے مہیا کی جاتی ہے۔ اس وقت سوویٹ روس میں بچوں کے لئے ایسے چار ہزار طبی مراکز موجود ہیں جو نہ صرف بچوں کی امراض اور ایامِ طفلی کی اموات کو گھٹانے کے لئے جنگ کر رہے ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ صحت مند نسل کی پرورش کر رہے ہیں۔

بچوں کے تعلیمی شفاخانے چھ سال سے زیادہ عمر کے بچے تعلیمی شفاخانوں کے زیرِ نگرانی آ جاتے ہیں۔ یہاں بھی اور مراکز مشورہ میں بھی بچوں کے ڈاکٹروں کو بچوں کی مختلف امراض (متعدی امراض، امراض چشم وغیرہ) کے ماہرین کے ذریعے سے عملی ہدایات دی جاتی ہیں۔ ہر بچے کے لئے اس کا معالج "گھر کا ڈاکٹر" کے مترادف

ہے جس کی طبیعت کو اس کا معالج پیدایش کے روز سے جانتا ہے۔ اس وقت سوویٹ روس میں ۱۵۰۰ سے زیادہ تعلیمی شفاخانے موجود ہیں۔

بچوں کے ہسپتال مراکز مشورہ اور تعلیمی شفاخانے خطرناک بیماروں کو بچوں کے ہسپتالوں میں بھیج دیتے ہیں جن میں مریض کے طبی معائنے کے لئے جدید ترین آلات اور ادویات موجود ہیں مختلف اقسام کے ایکس رے کے آلات اور ٹیکہ لگانے کی متعدد دوائیاں یہاں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ ان ہسپتالوں میں چالیس ہزار مریضوں کے لئے جگہ مہیا کی گئی ہے۔ صحت افزا مقامات میں ایسے بچوں کے لئے خاص طور پر یہ انتظامات کئے گئے ہیں جو تپ دق یا وجع مفاصل کے مریض ہوں۔ جو بچے کسی شدید علالت کے باعث بہت کمزور ہو رہے ہوں انہیں بھی انہی صحت افزا مقامات میں بھیج دیا جاتا ہے۔

بارہ ہزار بچوں کے معالج اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ سوویٹ روس میں ہر بچے کے لئے طبی امداد مفت ہے۔ ایسے تمام اخراجات حکومت خود برداشت کرتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سوویٹ روس جیسی وسیع و عریض سلطنت کے لئے بچوں کے ڈاکٹروں کی ایک خاصی تعداد کی ضرورت ہے۔ ۱۹۳۱ء میں بچوں کے ڈاکٹروں کی تعلیم کے لئے ملک کی بارہ بڑی بڑی طبی درسگاہوں میں الگ الگ جماعت قائم کی گئی۔ بچوں کا ڈاکٹر بننے کے لئے ہر متعلم کو پانچ سال تک تعلیم لینی پڑتی ہے۔ چنانچہ اس وقت سوویٹ روس میں بارہ ہزار سے زیادہ بچوں کے ڈاکٹر فارغ التحصیل ہو کر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور امید ہے کہ سنہ ۱۹۴۲ء میں ان کی تعداد پچیس ہزار تک پہنچ جائے گی۔

پھر کیا تعجب ہے اگر سوویٹ روس کے مداحوں میں رومین رولینڈ، آئن سٹائن، رابندر ناتھ ٹیگور، جواہر لال نہرو جیسی متعدد ہستیاں موجود ہیں۔

مظفر احمد

فرانس کا آوارہ شاعر

فرانسا وِلاں

آوارہ کے لفظ سے فرانس کے کسی ایک شاعر کو اس ملک کے دیگر شعراء سے ممتاز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ عموماً فرانس کے شعراء اوباش اور آوارہ مزاج رہے ہیں۔ لیکن اس وقت جس شاعر کا بیان میں کرنے کو ہوں اُسے ایک طرح سے شاعری کا ضحاک کہا جا سکتا ہے۔ آج ولاں کو پندرھویں صدی کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے لیکن مغرب کی تاریخ ادب میں بہت کم نام ایسے ملیں گے جن کے حالات پر اتنے عرصے تک تاریکی کا پردہ پڑا رہا ہو۔ یورپ کی علم پروری اور خصوصاً فرانسیسیوں کی ادب نوازی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بات ناممکنات سے معلوم ہوتی ہے کہ فرانسیسی شاعری کے ابوالآبا کے متعلق بہت عرصے تک لوگوں کی سوانحاتی واقفیت محض سرسری ہو، لیکن حقیقت یہی تھی۔ ۱۸۷۷ء کے آغاز تک کسی کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ اس شاعر کا اصلی نام کیا ہے اور اس کے ذاتی حالات کے متعلق بھی لوگ صرف وہی باتیں جانتے تھے جو اُس کے اپنے کلام سے معلوم کی جا سکتی تھیں۔ اس کے بڑے بڑے مداحوں کو بھی صرف اسی قدر معلوم تھا کہ اسے دوبار نامعلوم جرائم کی بنا پر موت کی سزا ہوئی اور تیس کی عمر تک اس کی ماں زندہ تھی اور اُس کا باپ مر چکا تھا اور اس نے پیرس کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی، اور اُس کے دوست احباب رذیل ترین طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اُس نے اپنی جوانی کا زمانہ مے خواری اور عیاشی میں ضائع کیا۔ اور اس پست زندگی کو قائم رکھنے کے لئے، جس میں کبھی اندھی ہوس پرستی اور کبھی فاقہ کشی کا سامنا رہتا تھا، وہ بے حد گھناونے یا کمینہ افعال کے ارتکاب میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا اور موت کی سزا سے مخلصی حاصل ہونے کا باعث شاہ لوئی یازدہم اور وہ امرا تھے جو اس کی ادبی اور شاعرانہ خصوصیات کے مداح تھے۔ ۱۸۷۷ء میں فرانسیسی محقق آگسٹے لونگنان کی کتاب شائع ہونے سے پیشتر یہی ایک دو باتیں فرانس کے پہلے شاعر کے بارے میں کہی سنی جاتی تھیں۔ لیکن آگسٹے لونگنان کی تحقیقات سے اس شاعر کے طرز زندگی اور عادات واطوار کے متعلق صحیح معلومات عام ہوئیں اور دنیا نے پیرس کے بے باک اور بدقسمت شاعر کی دلکش شخصیت اور اُس کی عجیب و غریب جنون انگیز اور وحشیانہ زندگی کے بارے میں حقیقت معلوم کی وہ شاعر جس کا زوردار اور آتشیں کلام پندرھویں صدی کے فرانسیسی ادب کے دھندلکے میں ایک شعلہ گوں سیارے کی مانند نمودار ہوتا ہے۔

کسی طرح کے مبالغے کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۴۳۱ء کا سال فرانس کی قومی زندگی میں ایک انقلابی سال تھا۔ سو سال تک قومی احیاء اور قیام کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد فرانس کے باشندے آخر کار چارلس ہفتم کے سر پر تاج رکھنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کامیابی کا سہرا دنیا کی اُس شریف اور اولوالعزم عورت کے سر تھا جس کا نام جون آف آرک ہے۔ پیرس کو سولہ سال کے بعد اپنے بادشاہ کی حکومت حاصل ہوئی اور اس کے بعد چار یا پانچ سال کے اندر ہی انگریزوں کو فرانس سے مکمل طور پر نکال دیا گیا۔ جون آف آرک نے فرانس کی بکھری ہوئی اور متضاد ملاقتوں کو یک جا کر دیا اور لوگوں میں حب الوطنی کی وہ روح پھونک دی جسے قومی زندگی کی ابتدا کہا جاتا ہے۔

جب کسی قوم یا ملک میں نئی زندگی کی تحریک ہوتی ہے تو اس کا اظہار کئی طریقوں سے ہوتا ہے۔ جن میں سے ایک بڑی علامت قومی زبان کی تشکیل بھی ہے۔ از بسکہ قومی احیاء کے لئے قومی زبان لازمی ہے اس لئے قومی احیاء کے دور میں قومی زبان کا تشکیل پانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ پندرھویں صدی کے درمیانی عرصے تک فرانس میں کوئی قومی زبان نہ تھی۔ صد سالہ جنگ کے اختتام کے بعد جوں جوں قومی استحکام عمل میں آیا، قومی زبان بھی ایک مخصوص صورت اختیار کرتی گئی۔

لیکن قومی زبان کی تشکیل میں نثر کی بجائے نظم کا بہت زیادہ حصہ ہوتا ہے۔ اردو زبان کا ابتدائی ادب بلکہ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء تک ہر ادبی تخلیق نظم ہی کی صورت میں نمودار ہوتی رہی۔ شعرائے اردو کو بہتر زبان بنانے میں جو کام کیا اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور قومی اختلاط کے بعد سر سید سکول کے نثر نگاروں کی بہ نسبت، سب جانتے ہیں کہ حالی کی مسدس اور چپ کی داد نے عوام کو اردو ادب اور اردو زبان کی قومی اہمیت کی طرف رجوع کرنے میں بہت زیادہ حصہ لیا۔

پندرھویں صدی کے درمیانی دور سے پہلے فرانسیسی شعراء کے کلام میں قومی زندگی کے احساس کا قریباً فقدان تھا۔ حب الوطنی کے جذبات یقیناً موجود تھے لیکن اُن کا پورا پورا اظہار شاعری میں نادر معدوم کی ذیل میں آتا تھا۔ اس وقت کی شاعری کے موضوع بے حد محدود تھے۔ محبت، جوانمردی، مذہب وغیرہ اور ان جذبات کے اظہار میں بھی اگرچہ بسا اوقات دلکش نغموں کی تخلیق ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن اُسے بہ ہیئت مجموعی کوئی قومی رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اس ابتدائی شاعری میں مقررہ اصولوں سے پیدا شدہ تصنع اس بات کا احساس دلاتا تھا گویا سخنور کی ذہنیت جذبات کی بے ساختگی اور فطری اخلاص اور بے باکی سے یکسر عاری ہے۔ اس شاعری میں ایسی دھندلی صورتیں نگاہوں سے دوچار ہوتی ہیں جن میں زندگی کی تازگی مفقود ہے۔ قوم کے جدید نشو و نما پر دلکش اور شیریں نغمات کسی قسم کا قطعی اثر ہرگز نہیں کر سکتے۔ جب اجتماعی زندگی حیاتِ تازہ کی بھٹی سے نئی روح لے کر منصۂ شہود پر آ رہی ہو تو کسی میٹھے راگ میں یہ قدرت نہیں ہو سکتی کہ وہ قومی زبان میں نئی تحریک پیدا کر دے جو اس حیاتِ تازہ کے سیاسی اور سماجی اقدامات کے مطابق ہو۔ قدرت اس کام کے لئے جس فرد کا انتخاب کرتی ہے وہ گنوار، غیر مہذب اور صورت اور تخیل میں عامیانہ ہو تو ہو، لیکن اس کے لئے یہ ایک بات ہی لازمی ہے اور کافی کہ اُس کے ہونٹ سرودِ ابدی کے آتشیں جام کو چھو چکے ہوں اور اُس کی آواز میں ایک نئی دنیا کا لب و لہجہ گونج رہا ہو۔

وِلاں بہت حد تک ایسا شاعر تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ماحول میں گھرا ہونے کے باعث بہت ہی ذاتی اور کتابہ پسند شاعر بھی تھا۔ اپنے تمام کلام کا بنیادی مواد اُس کی اپنی ذات تھی۔ اس کے کلام کے دو لمبے حصّے جن کے نام "چھوٹا عہد نامہ" اور "بڑا عہد نامہ" ہیں، تمامتر سوانحاتی ہیں۔ اور اُس کی بدنصیبیوں، مصیبتوں، پستی، عشق و عاشقی، نفرت اور دشمنی بلکہ بعض اوقات اس کے جرائم کے ذکر و بیان سے بھرپور ہیں اور اس کی دوسری مختصر نظموں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان مختصر نغموں کی فضائے بعید بھی اس کی اپنی ہی ہنگامہ خیز زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اور شعراء کی بہ نسبت ولاں کے معاملے میں ضروری ہے کہ اُس کے کلام تک پہنچنے سے پہلے ہم اس کے حالات سے آگاہی حاصل کر لیں۔

وِلاں کا اپنا نام فرانسا دی مونٹ کاربیٹے تھا۔ ولاں کا نام اس نے ایک اور شخص کے نام سے لیا تھا جس کا نام گلوم دی ولاں تھا۔ یہ شخص ایک نیک پادری تھا جس نے ولاں کو اس کے باپ کی موت کے بعد متبنّٰی بنا لیا تھا۔ اس وقت شاعر کی عمر ابھی نو ہی سال کی تھی۔ ولاں پر پادری کی مہر و شفقت بے اندازہ تھی۔ جوانی کے بعد شاعر نے جب بدکاری اور مجرمانہ طرزِ زندگی کو اپنا خاصہ بنا لیا تب بھی وہ پادری اُس سے ہمیشہ نیک سلوک کرتا رہا اور اس کی اس خیر اندیشی میں ذرّہ بھر فرق نہ آیا اور اس مہربانی کے لئے شاعر ولاں بھی عمر بھر اپنے ہمدرد اور مہربان پادری کا ممنون رہا۔ لیکن اس نے اظہارِ تشکر کے طور پر بھی کبھی اپنے طرزِ عمل کو سدھارنے کی کوشش نہ کی۔

۱۴۴۹ء میں ولاں نے پیرس کے دار العلوم سے بی اے اور ۱۴۵۲ء میں ایم اے کا امتحان پاس کیا لیکن ان علمی سندوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ کیونکہ پندرھویں صدی کے فرانس میں یہ ڈگریاں تہذیب و تمدن اور علم و فن کے وہ اثرات پیدا کرنے کے ناقابل تھیں جو ان کے سننے سے آج کسی سامع پر ظاہر ہوتے ہیں اور اس تعلیم کے بہت ہی کم اثرات ولاں کی ذہنیت پر باقی رہے۔ اُس کی ایک نظم "نازنینوں کا نوحہ" سے اس پس ماندہ علم کی ایک جھلک ظاہر ہوتی ہے (یہ نظم اس مضمون کے آخر میں دیکھئے)

پیرس کے دار العلوم میں علم حاصل کرنے کے دوران میں ہی بدقسمتی سے ولاں ایک اور علم کی طرف بھی رجوع ہو گیا۔ جس کا عملی پہلو اس کتابی علم سے کہیں زیادہ خطرناک اور مضر اخلاق تھا اور اس خطرناک علم کو حاصل کرنے کا وسیلہ بُری صحبت تھا۔ اس کے دو طالب علم دوست آگے چل کر پھانسی کی سزا کو پہنچے۔ صنفِ نازک اور مے خانوں کی طرف توجہ کرنے میں ہی اس کا بہت سا وقت صرف ہونے لگا۔ اس کے کلام ہی

سے پیرس کے میخانوں اور وہاں پھرنے والیوں سے گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ ولاں اچھی، خوش حال اور باعزت زندگی بسر کرنے کا بے حد شایق تھا لیکن ایسا اس کے مقدّر میں نہیں تھا۔ جوانی کے خیال اُسے ہر دم اس کی دل پسند زندگی سے دور اوباشانہ جھمیلوں اور ہاؤ ہو کے ہنگاموں میں الجھاتے رہے لیکن سیہ کاری اور ہر طرح کے عیوب کے طوفان میں بھی ایک دو گوشے اس کے دل کے ایسے رہ گئے جن کی روشنی اس سے شیریں گیت کہلواتی رہی۔ میخانوں کی ہنگامی زندگی کے باوجود اُسے عمر بھر اپنی ماں سے بے حد محبت رہی اور یہی ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بسا اوقات شعراء کے باغ حیات میں ایک ایسی خوشبو پھیلتی دکھائی دیتی ہے جو نظامِ عالم کو مہکانے کا باعث بنتی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں بہت سے ایسے طلبا ولاں کے دوست بنے جو اپنی آیندہ زندگی میں چل کر اچھے عہدوں پر فائز ہوئے اور انہی کی بدولت اکثر ولاں حکومت کی سرزنش سے بچنے میں کامیاب ہوتا رہا۔

چوبیس سال کی عمر تک ولاں کی زندگی میں کوئی ایسی خاص بات واقع نہیں ہوئی جس کی بنا پر اس کی سیرت اور چلن پر حرف زنی کی جا سکے۔ لیکن جوانی کے زمانے کے متعلق وہ خود کہتا ہے کہ اُس نے اپنے عہدِ شباب میں اکثر لوگوں سے کہیں زیادہ عیش کئے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے عیاشی اور مے خواری کی زندگی گذاری ہے اور یہیں یہ بات بہت جلد قرینِ قیاس معلوم ہو سکتی ہے۔ جب ہم اس کے کلام میں میخانوں، بدمعاشوں، اور بدکار عورتوں کی ایک ختم نہ ہونے والی داستان پڑھتے ہیں۔ اپنی افتادِ طبع کے بارے میں بھی وہ ایک جگہ اعتراف کرتا ہے کہ اس کی سیرت میں اُن عیبوں کا کثرت سے امتزاج ہے جو انسان کو قعرِ مذلت کی طرف نہایت آسانی سے لے جا سکتے ہیں یعنی وارفتہ مزاجی، چٹورا پن، میخواری، فضول خرچی اور جس شخص میں اتنے "خصائص حسنہ" کا اجتماع ہو ظاہر ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں مستقبل کے نتائج کا خیال تک نہ آنے دے گا۔ رفتہ رفتہ ولاں کا بُرا چلن پیرس میں اس قدر زبان زدِ عام ہو گیا کہ لوگ "ولاں" سے "ولانزی" حاصل مصدر بنا کر روزمرہ کی زبان میں استعمال کرنے لگے جیسے اردو میں ٹھگ سے ٹھگی اور اس لفظ کا استعمال اُس وقت تک جاری رہا جب تک ولاں کی شہرت شاعر اور عیب کار کی حیثیت سے قایم رہی۔

اسی زمانے میں ولاں کی زندگی میں ایک ایسی ہستی نمودار ہوئی جس کا اثر ولاں کے ذہن سے تمام عمر نہ گیا اور جو ولاں کے اپنے کلام میں بار بار کہنے کے مطابق اس کی گمراہی اور بے وقت انجام کا باعث ہوئی۔ یہ شخصیت ایک نوجوان عورت تھی جس کا نام کیتھرین واسیلیز تھا۔ ولاں کے تمام کلام میں ایک پاکباز اور سچی محبت کی متواتر یاد موجود ہے اور اس یاد کے ساتھ ہی ساتھ وہ ہر جگہ اپنی محبوبہ کی بے اعتنائی، بے وفائی اور ظلم کا شکوہ کئے جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ولاں کی محبوبہ کی بے اعتنائی کی وجہ ایک اور شخص ہو جس کی موجودگی میں ولاں ایک بار اپنے پٹنے کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کیتھرین نے کبھی بھی ولاں پر نظر التفات نہیں کی تھی۔ وہ خود مانتا ہے کہ شروع میں وہ اُسے اپنے جال میں پھنسانے کے لئے مہربان بھی رہی۔ اس کا اظہار ایک اور جگہ بھی ہے جہاں ولاں اپنی محبوبہ پر زر پرستی کا الزام لگاتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نے زر کے بدلے ولاں کو اپنی عنایات سے سرفراز کیا اور جب زر نہ رہا تو اپنی توجہات کا مرکز ایک بدصورت بوڑھے لیکن امیر آدمی کو بنا لیا۔ لیکن عین ممکن ہے کہ ایسے اہم الزامات اس نے برانگیختگی اور حسد کے اس ہنگامی دورے میں اختراع کئے ہوں جس کا شکار نگاہ کرم نہ ہونے کی وجہ سے کبھی نہ کبھی ہر ایک عاشق ہو جایا کرتا ہے۔ ذمہ دار شہادت اس بات کی مقتضی ہے کہ کیتھرین نے کبھی کوئی اہم بدسلوکی ولاں سے نہیں کی۔ بہرحال اس حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ ولاں کو کیتھرین سے دلی محبت تھی لیکن یہ پرخلوص جذبہ بھی آوارہ مزاج شاعر کو راہ راست پر چلانے میں کوئی مدد نہ دے سکا اور اس پاکباز محبت کے باوجود شبانہ روز میخانوں کے عشقی ہنگاموں میں پوری طرح حصہ لیتا رہا اور یوں اُس کے کلام میں بے شمار عورتوں کے نام رونق افروز ہوتے رہے اور اُس کے ماحول کی ناگوار اور رسوا و بدنام ہم آہنگی کو مکمل بنانے کے لئے کبھی بھی نسوانی اجزا کی کمی نہ ہوئی۔ کیتھرین کے واقعے سے ولاں کی ذہنیت ایک عجیب قسم کا اجتماع ضدین معلوم ہوتی ہے اور یہی دورنگی اس کے کلام میں بھی ہمیشہ موجود رہی ہے بلکہ اُس کی زندگی کے واقعات کا گوناگوں انداز اس کے کلام کو بھی بوقلموں بنا دیتا ہے۔ لیکن اس رنگا رنگ کے ہنگامے میں ہم ایک بات سوچتے ہی رہ جاتے ہیں اور وہ یہ کہ جو شخص ایک عورت سے اتنی سچائی اور پاکیزگی سے محبت کرتا ہو وہ کیونکر ذلت کی اس پستی میں رہ سکتا ہے جو ولاں کا شعار تھی۔ مگر اب جدید نفسیات کی علمی روشنی کا زمانہ آ چکا ہے اور ہم جان

چکے ہیں کہ انسان کے بیرونی چلن اور رویے ہی سے اس کی سیرت کی گہرائی تک رسائی نہیں ہوسکتی بلکہ اس کے ذہنی فعل پر اُن تمام الجھے ہوئے مسائل کے حل کا دار و مدار ہے جنہیں ہم دور سے دیکھ کر سلجھانے کے ناقابل سمجھ بیٹھے ہیں۔

جس وقت سے ولاں نے جرائم کو اپنا مستقل پیشہ بنا لیا۔ چند باتیں اس کی زندگی کے لئے مخصوص ہوگئیں۔ عیاشی، میخواری، چوروں، رہزنوں اور آوارہ عورتوں کی صحبت، جرائم، فراریاں، قید اور سزائیں اور ان مختلف سزاؤں کے سلسلے میں دو بار اُسے موت کی سزا ملی۔ اگرچہ اس کے مداحوں اور بڑے طبقے کے بہی خواہوں نے اس کی سزاؤں کو کم کروا دیا اس قسم کی ہنگامی زندگی میں مفلسی ایک لازمی چیز تھی اور اسی غریبی کے مصائب ہی نے اس کے کلام میں وہ تلخ اور پرخلوص اور بے باک لہجہ پیدا کیا جو اس کی شاعرانہ تخلیق کو اپنے ہمعصروں کی پرتکلف اور مصنوعی شاعری سے ممتاز کرتا ہے۔ اُس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گویا ایک کمزور فطرت انسان ہے جو گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے اور پھر درد کی شدت سے چلاتا ہے لیکن اس کی توبہ ہر بار ٹوٹتی ہے۔ اُس کے گناہوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یوں اس کی روح کے زخم پہلے سے زیادہ گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

سب سے زیادہ متضاد خیالات ولاں کے کلام میں عورتوں کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔ کہیں وہ ماں کا متوالا ہے، کہیں وہ عورت اور مرد کے صحیح تعلق کا معترف ہے اور کہیں نفس پرستی سے عاجز ہوکر عورت کو ایک حربۂ عیش کے سوا اور کچھ بھی سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

تیس سال کی عمر سے پہلے ہی اُسے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا وقت اب پورا ہو چکا ہے۔ عیاشی، قید اور مشقت اور فاقوں کی غضبناک زندگی اپنا کام کئے بغیر نہ رہی۔ قدرتی نتائج ظاہر ہوئے، جوانی اور کوتاہ بینی کے امراض کے علاوہ اب اُسے سِل کا سامنا ہوا اور اس کے پھیپھڑے گلنا شروع ہوگئے۔ وہ اپنے اس مرض کا ذمہ دار اڈلینز کے پادری کو ٹھہراتا ہے کیونکہ اس نے اُسے متواتر ٹھنڈا پانی پینے پر مجبور رکھا تھا۔ ان تمام حالات سے غمگین، بے دل اور ناامید ہوکر، اور قید اور موسم کی سختیوں سے اپنے خون کی سرخی کھو کر، خالی جیب اور خالی پیٹ کے ساتھ، ضعف سے بات کرنے کے ناقابل، آخرکار اس کی آنکھیں کھلیں اور اُس نے اپنی گذشتہ زندگی کی مضر حماقتوں کی اہمیت کو جانا اور ناپائدار عشرتوں سے بدظن ہوا۔ اُن عشرتوں سے جن کے دوبارہ حاصل ہونے کی نہ امید تھی نہ اہمیت۔ مصیبت اور اذیت سے اس کی عقلی قوت تیز تر ہوگئی تھی۔ اُس نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور اُن پر پشیمانی ظاہر کی۔ دشمنوں کو معاف کیا اور اطمینان قلبی کے لئے مذہب اور ماں کی برکت والی محبت کی طرف رجوع ہوا اور یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دینے لگا کہ ہر چیز فانی ہے اور بُری زندگی کے بعد بھی ایک بہتری ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ اچھی موت مرے۔

ولاں کا کلام مختصر نظموں۔ گیتوں اور چھوٹی اور بڑی مثنویوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے ہیئت کے لحاظ سے وہ کلام پندرھویں صدی کے عام فرانسیسی شعرائے کے مطابق ہے لیکن روح میں بے حد مختلف۔ اُسے شاعرانہ اصولوں اور مقررہ قوانین کی مطلق پروا نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی دو لمبی نظمیں "چھوٹا اور بڑا عہد نامہ" عجب بے ڈھب واقع ہوئی ہیں جن میں جابجا غیر متعلق مواد داخل ہے۔ لیکن اس سے اس کی شاعرانہ حیثیت پر کوئی داغ نہیں آتا۔ کیونکہ وہ اپنے زمانے کے دوسرے شعراء کی طرح محض ایک نظم نگار ہی نہ تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُسے دوسرے شعراء کی طرح سرکار دربار کی منفعت بخش فضا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ اس کی زندگی تلخ، آزاد اور بے روک تھی۔ ولاں کی نظموں میں زیادہ تر بدمعاشوں کی قابلِ رحم، [illegible] اور ظلم سے بھرپور دنیا کا ایک گہرا نقشہ موجود ہے۔ گویا وہ نظمیں اس کی روح کی پریشان حقیقتوں کا سچا مرقع ہیں لیکن یہی سچا مرقع اکثر مقامات پر بے حد پرخلوص اور اثر انگیز خصائص لئے ہوئے ہے۔ ولاں کی شاعری میں کہیں عیش و عشرت اور زندہ دلی کی افراط ہے اور کہیں موت و حیات اور غربت کی کشمکشوں کی بہتات۔ فرانسیسی شاعری میں ولاں پہلا شاعر ہے جس کے کلام میں ایک روحِ منفرد کا بے باک اظہار ہے۔

ولاں کی تمام زندگی اور اس کے اپنے پیش کردہ نقشے کو دیکھتے ہوئے جسے وہ بے حد کھرے اور حقیقت پرستانہ انداز میں پیش کرتا ہے ہمیں اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ مختلف صورتِ حالات میں اس کی زندگی یقیناً مختلف اور بہتر ہوتی۔ اگر اُسے محبت میں کامیابی ہوتی اور اگر وہ اُس بلند معیارِ حیات کی توقع کرسکتا جس کا ذکر وہ بے حد حساس انداز میں کرتا ہے، تو ممکن تھا کہ اپنے وقت کی تاریخ میں اور ادب میں زیادہ اچھی اور باعزت جگہ حاصل کرتا اور بے پروائی اور خواہشات کی اندھا

دھند، تکمیل اور ناکام محبت کا جنون انگیز ملال اُسے سماج کے لئے محض ایک عضوِ معطل ہی نہ بنا دیتا لیکن ہم یہ خیال ہی کر سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اثرات جو اس کی زندگی میں طاری وساری رہے انہوں نے اس کے جوہرِ خداداد اور ذہانت کی نشو ونما اور پختگی میں کوئی مدد نہ کی اور اُسے اپنے رنگ کا ممتاز شاعر بنانے میں کوتاہی کی۔ کیونکہ آیندہ نسلوں کو کسی فن کار کی ذاتی اور اخلاقی حیثیت سے اتنا تعلق نہیں ہوتا جتنا اُس کی تخلیق سے۔ انیسویں صدی کے سب سے بڑے فرانسیسی نقاد تھیو فائل گاٹیئے کے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ "اگر یوں ہوتا تو ممکن تھا کہ ہم ایک ایماندار انسان کو حاصل کر لیتے لیکن ایک شاعر ہمارے ہاتھوں سے چلا جاتا۔ اور اچھے شاعر اچھے آدمیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ نایاب ہیں۔ اگرچہ اچھے آدمی بھی کوئی عام نہیں"!

اب وِلان کے کلام کو دیکھئے لیکن ایک دو باتیں باقی ہیں۔

میں نے صرف مختصر نظموں کو ہی لیا ہے اور اس میں بھی روحِ سخن کو قایم رکھتے ہوئے۔ ہندوستانی محاورے اور فضا کا خیال رکھا ہے تاکہ فرانسیسی اور انگریزی میں جو لطف وہاں کے رہنے والے اٹھا سکتے ہیں وہی لطف اردو والوں کو بھی آسکے خصوصاً آخری نظم "نازنینوں کا نوحہ" کا ولان سے اتنا ہی تعلق رہ گیا ہے کہ اُس کی صورت اور خیال ولاں سے ہے۔ باقی نظم میری اپنی ہے۔ لیکن اس نظم کا پابند ترجمہ کرنے میں صرف ایک بے رنگ انشا کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ "الوداع" اور "محبوبہ کی موت" ولان اور کیتھرین سے متعلق ہیں "موت" سے ولان کی پشیمانی کے بعد کی ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے۔ "جو ہوتا میں راجہ" محض ایک دلکش نغمہ ہے اور "بلاوا" ولان کی ہنگامہ پرور سجانوں کی زندگی اور عشرتوں کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس میں بھی ہلکا سا ناصحانہ رنگ اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اگرچہ عالم دوبارہ نیست سے عیش کوشی کی ترغیب دینا میرے خیال میں محض حسنِ تعلیل ہے!

محبوبہ کی موت

موت سے، موت ہی سے شکوہ شکایت ہے مجھے
موت ہی دہر میں اک وجہِ مصیبت ہے مجھے
موت نے چھین لیا مجھ سے مری راحت کو،
موت سے ہو نہ سکا دیکھے مری راحت کو!

دشمنی اب تو رہے گی مرے دل میں تیری،
جب تلک جانِ جہاں مل نہ سکے گی میری!
موت ہی میری طریقہ ہے، ملا دے ایسے!
دشمنی اپنی مرے دل سے مٹا دے ایسے!

جب سے سینے سے مرے تو نے جدا اُس کو کیا،
مجھ میں قوت ہی نہیں باقی، تو جینا کیسا؟
دو تھے ہم، دو تھے مگر دل تو ہمارا اک تھا،
سانس بھی ایک تھا، جینے کا سہارا اک تھا!
اور جو وہ مر گئی، اب مجھ کو بھی مرنا ہے ضرور!
مجھ کو بھی موت کے رستے سے گذرنا ہے ضرور!
ورنہ جینا میرا جینا نہیں، مرنا ہوگا!
زیست بھی موت کے صحرا سے گذرنا ہوگا!

الوداع

الوداع! اشک سے لبریز ہیں آنکھیں میری،
الوداع! اب نہ نظر آئے گی صورت تیری!
الوداع! مہر ومحبت! تجھے اب [illegible] رخصت!
الوداع! قلبِ حزیں، درد وکرب سے رخصت!
الوداع، جانِ جہاں! روحِ حسیں! اب رخصت!
تیرگی آئی ہے اے ماہ جبیں! اب رخصت!
اب تو تقدیر میں ہی لکھی ہے فرقت تیری!
الوداع! اشک سے لبریز ہیں آنکھیں میری!

جو ہوتا میں راجہ

جو ہوتا میں راجہ مری جاں!
جو ہوتا میں راجہ!
کئی ملک قبضے میں کرتا میں،
پھر تیرے قدموں پہ جھکتے،

ہوئی عشق کی آگ میں جو ستی!
نہیں، آہ! دنیا میں اب رانیاں!
یہ دنیا ہے رہنے کی بستی کہاں؟

سوئمبر کی سنجوگتا ہے کہاں؟
بتائے کوئی آج اُس کا نشاں!
برندا کے بن میں جو تھیں نغمہ خواں،
کہاں ہیں کنھیا کی سب گوپیاں؟

ہوا عشق کا نام بیتی سی بات!
عدم ہو گئی زندگی کی وہ رات!

پرانا عروجِ شہانہ گیا،
جوانی کا رنگیں فسانہ گیا!
وہ اندازِ روز و شبانہ گیا!
زمانہ گیا، وہ زمانہ گیا!

رہ گیا حسن خوبانِ دل خواہ کا!
ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

میراجی

رباعی

مغرب میں شتاب اے شمس و قمر چھپ جاؤ
کچھ دیر رہ آوارگی سے فرصت پاؤ
ہیں آپ نئے مہر کے آثارِ طلوع
اے اہلِ زمیں سب ضیا پر آؤ

باجا مری

حسیّات

یوسفؑ کی طلب میں ہے زلیخا کئی دن سے
وامق کی عناں گیر ہے عذرا کئی دن سے

پہلو میں ہے وہ جانِ تمنا کئی دن سے
مسکن ہے مرا حاصلِ دنیا کئی دن سے

بیمارِ غمِ عشق ہے اچھا کئی دن سے
اُس آنکھ میں ہے شانِ مسیحا کئی دن سے

ہے ابرِ کرم نخلِ تمنّا پہ نچھاور
بے تاب ہے الطاف کا دریا کئی دن سے

ہے شام و سحر مطلع انوار مرا گھر
دیکھا نہیں روئے شبِ یلدا کئی دن سے

کس ملک کی شاہی مجھے اللہ نے دے دی
بے چین سے ہیں قیصر و کسرا کئی دن سے

وہ مست نگاہیں مجھے کیا کہتی ہیں پیہم
ہے پیشِ نظر کوثر و طوبےٰ کئی دن سے

ہے رشکِ چمن لالہ و گل سے تری خلوت
ویراں ہے چمن صورتِ صحرا کئی دن سے

باتیں ہیں کہ ہیں زمزم و تسنیم کی موجیں
مخمور ہوں بے ساغر و صہبا کئی دن سے

راتیں ہیں کہ ہیں جنت و فردوس کے منظر
ہے تجھ پہ مجھے حُور کا دھوکا کئی دن سے

میں ہوں ترا جلوہ ہے شبستانِ طرب ہے
آشوبِ جہاں کی نہیں پروا کئی دن سے

گھر گھر میں مسرت کی ضیا پھیل گئی ہے
ہے نور فشاں جلوۂ زیبا کئی دن سے

ہے اب تو نظیرؔ ایک نئے رنگ پہ شیدا
ارباب سخن میں ہے یہ چرچا کئی دن سے

اصغر حسین خاں نظیرؔ

گلبرگہ کا رومان

گلبرگہ میں ایک ایسی عمارت ہے جس کی وجہ سے اسے ایک خصوصیت حاصل ہے اور جس کے باعث وہ ہندوستان کے تمام شہروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عمارت اس کی عظیم الشان جامع مسجد ہے جو ہندوستان بھر میں آپ ہی اپنی مثال ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے قرطبہ کی مشہور مسجد کے نمونے پر تیار کیا گیا تھا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ گلبرگہ کی مسجد کے نمونے پر ہندوستان میں کبھی کوئی اور مسجد تیار نہیں کی گئی۔ کیونکہ اس مسجد کا صحن سقفی ہے اور نمازیوں کو سورج کی گرمی سے بچانے کے لئے بہت موزوں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ گلبرگہ کی یہ مسجد ۱۳۶۷ء میں، جبکہ بہمنی خاندان کے دوسرے بادشاہ محمد شاہ کی حکومت تھی، بنائی گئی۔ مسجد کی چھت گنبدوں کا ایک جنگل دکھائی دیتی ہے۔ اندرونی حصے میں محرابوں کا ایک سلسلہ ہے یہ محرابیں ایک سو چوکور ستونوں سے پیدا کی گئی ہیں اور یوں محرابوں اور ستونوں سے بے شمار بغلی راستے بن گئے ہیں۔ مسجد کی تمام عمارت کا رقبہ ۳۸۰۱۶ مربع فٹ ہے اور [illegible]یں اور نقش ونگار کی کمی کے باوجود عمارت کی ظاہری حیثیت پُرتکلف اور بیش قیمت دکھائی دیتی ہے فرگوسن نے جو ہندوستانی فن تعمیر کا زبردست نقاد ہے اس مسجد کو ہندوستان میں افغانوں کی بنائی ہوئی بہترین مسجدوں میں شمار کیا ہے۔ پہلو کی دیواروں میں بڑی بڑی محرابیں پیدا کی گئی ہیں اور انہی سے روشنی داخل ہوتی ہے۔ اس عظیم الشان عمارت کے فرحت زا صحن میں کھڑے ہو کر اگر انسان ذرا سا دھیان دے تو گلبرگہ کی گذری ہوئی شان وشوکت کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ وہ گلبرگہ جو ایک زمانے میں دکن کا دارالسلطنت تھا۔

چودھویں صدی کا درمیانی زمانہ ہے، جنرل ظفر خاں نے سلطان محمد تغلق کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا ہے۔ بات اتنی ہے کہ محمد تغلق نے دو مختلف موقعوں پر اپنا دارالسلطنت دہلی سے ہٹا کر دولت آباد میں قائم کرنا چاہا۔ باغی کو فتح نصیب ہوتی ہے اور اگرچہ اس کی تاج پوشی ۱۳۴۷ء میں دولت آباد ہی میں ہوئی اس نے گلبرگہ کو اپنا دارالسلطنت منتخب کیا۔

گلبرگہ غیر معمولی افسانوں اور دلکش رومانوں کا شہر ہے اور اس کے ان رومانوی تصورات کا آغاز اس پہلے حکمران ہی سے ہوتا ہے جس نے اسے راج دھانی کے لئے انتخاب کیا اور حسن آباد یا احسن آباد کا نام دیا۔ کیونکہ اس کا اپنا نام حسن تھا۔ گلبرگہ کے پہلے بادشاہ کی زندگی میں الف لیلہ کے افسانوں کا سا رنگ پایا جاتا ہے اور اسی کے اثر سے یہ شہر ایک خاص مشرقی لئے ہوئے ہے۔ تاریخی لحاظ سے ان باتوں کو حقیقت کا رتبہ حاصل ہو یا نہ ہو ہماری دلچسپی رومان اور افسانے میں ہے اور ہمیں تو افسانہ ہی حقیقت سے کہیں دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ علاءالدین حسن گنگو نے اپنی زندگی سیڑھی کے پہلے زینے سے شروع کی۔ وہ دہلی کے ایک برہمن گنگو کے ہاں ایک معمولی ملازم تھا۔ ایک دن جب وہ اپنے مالک کے کھیت میں ہل چلا رہا تھا اُسے کھیت میں سے سونے اور چاندی سے بھرا ہوا ایک برتن ملا علاءالدین دیانتداری ہی کو بہترین مصلحت خیال کرنے والوں میں سے تھا اس نے برتن جوں کا توں مالک کے پاس پہنچا دیا۔ گنگو برہمن پر اس دیانتداری کا بے حد اثر ہوا اور اس نے اس تمام معاملے کا حال اپنے آقا غیاث الدین تغلق کے گوش گذار کر دیا۔ غیاث الدین نے یہ سن کر حسن کو ایک سو سواروں کی سرداری سپرد کر دی۔ گنگو برہمن شاہی دربار کا نجومی تھا۔ اُس نے حسن کی جنم پتری بنائی اور اس سے ظاہر ہوا کہ ایک روز حسن شاہی رتبہ حاصل کرے گا۔ حسن ان باتوں سے گنگو کا بہت ممنون ہوا اور اس نے وعدہ کیا کہ اگر ایسا دن آیا تو وہ تخت پر بیٹھتے ہی اپنے پرانے مالک کی یاد میں گنگو بہمن کا لقب اختیار کرے گا۔ حسن اپنی بات کا دھنی تھا۔ ترقی کے بعد اپنے پہلے مالک سے بے اعتنائی کی بجائے اس نے اپنے عہد کا پاس کیا اور مسلمان ہونے کے باوجود اپنے پرانے مالک کی ذات بہمنی کو اپنا لقب بنایا۔ اس کے علاوہ اُس نے اپنی گلبرگہ کی نئی سلطنت کا خزانچی گنگو کو بنا دیا۔

حسن نے بے اندازہ دولت سمیٹی۔ فرشتہ کی تاریخ سے

معلوم ہوتا ہے کہ علاءالدین حسن نے اپنے بڑے بیٹے محمد کی شادی پر دس ہزار خلعت اپنے دربار کے امرا میں تقسیم کئے اور ان کے علاوہ دو سو ہیروں سے مرصع خنجر بھی عنایت کئے۔ ۱۳۵۹ء میں علاءالدین حسن مرگیا اور عنان سلطنت محمد کے ہاتھ میں آئی۔ علاءالدین حسن کا مقبرہ گلبرگہ میں ہے اور اس کی تعمیر میں تکلف کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ استحکام اور سادگی ہی اس کی سب سے بڑی خصوصیات ہیں۔ یہ مقبرہ گلبرگہ کے سات دوسرے بادشاہوں اور حسن کے بعد تخت پر آنے والوں کے مقبروں سے ذرا فاصلے پر ہے اور اس کی عمارت کے زور اور استحکام سے پہلے بہمنی بادشاہ حسن کی جسمانی اور اخلاقی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔

گلبرگہ کے پرانے قلعے کی مضبوطی سے اس کے تعمیر کرنے والے سلطان علاءالدین حسن گنگو بہمنی کی زبردست قوت ارادہ آج اس قدر امتداد زمانہ کے باوجود بھی ٹپکتی ہے۔ گلبرگہ کا قلعہ چوکور اور زمین سے قریباً پچاسی فٹ بلند ہے۔ اوپر کی جو توپیں موجود ہیں وہ اپنے حجم کے لحاظ سے ہولناک ہیں۔ اگرچہ یہ توپیں اب اتار لی گئی ہیں اس کے باوجود ان کو ایک نظر دیکھنے سے ہی اس زمانے کی شان و شوکت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جب ان توپوں نے کئی اہم کام سرانجام دئے تھے قلعے کی چوٹی سے گلبرگہ اور اس کے نواحی علاقوں کا ایک دلکش منظر دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ بیرونی دیوار مٹی سے بنائی گئی ہے لیکن وہ پرشکوہ اور مضبوط ہے۔ اندرونی دیوار برجوں، مورچوں اور پناہ گاہوں کے ایک ان گنت سلسلے کو ملاتی ہے جس میں جگہ جگہ بڑے بڑے گول پتھر لگے ہوئے ہیں۔ یوں گویا قدرت نے اپنے خام مواد کو انسانی ساخت کے سانچے میں ڈھالا ہوا ہے۔ مدافعت کے دونوں خطوط کے درمیان خندق واقع ہے جو اب خالی اور بالکل بے ضرر ہے لیکن ایک وقت تھا کہ یہی خندق دشمن کے حملے روکنے کے لئے ایک زبردست رکاوٹ تھی۔ خندق کی تہ میں مختلف نباتات نے اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔ اور یوں اس سے ایک عجیب ویرانی سے ٹپکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

جب محمد شاہ بہمنی نے ورنگل کے راجہ پر فتح حاصل کر لی تو راجہ نے ایک ہاتھی دانت کا تخت گلبرگہ کے بادشاہ کی نذر کیا۔ اس تخت پر سونے اور جواہرات کا کام کیا ہوا تھا۔ چند سال کے بعد اس تخت کی قیمت کا اندازہ پینتیس لاکھ پاؤنڈ کیا گیا۔ روایات کے مطابق گلبرگہ کی جامع مسجد پہلے دربار کا کام بھی دیتی تھی۔ چنانچہ یہ نیا تخت وہیں رکھا گیا تھا اور علاءالدین حسن کا پرانا سیمیں تخت خزانے میں داخل کر دیا گیا۔

ڈاکہ زنی کا قلع قمع کرنے کے لئے محمد شاہ کے طریقے بہت باقاعدہ اور کاری تھے۔ اس کے زمانہ حکومت میں ایک سال کے اندر اندر آٹھ ہزار ڈاکوؤں کو کیفر کردار تک پہنچایا گیا اور ان کے سر گلبرگہ کے دروازوں کے باہر کھمبوں پر آویزاں کر دئے گئے تاکہ عوام کو عبرت ہو۔ محمد شاہ ۱۳۷۵ء میں مرگیا۔ اس کے بعد مجاہد شاہ کی باری آئی۔ لیکن اسے تین ہی سال کے بعد قتل کر دیا گیا اس کے بعد مجاہد کا قاتل تخت کا مالک بنا لیکن ایک روز جامع مسجد میں نماز کے دوران میں اسے بھی خنجر سے ہلاک کر دیا گیا۔

محمد شاہ ثانی کے زمانے میں امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ اس بادشاہ کو بعض اوقات ارسطو کا لقب بھی دیا جاتا ہے۔ اس کے زمانے میں علم و ادب کا مرکز ہونے کی حیثیت سے گلبرگہ کی شہرت دور دور تک جا پہنچی محمد شاہ ثانی نے فارسی کے مشہور عالم شاعر حافظ شیرازی کو بھی گلبرگہ آنے کی دعوت دی۔ اور حافظ نے آنا قبول بھی کر لیا، محمد شاہ ثانی نے حافظ کے لانے کے لئے ایک جہاز روانہ کیا لیکن بدقسمتی سے ارمز کے مقام پر ٹھہرنے کے بعد جہاز کو طوفان نے آلیا اور اسے واپس بندرگاہ میں جانا پڑا۔ لیکن حافظ نے سمندر کے سفر کی جانفشانی کا ایک مظاہرہ دیکھ لیا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ گلبرگہ پہنچ کر جو تحائف اسے ملیں گے ان کی قیمت سمندر کے ایک لمبے سفر کے مصائب کے مقابلے میں بہت کم ہوگی۔ اس لئے اس نے سفر کا ارادہ چھوڑ دیا۔ اگر حافظ شیرازی اس وقت ہندوستان آجاتا تو اس کا یہ سفر تاریخی اور ادبی لحاظ سے ایک یادگار سفر ہوتا اور ہندوستان کے ادب کی تاریخ پر اس کے نقوش لافانی ثابت ہوتے لیکن محمد شاہ ثانی نے شاعر کی ستائش کے طور پر، اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اس سفر کے تکمیل نہ پانے کے باوجود بلبل شیراز کو ایک ہزار اشرفیاں بھجوا دیں۔

وہ مقبرہ جس کی گلبرگہ میں سب سے بڑھ کر عزت کی جاتی ہے۔ بندہ نواز یا گیسو دراز کا ہے۔ یہ بندہ نواز ۱۴۱۳ء میں گلبرگہ میں وارد ہوئے۔ بندہ نواز کا تعلق اسی چشتی خاندان سے تھا جس سے شیخ سلیم چشتی جن کا مقبرہ فتحپور سیکری میں ہے، پیدا ہوئے۔ خواجہ معین الدین چشتی کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا۔ گلبرگہ میں بندہ نواز کے مقبرے کی عمارت دلکش اور پروقار ہے۔ یہ مقبرہ ۱۶۴۰ء کے قریب تعمیر کیا گیا تھا اور اسے بندہ نواز کے ایک وارث ہی نے تیار کیا تھا۔ دیواروں پر نہایت وضاحت اور تفصیل کے ساتھ قرآن کی آیتیں سنہرے رنگوں میں منقش ہیں۔ ایک فارسی رباعی میں بندہ نواز کی نیکی کی تعریف بھی منقوش ہے۔ اس مقبرے کے قریب کئی

ایسی عمارتیں ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اورنگ زیب نے بنوائی تھیں اور وہ اکثر اس مقبرے کی زیارت کے لئے گلبرگہ آیا کرتا تھا۔ ان عمارتوں میں ایک بڑی سرائے بھی ہے جہاں زائرین کے رہنے کا انتظام مفت کیا جاتا ہے اس کے علاوہ ایک مسجد، ایک مدرسہ اور ایک نہایت خوبصورت محرابی پل ہے۔ سرائے کے احاطے میں زائرین اور فقیروں کی آوازوں کا ملا جلا شور برپا رہتا ہے اور تیسرے پہر کے وقت جبکہ رات کا کھانا تیار کیا جا رہا ہو۔ چھوٹے چھوٹے مطبخوں سے اٹھنے والا دھواں ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں لرزاں سایوں کو ایک نیلا اور خاکستری لباس پہنا دیتا ہے۔

۱۶۵۷ء میں گلبرگہ کو دہلی کی سلطنت کے ساتھ ملحق کر دیا گیا اور ۱۶۸۵ء میں خواجہ گیسو دراز کی درگاہ پر اورنگ زیب کی آمد ایک یادگار واقعہ ہے۔ اس نے اس وقت بیجاپور کو فتح کر لیا تھا۔ اور گولکنڈہ کی طرف ایک اور سلطنت پر قابو پانے کے لئے جا رہا تھا۔

بندہ نواز کا مقبرہ شہر کی دیواروں سے باہر واقع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ نواز نے فیروز شاہ بہمنی کے بیٹے کو اپنی برکت سے محروم قرار دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ فیروز شاہ کا بھائی احمد آیندہ تخت پر بیٹھے گا۔ اس لئے بادشاہ نے بندہ نواز پر بغاوت کا الزام لگایا اور کہا کہ اُس کی تعلیم سلطنت کے لئے بے حد مضر ہے لیکن احمد نے بندہ نواز کی حمایت کی اور یہ ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ بندہ نواز شہر کو چھوڑ کر اس مقام پر رہنے لگے جہاں یہ مقبرہ واقع ہے اور یہی مقام گذشتہ پانچ صدیوں میں گلبرگہ کے لئے ایک برکت ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ اس درگاہ کی شہرت کی وجہ ہی سے گلبرگہ کی شہرت جوں کی توں قایم رہی ہے۔ ہزاروں زائرین اور تاجر ہر سال گلبرگہ آتے ہیں ستمبر کے مہینے میں چودہ دن تک بندہ نواز گیسو دراز کا سالانہ عرس ہوتا ہے اور اس میلے میں مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ اس میلے کی وجہ سے شہر کی تجارت کو بھی بہت فروغ حاصل ہوا ہے۔

فیروز شاہ بہمنی گلبرگہ کے عظیم ترین بادشاہوں سے تھا اور اُس کی شخصیت ایک زبردست شان و شکوہ کی مالک تھی۔ اُس کے زمانہ سلطنت میں گلبرگہ کی شان اور ترقی انتہائی زینے پر تھی۔ ہر سال شاہی انتظامات کے ماتحت گوآ اور چاول سے بیرونی تجارت کے لئے جہاز روانہ کئے جاتے تھے۔ فرشتہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فیروز شاہ بہمنی مختلف زبانوں کا ماہر تھا۔ اُس کے حرم میں تیرہ سے زیادہ مختلف قوموں کی عورتیں تھیں اور فیروز شاہ اُن سب سے اُن کی قومی زبان میں گفتگو کر سکتا تھا۔ اُس میں صرف دو ہی باتیں ایسی تھیں جنہیں مذہبی لحاظ سے غیر مستحسن کہا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ شراب کا عادی تھا اور دوسرے موسیقی کا بے حد شائق تھا۔ وہ اپنی ان عادتوں کے متعلق عموماً اظہار افسوس کیا کرتا تھا لیکن وہ کہتا تھا کہ چونکہ موسیقی اس کی روح کو خدا کی طرف راغب کرتی ہے اور شراب وہ کبھی اتنی مقدار میں استعمال نہیں کرتا کہ نیک و بد کا امتیاز باقی نہ رہے اس لئے اُسے توقع ہے کہ اُس کے یہ دو گناہ خدا معاف کر دیگا۔

گلبرگہ سے بارہ میل کے فاصلے پر فیروزآباد کے کھنڈر واقع ہیں۔ یہ عیش و عشرت کا ایک مضبوط اور زبردست شہر تھا۔ جسے فیروز شاہ کی عشرت پسند طبیعت نے بنا کر اپنے نام سے منسوب کیا تھا۔ اس بات کے باوجود کہ اس شہر کی عمارتیں اب بالکل کھنڈر بن چکی ہیں۔ یہاں کئی ایک دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ فیروزآباد کے بازار اور کوچے وسیع اور باقاعدہ تھے۔ اس کی دو مشہور عمارتیں "کنیزی محل" یعنی رقاصہ عورتوں کا محل، اور "شاہی حرم" ہیں۔ زنانہ حرم میں بہت سے شاندار صحن بھی ہیں اور دریائے بھیما سے ایک نہر نکال کر یہاں پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہر صحن کی مکینوں پر بادشاہ کی منظور نظر حرموں کی حکومت ہوتی تھی اور حرم کے تمام انتظامات بہت سختی اور باقاعدگی کے ساتھ عمل میں لائے جاتے تھے۔ فیروز شاہ ایک بہت ہوشیار اور عقلمند انسان تھا۔ چنانچہ حرم کی ہر عورت یہی سمجھتی تھی کہ وہی سلطان کو سب سے بڑھ کر عزیز ہے۔

گلبرگہ میں فیروز شاہ کا جو مقبرہ ہے وہ بہمنی مقبروں میں ایک خاص رتبہ رکھتا ہے۔ یہ ایک قلعہ نما عمارت ہے اور اس پر بڑے بڑے گنبد ہیں۔ فیروز شاہ کے اس مقبرہ میں جالی کا کام خاص طور پر قابل دید ہے اندرونی حصے کی آرائش بھی شاندار ہے اور بہ ہیئت مجموعی یہ عمارت اس عظیم الشان بادشاہ کے شایان شان ہے۔ فیروز شاہ کی راجہ وجے نگر سے ملاقات ایک خاص تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور شان و شوکت کی نمائش کے لحاظ سے اپنے مقابلے میں بہت کم مثالیں رکھتی ہے۔

گلبرگہ کے قلعے کے قریب ہی سراج الدین کی درگاہ ہے۔ یہ اپنے تناسب اور نازک میناروں کی وجہ سے بہت خوبصورت عمارت ہے سراج الدین گلبرگہ میں ۱۳۱۸ء کے قریب آئے اور ان کی درگاہ بھی بندہ نواز کی درگاہ کے برابر ہی مقدس خیال کی جاتی ہے۔

گلبرگہ میں جو مقبرہ ہے وہ گنبدوں والا ہے۔ لیکن ایک مقبرہ اس

لحاظ سے بھی امتیاز رکھتا ہے۔ یہ رکن الدین کا مقبرہ ہے۔ جب بندہ نواز گلبرگہ میں آئے تو رکن الدین پہلے ہی سے یہاں موجود تھے۔ رکن الدین اور بندہ نواز میں ایک جھگڑے کی وجہ سے رکن الدین اس جگہ الگ تھلگ رہنے لگے جہاں کہ ان کا مقبرہ اب موجود ہے۔ اس درگاہ پر بھی ہزارہا لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں۔ اس عمارت کے قریب ہی ایک اور عمارت ہے۔ اس کا نام چور گنبد ہے۔ اس عمارت سے بھی ایک خاص روایت وابستہ ہے بندہ نواز کے وقت بھی یہ عمارت موجود تھی اور ان کی خدمت میں اُن کے استعمال کے لئے پیش کی گئی تھی۔ لیکن بندہ نواز نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس عمارت کو ایک سود خوار مہاجن نے بنایا تھا اور سود کے روپے سے تیار شدہ عمارت میں رہنا ان کے اصول کے خلاف تھا۔ اس واقعے کے بعد سے اس عمارت کو لوگ منحوس خیال کرنے لگے اور یہ غیر آباد ہی رہنے لگی۔ لیکن ایک چور اور رہزن تھا جو بندہ نواز کی اصول پرستی کا قائل نہ تھا۔ اُس نے اس عمارت کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے بے حد موزوں پایا اور اس میں اقامت اختیار کر لی بہت عرصے تک لوگوں کو اس بات کا علم نہ ہو سکا۔ آخر ایک دن صیاد آپ اپنے جال میں آگیا اور قانونی کارروائی کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اُس دن سے اس عمارت کا نام چور گنبد مشہور ہو گیا۔

فیروز شاہ کے بعد احمد شاہ ولی بہمنی تخت پر بیٹھا۔ اس نے دارالسلطنت گلبرگہ سے بیدر تبدیل کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت کے بعد سے گلبرگہ میں پے در پے انقلاب آتے گئے کبھی بہمنی خاندان کے قبضہ میں چلا جاتا اور کبھی اس پر بیجاپور کے عادل شاہی قابض ہو جاتے ۱۶۵۷ء سے ۱۷۲۴ء تک گلبرگہ مغلوں کے قبضے میں رہا اور پھر نظام کے اعلانِ خود مختاری کے بعد سے ریاست دکن میں شامل کر لیا گیا۔

گلبرگہ میں مقبروں کی اتنی کثرت ہے کہ اس کی بیشتر پرانی عمارتیں دفاتر کے طور پر استعمال ہوتی رہیں لیکن اب محکمۂ آثار قدیمہ حیدر آباد کی محنت سے ان عمارتوں کا مناسب انتظام کیا جا چکا ہے۔ اور بہمنی بادشاہوں کی یادگاریں محفوظ ہیں۔

(ماخوذ)

فیروزہ خانم





اعجازِ بیان

بے حجابانہ مرے پاس آئیے ! آئیے آکر یہیں رہ جائیے
پھر کوئی مبہم اشارہ کیجئے، جو نہ سمجھوں پھر وہی کہہ جائیے
شادماں ہو جاؤں گو پاؤں نہ بھید اس طرح کچھ زیر لب فرمائیے
مجھ کو دھوکا ہو نوازا آپ نے کاسۂ سر یوں مرا ٹھکرائیے
فرطِ حیرت سے میں سمجھوں خواب ہے، دفعتاً یوں میرے پاس آجائیے
کچھ خفا ہیں آپ میرے خواب میں آئیے اس خواب سے چونکائیے
یوں نہ اُٹھ کر جائیے چیں بر جبیں ہاں خدارا مسکراتے جائیے
میرے شکوے آپ یوں ہی ٹالئے کچھ نہ سنیئے اور خفا ہو جائیے
آہ وہ بے اختیاری شوق کی سنئیے سب کچھ اور چپ رہ جائیے
کشمکش کا ہائے وہ عالم نہ پوچھ ! بڑھیئے آگے اور پھر رک جائیے
پھر اُٹھا لوں آپ کو آغوش میں پھر اُسی انداز سے گر جائیے

کچھ نہ کہیئے آپ سے بس آپ کو — دیکھتے ہی دیکھتے کھو جائیے
دیکھئے میری نظر سے اپنا حُسن — دیکھئے اور دم بخود رہ جائیے
پھر مری بے باکیاں ہیں منتظر — پھر اُسی انداز سے شرمائیے
پھر اُسی انداز سے شرمائیے — جھینپ کر دیوار سے لگ جائیے
میں جو چاہوں چھیڑنا تو سر بسر — پیکرِ شرم و حیا بن جائیے
اور کبھی موقع ملے گر آپ کو — چھیڑئیے اور چھیڑ کر چھپ جائیے
مت خدارا برگِ گل کو چومئے — مت خدارا دور سے ترسائیے
لیجئے یہ دل ہے اس کو روندئیے — روندئیے مت پھول کو باز آئیے
کر چکا غیر آپ سے پہلو تہی — اب تو پہلو میں خدارا آئیے
لائیے دل تک مرے جسمِ گداز — ریشمی ملبوس کو سرکائیے

دیکھئے اعجاز جاں اس چھیڑ پر
اس ادائے ناز پر مر جائیے

سعید احمد اعجاز

آزاد اور حالی مرحوم کی نیچرل شاعری

(ایڈیٹر کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

اردو علم ادب میں عموماً دو قسم کی شاعری موجود پائی جاتی ہے۔

عشقیہ[1] اور نیچرل[2]

عشقیہ سے مراد وہ طرز سخن ہے جو زمانہ قدیم سے یہاں مروج ہے اور بہت متعارف ہے یعنی حسن و عشق کا بیان گل و بلبل کی داستان یا غزل و ہزل اور واسوخت وغیرہ۔ جس میں متاخرین لکھنؤ نے ریختی کا بھی اضافہ کر دیا تھا لیکن نیچرل شاعری اس سے بہت مختلف ہے کیونکہ اس میں شاعر ہمیشہ حقایق و واقعات کو قلم بند کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آخر الذکر نیچرل شاعری کی بنیاد شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اور حالی مرحوم نے ڈالی تھی اور اس خاص کارنامے کا فخر سرزمین پنجاب کو حاصل ہے۔ ممکن ہے یہ بالکل صحیح ہو جیسا کہ پنجاب کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے۔ مگر اس حقیقت کو شرف قبولیت دینے سے قبل ناظرین مندرجہ ذیل سطور پر کچھ غور فرمائیں۔

جدید اردو علم ادب جس سے نیچرل شاعری کا خاص تعلق ہے۔ کیونکہ اسی میں اس کا حدوث ہوا زمانۂ غدر دہلی کے بعد کی پیداوار ہے اور غدر ۱۸۵۷ء و ۱۸۵۸ء کے درمیان وقوع پذیر ہوا تھا۔ مگر دلی اور لکھنؤ میں کامل سکون کی حالت ۱۸۶۰ء میں رونما ہوئی تھی۔ جس کے چار پانچ سال بعد سرکار عالیہ کی طرف سے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں کئی طرح کی ایسی سوسائٹیاں یا انجمنیں قایم کی گئی تھیں جو راعی و رعایا کے تعلقات کو آیندہ زیادہ مضبوط کرنے اور عوام الناس کی فلاح و بہبود کے وسائل بہم پہنچانے پر مامور تھیں انہی کثیر التعداد سوسائٹیوں میں سے ایک دلی کی سوسائٹی تھی جس کا آغاز اگست ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ اس کا نام دہلی سوسائٹی تھا اور اس کے پیٹرن یا چیف پریزیڈنٹ خود گورنر پنجاب مقرر ہوئے تھے۔ اس سوسائٹی میں ہندو مسلم روسائے شہر کے علاوہ دلی کے اکثر جدید مذاق کے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ اصحاب بھی شامل تھے جن میں سے کوئی نہ کوئی ہر ماہ ایک مفید عام مضمون پر لکچر دیا کرتا تھا۔ انہی مفید علمی جلسوں میں ایک مرتبہ سرکار برطانیہ کی طرف سے تمام عشقیہ غزلوں۔ اور ہزل نویسی یا فحش گوئی کا سدباب کرنے کے لئے۔ ایک تحریک پیش کی گئی تھی۔ پھر جب اسی سوسائٹی کی طرف سے ایک ماہانہ ادبی رسالہ جاری ہوا۔ تو اس کا یہ دستور قرار پایا کہ ہر مہینے کسی خاص علمی مضمون پر آپس میں بحثیں کی جائیں اور اس پر کوئی اچھی نظم یا نثر۔ اہل مجلس کو سنائی جائے اور پھر وہ رسالہ مذکور میں مفاد عامہ کے لئے شائع کر دی جائے۔

اس خاص مقررہ کارگزاری کے علاوہ دہلی سوسائٹی کا مقصد اردو میں ہر طرح کی جدید علمی اور سائنٹفک کتابیں طبع کرانا اور ان کو پبلک سے روشناس کرانا بھی تھا۔ تاکہ ملک میں مغربی علوم کی اشاعت ہو۔ یہ واقعات ۱۸۶۵ء اور ۱۸۶۶ء سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی دلی سوسائٹی کی دیکھا دیکھی ۱۸۶۶ء کے بعد جبکہ صوبہ پنجاب میں تعلیم انگریزی کا رواج ہونے لگا تو یہاں بھی ایک بک ڈپو قایم کیا گیا۔ جس میں علوم مغربی کی بعض کتابیں زبان اردو سے ترجمہ کرانے کا بند و بست کیا گیا تھا۔ اسی طرح جب سر سید مرحوم نے علی گڈھ میں ایک مدرسہ انگریزی علم ادب کی تعلیم کے لئے جاری کیا تو وہاں بھی اسی دہلی سوسائٹی کی تقلید پر ایک سائنٹفک سوسائٹی قایم ہوئی تھی۔ غرض اول اول اردو زبان میں قدیم مقفیٰ عبارت کی نثروں اور عشقیہ غزلوں کو ترک کرنے کا خیال مذکورۃ الصدر دہلی سوسائٹی ہی کی تحریک پر عوام میں پیدا ہوا تھا اور وہ ایسا وقت تھا کہ نہ تو آزاد مرحوم اور نہ حالی مغفور اس وقت پنجاب میں موجود تھے۔ بلکہ حضرت حالی کا تو تخلص بھی اس زمانے میں خستہ تھا نہ کہ حالی اور آزاد مرحوم تو سب سے پہلے لاہور میں آکر ڈاک خانے کے محکمے میں ملازم ہوئے تھے اور اس وقت

ان کا کوئی تعلق کسی بک ڈپو یا اخبار یا رسالہ یا کسی علمی انجمن سے مطلقاً نہیں تھا۔ البتہ ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب جو لالہ سری رام آنجہانی کے چچا تھے اور مرزا غالب کے بھی عزیز دوستوں میں سے تھے۔ وہ ایک طرف تو دہلی سوسائٹی اور دوسری طرف پنجاب کے محکمہ تعلیم سے تعلق رکھتے تھے۔ پس اسی قسم کے اہل قلم دہلی سوسائٹی کی رونق تھے۔

چنانچہ انہی کے ایک ہمعصر اور ہم نوا ممبر مولوی الفت حسین صاحب مرحوم تھے جنہوں نے مندرجہ ذیل مضمون سوسائٹی مذکور کے ایک اجلاس میں پڑھا اور وہ رسالہ دہلی سوسائٹی نمبر ۸ (جلد ۲) بابت اگست ۱۸۶۳ء میں شایع ہوا۔

مضمون مصنفہ مولوی الفت حسین صاحب

چونکہ فی الحال ہندوستان میں شاعری عاشقانہ رہ گئی تھی جس سے اخلاق عام روز بروز بالکل بگڑتے جاتے تھے۔ اس لئے سرکار سے بڑی فحش مضامین کی کتب چھپنے و بکنے کی ممانعت ہوگئی۔ اب اکثر خلقت اس عنایت سرکار کو بھی غضب سمجھتی اور کہتے ہیں کہ کیا کہئے ایک وقت شاعری ہندوستان میں باقی تھی۔ سو وہ یوں کھو دی۔ اگرچہ قدر دان تو پہلے ہی جا چکے تھے۔ مگر خیر کچھ شوق طبیعت باقی تھا۔ کچھ کہہ سن کر طبیعت بہلا لیتے تھے۔ دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی۔ افسوس کہ وہ لطف زبان بھی نہیں۔ لہذا حقیر نے چاہا کہ اس غلط فہمی کو دور کیا جائے۔ اس لئے چند شاگردوں اور رشتہ داروں کو اس طرف متوجہ کیا کہ اخلاقی مضامین کے اشعار کہا کریں اور عمدہ مضامین مفیدہ میں زور طبیعت دکھائیں "تا کہ لفظاً و معناً ہر طرح حظ حاصل کریں۔ گورنمنٹ نے جو لغو دبے ہو وہ شاعری کی بنیاد اکھاڑ دی یہ ہمارے جوانوں اور تمیز داروں کے لڑکوں کے لئے تہذیب کا درخت بویا ہے طبع آزمائی کے لئے ہزاروں مفید مطالب ایسے ہیں کہ ... تک نظم و نثر کے میدان میں نہیں آئے۔ چنانچہ بعض شائقین نے ر... کی مصیبت نظم میں اچھی لکھی ہے اور اس باب میں معقول تحریص و ... دی ہے۔ اور ایک شخص نے لڑائی و بغض و حسد و تکبر و ریا کی مذمت خو... طرح اشعار میں لکھی ہے کہ بندہ کے نام پر اس کا نام الفت نام رکھا ہے۔

غرض یہ ہے کہ میدان شاعری بہت وسیع ہے۔ اس نیک انداز سے اچھی طرف قدم بڑھائیں اور اپنے بھائیوں کی درستی اخلاق چاہیں۔ اپنی نازک طبعی اور ذہانت کو اچھی جگہ کام میں لائیں یعنی عشق و رندی میں نہ کھو دیں۔ بیشک ہندوستانی جیسے شاعری میں کامل ہیں۔ اگر اس کمال کو عمدہ طور پر اخلاق کی باتوں میں خرچ کریں تو ایک دن اپنے آپ کو کمال اوج پر پائیں گے"۔

مندرجہ مضمون سے صاف واضح ہے کہ نیچرل شاعری کی تحریک دہلی سوسائٹی کی طرف سے ہوئی تھی اور وہ سوسائٹی وہاں ۱۸۶۵ء میں قیام پذیر ہوئی تھی جبکہ خواجہ الطاف حسین صاحب حالی مرحوم نواب مصطفٰے خاں شیفتہ والی جہانگیر آباد کے مصاحب اور ان کے صاحبزادوں کے اتالیق تھے چنانچہ تذکرہ حالی میں جو کہ حالی مرحوم کی صد سالہ برسی کی تقریب پر کسی واقفکار کے قلم سے مرتب ہوا ہے یہ عبارت موجود ہے۔

مولانا کا تعلق نواب صاحب سے اُن کی وفات تک رہا۔ جب ۱۸۶۹ء میں نواب صاحب کا انتقال ہوگیا تو پھر مولانا کو کسی دوسرے ذریعہ معاش کی فکر ہوئی . . . چنانچہ ان کو فوراً گورنمنٹ بکڈپو لاہور میں ایک جگہ مل گئی . . . پھر ۱۸۶۹ء کے اوائل میں اخبار انجمن پنجاب کے نام سے سر رشتہ تعلیم پنجاب کی طرف سے ایک اخبار جاری ہوا۔ جو عرصہ تک کامیابی سے چلتا رہا لیکن بعد میں سرکار نے اسے ماہوار کرکے اس کا نام اتالیق پنجاب رکھ دیا۔ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال اس کے ایڈیٹر تھے اور مولانا بھی کچھ عرصے تک اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے ہیں . . . . "ایک جدید قسم کے مشاعرے کا قیام"

اس عنوان سے پھر اسی کتاب میں یہ الفاظ اور عبارت صاف طور پر موجود ہے۔

"مولانا کے قیام لاہور کے زمانے میں مولوی محمد حسین آزاد دہلوی نے کرنیل ہالرائیڈ صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات پنجاب کے ایما سے ۱۸۷۴ء میں ایک جدید مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں بجائے مصرعہ طرح کے کسی مضمون کا عنوان تمام شعرا کو دے دیا جاتا تھا اور مشاعرے میں شعرا اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس مضمون پر طبع آزمائیاں کیا کرتے تھے۔ یہ مشاعرے انجمن پنجاب کے دفتر میں بڑی شان و شوکت سے ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا حالی مرحوم بھی ان مشاعروں میں شامل ہوئے اور آپ کی سب سے پہلی چار دلچسپ مثنویاں یعنی برکھارت۔ نشاط اُمید۔ رحم و انصاف اور حب وطن انہی مشاعروں کی یادگار ہیں"۔

مضمون ہذا کو بخوف طوالت یہیں ختم کرتا ہوں۔ حاصل یہ کہ ہندوستان میں نیچرل شاعری کی ابتدا دہلی سوسائٹی کے دفتر واقع دہلی میں ہوئی تھی اور اس کے بانی مبانی نہ تو حضرت آزاد ہیں نہ حالی جیسا کہ عام طور پر یہاں مشہور ہے۔

سرخوش

ناک سے زیادہ دانتوں میں ڈالتے ہوئے ویدجی کی تائید کی۔ پنڈت مادھورام بولے "اب تو آپ کو یقین آگیا ہوگا مولا داد خاں جی آپ واقعی غمگین نظر آتے ہیں"۔

"حقہ ذرا اوپر اٹھائے رکھنا۔ چاندی" پٹواری نے ایک سرد آہ بھری اور کہنے لگا "ٹھیک ہے ویدجی۔ آج میں غمگین ہوں۔ آپ کا خیال بالکل درست ہے ویدجی آج میری روح غمگین ہے۔ آج بڑے تحصیلدار صاحب دورہ پر آئے تھے۔ میرا کام دیکھ کر تحصیلدار صاحب چودھری خادم حسین گرداور اور مجھے ہمراہ لے کر کنگھن پور کے موضع کی پڑتال کو گئے اور یہ کنگھن پور ـــــ ویدجی، میری پہلی محبت کی بستی ہے۔ میرے پریم کی دھرتی ہے۔" پٹواری نے حقے کا ایک لمبا کش بھرا۔ کان پر سے قلم اٹھا کر کان کو کھجلایا اور پھر کہنے لگا۔

"ویدجی، آج میں کوئی تیس پورے تیس سال کے بعد اس سرزمین محبت کی طرف گیا ہوں۔ مگر وہاں پہنچ کر مجھے اپنی زندگی کے کچھ بھولے بسرے افسانے یاد آگئے۔ میری جوانی کی کچھ بیتی ہوئی گھڑیاں میری نگاہوں کے سامنے ناچنے لگیں اور میری پہلی محبت کے سنہرے خواب میری روح میں چمکنے لگے۔ ویدجی مجھے زندگی کی وہ 'مٹھاس' یاد آگئی جس مٹھاس کے بعد میری ساری زندگی ناقابل بیان تلخیوں کا ایک مجموعہ بن گئی"۔

یہاں پٹواری کی آواز بھرا گئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں سے آنسوؤں کے دو چار گرم گرم قطرے ٹپ ٹپ گرے اور اس کی گردن جھک گئی۔ منشی نور عالم نے اپنے اخبار کو مروڑ کر جیب میں ڈال لیا۔ چاندی چوکیدار نے ایک انگڑائی لی اور فضلو ڈاکئے نے نسوار کی ایک چٹکی چڑھائی۔ تھوڑی دیر کے بعد پٹواری نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ویدجی یہ آنسو میرے پریم کے موتی ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں کے یہ ستارے اپنی سکینہ کی پیاری یاد پر نچھاور کر دیئے ہیں ـــــ آہ ـــــ آج سے ٹھیک تیس سال پہلے میرے آغاز شباب کا زمانہ تھا۔ یہی کوئی انیس بیس کا سن تھا۔ رگوں میں خون اور خون میں حرارت تھی۔ میں نیا نیا مڈل پاس کر کے نکلا تھا اور اسی کنگھن پور میں بطور پٹواری متعین ہوا تھا۔ اس سے پہلے مجھے ملازمت کا قطعاً کوئی تجربہ نہ تھا۔

کنگھن پور ـــــ آپ جانتے ہوں گے ویدجی، خالص راجپوت زمینداروں کی بستی ہے۔ میں نے جب اپنے حلقے کا کام سنبھالا تو اپنی رہائش کے لئے کنگھن پور کو ہی پسند کیا۔ ایک تو درمیانی موضع تھا۔ دوسرے ڈھنگروٹ کا پتن نزدیک پڑتا تھا۔ اتفاق کی بات، ویدجی، ان دنوں گاؤں بھر میں کوئی مکان خالی نہ تھا۔ لاکو نمبردار نے بڑی کوشش کی مگر کوئی علیحدہ مکان نہ مل سکا۔ آخر اس بیچارے نے اپنے کوٹھے میں ہی مجھے بھی ایک کوٹھڑی رہنے کے لئے دے دی۔ لاکو کے مکان میں کل تین کمرے، ایک پسار، اور ایک وسیع دالان تھا۔ اپنی کوٹھڑی میں میں نے اپنے کاغذوں کی الماری، بستر، چارپائی، اور لالٹین رکھ دی میرا کھانا عموماً باہر ہی ہوتا تھا۔ لیکن اگر کبھی ناغہ ہوجاتا تو میں لاکو کا ہی مہمان ہوتا مگر ویدجی آپ یہ نہ سمجھیں کہ لاکو میری اس مہمانی سے تنگ آگیا ہوگا۔ وہ تنگ آتا کیوں؟ یہ کوئی گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ میری وجہ سے لاکو کا سارے زمینداروں پر رعب تھا۔ سارا حلقہ اس کا غلام تھا۔ زمیندار اپنے کاموں کے لئے لاکو سے سفارش کراتے اور اس کے صلہ میں اسے انڈوں اور مرغوں کے ٹوکرے دے جاتے تھے۔ میرے سہارے پر لاکو بادشاہی کر رہا تھا۔

لاکو نمبردار کے گھر میں اس کی بیوی، اس کی لڑکی سکینہ، اور دو چھوٹے بچے رہتے تھے۔ لاکو کا کنبہ یہی کچھ تھا۔ البتہ اس کا بڑا لڑکا شاہیا فوج میں سپاہی تھا جو عموماً باہر ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھار چھٹی پر گھر بھی آجاتا تھا باقی اولاد میں سے سکینہ سب سے بڑی تھی۔ سب سے بڑی اور سب سے خوبصورت کنگھن پور تو ایک طرف رہا۔ سکینہ میرے سارے حلقہ کی خوبصورت ترین دوشیزہ تھی۔ اس کے حسن و جمال کے چرچے گھر کی چاردیواری سے نکل کر اپنے گاؤں اور قرب و جوار کے تمام دیہات میں پھیل چکے تھے۔ جب وہ پانی بھرنے کے لئے ندی پر جاتی تو گاؤں کے نوخیز جوان اسے دیکھنے کے لئے راہ پر جمع ہوجاتے۔ بعض شریر طرح طرح کی "بولیاں" بھی گاتے لیکن نمبردار کے خوف کی وجہ سے کوئی اس کے قریب نہ پھٹکتا۔

کرپو تمباکو کی تازہ چلم بھر کر لایا۔ منشی نور عالم نے وہ پرانا اخبار جیب میں سے نکالا اور اسے الٹ پلٹ کر پھر جیب میں رکھ لیا۔ فضلو ڈاکئے نے نسوار کی ایک چٹکی چڑھائی اور چاندی چوکیدار نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"راجہ جی یہ بڑی عجیب کہانی ہے۔ میری دادی، خدا بخشے، انہیں دیووں اور پریوں کی ایسی ایسی کہانیاں یاد تھیں کہ آدمی سن کر حیران ہوجاتا تھا"۔

"یہ کہانی ہے؟ چاندی یہ کہانی نہیں" پٹواری نے تازہ چلم کا ایک کش لگایا اور کھانستے ہوئے کہا "چاندی یہ کہانی نہیں۔ یہ حقیقت ہے یہ

پریوں کے قصے نہیں مولا داد کے سر پر گزری ہوئی باتیں ہیں۔ میری آپ بیتی ہے ـــــ اچھا تو پنڈت جی! آپ کو یاد ہو گا وہ دن میری اٹھتی جوانی کے دن تھے۔ مال کے محکمے میں کام کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ بے چارے اہلکاروں کو عشق و شق کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ان کی زندگی کاغذی زندگی ہوتی ہے۔ محبت اور محبت کے رس سے خالی۔ میرا بھی یہی حال تھا میرے قدموں میں حسن کی گنگا بہہ رہی تھی مگر مجھے اتنی فرصت نہ تھی کہ اس حسنِ معصوم پر ایک بھرپور نظر ہی ڈال سکتا۔ میں باہر سے آتا اور اپنی کوٹھڑی میں "خسرہ گرداوری" اور "جمعبندیوں" کے انبار میں غرق ہو جاتا اور پھر زمینداروں کا ہجوم ـــــ ہر وقت دس پانچ آدمی بیٹھے ہی رہتے۔

مجھے روٹی پانی دینے کے لئے اکثر سکینہ ہی میری کوٹھڑی میں آیا جایا کرتی تھی۔ میری کوٹھڑی کی صفائی وغیرہ بھی اسی کے ذمے تھی۔ اکثر ہماری نگاہیں چار ہو جاتیں اور ہمارے نوجوان دلوں میں کچھ دھڑکن سی محسوس ہوتی۔ اس کے نرم و نازک ہاتھوں سے کھانا لیتے وقت میری روح ایک عجیب لذت محسوس کرتی۔ مگر بات ابھی یہیں تک تھی۔ ہاں کبھی کبھی ہم ایک دوسرے کو ٹوک دیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ میرے سامنے روٹی رکھتے ہوئے سکینہ کہنے لگی۔

"راجہ جی! حرام کی روٹی کھا کھا کر آپ تو روز بروز سرخ ہوئے جا رہے ہیں"۔ میں نے بھی جھٹ کہہ دیا ـــــ "تم سے زیادہ سرخ تو نہیں ہوں بھولی سکینہ"ـــــ یہ جواب سن کر وہ شرما گئی اور اس نے اپنے انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے رخساروں کو اپنی رنگی ہوئی کھدر کی چادر میں چھپا لیا۔ اکثر اسی قسم کی ٹوکیں ہوتی رہتیں۔

سردیوں کے دن تھے۔ لاکو کی بیوی تابو کو ساتواں مہینہ جا رہا تھا۔ اب گھر کا سارا جنجال سکینہ کے سر پر ہی تھا۔ بے چاری سحری کے وقت اٹھتی، جھاڑو بہار دیتی۔ دو بھینسوں کا دودھ بلوتی، بھائیوں کیلئے روٹی پکاتی، انہیں نہلاتی پہناتی، اور مدرسے بھیجتی۔ پھر میرا بھی پورا خیال رکھتی ـــــ پوچھو تو میں اسی میں خوش تھا۔ میں اسی میں خوش تھا کہ اس کی ماں چارپائی سے لگی رہے۔ بلکہ اکثر دعائیں کرتا کہ وہ مر جائے تاکہ ہمیں آزادی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے زیادہ سے زیادہ موقعے مل سکیں۔

مجھے وہاں رہتے ہوئے کوئی ایک سال ہو گیا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہو چکی تھی مگر اظہارِ محبت کی جرأت نہ تھی۔ سکینہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر میری کوٹھڑی میں آ جاتی اور ہم یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے۔ میں محسوس کرتا کہ سکینہ مجھ سے باتیں کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہے۔ میں اب زیادہ تر ڈیرے پر ہی رہا کرتا تھا اور زمینداروں سے عام ملنا جلنا بھی ترک کر چکا تھا۔

ایک دن مجھے چودھری خادم حسین گرداور نے تاج پور بلا بھیجا۔ وہاں مجھے خیال آیا کہ آؤ اس قصبہ سے سکینہ کے لئے کوئی تحفہ لے چلوں۔ میں نے کانچ کی کچھ چوڑیاں خرید لیں۔ سوچا کہ اُسے دوں گا۔ اگر قبول ہو گئیں تو میں سمجھوں گا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں چوڑیاں لے آیا۔ جب شام کو سکینہ روٹی لے کر میری کوٹھڑی میں آئی تو میں نے اُسے چوڑیاں دکھاتے ہوئے کہا ـــــ سکینہ، یہ میں تمہارے واسطے لایا ہوں۔ یہ میری محبت کی چوڑیاں ہیں۔ کہو قبول کرتی ہو؟ ـــــ وہ قدرے ٹھٹکی، اس نے کچھ سوچا اور پھر آہستہ سے اپنی گوری گوری گداز باہیں بڑھاتے ہوئے چوڑیاں تھام کر کہنے لگی ـــــ

"راجہ جی! یہ آپ کی محبت کی زنجیریں ہیں" اس جواب پر میں نے اُسے اپنی بے قرار آغوش میں کھینچ لیا اور اپنے پیاسے ہونٹوں کو اُن شاداب اور نازک ہونٹوں پر رکھ دیا۔

ویدجی، اب میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھتا تھا۔ مجھے سکینہ کی محبت حاصل تھی۔ میں قصبہ تاج پور سے سکینہ کے لئے اکثر تحفے لاتا رہتا تھا۔ یہی ریشمی آزار بند چھوٹے موتی اور رکانچ کی چوڑیاں ـــــ سکینہ بھی کبھی کبھی اپنے ہاتھ سے کاڑھ کر کوئی رومال مجھے دے دیا کرتی تھی۔ ہماری محبت انگور کی بیل کی طرح بڑھ رہی تھی۔ راجوڑی کی خاموش سوئی ہوئی راتیں، چیڑ کے درختوں کے آسیبی سائے اور پیر پنجال کے قریبی سلسلے کے رومانی غار اور کھوہیں یہ ہماری محبوب تفریح گاہیں تھیں۔ ہم اکثر یہاں بیٹھے رہتے اور محبت کے گیت گاتے سکینہ کی محبت مجھ پر کچھ اس طرح سے چھا رہی تھی کہ میں سرکاری کام سے بھی بے پروا سا رہنے لگا۔ ویدجی! میں ساری نوکری میں صرف ایک دفعہ معطل ہوا ہوں اور یہ انہیں دنوں کی بات ہے۔

رات کی بے زبان تاریکیوں اور دامنِ کوہ کے بہشتی سکوت کے آغوش میں جب ہم دونوں ایک دوسرے سے ملتے اور اپنے مستقبل کے متعلق سوچا کرتے تو سکینہ بات بات پر رو دیا کرتی تھی۔ جب وہ رخصت ہوتی تو اُس کی گھنی گھنی پلکیں اشکوں سے بھیگ رہی ہوتیں

دنیائے ادب

تھانیسر کی لڑائی اور اُس کے اثرات

دنیا میں ہمیشہ سے لڑائیاں ہوتی رہی ہیں لیکن بعض ایسی اہم اور زبردست لڑائیاں ہوئی ہیں جن کی بدولت ملکوں اور قوموں کی قسمت ہی پلٹ گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس قسم کی لڑائی بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں تھانیسر ہوئی تھی۔ جس نے اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت کا چراغ سدا کے لئے گُل کر دیا اور مسلمانوں کے قدم صدیوں کے لئے یہاں مضبوطی سے جما دیئے۔ یوں تو ہندوستان کی دولت اور جہاد کے شوق نے ساتویں صدی کے وسط ہی سے مسلمانوں کو ہندوستان میں دعوتِ عمل دے رکھی تھی اور ایران کی فتح نے اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے لئے راستہ بھی کھول دیا تھا لیکن تھانیسر کی لڑائی سے پہلے صرف دو ہی واقعات ایسے قابلِ ذکر ہوئے جن کا اثر اس ملک کی تاریخ پر پڑا ان میں پہلا محمد بن قاسم کا حملہ ہے جس نے ۷۱۲ء میں سندھ پر قبضہ کر کے ہندوستان میں پہلی مسلمان حکومت قایم کی لیکن اس حملہ کا اثر فقط سندھ تک محدود رہا۔ اور ہندوستان خاص پر کچھ اثر محسوس نہ ہوا۔ دوسرا واقعہ محمود غزنوی کے پے درپے حملوں کا ہے مگر یہ بھی بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں کی طرح آئے اور نکل گئے۔ اور ان کا اثر صرف پنجاب تک محدود رہا۔ کیونکہ محمود کی وفات کے چند ہی سال کے بعد ہندوؤں نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا اور دہلی میں ایک طاقتور سلطنت قایم کر لی۔ مگر محمود غزنوی نے درۂ خیبر کا راستہ از سرِ نو کھول کر آیندہ مسلمان حملہ آوروں کے لئے اس ملک میں داخل ہونے کی یقینی راہ دکھا دی۔ دراصل یہی ہندوستان کا پہلا پھاٹک ہے۔

محمد بن قاسم غلط راستے سے ہندوستان آیا۔ اور سندھ اور راجپوتانہ کے ریگستانوں نے اُسے ہندوستان خاص تک پہنچنے نہ دیا۔ محمود غزنوی درۂ خیبر سے آیا جس کی بدولت آسانی سے پنجاب میں داخل ہو کر سرہند تک پہنچ گیا۔ جو ہندوستان کے اندرونی قلعہ کا اصلی پھاٹک ہے۔ ہندوستان کی تمام فیصلہ کن اور تاریخی لڑائیاں اسی سرزمین میں ہوئی ہیں۔ دہلی کی تاریخی اہمیت کی بھی یہی وجہ ہے جس کے بدولت اکثر سلطنتوں نے اُسے پایۂ تخت بنایا۔

تھانیسر اسی علاقہ کا ایک تاریخی مقام ہے جو راجہ ہرش کے باپ راجہ پربھاکر وردھن کا پایہ تخت رہ چکا ہے۔ ہرش کے لاولد وجوان بھائی کی مرگ بہنوئی کے بعد جب اس کی بہن شوہر کے غم میں اپنا راج پاٹ چھوڑ کر بودھ مت کی بھکشنی ہو گئی اور قنوج کی رعایا نے ہرش کو اپنا راجہ انتخاب کیا تو اس نے بھی تھانیسر چھوڑ کر قنوج کو اپنا دار السلطنت بنا لیا مگر تھانیسر کی جغرافیائی اہمیت اپنی جگہ پر قائم رہی اور آگے چل کر اس نے ہندوستان کی قسمت کا پانسہ ہمیشہ کے لئے پلٹ دیا۔

تھانیسر کی لڑائی ۱۱۹۱ء میں محمد غوری اور پرتھی راج کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قایم ہو گئی اور وہ مستقل طور پر ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ اس لڑائی کے بعد پھر ہندوؤں کو ہندوستان میں

حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔

دکن میں وجے نگر کی سلطنت ایک بجھنے والے شعلے کی آخری بھڑک تھی۔ اور اٹھارہویں صدی میں مرہٹوں کا عروج بھی محض چند روزہ تھا جسے ایک طرف احمد شاہ ابدالی نے اور دوسری طرف انگریزوں نے کچل دیا۔ سیاسی حیثیت سے قطع نظر تھانیسر کی لڑائی کا ملک کے مذہب معاشرت اور کلچر پر دائمی اثر پڑا۔ اور اس کا پولیٹیکل اثر لگ بھگ سات صدی تک باقی رہا۔

اس وقت ہندوستان میں کئی طاقتور راجپوت خاندانوں کی حکومت قائم تھی جن میں قنوج کے راٹھور اور دہلی کے چوہان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چوہان دہلی اور اجمیر کے حکمران تھے۔ راٹھوروں کی حکومت قنوج کے گرد و نواح میں تھی۔ مگر چوہانوں کا عروج سب سے بڑھا ہوا تھا۔ اور پرتھی راج کی بہادری کا سکہ ہندوستان بھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ تھانیسر کے متصل ہی تراین کی پہلی لڑائی میں پرتھی راج محمد غوری کو شکست فاش دے چکا تھا۔ جس سے اس کا رتبہ تمام ہندو راجوں میں اونچا ہو گیا تھا۔ لیکن غوری کے دل میں یہ شکست کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔ اور ۱۱۹۲ء میں وہ اسی میدان میں ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ جس میں ترک افغان اور دیگر جنگ جو شامل تھے۔ اپنی شکست کا بدلہ لینے آیا۔ اس وقت پنجاب میں ترکوں کی حکومت قائم تھی۔ اور لاہور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے حملہ آور راجپوتوں پر تھانیسر ہی کے میدان میں حملہ کر سکتے تھے۔ پرتھی راج متعدد راجاؤں اور بے شمار بہادروں کے ہمراہ تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی لے کر تراین کے میدان میں تھانیسر سے چودہ میل کے فاصلہ پر مقابلہ کے لئے آ ڈٹا۔ مگر اس بار راجپوتوں کی بہادری کام نہ آئی۔ اور فتح مسلمانوں کے ہاتھ رہی راجپوت بہادری اور جان بازی میں کسی سے کم نہ تھے۔ مگر انہوں نے پچھلے تجربے سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ اور وہ تمام غلطیاں دہرائیں جن کی وجہ سے وہ پہلے بھی مسلمان حملہ آوروں کے مقابلے میں ہار چکے تھے۔

ان دنوں فریقین کا دارومدار سواروں پر تھا۔ لیکن ہندو سرداروں کو یہ ہرگز معلوم نہ تھا کہ تیزی سے نقل و حرکت کرنے والے سواروں کے پے درپے حملے ایک جگہ پر کھڑی ہوئی کثیر فوج کو پراگندہ کر سکتے ہیں۔ لڑائی شروع ہونے پر جب ہندو سواروں نے مسلمان سواروں کے پہلے حملے کو کامیابی سے روک لیا تو محمد غوری یہ ترکیب چلا کہ اس نے اپنی فوج کے درمیانی حصے کو چھوڑ کر بقیہ فوج کے چار حصے کر کے چاروں طرف سے راجپوتوں پر حملہ کرنے کی ہدایت کی۔ یہ سوار راجپوتوں پر حملہ کر کے فوراً پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اس طرح تمام دن میدان کارزار گرم رہا۔ آخر کار جب راجپوت لڑتے لڑتے تھک گئے تو خود محمد غوری بارہ ہزار چیدہ اور تازہ دم سواروں و تیراندازوں کو ساتھ لے کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ راجپوت دل کھول کر لڑے مگر وہ تھکے ہوئے تھے۔ آخر ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پرتھی راج میدان سے بھاگ نکلا ہوا تھا لیکن قلعہ سرستی کے قریب گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا۔

یہ خیال صحیح ہے کہ اگر جے چند والی قنوج اس لڑائی میں پرتھی راج کا ساتھ دیتا جو اس وقت صرف اپنی ہی نہیں بلکہ تمام راجپوتوں کی طرف سے لڑ رہا تھا تو راجپوتوں کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ یہ بات جے چند کے ماتھے پر ہمیشہ کے لئے کلنک کا ٹیکہ بنی رہے گی کہ اس نے ذاتی عداوت یا پولیٹیکل رقابت سے متاثر ہو کر اس کڑی مصیبت کے وقت اپنی ملکی یا قومی آن کا کوئی خیال نہ کیا اور گو اس کی سلطنت پرتھی راج کی حکومت سے کہیں زیادہ بڑی اور طاقتور تھی۔ لیکن اس نے ملک کی حفاظت کی کوئی پروا نہ کی اگر وہ پوری قوت سے پرتھی راج کا ساتھ دیتا تو ترک اس قدر آسانی کے ساتھ ہندوستان پر قبضہ نہ کر سکتے۔ مگر شدنی اٹل ہے۔ شروع سے لے کر اب تک ہندوستان اپنی پھوٹ ہی کی وجہ سے برباد ہوتا چلا آیا ہے۔ جے چند بھی اس قومی غداری کے بعد بہت دنوں تک چین سے نہ بیٹھنے پایا۔ پرتھی راج کی شکست کے دو ہی سال بعد اس کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد راجپوت وقتاً فوقتاً مسلمانوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن دہلی اور قنوج کی ریاستوں کے مٹ جانے کے بعد ہندوستان میں ترکوں کے سیلاب کو روکنے والی کوئی طاقت نہ رہی۔ ہانسی اور اجمیر کی ریاستیں بھی آسانی سے فتح ہو گئیں اور سلطان محمد غوری قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا نائب مقرر کر کے غزنی واپس چلا گیا۔

یہاں پر اس زمانے کے سماجک حالات کا مختصر بیان بے جا نہ ہوگا۔ ذات پات کی بندشوں نے اس وقت کے ہندوؤں کو پوری مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ براہمن سب سے اونچے مانے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ موت کی سزا سے مستثنیٰ تھے۔ راجپوتوں کا درجہ بھی چنداں کم نہ تھا۔ ان کی بہادری بے نظیر تھی اور وہ میدان جنگ سے بھاگ کر جان

بچانے سے وہیں جان دے دینا کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن مصائب و حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا ان میں مادہ نہ تھا۔ ذاتی شان اور خاندانی آن کے لئے وہ ہر وقت مر مٹنے کو تیار رہتے تھے لیکن مجموعی حیثیت سے دیس یا دھرم کی حفاظت و ترقی کا انہیں چنداں خیال نہ تھا اور جتنا انہیں اپنی بات کا لحاظ اور اپنی عزت کا پاس تھا اس کا آٹھواں دسواں حصہ بھی ملک کی شان یا قوم کی حفاظت کا لحاظ نہ تھا۔ عورتوں کی حالت محکومیت کی تھی۔ بیواؤں کو دوبارہ شادی کا اختیار نہ تھا ستی اور جوہر کا عام رواج تھا۔ دختر کشی بھی عیب نہ تھی۔ کم سنی میں شادی کر دی جاتی تھی۔

ملک کی مالی حالت اچھی اور تجارت ترقی پر تھی۔ علم و ادب کا عام چرچا تھا اور راجپوت راجوں، رئیسوں کو اس سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور وہ پنڈتوں اور ودوانوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کئی حکمران خود بھی شاعر اور مصنف تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ملک میں کوئی نظام یا سنگٹھن نہ تھا۔ اور نہ عوام کی منتشر طاقتوں کی شیرازہ بندی کی کوئی صورت تھی۔ باہمی رقابتوں اور روزمرہ خانہ جنگیوں نے ملک کو کمزور کر دیا تھا۔

تھانیسر کی لڑائی کے پہلے ہی سے بدھ مت کی جگہ شیومت اور وشنو دھرم نے لے لی تھی جس کو بھگتی کی مذہبی تحریک سے بڑی تقویت پہنچ چکی تھی۔ ملک میں ہزاروں مندر اور شوالے بن گئے تھے۔ مسلمانوں کی فتوحات نے سوشل نظام کو تہ و بالا کر دیا اور ہندو مذہب، ہندو لٹریچر اور ہندو کلچر سب کو ان سے بڑا دھکا پہنچا۔ اور بے شمار ہندو مسلمان ہو گئے۔ لیکن یہ سب تبدیلیاں سطحی تھیں۔ ملک کے نظم و نسق کے لئے مسلمان حکمرانوں کو ہندو ملازموں ہی کو رکھنا پڑتا تھا اس لئے سلطنت میں انقلاب ہونے کے باوجود مالگذاری کی تحصیل وصول اور عدالتوں کا کام تعمیرات اور دیگر سول محکمے ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں رہے۔ مسلمان بادشاہوں نے جو عمارتیں بنوائیں ان میں ہندو کاریگر ہی کام کرتے تھے۔ ہندو سنار ان کے سکے ڈھالتے اور ہندو پنڈت دھرم شاستر کے متعلق ان کو مشورے دیتے تھے۔

تھانیسر کی لڑائی کے بعد مسلمان ہندوستان میں مستقل طور پر آباد ہو گئے جس کا ملک کی تاریخ پر بہت بڑا اثر پڑا۔ ظاہر ہے کہ ایک جگہ سکونت رکھنے کے بعد ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے سے کیسے بے اثر رہ سکتے تھے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کا یہ اثر ہوا کہ دونوں نے ایسا طریق زندگی اختیار کر لیا جو نہ خالص مسلم تھا نہ ہندو۔ بلکہ جو دونوں کا مشترکہ اور مجموعی کلچر تھا۔ جسے ہم "ہندو مسلم کلچر" کے نام سے یاد کر سکتے ہیں اور جس میں ہندو مسلمان دونوں کے پہلو بہ پہلو رہنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

اس نئے طرز معاشرت میں ہندو مذہب، ہندو آرٹ، ہندو لٹریچر اور سائنس نے مسلم عناصر کو کچھ اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا کہ خود ہندو کلچر کی ماہیت تبدیل ہو گئی۔ اسی طرح ہندو مسلم تصادم سے مسلم کلچر، مسلم آرٹ اور خود اسلام نے ہندوستان میں ایک نئی شکل اختیار کر لی۔

ہندو مذہب پر اسلام کا سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ عوام کے عقاید میں توحید کا خیال جو عرصہ سے سست پڑ گیا تھا پھر زیادہ زور کے ساتھ جاگزین ہو گیا۔ پورانک ہندوؤں میں بہت سے دیوی دیوتا پوجے جاتے تھے، اور گو شروع ہی سے ہندو مذہب میں ایک قادر مطلق پرمیشور کا خیال موجود ہے لیکن دیوی دیوتاؤں کی کثرت نے توحید کو کمزور کر کے اسے بالکل پس پشت ڈال دیا تھا۔ اسلام نے ہندوستان آ کر خدا کی وحدانیت پر غیر معمولی زور دیا جس کا عام خیالات پر بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ تین چار صدی بعد کے ہندو ریفارمروں اور روحانی لیڈروں کی تعلیمات میں اس کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ ان ریفارمروں نے بعض مذہبی عقاید عمداً ترک کر دیئے اور ان کی جگہ جن عقائد کا پرچار کیا ان کی بدولت ہندو مذہب اور اسلام دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے۔ اس مذہبی اصلاح کی سب سے نمایاں مثال کبیر اور گورونانک کی تعلیمات میں ملتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ریداس، دادو، ملوک داس اور بہت سے دوسرے روحانی پیشواؤں کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مسلم صوفیوں نے بھی جو محمد بن قاسم کے وقت سے سندھ آ کر ہندوستان کے بہت سے مقامات میں پہنچ گئے تھے بعض ہندو عقائد قبول کر لئے۔

اس وقت کی تعمیرات میں بھی اس مشترکہ کلچر کا اثر بخوبی نمایاں ہے۔ اس زمانہ کی ہندو عمارتیں بھی خالص ہندو طرز کی نہیں ہیں۔ ان کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نئے اسٹائل نے جو نہ خالص ہندو ہے اور نہ خالص مسلم، پرانے طرز کی جگہ لے لی ہے۔ اسی طرح مسلم تعمیرات میں صاف طور پر ہندو اثر نظر آ رہا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ مسلم تعمیرات میں ایرانی اور عربی طرز تعمیرات کے چند پہلو اب بھی قائم رہے۔ لیکن جب یہ پہلو ہندو طرز تعمیر میں شامل ہو گئے

یک نیا اسٹائل پیدا ہو گیا جس میں ہند تعمیر کا رنگ صاف طور پر ملکتا ہے۔ اس نئے اور متحدہ اسٹائل میں اگر ایک طرف مسلم طرز تعمیر کی ادگی باقی نہ رہی تو دوسری طرف ہندوؤں کے شوقِ آرائش و سجاوٹ ی بہت کمی ہو گئی۔ ہندو صناعی کی عام وضع قطع (جنرل ڈیزائن) ا کی سجاوٹ اور پُرکاری تو قائم رہی لیکن اس پر مخروطی محراب اور سادہ داور ہموار دیواروں کے جو پیوند لگ گئے وہ فنِ تعمیر کے خاص اسلامی جزد ۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس زمانے کی ہندو مسلم تعمیرات عمل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں جن میں چند ظاہری اختلافات باوجود معنوی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

ہندو مسلم کلچر کا اثر تعمیرات سے کہیں زیادہ مصوری میں پایا ہے۔ چنانچہ مغل اور راجپوت مصوری ایک ہی آرٹ کے دو مختلف نے ہیں اور راجپوت مصوری کا فرق محض سطحی ہے۔ راجپوت آرٹ راگ راگنیوں اور ناٹکوں کی تصویروں میں جو عورتیں بنائی گئی ہیں وہ وصورت سے تو راجپوت ہیں لیکن ان کا لباس اور ان کی نشست نی ہے۔ اس طرح نیا آرٹ خالص ہندو یا خالص مسلم آرٹ سے جداگانہ ہے اور اس کو ہندو مسلم آرٹ کے نام سے یاد کیا جا سکتا نئے طرز میں اجنتا کے آرٹ کے لوچ اور نرمی کے ساتھ ساتھ سمرقند رات کا تناسب اور وصل و فصل بھی موجود ہے۔ اور انواع و اقسام رنگوں کی حیرت انگیز شوخی اور ان کی آمیزش نے باریک خطوط ساتھ مل کر ایک نیا حسن پیدا کر دیا۔

نئے ہندو مسلم کلچر کا اثر دیسی لٹریچر اور دیسی زبانوں پر بھی پڑا۔ م فتوحات کے بعد سنسکرت کا زمانہ تو بالکل ختم ہو گیا۔ اور اس لیہ اظہارِ خیال کے لئے ہندی مرہٹی، بنگالی، گجراتی زبانیں وجود ئیں۔ مسلمانوں نے بھی ترکی فارسی ترک کر کے دیسی زبان اختیار اور اس طرح ایک نئی زبان یعنی اردو یا ہندوستانی پیدا ہوئی۔ ہندی ن پر بھی م اثرات کے گہرے نقوش ہیں۔ الفاظ گرامر تشبیہات اور تحریر سب پر اس کا اثر نمایاں ہے۔ یہی بات مرہٹی۔ پنجابی اور سندھی زبانوں پر صادق آتی ہے۔ امیر خسرو کی خالق باری اسی اثر کا خوشگوار ہے قطب الدین ... کا خطاب لاکھ بخش ان دونوں زبانوں کے جول کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

اہلِ عرب بہت دنوں پہلے ہندو علم حساب اور ہندو فن طب سے کے مرہونِ منت ہو چکے تھے لیکن عربوں نے یونان سے بھی اپنے علم میں بہت کچھ اضافہ کیا اس لئے وہ ان صیغوں میں ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے۔ چنانچہ ان کی نئی معلومات سے ہندوؤں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ہندو ریاضی دانوں نے کئی اصطلاحات مسلمانوں سے مستعار ہیں۔ اور کئی عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا مثلاً علم ہیئت میں تاجک کا سنسکرت میں ترجمہ کیا گیا۔ دواسازی کی کئی خاص ترکیبیں ہندوؤں نے مسلمانوں سے سیکھیں جنہوں نے فن کاغذ سازی بھی چین سے حاصل کر کے ہندوستان میں رائج کیا۔

ہندو موسیقی پر بھی اس ملاپ کا غیر معمولی اثر پڑا۔ مسلمانوں نے یہاں کی قدیم راگنیاں قبول کرلیں لیکن آلات موسیقی میں بہت کچھ ردوبدل کیا۔ جو آج تک رائج ہے۔ چنانچہ یہاں کے پکھاوج اور مردنگ کی جگہ طبلہ بن گیا اور بین کی جگہ ستار نے لے لی۔

لباس رسمیات، آدابِ محفل، غذا، کھانا پکانا سب پر مسلمانی تہذیب و معاشرت کا گہرا اثر پڑا۔ موجودہ حلوائی کی دُکان تو شروع سے آخر تک مسلمانوں کی رہین منت ہے۔

غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ مسلم اثر سے خالی نہ رہا اور ہندوؤں نے جن کی احتیاط اور الگ تھلگ رہنے کی عادت ضرب المثل ہے۔ دانستہ مسلمانوں کی معاشرت اور زندگی کے طور طریقوں کو بالکل اپنا لیا۔ مسلمان بھی ہندو تہذیب و ہندو تمدن سے شیر و شکر کی طرح گھُل مِل گئے۔ آج کل کے ناواقف مسلمان شاید یہ سن کر تعجب کریں کہ تھانیسر کے فاتح محمد غوری نے عرصہ تک پرتھی راج کے سکّوں کا سانچہ قایم رکھا۔ اس کے سکوں کی پشت پر لکشمی جی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ بلبن پہلا ترک حکمران تھا جس نے عربی طرز کے سکّے رائج کئے۔

ہندوستان کو مسلمانوں کی آمد سے ایک اور بہت بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ آٹھویں صدی عیسوی میں بدھ دھرم کے زوال کے بعد صدیوں تک اس کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں نے اس تعلق کو ازسرِ نو جاری کیا۔ چنانچہ یورپ کی نئی ایجادات ترکوں ہی کے ذریعے ہندوستان میں رائج ہوئیں۔ بارود کو سب سے پہلے ہندوستان میں بابر نے پانی پت کی پہلی لڑائی میں داخل کیا۔ اس طرح تھانیسر کی لڑائی نے ہندوؤں کا عروج ختم کرنے کے ساتھ ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی جو آج تک ہماری زندگی پر حاوی ہے اور آیندہ بھی عرصہ تک رہے گی۔

"زمانہ"
منشی دیانرائن نگم (ایڈیٹر)

اُردو غزل کا مستقبل

اردو غزل کے تین دور

کسی چیز کے متعلق پیش گوئی کرنے سے قبل اس کے ماضی و حال پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ مستقبل کی تعمیر میں ماضی و حال کی چٹانوں سے بڑی حد تک کام لیا جاتا ہے۔ انسان کی نگاہ، مستقبل کے تاریک کہرے میں کام نہیں کرسکتی۔ مگر ماضی و حال کی عینک کے ذریعہ، انسانی نگاہ اس کہرے کی بہت سی روشن پرچھائیوں کو دیکھ سکتی ہے۔ جو لوگ ماضی و حال سے بے نیاز ہو کر مستقبل کے متعلق فتوے لگا دیتے ہیں۔ ان کی پیش گوئیاں "کودکِ ناداں" کے تیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ میں اردو غزل کے ماضی و حال پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالنا چاہتا ہوں تاکہ مستقبل کے سمجھنے میں مجھے اور ناظرین کو آسانی ہو۔

ماضی

اردو غزل کا ماضی صحیح طور پر میر تقی میرؔ کے زمانہ سے شروع ہو کر فصیح الملک داغ پر ختم ہوتا ہے۔ میرزا مظہر جانِ جاناں ولی دکنی اور اسی نوع کے دوسرے شعرا کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان حضرات کا کلام اب آثارِ قدیمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو غزل کے تدریجی ارتقاء کا اندازہ لگانے کے لئے جن کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ میر تقی ہی حقیقت میں اردو غزل کے سب سے پہلے شاعر تھے اور آج دو سو برس سے کچھ اوپر زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اُن کے کلام کی تاثیر اور اسلوب کی دل کشی کم نہیں ہوتی۔ میر کے تیر و نشتر آج بھی ہمارے دل کو برماتے ہیں۔ اور ہمارے ادب کے بہت سے صفحات پر میر کے اشعار دمکتے ہوئے تاروں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اردو کے ماضی کو بھی ہم دو زمانوں میں تقسیم کریں گے۔ پہلا زمانہ تو میر سے شروع ہو کر غالب پر ختم ہوتا ہے اور دوسرے دور کی عمر بہت ہی مختصر ہے یعنی غالب سے لے کر داغ تک۔ میر تقی کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت سوز و گداز زبان کی چاشنی، بیان کی سادگی اور محاورات

کا برمحل استعمال ہے۔ میر کی غزل کو اس کے زمانے میں ہی قبولیت حاصل ہو گئی اور تمام ہندوستان پر اس کا رنگ چھا گیا۔ قائم چاند پوری کو جو میر تقی ہی کے ہمعصر تھے، میر کا مقلد تو نہیں کہہ سکتے لیکن ان کا طرز بیان میر سے بہت ملتا جلتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ میر کے انداز بیان سے وہ بھی متاثر ہوئے ہوں۔ میر تقی نے زیادہ تر توجہ زبان کی چاشنی، بیان کی سادگی، اور سوز و گداز پر کی۔ حقایق کی بلندی کی طرف میر نے زیادہ غور نہیں کیا۔ قدرت نے میر کو اسی لئے پیدا کیا تھا کہ وہ ہمارے درمیان سوز و گداز کا ایک آتش فشاں چھوڑ کر رخصت ہو جائیں۔ اور اردو ادب کے فدائی اُن کے اشعار پر ہمیشہ سر دھنتے رہیں۔ میر کا یہ شعر

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

پڑھنے والے کی نگاہ کے سامنے ایک ایسے حسین انسان کی صورت کو مجسم کر دیتا ہے جس کے ہونٹ سچ مچ گلاب کی پنکھڑی جیسے نظر آتے ہیں اس طرح کے سینکڑوں سادہ اور دلکش اشعار آپ کو میر کے یہاں ملیں گے۔ یہ اردو غزل کی ابتدا تھی، اس لئے بلند مسائل کی ترجمانی کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ پھر بھی میر کے اس شعر کا جواب پیش کرنے کے لئے، روح القدس کسی شاعر کی دوبارہ امداد کے لئے مشکل ہی سے آمادہ ہوگا

کل کا وعدہ کیا ہے اس نے میر　　ایک دن اور بھی جئے ہی بنی

غالب کے دور تک قریب قریب تمام شعراء غزل میں میر کے رنگ کی تقلید کرتے رہے۔ خواجہ میر درد کے یہاں البتہ سادگی بیان کے علاوہ تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے، اور وہ اردو غزل کے پہلے صوفی شاعر ہیں۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ اردو زبان، ابھی ان نازک اور پیچیدہ مسائل کی ترجمانی کے لئے پوری طرح تیار نہیں ہوئی تھی اس لئے خواجہ میر درد کے یہاں جا بجا ژولیدگی پیدا ہو گئی ہے اور خواجہ کا مافی الضمیر سمجھنے کے لئے بہت سے خلاؤں کو از خود پُر کرنا پڑتا ہے۔ خواجہ میر درد نے جہاں صاف کہا ہے اس کا جواب بس میر تقی کے ہی یہاں مل سکتا ہے، حیران ہوں کہ اس شعر کی داد کس زبان سے دوں۔

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصل بہار میں　　گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

میر تقی کی طرح خواجہ میر درد کے رنگ کو قبولیتِ عام حاصل نہ ہو سکی لیکن جو بنیاد خواجہ درد ڈال گئے تھے اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ لکھنؤ اور دہلی کے تمام شاعروں نے میر تقی کے رنگ کی تقلید کی لیکن بعد میں جا کر، اردو غزل میں صنایع و بدائع کا استعمال ہونے لگا جس کے موجد ناسخ لکھنوی سمجھے جاتے ہیں۔ آتش کے یہاں میر کا بڑی حد تک صحیح اتباع

پایا جاتا ہے اور نواب سید محمد خاں رند اپنے استاد کا نقش ثانی نظر آتا ہے مگر ناسخ جو کہتا تھا کہ

"آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں"

انداز بیان میں میر کا عکس نظر آتا ہے۔ ناسخ نے بیان کی سادگی کو تکلفات کی جھول اور صنائع، بدائع کی فرغل پہنا دی۔ عجیب بات ہے کہ عام طبائع نے اسی رنگ کو قبول کیا اور اردو غزل ایک چوچلا بن کر رہ گئی، دہلی کے شعرا پر بھی اس رنگ کا اثر پڑا اور لکھنو کے شعرا تو ان ہی چکن اور آب رواں کی قناطوں میں گھر کر رہ گئے۔ یہ لفظ پرستی کا دور تھا، معنویت کا تصور دماغوں سے بڑی حد تک محو ہو چکا تھا۔ شعرا تکلفات اور چوچلوں سے کھیل رہے تھے زخم جگر کے ثبوت کے لئے ناسور اور زخم کھرنڈ اور لہو کے تمام استعار صرف کئے جا رہے تھے اور عاشق کے چہرے کی زردی دکھانے کے لئے خون کی کمی، ہڈیوں کی خشکی اور ناتوانی کی مختلف کیفیتیں دکھائی جا رہی تھیں۔ اسی ماحول میں غالب پیدا ہوا جس نے اردو غزل میں ایک ایسا عظیم الشان انقلاب پیدا کیا، جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

میر تقی کے یہاں جو حقایق کی بلندی کی کوتاہی اور خواجہ میر درد کے یہاں تصوف کے مضامین میں اظہار بیان کی ژولیدگی باقی رہ گئی تھی، غالب نے اس کی حسین تلافی کر دی ــــ غالب اردو کا پہلا شاعر تھا جس نے اردو غزل میں بلند سے بلند مسائل کو بیان کیا۔ غالب نے اردو غزل کو فارسی غزل کے برابر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اگر شاعری کسی شریعت کا نام ہے تو غالب اس شریعت کا پیغمبر تھا۔ اس نے جدید ترکیبیں ایجاد کر کے اردو ادب کے دامن کو وسیع کر دیا۔ قدرت نے حافظ خسرو اور سعدی کو بخشی ہوئی شعریت اجتماعی طور پر غالب کے لئے مختص کر دی۔ غالب اردو کا پہلا مفکر شاعر تھا اور نہ صرف مفکر بلکہ انقلابی شاعر، جس نے زمانہ کے مزاج شعری کے خلاف جہاد کیا۔ ناسمجھوں نے اس کو برا بھلا کہا۔ اس کے کلام پر بے جا تنقیدیں کیں، لوگوں کے اسی طرز عمل سے متاثر ہو کر اسے کہنا پڑا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ۔۔۔ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

زمانہ نے غالب کو ٹھکرایا، ملک الشعرائی کا تاج کسی دوسرے سر پر رکھ دیا گیا، لیکن مستقبل اس کی پذیرائی کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ غالب اپنے مستقبل سے کس قدر باخبر تھا اس نے خود ہی کہا ہے۔

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است ۔۔۔ شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

غالب کی غزل نے لوگوں کو چونکا تو دیا، لیکن اس کے دور میں، اس کے رنگ کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی ــــ تکلفات شاعری نشہ کتنا تیز ہوتا ہے۔

مومن نے بھی اسی ماحول میں شعریت کی سانس لی ۔۔ مومن نے تغزل کا صحیح نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ مومن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت بیان کی شوخی ہے اور یہ اثر ہے اس کی بے پناہ عاشقانہ فطرت کا ــــ مگر جہاں کہیں وہ فلکیات اور نجوم و رمل کے مسائل استعاروں کی شکل میں بیان کرتا ہے تو دوسرا "ناسخ" نظر آتا ہے۔ مومن اور غالب کے رنگ سے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ دوسرے شعرا نے اس رنگ کو قبول نہیں کیا۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق معلوم ہوتا ہے کہ اردو غزل کو ابن یمین کے ناصحانہ رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ ناصحانہ ہے۔ حیرت ہے کہ جس زمانہ میں غالب کے اس شعر پر

اک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز ۔۔۔ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے ذوق کے اس شعر پر

واہ اے ذوق جراحت خوب ہی چھڑکا نمک

ہڈیاں میری ہما کس مزے سے کھائے ہے

لوگ سر دھنتے تھے ــــ ! دنیا والے کتنے جاہ پرست اور نا منصف ہوتے ہیں !

غالب کے بعد داغ اور امیر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور ان کے کلام کو علی قدر لذت قبولیت نصیب ہوئی۔ داغ شاگرد تو تھے ذوق کے مگر وہ میر، غالب اور مومن سے متاثر نظر آتے ہیں۔ غالب سے وہ "معنی آفرینی" کی حد تک متاثر ہیں۔ جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے۔ اس میں میر کی جھلک پائی جاتی ہے۔ داغ کی غزل میں شیرینی اور شوخی خوش گوار اعتدال کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ مومن کا تغزل تکمیلی شان کے ساتھ داغ کے یہاں نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم (آہ! کہ اقبال کو مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ کانپتا ہے) نے داغ کو حسن و عشق کا مصور کہا ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ داغ نے حسن و عشق کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے، داغ کی کلیات میں ناول کی طرح لطف آتا ہے۔ بس پڑھتے ہی رہیے طبیعت کسی طرح سیر نہیں ہوتی، داغ کے رنگ کو بے حد قبولیت حاصل ہوئی، میر تقی سے بھی زیادہ! داغ کا رنگ سارے ہندوستان پر چھا گیا اور آج بھی بہت سے شعرا داغ کے اتباع کو سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں۔ امیر مینائی کے یہاں لکھنو کے تکلفات بڑی حد تک پائے جاتے ہیں لیکن جہاں امیر نے صاف کہا ہے، اس کا جواب نہیں، یہ عجیب بات ہے کہ داغ کی قبولیت سے متاثر ہو کر امیر نے

بہت سی غزلیں داغ ہی کے رنگ میں کہی ہیں۔ مولانا حالی غزل میں اپنے استاد غالب سے متاثر نظر نہیں آتے۔ غزل میں حالی کے رنگ کے اتباع کی دو چار شاعروں کے سوا اور کسی نے کوشش نہیں کی۔

حال ــــ!

موجودہ اردو غزل، غالب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض چوٹی کے غزل گو شعرا اس حقیقت کا اعتراف نہ کریں لیکن ان کے اشعار، ڈنکے کی چوٹ اس کا اعتراف کر رہے ہیں۔ میں اردو غزل گو شعرا کے کلام کا تجزیہ کر کے بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں کہاں غالب کے خیال سے متاثر ہوئے ہیں۔

داغ کے بعد اردو غزل گوئی کو تین دوروں سے گزرنا پڑا، پہلا دور تو داغ کے رنگ کا دور تھا، اس کے بعد جب غالب کو لوگوں نے سمجھا تو عربی اور فارسی کے موٹے موٹے الفاظ کا غزل میں بے تحاشا استعمال شروع ہو گیا۔ اس کے بعد تیسرے دور میں غزل کی حالت پھر اعتدال پر آ گئی۔ موجودہ اردو غزل، اپنی خصوصیات کے اعتبار سے میر، خواجہ میر درد، غالب مومن اور داغ کے افکار کا نچوڑ ہے۔ اس میں اجتماعی طور پر وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں، زبان بہت زیادہ سلیس اور شیریں ہو گئی ہے۔ بلند سے بلند خیالات کی ترجمانی کی جا رہی ہے اور نئی نئی ترکیبوں کی ایجاد نے زبان میں بہت کچھ وسعت پیدا کر دی ہے۔

ہندوستان میں جتنی شاعروں کی بہتات ہوئی ہے، اتنی بہتات شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں ہوئی ہو۔ والیان ملک، وزرا، سیکرٹری کونسل کے ارکان، انجنیئر، ہواباز، موٹر ڈرائیور، تاجر، کاشتکار، درزی، نورباف، شیرینی ساز، حجام، قلی، تانگے والے، غرض ہر پیشہ کے لوگ شاعر بن گئے ہیں رسائل اور اخبارات کی کثرت نے شہرت کو ارزاں کر دیا ہے۔ اس لئے ہر شخص اس ارزانی سے فایدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ شعرا کی اس بے پناہ کثرت کے باعث اردو غزلیں ایک ہی ٹکسال کا سکہ بن کر رہ گئی ہیں، ایک ہی خیال سینکڑوں غزلوں میں خفیف تبدیلی کے ساتھ نظر آتا ہے اردو کی بے شمار غزلوں میں آپ کو

"ذوق نظر، برق تجلی، ارے تو بہ! فطرت، میکدہ بردوش"
عالم شب، جنبش مینا، لغزش مستانہ، صبح ازل، شام ابد"
"انگڑائی، کیف انگیز، وجد و سماع ــــــــ"

کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ یہی ٹکڑے جا بجا ملیں گے، شعرا اپنی جگہ ایک مستقل حقیقت ہے، مگر شاعروں کی اس کثرت کو ہندوستان کی وسعت گوارا نہیں کر سکتی۔

مستقبل ــــ!

بعض ناسمجھ اور کم فہم اردو غزل کے خلاف قلمی جہاد کر رہے ہیں، اردو غزل کے اساتذہ کی پگڑیاں اچھالی جا رہی ہیں اور ان اشعار کا جو در حقیقت الہامی اشعار ہیں۔ مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک دل میں چوٹ کھا کر آہ کرنے کی قابلیت موجود ہے، غزل فنا نہیں ہو سکتی، غزل باقی رہے گی۔ انقلاب کے خونریز ہنگامہ اور سیاسیات کے لرزہ بر اندام طوفان میں ــــ! ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خونی انقلاب آئے گا اور ضرور آئے گا لیکن یہ انقلاب کیا دل کو برف کا ٹکڑا بنا دے گا اگر دل اس انقلاب میں بھی بدستور دل رہا تو غزل بھی بدستور باقی رہے گی۔ آپ غزل کو مٹانے سے پہلے لوگوں کے سینے چیر کر دلوں کو نکال کر پھینک دیجئے کہ یہی کم بخت غزل کی بنیاد ہے۔ یقین جانئے کہ بڑے سے بڑے انقلاب کے وقت بھی، انسان وصل و ہجر کے تاثرات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اور غزل ان ہی تاثرات کی ترجمان ہے۔

ترکی میں آپ کے ہندوستان سے کہیں بڑا انقلاب آیا تھا۔ اس وقت جبکہ میدان جنگ میں گولے برس رہے تھے اور آگ اور خون کا دریا بہہ رہا تھا، غازی انور پاشا مرحوم اپنی چہیتی بیوی کو خط لکھتے ہیں:۔

"مجھے تمہاری وہ نازک انگلیاں جو میرے بالوں سے
کھیلا کرتی تھیں، یاد آ رہی ہیں"

بس یہی غزل ہے! ــــــ ہمارے انقلابی شاعر اور ادیب ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی زحمت فرمائیں گے۔

ہمارا خیال ہے کہ تخمیناً ایک صدی تک موجودہ غزل کا اثر باقی رہے گا۔ موجودہ شعرا نے اتنے متنوع اور مختلف بلند خیالات غزل میں پیش کر دیئے ہیں کہ مستقبل میں ان ہی خیالات کی غالباً الٹ پھیر ہوتی رہے گی زبان اب سے زیادہ سلیس ہو جائے گی لیکن چونکہ انسانی فطرت ایک حالت پر قانع نہیں رہتی۔ اس لئے کیا عجب ہے کہ ادق الفاظ کا دور پھر واپس آ جائے۔ آیندہ چل کر ردیف کا استعمال کم ہو جائے گا۔ عربی شاعری کی طرح قافیہ پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔ مسلسل غزلیں کثرت کے ساتھ کہی جائیں گی۔

اشتراکیت کا طوفان سرمایہ داری سے نفرت اور مزدور کی حمایت کے ساتھ ساتھ الحاد و انکار کی موجیں اپنے ساتھ لا رہا ہے، دنیا کا مستقبل بڑی حد تک مادی ہوگا، اس لئے عام اثر:۔

"برق و طور، ایمن و کلیم، غیب و شہود۔"

لذتِ سجدہ، چراغِ کعبہ اور فانوسِ کلیسا "
کے استعاروں کو نہ سمجھ سکیں گے، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ مستقبل کے اردو غزل گو شعرا بھی مادہ پرستی سے متاثر ہو کر تصوف کے مضامین کو ہاتھ نہ لگائیں۔ اردو غزل کو اس سے بہت صدمہ پہنچے گا۔

مستقبل میں اردو غزل سے یاس و ناامیدی کے مضامین بڑی حد تک خارج کر دیئے جائیں گے۔ شباب، ہستی، سوز و جذب اور رجائیت کے مضامین کو غزل کا جامہ پہنایا جائے گا۔ اسی زمانے میں دیکھ لیجئے کہ گورِ غریباں کی طرف عام طور پر اردو غزل گو شعرا کا خیال بہت ہی کم جاتا ہے۔ میرا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ اردو غزل غالب کے اثر سے کسی دور میں بھی بے نیاز نہ ہو سکے گی۔

ماہر القادری

"شاہکار" (گورکھپور)

غم و راحت

آلام باقی آرام فانی — راحت مسافر غم جاودانی
غم کا پتنگا تابندہ دائم — راحت کا جلوہ فانی ہے فانی
افراطِ عشرت آثارِ اجل کے — غم کی فزونی ہے زندگانی
ذوقِ الم تو بخشا ہے یارب
بھڑکا دے اب یہ سوزِ نہانی

تاجور سامری

نقد و نظر

تعمیر نو

مصنفہ مسٹر عبداللہ انور بیگ ایم اے ایل ایل بی۔ حجم ۱۹۶ صفحات سائز ۲۲+۲۹/۱۶ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ ملنے کا پتہ۔ اردو اکیڈیمی پنجاب لوہاری دروازہ لاہور۔

کتاب کے نام سے متاثر ہو کر ہم نے خیال کیا تھا کہ شاید اس میں قومی تعمیر کا کوئی خاص واضح اور معین پروگرام پیش کیا ہوگا لیکن پڑھنے کے بعد ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ فاضل مصنف کا دل و دماغ عام ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طرح اضطراب اور کشمکش کی جولانگاہ بنا ہوا ہے اور انھوں نے نہایت قابلیت کے ساتھ اُس ذہنی اضطراب کا اظہار اس کتاب کے اوراق میں کیا ہے۔ تعمیرِ نو کے مصنف پنجاب کے ایک نہایت قابل نوجوان ہیں جنہوں مغربی علوم کے ساتھ ساتھ اسلامیات کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اور چونکہ وہ حساس طبیعت اور دلِ دردمند کے مالک ہیں اس لئے وقتاً فوقتاً تصانیف کے ذریعہ سے مسلمانوں کی گزشتہ عظمت اور موجودہ فلاکت پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ تعمیرِ نو اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ قومی ادبار کو کس شدت سے محسوس کر رہا ہے اور کوئی راہِ عمل نہ ہونے کی وجہ سے خود اپنی آگ میں کس بے دردی سے جل رہا ہے۔ اس نوع کی تصانیف سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان زندگی کے معرکے میں آگے بڑھنے اور فتح و نصرت سے ہمکنار ہونے کے لئے بے تاب ہیں۔ لیکن مذہب کی قدیم روایات نے غیر شعوری طور پر انہیں جکڑ رکھا ہے اور وہ اپنی قوتِ عمل کے باوجود ہل نہیں سکتے۔

تعمیرِ نو کی زبان نہایت چست اور درست ہے لیکن اندازِ بیان میں بعض مقامات پر تعقید پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مصنف بہت تھوڑے لفظوں میں بہت کچھ بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ نفسِ مضمون کے اعتبار سے اس میں مختصر طور پر اُن اصولوں سے بحث کی گئی ہے جن سے کام لے کر دنیا میں قومیں بنتی اور ترقی کرتی ہیں۔ پھر ان اصولوں کی روشنی میں مسلمانوں کی ترقی کی داستان بہت اختصار لیکن خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر بحث کی گئی ہے اس ضمن میں قرآنی تعلیمات، اتحادِ اسلامی، سائنس کی موجودہ ترقیات اور جنگِ عظیم کے اسباب و نتائج پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ کتاب کے بیشتر مقامات ہمیں مصنف کے خیالات سے اختلاف ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ اضطراب و کشمکش اور غور و فکر کا یہ دور ختم ہونے کے بعد جب فاضل مصنف کی رائے سیاسی معاملات کے متعلق پختگی حاصل کر لے گی تو وہ تعمیرِ ملت کا کوئی واضح نسخہ بتا سکیں گے۔ ہمارے نزدیک تو آج ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے صرف ایک راہِ نجات ہے ——— اشتراکیت۔

بنی اسرائیل کا چاند

مصنفہ سر رائڈر ہیگرڈ۔ مترجمہ عبدالمجید حیرت بی اے (علیگ) سائز ۲۰+۳۰/۱۶ حجم ساڑھے چار سو صفحات۔ قیمت دو روپے ملنے کا پتہ مکتبۂ پنجاب لاہور

سر رائڈر ہیگرڈ انگریزی زبان کے مشہور اور مقبول ترین فسانہ نگاروں میں ہیں اور اُنکے ناول عوام سے لے کر بادشاہوں تک ہر جگہہ دلچسپی اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ "بنی اسرائیل کا چاند" میں مصنف نے سرزمین مصر کے ایک مشہور تاریخی واقعہ کو جسے مذہبی روایات نے تقدس کا رنگ بھی دے رکھا ہے ناول کی صورت میں پیش کیا ہے۔ بنی اسرائیل سیکڑوں برس تک مصر میں غلامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد مصر کو خدا حافظ کہتے ہیں۔ فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں داخل ہوتا ہے تو سخت طوفان برپا ہو جاتا ہے جس میں فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل پر فرعون جس قسم کے مظالم روا رکھتا تھا اُن کی داستان پڑھ کر رونگٹے کھڑے

ہو جاتے ہیں اور بنی اسرائیل جس استقامت اور بے خوفی سے ان مظالم کا مقابلہ کرتے رہے ہیں اس سے اس قوم کی بلند حوصلگی کا پتہ چلتا ہے کتاب میں زمانہ ماقبل تاریخ کی معاشرت، سیاست اور مذہب کا نقشہ خوب پیش کیا گیا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کے قہر و عتاب، جادوگروں۔ کاہنوں کی شعبدہ بازیاں اور مذہبی توہمات کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عشق و محبت کی چاشنی نے کتاب میں اور زیادہ دلچسپی پیدا کر دی ہے۔

ترجمے کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ عبدالمجید حیرت ایسا صاحب قلم اس کا مترجم ہے۔ حیرت صاحب نے نہایت خوش اسلوبی اور قابلیت کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کے مطالب کو ترجمہ کی دقتوں کی خاطر کہیں حذف نہیں کیا گیا بلکہ زبان و ادائے بیان کی روانی دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی خود بخود اردو کا جامہ پہن کر ہمارے سامنے آگئی ہے۔ زبان نہایت صاف، آسان اور شگفتہ ہے۔ رائڈر ہیگرڈ ایسے مصنف کے ناول کو جو اپنی تصانیف میں ہمیشہ پُراسرار ماحول پیدا کرنے کا عادی ہے اردو میں اس خوش اسلوبی سے پیش کرنا کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہو بہت بڑی کامیابی ہے۔ ہم حیرت صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ اگر انہیں سرکاری ملازمت کے افکار سے کبھی فرصت ملے تو انگریزی کے بلند پایہ مصنفوں کی اور کتابوں کو بھی اسی خوبی سے اردو دنیا کے سامنے پیش کریں۔

کتاب العلم

میسرز ایسٹرن پبلشنگ اینڈ سٹیشنری لمیٹڈ۔ چیمبرلین روڈ۔ لاہور

اردو سے ایک عظیم الشان انسائیکلوپیڈیا کتاب العلم کے نام سے تیار کر رہے ہیں اس کتاب کے سو جز بالاقساط شائع ہوں گے۔ ہر جز کی قیمت تین روپے دو آنے ہوگی۔ خریداری کی شرط یہ ہے کہ پہلے دس روپے بطور پیشگی کمپنی کے دفتر میں جمع کرا دئے جائیں۔ ہر جز شائع ہوتے ہی خریدار کے پاس بذریعہ قیمت طلب پیکٹ پہنچ جائے گا۔ کمپنی نے کتاب العلم کے نمونے کے صفحات ہمارے پاس بھیجے ہیں جن سے اس کتاب کی اہمیت اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتابت اور کاغذ نہایت اعلیٰ ہے۔ چھپائی سہ رنگ بلاک کی ہے۔ ہر علم اور فن کے متعلق بے شمار تصویریں ہیں جن سے کتاب کے مطالب کی وضاحت ہوتی ہے۔ کتاب العلم میں کن کن موضوعات پر مضامین ہوں گے۔ اس کی ایک خفیف سی جھلک مندرجہ ذیل فہرست سے ہو سکتی ہے۔

کائنات۔ معدنیات۔ حیاتیات، انسانیات کیمیا و طبیعیات ایجادات۔ فنون لطیفہ۔ تاریخیات۔ ادبیات۔ اقتصادیات۔ صحتیات نفسیات۔ دینیات۔ نظمیات۔ زرعیات۔ ملکیات۔ شخصیات۔ میکانیکیات۔

کتاب العلم اگر اس ساز و سامان اور اہتمام کے ساتھ تیار ہو گئی تو اردو زبان کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوگا۔ یورپ میں متعدد ادارے اس قسم کی عظیم الشان کتابیں بالاقساط شائع کرتے رہتے ہیں جس سے علم و ادب کے شائقین بیک وقت بہت سا روپیہ خرچ کرنے کی زحمت سے بچ جاتے ہیں اور ہر ماہ ایک جز کی قیمت ادا کر کے ایک خاص میعاد کے اندر مکمل کتاب حاصل کر لیتے ہیں۔ اردو میں اس نوع کی خدمت خدمت کا سہرا ایسٹرن پبلشنگ اینڈ سٹیشنری لمیٹڈ کے سر ہے۔ امید

ہے ہندوستان میں اس کتاب کی شایانِ شان قدر و منزلت ہو گی۔

"ع"

ہندوستانی کشیدہ کاری

مرتبہ محترمہ آنسہ آمنۃ اللہ صاحبہ سابق ہیڈ مسٹریس سر سکندر گرلز انڈسٹریل سکول

یوں تو آج تک فن کشیدہ کاری کی بہت سی کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں۔ مگر وہ سب کی سب جدت تنوع اور دیگر معلومات و ہدایات کی محتاج ہیں محترمہ امتہ اللہ صاحبہ نے اپنی تمام محنت و کاوش سے ہندوستانی کشیدہ کاری میں تمام ضروری ہدایات و معلومات اور جدید ڈیزائن پیش کرتے ہوئے اس کو بہت ہی مفید اور جدید ترین کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ہماری رائے میں اس کتاب کے ہوتے ہوئے کشیدہ سے ذرا بھی دلچسپی رکھنے والی بہنوں کو کسی سے سیکھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہو سکتی۔ محترمہ بیگم صاحبہ نواب احمد یار خاں دولتانہ صاحب نے اس کا تعارف لکھا ہے جس میں انہوں نے کشیدہ کی اہمیت اور فنی لحاظ سے اس کتاب کی خوبیاں بتلائی ہیں۔ اس کے بعد دو صفحات پر ضروری ہدایات و دیگر مختلف کام مثلاً شیڈ کا کام سلمہ۔ وشینائل کا کام سوزنی کا کام اور ربن ورک کے بنانے کے مختلف طریقے اور مختلف ٹانکے بمعہ اشکال درج کئے گئے ہیں۔ پھر $\frac{29}{4}\times22$ کے ۶۸ صفحات پر ہر قسم کے چھوٹے اور بڑے ڈیزائن دئے گئے ہیں۔ ڈیزائنوں کے ساتھ ساتھ درج شدہ ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک ڈیزائن کئی ایک مختلف جگہوں پر استعمال ہو سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں آرائش و زیبائش کی کوئی ایسی چیز نہ ہو گی جس کے متعلق اس میں ڈیزائن موجود نہ ہو۔ کتاب کے اخیر میں ۲۲×۲۹ کے پورے چھ صفحات پر بہت بڑے بڑے ڈیزائن دئے گئے ہیں جو کہ کتاب کی جدت میں ایک نمایاں اضافہ ہے۔ ہماری رائے میں اس کتاب کی اشاعت نے صحیح معنوں میں وقت کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ دی انڈین فیڈل آرٹ اینڈ انڈسٹری ہاؤس الہ یار سٹریٹ برانڈرتھ روڈ لاہور

ادارہ

اعتذار

(۱) ادبی دنیا کی گذشتہ اشاعت کے حصہ "دنیائے ادب" میں جناب ساغر نظامی کی نظم مکالمہ "ساقی و ساغر" معزز معاصر ساقی سے نقل کی گئی تھی اور بسکہ نظم ایک اعلیٰ درجہ کے رسالہ سے لی گئی تھی اس لئے اسے جوں کا توں کاتب کے سپرد کر دیا گیا اور یہ جس طرح "ساقی" میں چھپی تھی اسی طرح "ادبی دنیا" میں بھی چھپ گئی اب جناب ساغر کے ایک گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ نظم کے بعض اشعار غلط چھپ گئے ہیں۔ اس بارہ میں اگرچہ ہماری ذمہ داری ادارہ ساقی کی ذمہ داری سے کمتر ہے لیکن یہ فروگذاشت بہر حال قابل افسوس ہے۔ ہم جناب ساغر سے اس بارے میں معذرت خواہ ہیں۔

وہ غلطیاں یہ ہیں۔ ص۶۲ دوسرا شعر:۔ غلط وقت سحر کا کھڑا۔ صحیح۔ دشت سحر کا کھڑا

ص۶۳ پہلا شعر:۔ غلط مہر تخلیق ۔ صحیح عہد تخلیق

ص۶۳ دوسرا شعر:۔ غلط ابدی نیستی ہے۔ صحیح ابدی ہستی ہے

(۲) افسوس ہے کہ پچھلی اشاعت میں کاتب صاحب کے سہو نظر سے فہرست مضامین میں جناب بابر بٹالوی کے ڈرامہ "بے جوڑ شادی" کا ذکر نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ڈرامہ پرچے میں شائع ہوا۔ امید ہے بابر صاحب اس سہو کو نظر انداز فرمائیں گے۔

ادارہ

فہرستِ مضامین ادبی دُنیا لاہور

بابت ماہِ نومبر ۱۹۳۸ء

جلد ۱۶ تصاویر:- ۱- معلّم ۲- مصوّر **نمبر ۱۰**

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپکر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

دُنیائے کاروبار

مغل لائن

مغل لائن حاجیوں کو لے جانے کا اصلی راستہ ہے۔ گذشتہ ۵۸ سال سے اس راستے سے حاجیوں کو لے جایا جا رہا ہے۔ اس لائن کے زیر اہتمام جدید ترقی یافتہ جہازوں کا ایک بڑا کام کر رہا ہے۔

مغل لائن نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ اسلامی پبلک کے پُرزور اصرار پر کیبن اور ڈیک کے درجوں کے حج کے کرایوں میں کمی کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس فیصلہ سے وہ زائرین فائدہ اُٹھا سکیں گے جن کا سفر رمضان کے مہینے سے پہلے بندرگاہوں سے شروع ہو جائے گا۔ رمضان کے مہینے سے پہلے سفرِ حج شروع کرنے میں جو فائدے ہیں وہ ظاہر ہیں۔ موسم کے اس ابتدائی زمانے میں زائرین کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی اور سفر آرام سے کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ یہ فائدہ بھی ہے کہ پہلے جہازوں سے جانے والے زائرین رمضان کا مہینہ مقدس مقامات پر بسر کر سکیں گے۔ نیز وہ زائرین جو موسم کے شروع میں ہی ارضِ مقدس میں پہنچ جائیں گے۔ مقدس شہروں میں رہنے سہنے کے انتظامات زیادہ آسانی سے کر سکیں گے۔ اور آرام و آسائش کے ساتھ مدینہ شریف کی زیارت کم سے کم خرچ پر کر سکیں گے۔

مغل لائن نے اس بات کا فیصلہ اس لئے کیا ہے۔ کہ بہت عرصے سے مسلم لیڈروں اور حج کمیٹی نے اس اقدام کی سفارش کی ہوئی تھی۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ اقدام ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوگا۔ اور آئندہ سالوں میں بھی یہی طریق کار جاری رکھا جا سکے گا۔

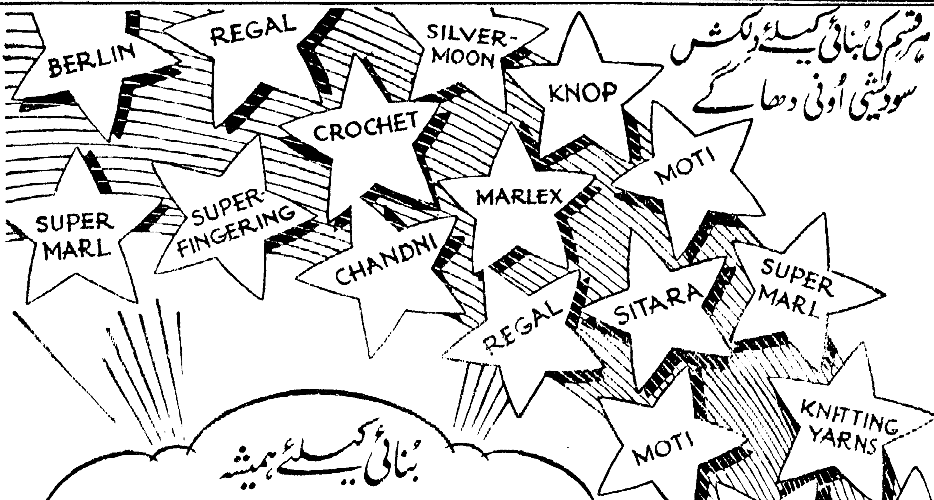
مغل لائن سے ہمیں اس بات کی اطلاع بھی ملی ہے کہ اُنہوں نے اس سال اپنے ایس ایس رضوی اور رحمانی جہازوں کی مرمت اور تعمیر نو پر بہت سا روپیہ صرف کیا ہے۔ اور اب ان جہازوں پر وہ تمام آرام و آسائش مہیا ہو سکتی ہے جس کی حاجیوں کو ضرورت ہو۔ عرشوں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک عرشہ صرف کیبن کے مسافروں کے لئے مخصوص ہوگا اور دوسرے عرشہ پر نماز کے لئے زاید جگہ مہیا ہو سکے گی۔ پہلے سے زیادہ اور اچھے کیبن بنائے گئے ہیں۔ اور ایسے انتظامات کئے گئے ہیں کہ کیبن کے مسافر تخلیہ قائم رکھ سکیں عرشوں پر پنکھے لگائے گئے ہیں۔ اور ایک نئی قسم کی بیت الخلا تعمیر کی گئی ہے یہ دونوں جہاز بہت عرصہ سے حاجیوں کے مقبول نظر رہے ہیں۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ اب ان میں جو نئی باتیں اضافہ کی گئی ہیں۔ وہ ان جہازوں کی قبولیت عامہ کو اور بھی بڑھا دیں گی۔

کملا مووی ٹون (لاہور) کی سرگرمیاں

پنجاب کی واحد اور کامیاب فلم کمپنی کملا مووی ٹون لمیٹڈ آج کل اپنے تازہ شاہکار "خونی جزیرہ" (city of silence) کی شوٹنگ میں دن رات مصروف ہے۔ خونی جزیرہ دو حصے مکمل ہو چکا ہے اور بقایا ایک حصہ بھی بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ کمپنی اس وقت جہاز کے اندرونی مناظر کی فلم بندی کر رہی ہے۔ اس کے بعد کہانی کے ایک بہت بڑے سیٹنگ کی فلم بندی ختم کر کے کمپنی اپنے اس انوکھے اور زبردست شاہکار خونی جزیرہ کو برائے نمائش ایک ہی وقت میں ہندوستان کے کئی شہروں میں پیش کر دے گی۔ ہندوستان کے کئی ڈسٹری بیوٹرز خونی جزیرہ جیسے زبردست شاہکار کو حاصل کرنے کے لئے کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر مسٹر آر۔ ایل۔ شوری سے بات چیت کر رہے ہیں۔

ادارہ

ہر قسم کی بُنائی کیلئے دلکش
سودیشی اُونی دھاگے



بُنائی کیلئے ہمیشہ

دھاروسپن اُون

استعمال کریں

جو کہ کئی قسموں اور خوشنما رنگوں میں مشہور دھاریوال ملز میں مدت سے
تیار ہو رہی ہے

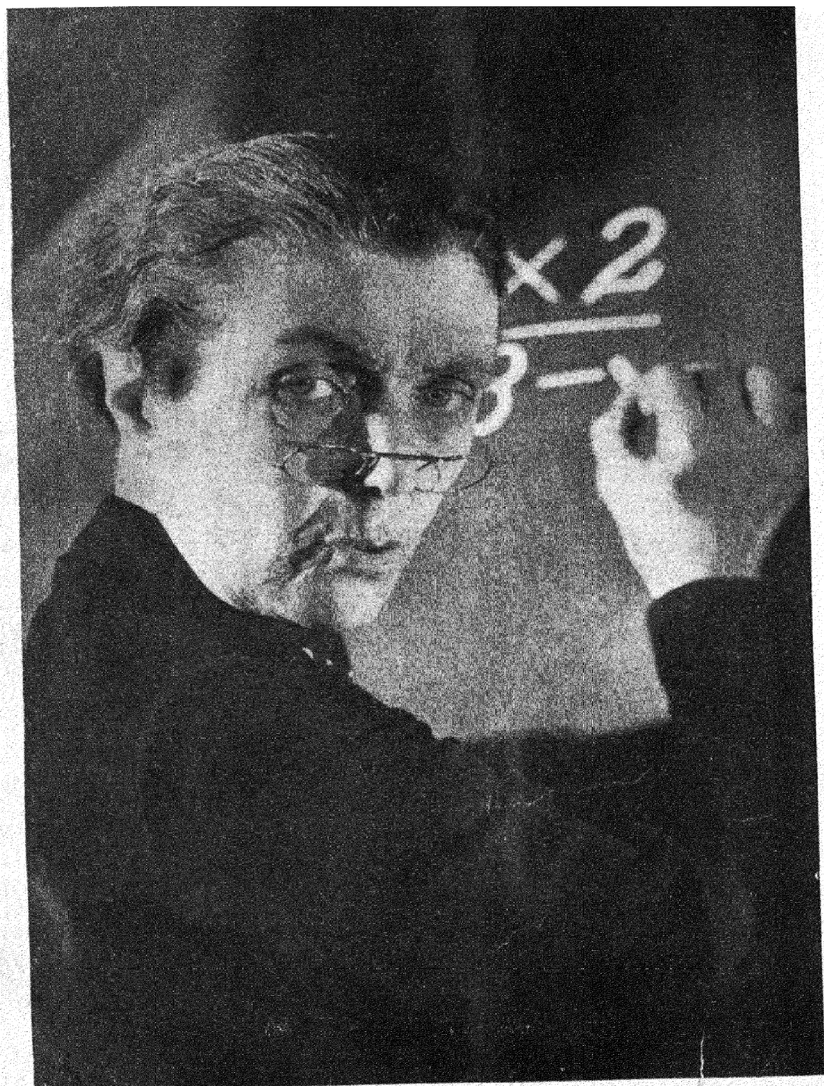
مفت نمونا جات کے لئے
ڈیپارٹمنٹ نمبر ۱۱۴ کو لکھئے



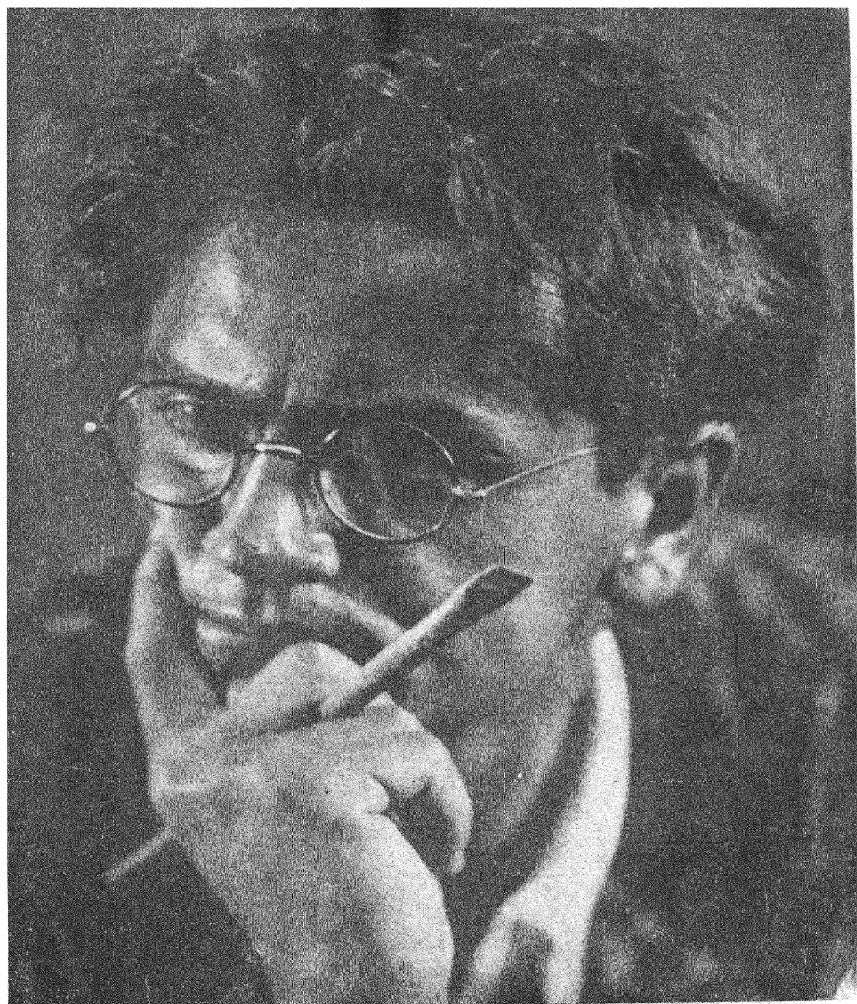
دی دھاریوال وُلن ملز قائم شدہ ۱۸۸۰ء دھاریوال پنجاب

دھاریوال ملز ڈپو:- میسن نرسنگھ داس بلڈنگ دی مال لاہور

لوکل نمائندے (۱) میسرز ملاوامل اوتم چند میسن نرسنگھ داس بلڈنگ دی مال لاہور (۲) میسرز گھنشیام داس اینڈ سنز گورو بازار امرت سر
(۳) میسرز ڈی-این-بَنتی اینڈ سنز مرچنٹس اینڈ ایجنٹس راولپنڈی شہر (۴) میسرز بھگوان داس گوردیال- بازار بھابڑہ بار جموں



معلم



١٩٥٠

بزمِ ادب

سالنامے کی ایک جھلک

ہمارے معاونین حسبِ معمول سالنامے کی تالیف میں گرم جوشی سے حصہ لے رہے ہیں اور اگر ہمیں مستقبل کے متعلق بہت خوش فہم نہ سمجھا جائے تو ہمیں یہ اعلان کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ اس دفعہ کا سالنامہ مضامین کے معیار اور تنوع کے لحاظ سے اپنے پیشرو سالناموں سے سبقت لے جائے گا۔ اس وقت تک جو مضامین موصول ہو چکے ہیں یا جن مضامین کے بروقت تیار ہو جانے کا پورا یقین ہے۔ اُن کا ایک مجمل سا خاکہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں۔ میراجی اور اندرلال داس صاحب قمر کے مضامین کا تذکرہ پچھلے پرچے میں کیا جا چکا ہے۔ نئے مضامین میں پروفیسر سنت سنگھ ایم اے کا دل آویز ڈرامہ "ایک اتوار"۔ جناب وقار انبالوی کا دیہاتی رومان "پنگھٹ"۔ منشی پیارے لال صاحب شاکر کا ادبی مضمون "نور دست" جس میں اس جواں مرگ شاعرہ کے حسین نغموں سے ناظرین کو آشنا کیا گیا ہے۔ سید شہنشاہ حسین کا قابلِ قدر تاریخی مضمون "بابر کی موت"۔ ہمارے نوجوان افسانہ نویس سردار راجندر سنگھ بیدی کا تازہ شاہکار "من کی من میں" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جناب سیفی نوگانوی نے "میر کے فلسفہ" پر۔ اور پروفیسر فیض احمد فیض نے "شاعری میں اظہار اور ترجمانی" پر دو نہایت بصیرت افروز مقالے لکھے ہیں۔ نوجوان ادیب چندر بھوشن سنگھ اور ہمارے دور افتادہ دوست مہر محمد خاں صاحب شہاب نے ہندی سے دو نہایت لطیف کہانیاں ترجمہ کی ہیں۔ منظومات میں جناب عرشی۔ حضرت اثر صہبائی۔ جناب تائب۔ جناب روشن دین تنویر۔ راجہ مہدی علی خاں۔ جناب اسد ملتانی۔ جناب علی منظور۔ جناب فراق گورکھپوری۔ حضرت نظیر لدھیانوی۔ جناب اندرجیت سترپال اور تابش صدیقی صاحب کی نظمیں اور غزلیں۔ سعید احمد صاحب اعجاز اور مرزا عباس بیگ صاحب محشر کی حیات افروز رباعیاں موصول ہو چکی ہیں۔ ہمارے نوجوان شاعر قیوم نظر نے جو آج کل بصد ب دشمناں کچھ علیل ہیں ایک بے نظیر ساقی نامہ لکھا ہے۔

جادو نگار کرشن چندر ایک افسانہ لکھ رہے ہیں "جنت اور جہنم" افسانہ کی دلکشی اس کے نام سے ظاہر ہے۔ رفیقِ محترم عاشق حسین بٹالوی نے اپنے اندازِ خاص میں ایک اچھوتا خیال سپردِ قلم کیا ہے اور افسانے کا نام رکھا ہے "روشنی کی کرن"۔ ہمارے دیرینہ کرمفرما پروفیسر تاجور نجیب آبادی "حالی اور شبلی" پر ایک دلچسپ اور سیر حاصل علمی مضمون تیار کر رہے ہیں۔

ہمارے دور افتادہ معاونین حضرات تمکین کاظمی اور تسکین عابدی حیدرآباد سے دو نہایت گراں پایہ علمی مضامین ارسال فرما رہے ہیں۔ تسکین صاحب کے مضمون کا عنوان ہے "دنیا کی حکمران خواتین"۔ محترمہ آمنہ تمکین بھی ایک لطیف مضمون ارسال فرما رہی ہیں۔ پروفیسر سنت رام صاحب اپنے خاص فلسفیانہ انداز میں "عمل اور عکس عمل" پر ایک خیال افروز مضمون مرتب فرما رہے ہیں۔ ہمارے نوجوان دوست جناب باقر بٹالوی نے "یہ لاہور ہے" کے نام سے ایک نہایت لطیف چیز لکھی ہے۔

ہمارے فاضل معاون بسنت سہائے صاحب نے ہندوستان کے قدیم ادب اور فنونِ لطیفہ کے ایک نہایت ضروری اور لطیف جزو پر ایک بے نظیر علمی مقالہ لکھا ہے۔ عنوان ہے "رس کے نظریے"۔

راجہ مہدی علی خاں صاحب۔ راجہ فاروق علی خاں صاحب۔ جناب طاہر قریشی اور منصور احمد مرحوم کے برادرِ خورد محمود احمد خاں صاحب چند بہترین طبعزاد اور ترجمہ شدہ افسانے لکھ رہے ہیں۔

ہمایوں کے نامور مدیر مولانا حامد علی خاں صاحب اور رومان کے مدیر۔ جناب خلیل صحافی بھی حسبِ معمول ہماری بزم میں رونق افروز ہوں گے۔

مدیر کے ایک آسٹرین دوست جو جرمن اور فرنچ کے فاضل اور

ہندوستان میں یورپ کے بہت بڑے بڑے اخبارات کے نامہ نگار ہیں۔ ہماری درخواست پر ایک نہایت دلچسپ مقالہ لکھ رہے ہیں۔ جس کا عنوان ہے "یوگوسلافیہ میں اسلامی کلچر" یہ مضمون اگر وقت پر موصول ہوگیا تو سالنامے کے بہترین مضامین میں شمار ہوگا۔

مذکورہ بالا مضامین نظم ونثر کے علاوہ ہمارے اکثر قلمی معاونین کے مضامین سالنامہ کی زینت ہوں گے۔ ان میں سے جن حضرات نے ابھی اپنے مبارک ارادوں سے ہمیں مطلع نہیں فرمایا۔ ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ اگرچہ سالنامہ کی محفل جم چکی ہے۔ لیکن صدر نشینوں کے لئے ہر وقت جگہ باقی ہے ۔ آپ شوق سے تشریف لائیے لیکن ذرا تیز گامی کی ضرورت ہے۔

سالنامہ کا سرورق اس دفعہ بھی حسب معمول سید سرفراز تیار کر رہے ہیں۔ لیکن اب کے اُن کی جدت پسند طبیعت نے آرٹ کے اس میدان میں چند نئے اسلوب پیدا کرکے ناظرین کے لئے جنت نگاہ کی تعمیر کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ تصاویر کے لحاظ سے "ادبی دنیا" کا میلان ہمیشہ مغربی آرٹ کی طرف رہا ہے۔ اگرچہ پچھلے سالنامے میں دو مشرقی طرز کے شاہکار بھی شائع ہوئے تھے لیکن اس دفعہ ہم نے انتظام کیا ہے کہ مشرقی آرٹ کا حصہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہو۔ ترقی یافتہ فوٹوگرافی کے چند بہترین اور دلچسپ نمونے بھی شامل اشاعت ہوں گے اور ہمیں امید ہے کہ تصویروں کے لحاظ سے سالنامہ ایک جاذب نظر مرقع ثابت ہوگا۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

نازی کیوں یہودی کا دشمن ہے

بن کولون کی یونیورسٹی دیکھنے کے لئے منگل وار ۲۶ جولائی ۱۹۳۸ء کو گیا۔ یونیورسٹی کی عمارت کے بیرونی باغیچے میں اتفاقیہ طور پر مجھے اولین جرمن یہودی سے دوچار ہونا پڑا۔ جس طرح یورپین ہندوستانی ہندوستانی میں امتیاز نہیں کر سکتے اسی طرح ہم ہندوستانیوں کے لئے ایک چینی اور دوسرے چینی میں تفریق کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور میرے لئے تو ایک جرمن اور جرمن یہودی میں تفریق کرنا اتنا ہی آسان "تھا جتنا ایک کوّے سے دوسرے کوّے کو پہچان لینا جرمن کہتے ہیں کہ یہودی کے بال گھونگر یالے ہوتے ہیں، پاؤں بڑے، ٹانگیں چھوٹی اور ضمیر . . . یقینی طور پر برار اسے خوش قسمتی کہیئے کہ جن یہودیوں کو میں نے جرمنی میں دیکھا ہے۔ انہوں نے مجھے اس امتحان کا موقع ہی نہیں ورنہ شاید مجھے آج تک کسی یہودی سے ملاقات نصیب نہ ہوتی۔ بہر حال یہ ہے اس کی کہانی :-

"میں تھوڑی سی انگریزی بھی جانتا ہوں کیونکہ میں ایک جنگی قیدی کی کی حیثیت سے دو سال انگلستان میں رہا ہوں۔ لڑائی میں میرا دایاں بازو ضائع ہو گیا۔ جب میں واپس آیا تو ایک بیمہ کمپنی میں ۱۰۰ مارک ماہوار پر ملازم ہو گیا اور پھر ترقی کرتا ہوا ۶۰۰ مارک پر پہنچ گیا۔ لیکن اب گذشتہ دو سال سے بیکار ہوں۔ میری کمپنی نے مجھے صرف اس جرم پر برطرف کر دیا کہ میں یہودی ہوں۔ حکومت میری جنگی خدمات کے صلے میں مجھے ۵۰ مارک ماہوار پنشن دیتی ہے۔ ۲۰ مارک ماہوار مکان کے کرائے میں چلے جاتے ہیں (اب میں ایک کمرے میں رہتا ہوں اس سے پہلے میں چار کمروں میں رہتا تھا) اور ایک مارک یومیہ میں خوراک پر صرف کرتا ہوں۔ اس قلیل رقم میں مجھے سیر ہو کر خوراک نہیں ملتی اس لئے میں ہمیشہ بھوکا رہتا ہوں اور اب مالکہ مکان نے مجھے کمرہ خالی کرنے کا نوٹس دے رکھا ہے کیونکہ مجھے یہودیوں کی بستی میں رہنا چاہیئے۔ امریکہ سے میرا ایک بھائی مجھے گزران کے لئے تھوڑی سی رقم بھیج دیتا ہے۔ میں تمام دن باغ میں آوارہ و سرگرداں گھومتا رہتا ہوں۔ اور جب سب لوگ رخصت ہو جاتے ہیں تو دبکتا ہوا حمام میں جا کر منہ ہاتھ دھو لیتا ہوں۔

"میں پبلک مقامات میں جانے سے محترز رہتا ہوں کیونکہ وہاں یہودیوں کے ساتھ نفرت و حقارت کا سلوک کیا جاتا ہے۔ زندگی مجھے دوبھر ہو رہی ہے، میں تفرج گاہوں میں بھی نہیں جا سکتا۔ میرے چند جرمن دوست ایسے بھی ہیں جو رات کی تاریکی میں مجھ سے ملنے آتے ہیں اور مجھے اخبارات دے جاتے ہیں۔ تمام دن میں کھنڈروں میں منہ چھپاتا پھرتا ہوں۔ ایک ہی سال میں میرے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ میرے والدین ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کے مالک تھے لیکن ان کا کاروبار اب تباہ ہو چکا ہے اور وہ ۱۰۰ مارک ماہوار پر گذارہ کرتے ہیں جو میرا بھائی انہیں امریکہ سے بھیجتا ہے۔ میں جرمنی کو چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ میرے پاس روپیہ نہیں ہے، اور میں جاؤں بھی کہاں؟"

یہودیوں کی مظلومیت کی دردناک داستانیں

لنڈن (ہالینڈ) میں میں ایک یہودی ماں بیٹوں سے ملا جنہیں جرمنی چھوڑے دو سال ہو چکے تھے۔ ماں نے اپنی داستان یوں سنائی :-

"ہم یہاں پناہ گزین ہیں۔ جب میرے خاوند نے جرمنی سے ہجرت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے مخالفت کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں آخر میں مان گئی کیونکہ اب ہالینڈ میں کوئی یہودی آباد نہیں ہو سکتا

جنگ عظیم کے دنوں میں فرانس میں ہمارا کاروبار اعلیٰ پیمانے پر چل رہا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اعلانِ جنگ کے وقت ہم جرمنی میں تھے، چنانچہ فرانس میں ہماری تمام جائداد ضبط کر لی گئی اور اب جبکہ ہم ہالینڈ جانے کیلئے رخصت ہوئے تو پھر ہماری جرمنی کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ جنگ کے دوران میں مادرِ وطن کے لئے ہم خوشی سے دکھ سہتے تھے لیکن موجودہ صدمہ اُن سب سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا ہے۔ ہم اپنا وطن کھو چکے ہیں اور اب ہمارے خاندان تباہ ہو رہے ہیں۔ جرمنی میں میرا بیٹا پڑھائی کے معاملے میں بڑا ہونہار سمجھا جاتا تھا لیکن اب ہالینڈ میں اس کے لئے جرمن، لاطینی اور انگریزی کے علاوہ ڈچ زبان کا جاننا بھی ضروری تھا۔ دو سال تک وہ سخت محنت کرتا رہا ہے اور اب ہیڈ ماسٹر مجھ سے کہتا ہے کہ اس نے کوئی ترقی نہیں کی۔ اس کے دو سال ضائع ہو گئے۔ لیکن اب وہ کیا کرے اور کہاں جائے! ڈچ اسے کوئی ملازمت نہ دیں گے میری ایک بیٹی بھی ہے۔ حسین اور بے پروا لیکن میرا بیٹا بڑا احساس ہے۔ اپنی قوم کے ساتھ اس بے انصافی کا سلوک دیکھ کر اسے دکھ ہوتا ہے۔ اپنے بچوں کا مستقبل اتنا تاریک دیکھ کر میرے دل کے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ شاید میں اچھی ماں نہیں ہوں۔ میرے بچے شادی بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارا روزگار مخدوش ہے۔ بچوں کی تعلیم ناکافی ہے اور ہم بے گھر ہو رہے ہیں۔ میری بہن بیوہ ہے۔ اس کی جائداد بھی کافی ہے لیکن ابھی تک وہ جرمنی میں ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ میں ایک مسلسل ذہنی دُکھ میں مبتلا ہوں۔ او رممکن ہے جلد ہی پاگل ہو جاؤں۔ دروازے کی ہر دستک ٹیلیفون کی ہر گھنٹی یہاں تک کہ ہر آہٹ مجھے چونکا دیتی ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر روتی رہتی ہے لیکن باہر سڑک تک جانے کی جرأت نہیں کر سکتی اس کے خویش واقارب جرمنی کو خیرباد کہہ رہے ہیں۔ لیکن وہ اپنی جائداد چھوڑ کر کہاں جائے۔ ہالینڈ میں ہمارے افلاس کا یہ حال ہے کہ میں حیران ہوتی ہوں ہمارا گذارا کیسے ہوتا ہے۔ اگرچہ ابھی ظاہرا طور پر نظر نہیں آتا لیکن میرے خیال میں اب ہالینڈ میں یہودیوں کی مخالفت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

یہودیوں کے لئے اجتماعی بربادیوں کے سامان

انفرادی مظلومیت کی ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں لیکن ستم تو یہ ہے کہ یہودیوں کی مصائب نہ انفرادی ہیں اور نہ عارضی۔ انفرادی طور پر ایذا رسانی اور ضبطیٔ املاک کے واقعات ابتدائے جوش وغیض کے صرف پہلے چند ایام میں واقع ہوئے۔ اب یہ کام منظم صورت میں ایک خوفناک مشین کی طرح ہو رہا ہے جس کی استخوان شکن لپیٹ میں تمام یہودی من حیث المجموع آ گئے ہیں۔ یہ مشین بلا امتیاز بے دردی کے ساتھ اپنے کام کو سرانجام دیتی چلی جاتی ہے۔ یہودی سول ملازمتوں سے مستثنیٰ قرار دے دیئے گئے ہیں۔ پیشوں، یونیورسٹیوں، اخباروں، فنونِ لطیفہ اور فوج کی ملازمتوں کے دروازے اُن کے لئے بند کر دیئے گئے ہیں۔ وہ نہ زمین خرید سکتے ہیں نہ جرمنوں کو نوکر رکھ سکتے ہیں اور نہ اُن کے پاس ملازم ہو سکتے ہیں۔ وہ تجارت کر سکتے ہیں لیکن جرمنوں کو ہدایت ہے کہ وہ ان کے ساتھ لین دین نہ کریں۔ وہ دُکانیں کھول سکتے ہیں لیکن جرمن تھوک فروش ان کے ہاتھ اپنا مال فروخت کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ بدیشی مال درآمد کر سکتے ہیں لیکن حکومت انہیں بدیشی سکہ مہیا نہیں کرتی۔ اُن کے رہن وقت سے پہلے واگذار کر دیئے گئے ہیں، انہیں ادھار دینے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ اُن کی زمینیں رفاہِ عامہ کے لئے طلب کی جا رہی ہیں! وہ اپنے کاروبار فروخت کر سکتے ہیں لیکن ان کے کاروبار کے نام کوڑیوں میں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ وہ جرمنی سے جا سکتے ہیں لیکن اپنے ساتھ اپنے سرمایہ کا صرف ۱۰ فی صدی حصہ لے جا سکتے ہیں۔ اُن کے بچے سکول میں الگ بنچوں پر بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں جہاں انہیں قوانینِ نسلی پر اسباق سننے پڑتے ہیں، انعامات حاصل کرنے کا راستہ اُن کے لئے مسدود ہے، نوجوانوں کے ہوسٹلوں میں وہ مقیم نہیں ہو سکتے اور نہ وہ لیبر سروس میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ شدید معاشرتی مقاطعہ کیا گیا ہے۔ مکمل اخلاقی پستی کا نمونہ۔ بیسویں صدی کے اس روشنی کے زمانے میں "چنڈال" بنائے جا رہے ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ کئی جرمن حیرت زدہ ہو کر مجھ سے پوچھتے تھے کہ کس طرح میں جو ایک ہندوستانی ہوں۔ اس سیدھی سادی بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ جیسے ہندیوں نے صدہا سال سے اپنا وطیرہ بنا رکھا ہے۔ جرمنوں کے امتیازِ نسلی کا بعینہٖ وہی مطلب ہے جو ہندوستان میں ہندوؤں میں ذات پات کا ہے۔ منو نے ہر ہٹلر کی صورت میں پھر جنم لیا ہے اور ایک نئی سمرتی تصنیف کی ہے۔ منو مر گیا، منو زندہ باد!

لیکن یہ سب کچھ سمجھ میں آ سکتا ہے اگر ہم یہ جان لیں کہ اس وقت جرمنی میں کیا ہو رہا ہے۔ ہٹلر نے ایک دفعہ کہا تھا "ہم جرمنی کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتے"۔ جرمنی ہٹلر کے نزدیک مذہب کے مترادف ہے اور

جرمنوں کے لئے ہٹلر جرمنی کے مترادف ہے۔ میں نے ایک جگہ ایک فقرہ لکھا ہوا دیکھا "ایک حکومت، ایک قسم کی رعایا، ایک لیڈر" یہ ہے جرمنوں کے خیالات کی صحیح تصویر۔ جرمنوں کے صرف تین ہیرو ہیں، فریڈرک اعظم، بسمارک اور ہٹلر۔ بسمارک کے زمانے میں جرمنی ۲۲ ریاستوں پر مشتمل تھا جن میں سے بعض کی اپنی افواج تھیں۔ ہٹلر کی خواہش ہے کہ اُن ۱۵ ملین جرمنوں کو جو دوسرے علاقوں میں بستے ہیں پھر جذب کر لیا جائے۔ قوم کو ایک مرکز پر لانے میں جرمنی فرانس اور انگلستان کے مقابلے میں صدیوں پیچھے رہ گیا ہے۔ اب وہ ضائع شدہ وقت کی کمی پوری کرنے کے لئے سرپٹ دوڑ رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس اندھا دھند دوڑ میں بے چارے یہودی کچلے جا رہے ہیں۔ یہودیوں کی ذات سے انہیں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم بھی نیچ ذاتوں سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ ہم نے ان کی ایک علیحدہ ذات بنا دی تھی۔ جرمن اپنے کاموں کو ہم سے زیادہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ انہیں اچھوتوں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ایک رحم دل خاتون نے جو ایک چیونٹی کی ایذارسانی کو بھی روا نہیں رکھتیں مجھے مندرجہ ذیل عبارت لکھ بھیجی ہے:۔

"ہم یہودیوں کے ساتھ دشمنی نہیں کرتے۔ نہ ہم انہیں قتل کرتے ہیں لیکن ہم ان بن بلائے مہمانوں کو اپنے لئے تکلیف دہ ضرور سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ اپنی سہولت کے مطابق ہمارے ملک سے رخصت ہو جائیں۔ حبشیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اسے چاہئے تھا کہ یہاں ہمارے اچھوتوں کا ذکر بھی کرتی، اس سے اُسے درد کی نسبت بھی نہیں آپ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ہم ظالم ہیں "ہیں" تو یقیناً آپ کی ہم خیال ہوں لیکن یہودیوں اور اچھوتوں سے پوچھئے۔ انفرادی طور پر ہم انسانیت کے پتلے ہیں لیکن اجتماعی طور پر ہم صرف ظالم ہی نہیں بلکہ بے درد بھی ہیں اور یہ تہذیب نو کا خاصہ ہے۔"

نسلی پاکیزگی کا نقطۂ نظر

یہودیوں کے اس قصے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جرمنوں کو یہودیوں سے نفرت ہے یا یہودی جرمنوں کے دشمن ہیں بلکہ یہودی اور غیر یہودی میں نفرت اور دشمنی کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب عیسائیت نے جنم لیا تھا۔ یہ منافرت عالمگیر ہے اگرچہ ہر جگہ اتنی شدت سے ظاہر نہیں کی جاتی جرمنی میں یہ آگ ہمیشہ سلگتی ہی رہی ہے اور کسی زمانے میں بھی مکمل طور پر نہیں بجھی۔ لیکن پرانے زمانے میں یہ منافرت صرف مذہب اور افراد تک محدود تھی۔ موجودہ معاملات نے قومی اور نسلی درجہ حاصل کر لیا ہے اور کسی حد تک انفرادی۔ جرمنوں نے ایک نظریہ قائم کر لیا ہے اور اس نظریے کے ساتھ چند غیر خوش آیند حقائق کو وابستہ کر رکھا ہے ——— بالکل اسی طرح جس طرح ہم نے ہندوستان میں نسل کو آمیزشوں سے پاک رکھنے کے لئے ایک نظریہ قائم کیا تھا۔ یہودی کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ اس کا کوئی وطن نہیں، اس کی کوئی حکومت نہیں ——— وہ "دنیا کا شہری" ہے۔ آوارہ یہودی قومیت پرست جرمنی میں بین الاقوامی ہستی رکھتا ہے۔ وہ مذہب، رسم و رواج، روایات اور پیدائش میں ہندوستانی برہمن کی طرح سب سے الگ تھلگ اور بلند و بالا ہے لیکن خدا کے منتخب بندے عام طور پر بندوں کے محبوب نہیں ہوا کرتے قدرت کے قوانین بڑے سخت ہوتے ہیں اور یہ قہر خداوندی جرمنی کے "قانون نسل" کی صورت میں نازل ہوا۔ "شہری حقوق صرف قوم کے افراد کو ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ قوم کے ممبر صرف وہی لوگ شمار ہوں گے جن کی رگوں میں جرمن خون موجزن ہے۔ اس لئے کوئی یہودی ہماری قوم کا ممبر نہیں ہو سکتا۔" یہ ہے انتقام کی دیوی کا کرشمہ جس نے یہودی کی یہودیت اور خود پسندی کو اس کے لئے عذاب بنا ڈالا۔ اس کے بعد قانون "ایک پورے یہودی" کی تعریف کرتا ہے ——— جس کے آبا تین نسلوں تک یہودی ہوں، غیر نسلی خون کی ملاوٹ اس تعریف سے خارج ہو جاتی ہے۔ لیکن ان بوڑھے یہودیوں کے لئے قانون نرم ہو جاتا ہے جنہوں نے جنگ عظیم میں صدمات برداشت کئے ہیں۔

جرمن اس بات پر پختہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہودی ایک علیحدہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی رگوں میں ایسا بدیشی خون موجزن ہے جو کسی طرح بھی جرمن خون کے ساتھ نہیں مل سکتا۔ سوئٹزرلینڈ، پولینڈ، سویڈن، ہالینڈ، اور انگلستان کے باشندے جرمنوں کے ساتھ مل کر جرمن ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہودی کبھی جرمن نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک یہودی لڑکی جرمن لڑکے کے ساتھ شادی کرے تو اس کی اولاد جرمن نہیں ہوتی بلکہ یہودی ہوتی ہے یہودی کا خون اپنی اصلیت کبھی نہیں بدلتا۔ اس لئے اسے صرف یہودی خون کے ساتھ ہی ملنا چاہئے۔ جرمن کبھی حبشی کے ساتھ شادی نہیں کرتا وہ چینی کو بھی پسند نہیں کرتا" لیکن ہم تم ہندوستانیوں میں شادی بیاہ کرنا برا نہیں سمجھتے کیونکہ تم آریہ ہو۔" اب اس کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ میرے لئے تو یہ ایک مسکت جواب تھا اور یہ بات صحیح بھی ہے

کہ اگرچہ جنگِ عظیم میں یہودیوں نے بھی حصہ لیا۔ لیکن زیادہ تر یہودی اس سے بچنے کی کوشش کرتے رہے اور بہتوں نے تو جنگ کو دولت کمانے کا ذریعہ بنا لیا۔ یہ خیال کرنا مضحکہ خیز سا معلوم ہوتا ہے کہ "جنگی محاصرے یا امریکی فوج کی وجہ سے نہیں بلکہ یہودیوں کی وجہ سے جرمنی کو شکست ہوئی" کیونکہ انہوں نے ہم پر پشت کی طرف سے حملہ کر دیا"۔ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ انہوں نے ... کے تمام ذخائر پر قبضہ کر لیا۔ جائیدادیں خرید لیں اور دولت کے انبار لگا لئے۔ حالانکہ ان دنوں جرمن قوم بھوکوں مر رہی تھی۔ یہودی ہمیشہ ایک حلقۂ زبوں میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ دولت کے انبار کی چوٹی پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ یورپ میں اسے زمین کے حقوقِ ملکیت سے محروم کر دیا گیا لیکن اس نے تجارت اور ساہوکارے کے ذریعے سے عروج حاصل کر لیا۔ فوج اور سول سروس کی ملازمتیں اس کے لئے روک لی گئیں تو وہ اعلیٰ پیشوں میں معراجِ ترقی پر پہنچ گیا۔ گرجے کی طرف سے اس کی آزاردہی کا سامان ہوا تو وہ فنونِ لطیفہ میں چمک اٹھا۔ مختصر یہ کہ جس طرف بھی اس نے قدم اٹھایا وہ ہمیشہ بامِ عروج پر نظر آیا۔

کیا اس کا ردِّ عمل بھی ہوگا؟

قومیت کے اس منفی رُخ کا ایک مثبت رُخ بھی ہے جو زیادہ روشن اور خوش آئند ہے۔ مجھے یقین ہے کہ موجودہ ردِ عمل ٹھنڈا پڑ جائے گا اور یہودی کو بلا روک ٹوک کاروبار کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ افراد کی فطری نرم دلی اور انصاف پژوہی انہیں انسانیت کا سلوک کرنے پر مجبور کر دے گی لیکن جرمن آبادی کی پالیسی جس کا ایک چھوٹا لیکن روشن ترجمہ قومِ یہود کی تھی۔ اسی طرح جاری رہے گی اور اُسے عالمگیر شہرت حاصل ہو جائے گی جنگِ عظیم میں بیس لاکھ انسانوں کا قتلِ عام ہوا تو ... کے بیس لاکھ کھلے ہوئے پھول مرجھا گئے۔ جنگ کے بعد اقتصادی مشکلات نے دس لاکھ معصوم بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اقتصادی تنظیم اور سیاسی بے ترتیبی کے دوران میں جس کے نتائج بے روزگاری کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ شادیوں میں معتدبہ کمی ہو گئی اور اس طرح ۱۴ سال کے عرصے میں تیس لاکھ بچے کم پیدا ہوئے۔ پیدائش کی یہ کمی ملک کی آبادی کے نمایاں عناصر پر اثر انداز ہوئی۔ بچوں کی اوسط تعداد جرائم پیشہ خاندانوں میں ۴٫۴ ۔ عام باشندوں میں ۲٫۲ فی خاندان اور اونچے گھرانوں میں صرف ۱٫۹ تھی۔ چنانچہ پیدائش کی کمی کے علاوہ پیدائش

کا بڑا عنصر ادنیٰ درجے کا تھا اور بے شمار روپیہ غربا کی امداد اور بے یار و مددگار بچوں کی پرورش پر ضائع ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ہٹلر کا ظہور ہوا۔

"میں اپنے ملک اور قوم کی کامیابی اور کامرانی کا ثبوت نئی سڑکوں کی تعمیر کو نہیں سمجھتا اور نہ ملک کے نئے کارخانوں، نئے پلوں اور فوج کی نئی پلٹنوں کو سمجھتا ہوں جنہیں ہم جدید ترین سامان سے آراستہ کر رہے ہیں۔ ہماری کامرانی کا حقیقی راز جرمن بچے اور جرمن نوجوان میں مضمر ہے جب ان کے نشو و نما اور ترقی کے سامان پیدا ہوں گے تو میں سمجھوں گا کہ جرمن قوم کو حقیقی قیام حاصل ہو گیا اور ہمارا کام تکمیل کو پہنچ گیا"۔ واقعی یہ بہت اچھی اور عظیم الشان بات ہے اگرچہ اس تحریک کا پیشوا خود اپنی طرف سے ایک بچے کا اضافہ بھی نہیں کر رہا۔ جرمن سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی تمام محبت اپنی قوم اور ملک کے لئے وقف کر چکا ہے اور اس کا کوئی حصہ اپنی بیوی کے لئے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ اپنی اولاد کے لئے جو محبت اسے ودیعت ہوئی تھی اس کا اظہار وہ اپنی قوم کے بچوں کے ساتھ کھیل کر کر لیتا ہے۔

شادیوں کے لئے ترغیب

آبادی کو بڑھانے کے لئے جو طریقے اس نے استعمال کئے وہ نہایت کامیاب ثابت ہوئے یہاں تک کہ دوسرے ممالک نے بھی اس کی پیروی شروع کر دی۔ گھر کا سامان خریدنے کے لئے حکومت ایک ہزار مارک تک قرضہ بلا سود عطا کرتی ہے۔ ہر بچے کی پیدائش پر قرضے کا چوتھائی حصہ معاف کر دیا جاتا ہے۔ ہر پانچویں بچے کی پیدائش پر اور دوسرے بچوں کے لئے جن کی عمر ۱۶ سال سے کم ہو۔ دس مارک ماہوار الاؤنس دیا جاتا ہے۔ ان تمام عطیات پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ جتنے زیادہ بچے کسی خاندان میں ہوں وہ اتنا ہی زیادہ خوش قسمت اور خوشحال ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹروں کے گھرانے عموماً سب سے زیادہ گناہ گار ہوتے ہیں۔ اس لئے قانون کہتا ہے کہ ہر ڈاکٹر کے گھرانے کو تیسرے اور پھر آیندہ بچوں کی پیدائش پر ۵۰ مارک ماہوار وظیفہ عطا ہوگا۔ یہاں تک کہ بچے کی عمر ۱۲ سال کی نہ ہو جائے۔ ہر سول ملازم کو "جوں ہی وہ شادی کرے" اپنے درجے کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ ملنی شروع ہو جاتی ہے۔ شادی سے پہلے فریقین کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے اور اس میں کامیاب رہنے پر وہ تمام الاؤنس حاصل کرنے کے حقدار سمجھے جاتے ہیں۔ اس قانون کے

کامیاب نتائج کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ شادیوں کی تعداد جو ۱۹۳۲ء میں پانچ لاکھ تھی ۱۹۳۴ء میں سات لاکھ چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ پیدائش کی تعداد ۱۹۳۳ء میں دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ لیکن آبادی کی موجودہ قوت کو برقرار رکھنے کے لئے ابھی اس میں پانچ لاکھ پیدائشوں کی کمی ہے جو کسی نہ کسی طرح پوری کرنی پڑے گی۔ بچوں کی پیدائش میں اضافہ ہونا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ کثیرالاولادی کے ساتھ مالی مشکلات کا خوف اب لوگوں کے دلوں سے دور ہو چکا ہے کیونکہ اب کثیرالاولاد ہونا خوشحالی کا پیش خیمہ ہے۔

یہاں تک تو قوم کی تعداد کو بڑھانے کے اقدامات کا ذکر تھا۔

اب ان پابندیوں کا حال سنئے جو قوم پر صرف صحت مند اور تندرست بچے پیدا کرنے کے لئے عاید کی گئی ہیں۔ قوم کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ایسے تمام مرد یا عورتوں کا نکاح ممنوع ہے جو (۱) کسی متعدی بیماری میں مبتلا ہوں (۲) قانونی طور پر اپنے معاملات کو سرانجام دینے کے ناقابل ہوں (۳) کسی دماغی بیماری میں مبتلا ہوں یا (۴) کسی ایسے مرض میں مبتلا ہوں جو انہیں وراثتاً ملا ہو۔ جرمنی میں شادی کو "ذاتی معاملے" کی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ یہ ایک فرض ہے جس کے لئے ہر جرمن اپنی قوم کے سامنے جواب دہ ہے۔ "قانون یہ بھی کہتا ہے کہ جرمنی عدالت ایسے تمام مردوں اور عورتوں کو حکماً بانجھ کر دینے کا اختیار رکھتی ہے جو کسی دماغی مرض میں مبتلا ہوں یا کسی ایسی بیماری کا شکار ہوں جس کا ان کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہونے کا احتمال ہو۔ یہ ہے علم حیات کا سبق جس کے مطابق گھروں کی صفائی ملک کو ناقابل افراد کے وجود سے انہیں کی بھلائی کے لئے انہیں کے ذریعے سے پاک رکھتی ہے"۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ جرمن نسل کی بہبودی کو قوم کی حیات و ترقی کی بنیاد تصور کرے ...... ہر فرد پر یہ حقیقت روشن ہونی چاہیئے کہ بچہ قوم کا عزیز ترین سرمایہ اور گراں مایہ ترین متاع ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ صرف انہی لوگوں کو بچے پیدا کرنے دے جو جسمانی حیثیت سے ہر طرح تندرست ہیں۔ سب سے بڑی رو سیاہی یہ ہے کہ بیمار اور اپاہج والدین اپنے جیسے بچے پیدا کریں ... اس سے بڑا اور کونسا گناہ ہو سکتا ہے کہ قوم کو تندرست بچے نہ دیئے جائیں .... ان نتائج کو حاصل کرنے کے لئے حکومت جدید ترین طبی معلومات کو کام میں لائے گی ..."۔ چنانچہ جو روپیہ بے فائدہ نقصان دہ اور ناقابل صحت افراد کی زندگی پر خرچ کیا جاتا تھا۔ وہ اب بچا لیا گیا ہے۔ ایک ارب پچاس کروڑ مارک صرف پاگل خانوں کے بند ہونے سے بچ رہا ہے۔ ناکارہ افراد کی "خبر گیری" کا پرانا طریقہ بند کر دیا گیا ہے۔ اب قومی چمن میں صرف انہی نونہالوں کے لئے بیج بویا جاتا ہے جو قومی چمن کی زینت کا باعث ہوں اور گھاس پھونس کی بیکار روئیدگی کو جبراً روک کر اس بات کا انتظار نہیں کیا جاتا کہ قدرت ناکارہ عناصر کو خود فنا کرے گی۔ افراد کو اُن کے حسن اخلاق کا واسطہ دے کر استدعا کی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بانجھ پن کے عمل کے لئے پیش کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس یہودی قضیئے کو اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے جو جرمنوں نے اپنی آبادی کے متعلق اختیار کر رکھا ہے۔ اصل میں جرمن آبادی کو عیوب سے پاک کرنے کے لئے جو قوانین حکومت نے نافذ کر رکھے ہیں وہ اُن قوانین سے کہیں زیادہ سخت ہیں جو یہودیوں پر عائد کئے گئے ہیں یعنی شادیوں کے لئے امتناعی قانون بعض کے لئے طبی سند کی ضرورت بعض کے لئے بانجھ پن کے احکام وغیرہ اپنی شدت میں اتنے ہی ظالمانہ ہیں جتنے کہ یہودیوں کے متعلق نسلی قانون میرا خیال ہے کہ مستقبل میں آخرالذکر قانون میں آہستہ آہستہ نرمی آتی جائے گی اور اول الذکر سخت تر ہوتا جائے گا اور پھر لوگ جرمنی کے نقطۂ خیال کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگ جائیں گے۔

(ترجمہ)

منظر احمد

شاعر کا نغمہ

آکاش کی نیلی وادی میں جب نور کی بارش ہوتی ہے
جب کالی کالی چادر اوڑھے صبح کی دیوی سوتی ہے
جب رات کی رانی خوفِ سحر سے چپکے چپکے روتی ہے
ہنگامِ سحر نوخیز کلی جب منہ شبنم سے دھوتی ہے
میں روتا ہوں اتنا کہ فلک کے تارے رونے لگتے ہیں

پربت کی سنہری چوٹی پر جب کالی گھٹا منڈلاتی ہے
جب نیر کی بہتی دھارا پر سورج کی کرن لہراتی ہے
چلتے چلتے دھرتی پر جب ندی تھک سی جاتی ہے
کوئل اپنی کوک سے جس دم دکھیوں کو کلپاتی ہے
میں روتا ہوں اتنا کہ فرشتے سارے رونے لگتے ہیں

جب سندر کلیوں کے لب پر معصوم تبسّم ہوتا ہے
جب دل کا ذرّہ ذرّہ اڑ کر شاملِ انجم ہوتا ہے
رنگین فضاؤں میں رقصاں جب سازِ ترنم ہوتا ہے
جب سرِّ سکوں کہساروں کے دامانوں میں گم ہوتا ہے
میں روتا ہوں اتنا کہ حسیں نظّارے رونے لگتے ہیں

علی احمد

مغرب کا ایک مشرقی شاعر

طامس مور

اپنے ماحول سے متاثر ہونا تو لازمی ہے لیکن بعض پہلوؤں سے دُور کی باتیں بھی نہایت گہرے اثرات کرتی ہیں۔ شروع سے ذہن انسانی میں ایک دُور کی بات یعنی جنت کا خیالی نقشہ قائم ہے اور یوں دُور کی ہر بات اپنے نا معلوم خصائص کی بنا پر دھندلی اور دلکش معلوم ہوتی ہے۔ کہنے کو تو کپلنگ نے کہہ دیا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔ لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے اس بات کا خیال نہ رکھا کہ دوری کی دلکشی سے ہی کرۂ ارض کے ان دونوں حصوں کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا لازمی ہے۔ اور یہی اثرات گہرے اور پائیدار ہو کر ان کو ایک دوسرے کے رنگ میں ڈھال سکتے ہیں۔ مشرق پر مغرب کے اثرات ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں قدم قدم پر اُن کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن اس وقت ہمیں مغرب پر مشرق کے اثرات سے سروکار ہے۔

جس طرح ہمارے لئے آج لفظ مغرب دور جدید کی تمام ارتقائی برکتوں کا تصور لئے ہوئے ہے اُسی طرح آج سے ڈیڑھ سو سال پیشتر ایک مغربی کے لئے مشرق کا لفظ ہی چند محدود معانی کی ایک رنگین جمعیت کا مظہر تھا۔ مشرق کا لفظ ہی سن کر اُس کی نگاہ تصور ایک ایسی خوابگوں سرزمین کا نظارہ کرتی تھی جہاں الف لیلہ کی شہزادیاں ہیں، پریاں ہیں، حوریں ہیں، درویش، حرم، موذن، مساجد، منادر، فقیر، زر و جواہرات کے بے پناہ انبار، عود و عنبر کی خوشبوئیں، بادشاہوں اور راجوں کے دربار، شاہی شان و شوکت، خلعتیں، زرہ بکتریں ملبوس سوار اور بے شمار اور ایسی اشیا جن کی درخشانی اور جن کا شکوہ نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے اور یہ سب باتیں انہیں دوری کے ایک ایسے فسانہ ساز دھندلکے سے دکھائی دیتی تھیں۔ جس کی زرفشانی اور تنوع انہیں جنت کے اُسی ازلی تصور کی یاد دلاتا تھا۔

دور دراز کے سفر سے آنے والے سیاحوں کی جہاں دیدہ دروغ گوئی عوام کے لئے اور خصوصاً اُس زمانے کے شعرا کے لئے ایک ایسی عجیب اور دلکش دنیا کا نقشہ بنانے کا باعث ہوئی جس نے بے اختیار ان کے دلوں کو مشرق کی رومان انگیز فضا کی طرف مائل کر دیا۔ بائرن بذاتِ خود اپنی سفری زندگی میں مشرق قریب تک آ پہنچا اور بائرن کے دوست اور ہمعصر ٹامس مور کو بھی ایسے ہی معاملات کا سامنا ہوا۔

شاعری پر ان مشرقی اثرات کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب کے تاجروں کو مشرق نے اپنی سنہری روایات کے جال سے کھینچنا شروع کر دیا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی شاعری میں بہت سی مشرقی روایات رائج ہونے کے علاوہ لغت میں بے شمار مشرقی الفاظ کا اضافہ ہوا۔ عربی سے عنبر، غزال، حرم، مینار، مون سون، زعفران، سلطان، شیخ اور مسجد جیسے الفاظ ملے۔ فارسی سے عطر، بازار، کارواں اور کارواں سرائے، درویش، دیوان، یاسمین، مشک، اور پری کی درآمد ہوئی۔ اور سنسکرت اور ہندوستان سے اوتار، کافور، جنگل، صندل، راجہ، پالکی اور قلی کے الفاظ نے انتقال کیا اور انگریزی زبان نے نہ صرف ان لفظوں کو اپنے دامن میں لیا بلکہ ان سے متعلق شاعرانہ روایات، تصورات اور تشبیہات بھی اس کا جزو بن

گئے۔ مغربی یا انگریزی شاعری پر پہلے عرب اور ایران کی شاعری نے اثر کیا پھر ہندوستان اور چین جاپان کی باری آئی۔ اس حفظ مراتب کی دو وجوہات ہیں ایک جغرافیائی جو ملک زیادہ قریب تھا۔ اس کا اثر قدرتاً پہلے ہوا اور دوسری نفسیاتی یعنی اُس زمانے کے شعرا کے جذبات و احساسات کو مشرق بعید کی بہ نسبت مشرق قریب یعنی عرب اور ایران کے شعرا کے جذبات اور احساسات سے ایک مناسبت تھی۔ عرب کے بعد کے شعرا اور ایرانی شعرا کے کلام میں شدت اور گہرائی نہ تھی۔ ان کا کلام ایک ہلکی پھلکی اور خوش طبع سی شے تھا۔ اس میں حسن و طاقت کے فانی ہونے پر نوحہ خوانی تھی۔ اس میں محبت کے رومانوی فسانے تھے۔ اور یہ محدود باتیں انگریزی زبان کی شاعرانہ روایات کے مطابق تھیں۔ ان سے انگریزی شاعری میں ایک نیا رنگ یقیناً پیدا ہوا لیکن وہ رنگ ان کی پہلی شاعری میں بھی اپنے طور پر موجود تھا۔ اس زمانے کے انگریزی شعرا میں ایک تکلف تھا۔ ایک جذباتی افتاد طبع تھی، ایک نرمی اور گداز تھا۔ یہ تمام مشرقی اثرات اس وقت ایک پائدار صورت پکڑ گئے۔ جب ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے رباعیات عمر خیام کا نفیس ترجمہ اپنے ہمعصروں کے پیش نظر کیا لیکن ہمیں اس سے بہت پہلے کے زمانے سے تعلق ہے۔ اس زمانے سے جب آئرستان میں ٹامس مور کی نغماتی تخلیق کو ایک زبردست قبولیت حاصل ہو رہی تھی۔

آئرستان اور ہندوستان میں بہت سی باتیں یکساں پائی جاتی ہیں۔ آئرستان کی ابتدا بھی ہندوستان کی طرح ایک افسانوی درجے کو پہنچ چکی ہے۔ جس طرح ایک زمانہ تھا۔ جب ہندوستان کی عظمت اور قوت کی ایک دنیا قائل تھی، اسی طرح ایک زمانہ تھا جب آئرستان کا لوہا بھی تمام یورپ مانتا تھا اور جس طرح آخر قدیم ہندوستان کو زوال آیا اسی طرح قدیم آئرستان کو بھی زوال آیا۔ پھر جیسے راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی مانند ہندوستان میں حیات تازہ کے شعلے بھڑکے اسی طرح آئرستان میں بھی تحریک آزادی نے ایک نئی روح پھونک دی لیکن یہ موازنہ تفصیلات میں تطابق نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ ہندوستان صرف ایک ملک ہی نہیں بلکہ اپنے تنوع اور وسعت کے لحاظ سے ایک ذیلی براعظم بھی ہے اور آئرستان محض ایک محدود ملک ہے۔ اس میں ایک جمعیت ہے ایک یک رنگی ہے۔

میر تقی، غالب اور اقبال ایسے عظیم شعرا کے مطالعے کے لئے اس بات کی قطعی ضرورت نہیں ہے کہ ہم ان شاعروں کے سوانح سے واقف ہوں۔ اور اُن کے حالات زندگی سے ان کی شخصیت کے بارے میں تصور قائم کر سکیں۔ کیونکہ ان کا کلام ہی ان کی شخصیت اور انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے لیکن انشا، داغ اور ایسے دوسرے شعرا کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم اُن کے واقعات حیات کو پہلے جان لیں نہ صرف اُن کے ذاتی حالات بلکہ ان کے زمانے کے حالات جاننا بھی ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا کلام ان کے ماحول اور حالات زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

طامس مور بھی کوئی بڑا شاعر نہ تھا۔ اس لئے اس کے کلام کے مطالعے سے بیشتر اس کے حالات جاننا ضروری ہے۔ اس کے سوانح حاصل کرنے میں ہمیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا کیونکہ انہیں قعر گمنامی سے بچانے کے لئے اس کا اپنا لکھا ہوا روزنامچہ موجود ہے۔ اس روزنامچے کے مطالعے سے ہمیں شاعر کا کوئی خاص شاعرانہ "تصور" نہیں حاصل ہوتا۔ اس کی شخصیت عام ہی رہتی ہے۔ اس کے باوجود بہت کم شاعر ایسے گذرے ہیں جنہیں مور کی سی آسانی کے ساتھ آغاز شاعری میں ہی ایسی قبولیت اور شہرت حاصل ہو گئی ہو خصوصاً اس بات کے مدنظر کہ مور کو ابتدا میں کامیاب زندگی کے راستے میں رکاوٹیں بھی حائل ہوئیں۔

طامس مور ڈبلن کے ایک معمولی دکاندار کا بیٹا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جماعت بندی، ذات پات یا فرقہ پرستی یورپ میں اپنی پوری شدت کے ساتھ رائج تھی۔ طامس مور عیسائیت کے کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور اُس زمانے میں کیتھولک ہونے کے معنی گویا برادری بلکہ ایک طرح سے انسانیت سے خارج ہونے کے تھے۔ کیتھولک ہونے کی وجہ ہی سے مور ڈبلن کے ٹری نیٹی کالج میں دوسرے طلبا کے ساتھ علمی امتیاز حاصل کرنے کے لئے مقابلے میں شریک نہ ہو سکا۔ چنانچہ وہاں سے ہٹ کر وہ لندن کی دنیا میں اپنی قابلیت، اپنی حیات انگیز ذہانت اور اپنی خوش طبعی کو لئے ہوئے داخل ہوا۔ اس وقت تک اُسے ادبی لحاظ سے کوئی درجہ حاصل نہ ہوا تھا۔ یہاں آ کر اس نے انیکری اون کی نظموں کے ترجمے شائع کئے۔ ان نظموں سے صرف اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ مور نظم نگاری کی خاصی اہلیت رکھتا ہے نیز ایک لذیذ تخیل اور کسی حد تک عالمانہ استعداد کا مالک ہے۔ ان نظموں کے علاوہ اُس نے یونان کے چند شاعروں کی نظموں کے بھی ترجمے کئے۔ ان میں سے دو نظموں کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اب تک نہیں آئی وہ کیوں؟

اب تک نہیں آئی یہاں، اب تک نہیں آئی وہ کیوں !
کب تک رہوں میں منتظر، کب تک یونہی بیٹھا رہوں؟

دو بار اس گھر کا دیا، میں نے جلایا، بجھ گیا !
آخر چراغِ عمر بھی اک دن یونہی بجھ جائے گا !
جانے کہاں ہے اس گھڑی؟ جانے کہاں ہو کس کے گھر؟
ہوگا نہ اس کے دل پہ بھی کب تک مرے دل کا اثر!
اب تک نہیں آئی وہ کیوں! اب تک کہاں ہے کس جگہ؟
اب تک کہاں ہے، کس جگہ؟

دو بار اس گھر کا دیا میں نے جلایا بجھ گیا !
اس کی محبت کا دیا بھی اس طرح کیا بجھ گیا!
لیکن مجھے چین آئے کیوں؟ لیکن چراغِ دل مرا ،
اس میں نہ ہوگی کچھ کمی! یہ یوں ہی جلتا جائے گا !
یہ یوں ہی جلتا جائے گا ـــــ

افسوس! اُس نے کس قدر کھائی میرے سر کی قسم!
کہتی رہی وہ مجھ سے یہ آؤں گی میں، کرنا نہ غم!
لیکن جو ہو یوں بے وفا اس کی قسم کا اعتبار ؟
اس کی بلا سے میرا دل اس کے لئے ہو بے قرار !
کیا فکر اُسے! بیٹھا رہوں میں شام سے تا بہ سحر !
مغرور اور خود کام کو کیسا خطر؟ کس دل کا ڈر ؟
کیسا خطر؟ کس دل کا ڈر؟

ـــــ ۲ ـــــ

جس طرح شبنم خموشی میں گرے،
گرتے ہیں آنسو مرے تیرے لئے!
جس طرح ماضی میں تھی، ہے آج بھی
یاد ہی آرامِ جاں میرے لئے!

مجھ پہ طاری ہے طلسمِ جاوداں
تو ہمیشہ ہے خیالوں میں مرے!
نقش ہے دل پر وہ منظر آج بھی،
جیسے پہلی بار دیکھا تھا تجھے!
تلخ شیرینی مرے جذبات کی،
وجہِ دردِ مستقل مجھ کو ہوئی!
جیسے تو آئی اچانک، کیوں نہ یوں
زندگی سے دور تر بھی ہو گئی !

ـــــــــــ

ان ترجموں سے بھی ایک بات ظاہر ہے۔ طامس مور کو ان میں محبت کی شدت، اور ان کا ذاتی لب و لہجہ پسند آیا اور اس کی اپنی طبعزاد نظموں میں بھی یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔

طامس مور جس وقت لندن میں پہنچا تو اس کی عمر بیس سال کی تھی۔ مور ہی کی قابلیت کے اور کئی نوجوان بھی شاعری کو ذریعۂ شہرت بنا کر بڑے شہروں میں پہنچے لیکن کامیابی کی منزل تک بار نہ پا سکے مگر مور کی قسمت اچھی تھی۔ سب سے بڑی خوش نصیبی تو یہی تھی کہ اُسے لارڈ موئیرا سا مربی مل گیا جو ہر طرح سے اس کی امداد کو تیار تھا۔ یہ مانا کہ اس قسم کے مربی کی مدد سے ادبی حلقوں میں کوئی امتیاز حاصل نہ ہو سکتا تھا لیکن سماجی زینے پر بلندی کے سلسلے میں ایک لارڈ کی حمایت انگلستان ایسے امراء پرست ملک میں زبردست معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ مور کی ایسی تعلیم و تربیت کے نوجوان کی حمایت کو کسی کا دل بھی چاہ سکتا تھا اور اُس کی خوش طبعی اور مرنجاں مرنج فطرت اس کے لئے ہر جگہ دوست پیدا کر سکتی تھی۔ لندن کی سماج کے فیشن پرست طبقے میں مور کو بہت قبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک ایسا نغمہ ساز تھا جو اہم موضوعات کو بھی سلیقے سے ہلکا پھلکا سا بنا دیتا تھا۔ اونچی سوسائٹی کی خواتین کے البموں میں جذباتی، عام فہم اور سیدھے سادے اشعار مشغلے کے طور پر لکھ سکتا تھا۔ اور گاہے ماہے ایک اچھا سا گیت لکھ کر خود ہی اُسے گا بھی سکتا تھا۔ لیکن وقتاً فوقتاً اس قسم کی نظم نگاری سے پیٹ تو بھر نہیں سکتا، زندگی کے گذارے کے لئے کسی نہ کسی ذریعے کی ضرورت لازمی تھی۔ چنانچہ روزگار کے حصول میں طامس مور انگلستان کے بحری محکمے میں رجسٹرار کی حیثیت سے امریکہ چلا گیا۔ لندن کی سوسائٹی بہت بے وفا ہے۔ اس کی وہی مثل ہے کہ آنکھیں ہوئیں اوٹ اور

دل میں آیا کھوٹ۔ انیکری اُن کی نظموں کے مترجم کو آخر کب تک یاد رکھتی۔ دو دن۔ اور آتنا نہیں تو ایک دن اور۔ لیکن مور بھی لندن کو چھوڑ کر امریکہ کی نئی سرزمین میں پہنچ کر اپنی حاصل کی ہوئی قبولیت کو قائم رکھنے سے غافل نہ تھا۔ اس نے امریکہ سے اپنا دوسرا مجموعہ لندن روانہ کر دیا۔ یہ نظمیں سنجیدہ تھیں، ان میں ایک گداز، ایک نرمی اور نزاکت اور لذت و کیف تھا بلکہ ایک طرح سے ان نظموں کے رنگ و بو سے مور کی آیندہ ظاہر ہونے والی دو لمبی نظموں "لالہ رخ" اور "فرشتوں کا عشق" کی پیش گوئی ہوتی تھی۔ مور کے قارئین جو اس کی ابتدائی نظموں کی بنا پر ہی اُسے محبوب بنائے ہوئے تھے۔ ان نظموں سے اُس کے اور بھی معتقد ہو گئے۔

اس مجموعہ نظم کی اشاعت مور کی زندگی میں ایک اہمیت رکھتی ہے۔ جیفری نے ایک مجلّے میں مور کے کلام پر تنقید کی۔ لیکن شاعری کی بجائے شاعر کی اخلاقی حیثیت پر سخت اعتراض کئے۔ مور اس حرکت سے قدرتاً مشتعل ہوا اور اس نے جیفری کو دعوت مبازرت دے دی۔ شاعر اور نقاد اس مبازرت کے لئے ایک دوسرے سے ملے بھی لیکن پولیس کے افسروں کی مداخلت نے کسی قسم کا خون خرابہ نہ ہونے دیا۔ بہرصورت اس قصے کی تشہیر ہوتی رہی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مور نے ایک دشمن کی جان لینے کے بجائے دو آدمیوں کو اپنا دوست بنا لیا۔ جیفری اور مور میں صلح صفائی کرا دی گئی اور آخر ایک گہری دوستی قائم ہو گئی۔ اس واقعے کے کچھ عرصے کے بعد بائرن نے اس دعوتِ مبازرت کے متعلق کوئی مذاق کیا اور مور نے برانگیختہ ہو کر بائرن کو بھی دعوت مقابلہ دے دی لیکن بعض لوگوں نے بیچ میں پڑ کر معاملے کو ناگوار صورت اختیار کرنے سے بچا لیا اور بائرن اور مور میں ایک گہری اور پائیدار رفاقت کا بندھن پڑ گیا۔ اس واقعے سے مور کی مرنجاں مرنج طبیعت پر اچھی روشنی پڑتی ہے وہ گویا لڑائی جھگڑوں سے بھی اپنے دوستوں میں اضافہ کر لیا کرتا تھا۔

امریکہ میں تصنیف کی ہوئی نظمیں گویا شہرت کے پہلے زینے پر لانے والی تھیں۔ بائرن کی دوستی کے ساتھ ہی ساتھ اس کی حقیقی کامیابی کا زمانہ شروع ہو گیا۔

وہ نظمیں جنہوں نے مور کو بام شہرت پر پہنچایا (لالہ رُخ اور آئرستانی نغمے) ان کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ دونوں ناشر کی فرمائش پر لکھی گئی تھیں۔ آئرستانی نغموں کے الفاظ یا بول مور کو قومی دھنوں کے مطابق لکھنے تھے۔ اس کارگذاری کا نتیجہ اچھا نکلا، ناشروں کا اندازہ غلط نہ تھا۔ ان گیتوں کو بے حد قبولیت حاصل ہوئی اور یہ ملک کے اطراف و جوانب میں گائے گئے۔ مور کے باقی کلام کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ان گیتوں کے متعلق ایک بات ضرور کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ ابھی کافی عرصے تک یہ گیت کم سے کم آئرستان میں غیر فانی رہیں گے۔

ان میں سے دو گیتوں کے ترجمے ذیل میں درج ہیں۔ ترجمے میں اسمائے معرفہ کی تبدیلی ہندوستانی ذہن کے لئے رومان انگیزی کی بنا پر کی گئی ہے،

کسوٹی

شاما کی آنکھوں کے اندر جیسا ہے اُجیالا،
کوئی نہ جانے کس کے کارن ایسا ہے اُجیالا!
دائیں بائیں جب شاما اپنے نیناں بان چلائے،
کوئی نہ جانے اُس کے دھیان میں کونسا پریمی آئے!

ہیرا کے نینوں کو پریمی جب دیکھے رس پائے،
ان کی نیچی پلکیں جن کو لاج جھکاتی جائے!
بھولے سے ہوں اونچی نظریں جیسے بجلی چمکے،
اک پل کے چمکارے ہی سے پریمی کا من دھڑکے!
جگ میں ایسے نیناں لاکھوں جن میں ہے اُجیالا،
لیکن پریم کا میٹھا، موہن اِن میں ہے اجیالا!

شاما کا ملبوس سنہرا، جیسے پیلا سونا،
تن کے ساتھ لگا، مانو، جل پریوں نے پہنایا!
سندرتا کے سب گُن چھپ گئے، دھیان سے تو دیکھو!
روپ کی شوبھا ماند ہوئی، سنگار بھی کام نہ آیا!

ہیرا کا ملبوس نرالا، ہر اک بات نرالی،
لہرائے، بل کھائے جیسے پون ہو پربت والی!
سندرتا کے سب گُن اپنا روپ انوپ دکھائیں،
تن من دونوں آزادی میں پریم کے تیر چلائیں!
سیدھی سادی، بھولی بھالی موہن ہیرا میری!

پیراہن کا روپ بڑھے، ایسی سندرتا تیری !

شاما جب دو چار میں بیٹھے، ایسی بات بنائے،
جو سُن لے تکتا رہ جائے، تکتا ہی رہ جائے !
کوئی نہ جانے سوچ سمجھ کر گھاؤ لگائیں باتیں ؛
رنگ جمانے کو ہی یا بجلی چمکائیں باتیں !

میرا کا من ہے یا ہے اک پریم دیا کا مندر،
سکھ آنند کی مورت اس میں، چین ہے اس کے اندر!
سُکھ کی سیج پہ بھی ہے اتنی بات تو روکھی پھیکی،
بوجھ سے دب کر ہوتی ہے جو حالت اک پتّی کی!
باتوں سے، اتنا تو مانا، سب جگ چنچل جانے،
پریم دیا کے رس کو جو پائے، بس وہ پہچانے !

زود پشیمانی

وقت جو کھو دیا محبت میں،
دور سے دیکھتے ہیں، حسرت میں ؛
نورِ جاں بخش چشمِ میگوں کا،
تھا سبب میرے دل کے شگفتوں کا !
کیف باقی نہیں اُس افسوں کا،
بس یہی غم ہے تیرے مجنوں کا !
اب ہے ہمدم خیال کا سایا ؛
عقل نے لاکھ بار سمجھایا ؛
میں نے اک بار بھی نہیں مانی ؛
اور کھلائے فریبِ نسوانی !
اُس کے ملبوس تھے، کتابیں تھیں،
سلوٹوں میں کئی شرابیں تھیں !
وقت کھونا رہا حماقت میں،
دور سے دیکھتے ہیں، حسرت میں !
دل تھا میرا ڈرا ہوا آہو،
جس کی آنکھوں سے بہتے تھے آنسو !

بُوئے نافہ فضا میں بہتی تھی،
ہوش معدوم کر کے رہتی تھی !
مجھ پہ جس وقت وہ نگہہ کرتی،
کیسی حالت مری ہُوا کرتی !
پھر بھی دوری میں کہتا تھا اس سے،
یہ جنوں اور، ــــ اور، ــــ اور بڑھے !

کیا ہوئیں وہ حماقتیں معدوم ؟
اب ہے خود دار یہ دلِ محروم ؟
پھول وہ زرد ہو چکا ہے، کیا؟
جوش وہ سرد ہو چکا ہے، کیا؟
اب برانگیختہ نہیں کرتیں ؟
دل میں وحشت کو اب نہیں بھرتیں !
چشمِ میگوں کا وقت بیت گیا ؟
زہرِ افسوں کا وقت بیت گیا ؟

آہ ! کیسے کہوں کہ ہاں، بیتا !
وہ زمانہ ابھی کہاں بیتا؟!
اب بھی جب مجھ کو یاد آتی ہیں،
جوش و وحشت کو ساتھ لاتی ہیں،
عقل کی ایک بھی نہیں چلتی،
دل سے بہتی ہے خون کی ندّی !
فرق اتنا ہے پہلی باتوں میں
حسن و نکہت کی مست راتوں میں،
وہ مناظر تھے پہلے آنکھوں میں،
اور اب ہیں فقط خیالوں میں !

یہ گیت دلچسپ ہیں، دلکش ہیں، ان میں رس ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ صرف محبت کے عام نغمے ہی ہیں۔ ان میں کوئی غیر معمولی ادبی خصوصیات موجود نہیں ہیں اور نہ ان کی قبولیت اور بقا کسی ادبی بنا پر ہے۔ ان کی موسیقی، ان کا نغماتی حُسن، ان کی مٹھاس ہی ان کی حیات

کی وجہ ہے۔ اور ان کا موضوعِ عشق و محبت بھی باعثِ بقا ہے۔

مور کے کلام میں خالص آئرستانی روح موجود نہیں ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اُسے دوسرے ملکوں کے مذاق سے علیحدہ کردے خصوصاً "آئرستانی نغمے" اس روحِ ادب سے یکسر عاری ہیں جسے خالص آئرستانی کہا جاتا ہے اور جس میں ابہام، تخیل پرستی اور الجھے ہوئے تصورات کو بہت دخل ہوتا ہے۔ ان نغموں میں اور مور کی شاعری میں عموماً ہر بات صاف، سیدھی سادی، یقینی اور واضح ہوتی ہے۔ اس میں اشارے اور کنائے کو بالکل بار نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مور کے نغموں میں ہر آئرستانی کے لئے لذت و موسیقی موجود ہے اور یوں اِن گیتوں سے قومی روح کا اظہار ہوتا ہے۔ حقیقتاً مور کا اندازِ نظر بعد کے آئرستانی شعرائے جدید کا پیچیدہ اندازِ نظر نہیں ہے۔ ہاں اِن میں آئرستانی خوش مذاقی، نرم مزاجی، طبیعت کا گداز، حسنِ ادا اور دلکش تصور موجود ہیں۔

مور کو جو قبولیت اس کے ہم وطنوں میں حاصل ہوئی وہ اس کا مستحق تھا۔ کم از کم اس نے قومی روح کے لئے ذریعۂ اظہار و ترجمانی مہیا کیا۔ اس کے کلام کی روایتی خصوصیات ہی لوگوں کو اپیل کرتی تھیں اور وہ انہیں پورے طور پر سمجھتے تھے اور بہت عرصے تک اس کلام کی پیروی بھی کسی نہ کسی رنگ میں ہوتی ہی رہی۔ مور کی قبولیت اور شہرت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ تمام انگریزی داں طبقہ اس کے "آئرستانی نغموں" کا مدح خواں تھا۔ انگلستان کے مشہور رومانوی شاعر بائرن نے طامس مور کے کئی آئرستانی نغموں کو آئرستان کی تمام قدیم رزمیہ نظموں سے زیادہ رتبہ دیا ہے۔

مور نے جذبۂ حبِّ وطن کو بھی جس رنگ سے اپنے نغموں میں ظاہر کیا ہے اُسے دیکھ کر مخالفین کے دلوں میں بھی کسی طرح کے ناگوار یا ناپسندیدہ تاثرات نہیں ہوتے۔ مور کی پیدائش اس وقت ہوئی جب آئرستان میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا اور حب الوطنی کا جوش رگوں میں طاری تھا لیکن اس سلسلے میں اُس نے کبھی عملی حصہ لے کر اپنی زندگی کی عام روش اور بہاؤ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ مور فطری طور پر محض شاعر تھا۔ کوئی پیغامبر یا باغی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی انتخاب کا موقعہ آیا اس نے انقلاب پسندی پر میانہ روی کو ترجیح دی۔ لیکن قومی حیثیت سے آئرستان کے لئے اُس کے دل میں تخیل پرستی کا ایک احساس ضرور تھا۔ وہ اپنے ملک میں خوشحالی اور آزادی کا خواہاں تھا۔ اس کے دل میں انگلستان کے لئے بھی ایک ایسی جگہ تھی کہ وہ کھلم کھلا اس کے خلاف عملی حصہ نہیں لے سکتا تھا۔

۱۸۳۵ء تک "آئرستانی نغموں" کی اشاعت لگاتار جاری رہی لیکن پہلی اشاعت کے چند ہی سال بعد سے طامس مور ایک اور اہم کام میں مشغول ہو گیا۔

آج کل مغرب میں نظرِ انتقاد پہلے سے کہیں زیادہ گہری اور سخت ہو چکی ہے اور ہم کسی مغربی ناشر سے اس بات کی توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ کسی منظوم مشرقی داستان کے لئے تین ہزار پاؤنڈ کا گرانقدر معاوضہ دینا منظور کرلے گا۔ لیکن گذشتہ صدی کے اوائل کی اور حالت تھی۔ جب لوگ اقتصادی اور جذباتی لحاظ سے کہیں زیادہ امیر تھے ۱۸۱۲ء میں لانگ مین کی مشہور ناشر فرم نے مور کے سامنے "لالہ رُخ" کے لئے یہی معاوضہ پیش کیا۔ اور ناشر پھر بھی گھاٹے میں نہ رہے۔ "لالہ رُخ" کی مثنوی کو اشاعت ہوتے ہی مکمل کامیابی حاصل ہوئی۔ گویا ناشر نے پبلک کے مذاق کا اندازہ بالکل صحیح کیا تھا۔ یورپ کی بہت سی زبانوں میں اس مثنوی کا ترجمہ کیا گیا (اور اردو میں بھی اس کا نثری ترجمہ لطیف الدین احمد کے قلم سے ہو چکا ہے) لیکن آج اور زمانہ ہے۔ آج مغرب کو فرصت نہیں اور نہ ہی مذاق ہے کہ وہ اس قسم کی مشرقی داستانِ منظوم کی موسیقی میں خود کو کھو دے۔ آج کل کے نقادوں کی نظر میں "لالہ رخ" کا درجہ معمولی ہے اور اس موسیقانہ رومان کی دلکشی اور خوش اسلوبی کے باوجود اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی ۱۸۲۰ء کی جذبات پرست اور رومان نواز پبلک ہی ایسی ادبی تخلیق کی صحیح قدردان ہو سکتی تھی۔ اس مثنوی کی قبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ بائرن اور شیلے ایسے شعرا کے کلام میں ایک ایسا باغیانہ عنصر ہوتا ہے جو عوام کو ناگوار گذرتا ہے لیکن مور کے کلام (اور اس مثنوی) میں اُس باغیانہ عنصر کا فقدان ہے جو اپنی بے باکی کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں میں غیر مستحسن ہو۔ یہ مثنوی والدین کسی قسم کی جھجک کے بغیر اپنی نوجوان اولاد کے مطالعہ کے لئے پیش کر سکتے تھے۔ یہ مانا کہ اس میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جو احساسات کو عشق و محبت کے جذبات سے آشنا کرتے ہیں اور جن میں امنگوں کو بھڑکانے کا مواد موجود ہے۔ لیکن بہ ہیئتِ مجموعی اس کے کسی ٹکڑے پر بھی اخلاقی لحاظ سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لذیذ تصورات کو اخلاقیات کا آلہ کار کبھی نہیں بنایا گیا لیکن یہ مثنوی اس لحاظ سے پہلا اقدام تھا۔

مثنوی "لالہ رُخ" کے بعد مور کی اہم تخلیق "فرشتوں کا عشق" ہے۔ اس میں بھی وہی خصوصیات نمایاں ہیں جو اس کی پیشرو مثنوی میں تھیں لیکن بعض اشخاص نے اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا کہ ایک رنگین نظم میں مذہبی موضوع کو کیوں لایا گیا۔ لیکن ایسے بے بنیاد اعتراضات کے باوجود اس نظم کو بھی بہت قبولیت حاصل ہوئی۔

اس کے بعد مور نے ڈرامائی پیشکش کے لئے چند گیت لکھے جنہیں بیانیہ ٹکڑوں کے ذریعے ایک رشتے میں منسلک کر دیا۔ اس کا عنوان اُس نے "یونانی شامیں" رکھا۔ یہ ہلکے پھلکے گیتوں کا ایک مختصر مجموعہ تھا۔ جنہیں پہلی شام اور دوسری شام کے تحت درج کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک گیت کا ترجمہ (عبرت) اس مضمون کے آخر میں دیکھئے اور ایک گیت ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

گیت

میں روتا ہوں مری جاں! آہ، میں آنسو بہاتا ہوں،
اور ایسے لمبے، سونے دن کا ہر لمحہ گذرتا ہے!
جب آئے رات، پھر بھی ہے وہی کام آہ و زاری کا،
نہ تاریکی میں راحت ہے، نہ راحت ہے اُجالے میں!

تسلی کوئی بھی باقی نہیں ہے، بس تری یادیں،
خرابے میں مرے برباد دل کے شور کرتی ہیں!
اور اپنی وحشیانہ چال سے مجھ کو ڈراتی ہیں!

مرے پژمردہ دل میں کچھ نہیں، بے جان ہے یکسر!
فقط اک بازگشتِ عہدِ رفتہ قیدِ ہستی میں
تڑپتی ہے مری جاں! اور میں آنسو بہاتا ہوں!

ہر شخص کی زندگی میں جوانی آتی ہے، اور جوانی میں ہر شخص کے جذبات مچلتے ہیں اور کوئی نہ کوئی موہنی مورت اپنی فرقت کے دکھ کی لذت سے دل کو آشنا کر دیتی ہے۔ یہ گیت بھی فراق کا گیت ہے۔ اس میں بھی فرقت کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اور اس لئے یہ ہر شخص کو اپنے تجربے کے مطابق پسند آسکتا ہے اور مور کی تمام شاعری کا یہی حال ہے۔ اس کا ہر مصرعہ اکثریت کے احساسات اور جذبات کا ہم آہنگ اور ترجمان ہوتا ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ مور کی اس جذبات پرستی کی بنیاد خلوص اور حقیقت پر نہیں ہے۔ جس طرح مور کی احساسات سے لذت گیر ہونے کی خصوصیت اس کے کردار کا لازمہ اور حقیقت پر مبنی تھی۔ اسی طرح اُس کے کلام کی ہر خصوصیت حقیقی ہے اور اس کی بنیاد خلوص پر ہے۔

اس کے بعد کا مجموعہ "گیت، مثنویاں اور متفرق نظمیں" تھا۔ یہ بھی مور کے عام معیار کے مطابق تھا۔ اس مجموعے میں سے چند گیت اور نظمیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

جوانی لازمًا خیالات و جذبات کا ایک مرکز مقرر کر دیتی ہے، لیکن یہ مرکز تخیل پرستی اور محبت کے دھندلکے میں بعض اوقات عجیب صورتیں اختیار کر جاتا ہے۔

ایک دوشیزہ مجھے محبوب ہے
جس کو اوروں نے کبھی دیکھا نہیں!
نور میں آتی ہے، سائے میں کبھی،
نور میں، سائے میں، دونوں میں حسیں!
اس کو اکثر دیکھتا ہوں خواب میں
کان میں کرتی ہے کچھ سرگوشیاں!
لفظ وہ گر میں کسی سے جا کہوں،
آہ اُس کے لب پہ ہوتی ہے عیاں!
جان سکتے ہو اگر تو جان لو!
میرے خوابوں کی پری پہچان لو!
چھا رہی ہوں دل پہ جب تاریکیاں
اُس کی آنکھیں دیکھتا ہوں خندہ زن!
یاد آجاتی ہیں وہ سرگوشیاں،
گونج میں جن کی میں ہوتا ہوں مگن!
رنج و غم پھر پاس آتے ہی نہیں!
اور مرے دل کو ستاتے ہی نہیں!
اُس کی آنکھوں کا اجالا پھیل کر،
آنسوؤں میں نور بھرتا ہے مرے!
جب اذیت کوش ہو زخمی جگر
روشن اُن لمحوں کو کرتا ہے مرے!

جان سکتے ہو اگر تو جان لو،
میرے خوابوں کی پری پہچان لو!

محبت کا ابتدائی زمانہ گذر چکا ہے تجسس کی پہلی دلکشی مٹ چکی ہے اور ایک لمحے میں جب کمزوری اور تھکن ذراسی دیر کے لئے بے حال سا کردیتے ہیں . . . .

ابھی بھی تو ہے گریزاں، میں اشتیاق سے لئے،
حسین خیال!— یہ بے فائدہ تگ و دو ہے!
تصوّرات ہمیشہ ہیں اک تعاقب میں،
تری طرف سے وہی سرد، دُور کن رَد ہے!
کشادہ بازوؤں میں میرے آکے جاتی ہے،
مجھے فریبِ تصوّر سے کیوں ستاتی ہے؟
نظر میں آنے سے پہلے ہی، پھر وہی گہری
ہویدا غم کی ہے بے باک چشم تاریکی!
یہ دیکھتا ہوں کہ جس درجہ نور افشاں ہے
بس اتنی میرے تصور سے تو گریزاں ہے!
گھٹا میں برق کا جلوہ ہو جیسے اک لمحہ،
بس ایسے دید بھی تیری ہے مختصر نغمہ!

جوئندہ یابندہ، جستجو آخر کسی نہ کسی ذریعے سے کامیاب ہوتی ہے اور فرقت کی جگہ خلوت کی نئی صورتِ حال سے دوچار ہو کر نئی الجھنوں کو سلجھانا پڑتا ہے۔

آج کا دن ہے ہمارا پیاری!
آج کا دن ہے ہمارے بس میں،
ہم نہ کھوئیں گے اسے یوں بیکار!

رنج و غم اور مسرت ہیں جہاں میں یکساں،
جو بھی ممکن ہو کسی سے اسے حاصل کرلے!
عمر میں غم کے لئے اور بھی ہے وقت بہت،
جب ہوں پژمردہ مسرت کی سہانی کلیاں،
چشم نم کرکے بہائیں گے ہم آنسو بھی یہاں!

شاخ دیروز پہ اُس دم گلِ راحت یکسر،
خار کی صورتِ قاتل میں نظر آئے گا!

کس لئے یونہی گنواتی ہو یہ شیریں لمحے؟
آج ہے تم پہ جوانی کی بہار!
اور میں بھی ہوں تمہارا طالب!
وقت، ایسا نہ ہو، کل ہم سے یہ باتیں لے لے
دن جوانی کے، جوانی کی یہ راتیں لے لے!
نغمۂ حسن تمہارا نہ مجھے کل بھائے!
اور یا عشق کا جذبہ ہی نہ دل میں آئے!

لیکن اس چرخِ ناہنجار نے ایسا کون ہے جسے مستقل طور پہ آرام سے رہنے دیا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اخلاص سے لبریز دل میں جذبۂ محبت ایک ہی مرکز پہ قائم اور غیر فانی رہے۔ وفا کی قسمیں۔ وعدہ و اقرار کا زمانہ ہے۔

دوام

محبوب ہو! ہاں لو سنو، گرچہ نہیں ہو تم مری،
پھر بھی مجھے جانِ جہاں حد سے سوا مرغوب ہو!
اور رشتۂ امید جو دھندلا تھا، اب معدوم ہے
طالب ہوں لیکن میں تمہارا، تم مری مطلوب ہو!
یہ دل تمہارا جس قدر بھی مجھ سے ہٹتا جائے گا
میری نگاہوں میں تمہارا حُسن بڑھتا جائے گا!
گر اور کی چاہت میں ہی سرشار ہو جاؤ گی تم،
پھر بھی دلِ ناکام میں شوق اپنا ہی پاؤ گی تم!
بے التفاتی جس گرہ کو کھول سکتی ہی نہیں،
کیا تم سمجھتی ہو کہ موت عقدہ کشا ہو جائے گی؟
ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، آئندہ عمروں میں نہیں،
اس دل کے اندر ہی، تمہاری یاد پھر لوٹ آئے گی!

ہم تم

نہ پوچھو مجھ سے کہ اب بھی ہے دل میں وہ جذبہ؟
مری نگاہوں نے سب راز کہہ دیا ہے تمہیں!

لبِ فسردہ نے چھیڑا تھا جو کبھی نغمہ ،
وہ آج تک ہے رواں روح کے تسلسل میں !
جو اشک چشمِ ملول و حزیں سے گرتے ہیں ،
وہ اک زبانِ خموشی میں بس یہ کہتے ہیں !
"تمہیں ہو آہ ! تمہیں ، آج تک سے مجھے مرغوب !"

شعاعِ ماہ سے کرنیں نگاہ کی اچھی ،
مسرتوں سے اذیت اس آہ کی اچھی !
اگر یہی ہے محبت تو سن لو ، اس دل میں ،
خیال ایک تمہارے ہی چھائے رہتے ہیں !
مسرتوں میں محبت کی آزمائش کیا ؟
غمِ فراق سے اس دل کو آزما لینا !
یہ دل تو تم کو کبھی بھول ہی نہیں سکتا ،
یہ اختیار نہیں ہے کہ تم بھلا دینا !

انجامِ محبت کیا ہے۔ غم! لیکن ایسا غم عشق کہ
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا۔

یکتائی

ایک ہی بار ہوئی اُن کی ملاقات ، مگر
ایک دن وہ کہ جوانی سے تھا شیریں یکسر !
وقت اور فرقتِ قاتل کے غمِ پیہم نے
لاکھ اس خوابِ جوانی کو مٹانا چاہا ؛
خواب کی آج بھی باقی ہے وہی تابانی ،
کسی طاقت سے بھی وہ حسن نہیں مٹ سکتا !

نت نئے دیس میں سورج کی شعاعیں دیکھیں ،
اجنبی رنگِ مسرت کی بھی کرنیں دیکھیں ،
لیکن ان دونوں نے پھر خواب نہ ویسا دیکھا !
بے بہا خوابِ جوانی کا جو اک بار آیا !

ایک ہی بار ہوئی اُن کی ملاقات ، اُن کے
قلب سرشارِ جواں سال مسرت بھی ہوئے !
آج بھی اُن کے دلوں میں ہے وہی کیفِ حسیں ،
جس نے اک بار کیا روح کو ان کی شیریں !

"اُس راستے پر چل کر جس میں دوچار بہت سخت مقام آتے ہیں"۔
آخر کار یاس اور قنوطیت یکسر دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔

الوداع ! آج سے رخصت دلِ زخمی ! تجھ کو !
آخر کار ترے عیش کا لمحہ آیا !
جلد آجائے گا منظر ترے ابدی گھر کا !
الوداع ! آج سے رخصت دلِ زخمی ! تجھ کو !

ایک لمحے کی اذیت اے دل !
مستقل درد سے کم تر ہوگی !
ایک لمحے کو گذر جانے دے ،
پھر نہ حالت تری ابتر ہوگی !
الوداع ، آج سے ، افسردہ ، شکستہ دل کو

درد اب ختم ہوا ، بیت گیا ، بیت گیا
چشمِ تر سے نہ بہے گا کبھی اب خونِ جگر ،
لائی ہے موت تری راحتِ ابدی کا پیام !
اب سے ہمدم ہے ترا ایک بہشتی آرام !

بحر کی موج کوئی جس طرح ساحل دیکھے ،
اور پژمردہ مسافر گُلِ منزل دیکھے ،
جلد آجائے گا منظر ترے ابدی گھر کا !
آخر کار ترے عیش کا لمحہ آیا ،
الوداع ! آج سے رخصت دلِ زخمی تجھ کو !
الوداع آج سے افسردہ ، شکستہ دل کو !

اور اس سلسلے میں سب سے آخر میں ایک خالص مشرقی گیت ہے جو انگریزی کی بجائے فارسی سے ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

حسن اور نغمہ

۱۔ گلستاں میں بلبلِ آشفتہ نے
گل سے اک نغمے میں یہ شکوہ کیا،
گیت میں رس ہے بہت مانا مگر۔
"گیت ہے بیکار سی بیکار شئے،
"گر نہ اس کو ساتھ حاصل ہو ترا!"

۲۔ اس طرح بس اس طرح گیتوں سے ہے
حسنِ نسوانی کی افزوں دلکشی!
اور یوں ہی حسن نسوانی سے ہے
نغمۂ شاعر میں نورِ سرمدی!

۳۔ سن کے شکوہ بلبلِ آشفتہ کا
گل نے پتّی کی زباں سے یوں کہا
پھول میں ہے دلکشی، مانا، مگر
پھول ہے بیکار سی بیکار شئے
"گیت گائے گا تو نہ گر اس حسن کا!"

۴۔ جس طرح انجم کا بکھرا قافلہ،
چرخ پر حرکت میں رہتا ہے سدا
اس طرح جب تک جہاں باقی رہے،
حسن و نغمہ میں ہم آہنگی رہے!

کچھ عرصہ بعد مور امریکہ میں اپنے مقرر کردہ نمایندے کی بے ایمانی کی وجہ سے قرض کے لئے گرفتاری کے خطرے سے بچاؤ کی خاطر پیرس کو فرار ہو گیا۔ اس زمانے میں بھی اس کی خوش طبعی اور ادبی کارگذاریاں جاری رہیں۔ ۱۸۲۲ء میں مور پیرس سے چھپتا چھپاتا انگلستان لوٹا۔ یہاں آکر بھی اس نے کچھ طنزیہ کلام لکھا اور اس کی بنا پر ٹائمز کا مستقل طنز نگار بن گیا۔ لیکن مور ایک اچھا طنز نگار نہ تھا۔ کیونکہ جذبات پرستی اس کا خاصہ تھا۔ وہ ایک بات کو ناپسند کر سکتا تھا، اُس پر ہنس سکتا تھا لیکن مستقل طور پر ناراض نہ رہ سکتا تھا۔

۱۸۱۵ء میں مور نے ایک اور مجموعۂ نظم شائع کیا جس کا عنوان "قومی دھنیں" تھا۔ اس میں یورپ کے مختلف ملکوں کی مقبول دھنوں کے مطابق گیت لکھے گئے تھے۔ اردو میں مور کی نظموں کے جو اچھے ترجمے نادر کاکوروی نے شائع کئے تھے ان میں بھی ایک نظم اسی سلسلے کی تھی۔ یہ روسی دھن پر تھی۔ اس ترجمے کی خوبی مجبور کرتی ہے کہ اسے ذیل میں درج کیا جائے۔

یادِ ماضی

اکثر شبِ تنہائی میں   کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں   بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی   اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر!

وہ بچپن اور وہ سادگی   وہ رونا اور ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے   وہ دل لگی وہ قہقہے
وہ عیش وہ مہر و وفا   وہ وعدہ اور وہ شکریہ
وہ لذتِ بزمِ طرب   یاد آتی ہیں ایک ایک سب
دل کا کنول جو روز و شب   رہتا شگفتہ تھا سو اب
اُس کا یہ ابتر حال ہے   اک سبزۂ پامال ہے
اک پھول کملایا ہوا   سوکھا ہوا بکھرا ہوا
روندا پڑا ہے خاک پر!

یوں ہی شبِ تنہائی میں   کچھ دیر پہلے نیند سے
بیتی ہوئی ناکامیاں   گذرے ہوئے دن رنج کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی   اور ڈالتے ہیں روشنی
ان حسرتوں کی قبر پر۔

جو آرزوئیں پہلے تھیں   پھر غم سے حسرت بن گئیں
غم دوستوں کے فوت کا   اُن کی جواناموت کا
لے، دیکھ، شیشے میں مرے   اُن حسرتوں کا خون ہے
جو گردشِ ایّام سے   یا قسمتِ ناکام سے
یا عیشِ غم انجام سے   مرگِ بتِ گلفام سے
سینے میں میرے مر گئیں   کس طرح پاؤں میں حزیں
قابو دلِ بے صبر پر؟

جب آہ! اُن احباب کو   میں یاد کر اٹھتا ہوں جو
یوں مجھ سے پہلے چل دیئے   جس طرح طائر باغ کے
یا جیسے پھول اور پتیاں   گر جائیں سب قبل از خزاں
اور خالی رہ جائے شجر!

اس وقت تنہائی مری   بن کر مجسم بے کسی
کر دیتی ہے پیشِ نظر   ہُو حق سا اک ویران گھر
برباد جس کو چھوڑ کر،
سب رہنے والے چل دیئے؟

ٹوٹے کواڑ اور کھڑکیاں   چھت کے ٹپکنے کے نشاں،
پرنالے ہیں روزن نہیں   یہ حال ہے آنگن نہیں،
پردے نہیں چلمن نہیں   اک شمع تک روشن نہیں،
وہ خانۂ خالی ہے دل   میرے سوا جس میں کبھی

جھانکے نہ بھولے سے کوئی   پوچھے نہ جس کو دیو بھی
اجڑا ہوا ویران گھر!
یوں ہی شبِ تنہائی میں   کچھ دیر پہلے نیند سے
بیتی ہوئی ناکامیاں   گذرے ہوئے دن رنج کے
بنتے ہیں شمعِ بے کسی   اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر! (نادر)

اس سلسلے میں "قومی دھنوں" پر لکھی ہوئی چند اور چیزیں بھی حاضر ہیں۔ ان میں بھی محبت کی شاعری کا وہی تغزل سے لبریز ذاتی لہجہ موجود ہے جو مور کا خاص امتیاز ہے۔

۱۔ ہو گیا قسمت کا میری فیصلہ،
تو نہ اب غمگیں حقیقت کو چھپا!
وعدۂ فردا شکستہ ہو چکا،
دل نے تیرے رنگ بدلا ہے نیا!
تجھ کو اب مجھ سے محبت ہی نہیں،
اب ترے دل میں وہ چاہت ہی نہیں!

۲۔ ملتفت گرچہ نگاہیں ہیں تری،
وہ چمک اب عہدِ رفتہ کی نہیں!
اب بھی حاصل ہے ہم آغوشی وہی
لیکن اس کی کیفیت پہلی نہیں!

۳۔ آج تک میں خواب تھا دیکھا کیا،
جذبِ ماضی کا نہیں باقی ترا!
روزِ روشن کی طرح ظاہر ہوا!
دل نے تیرے رنگ بدلا ہے نیا!

۴۔ پھر وہی لے آ مسرت، رنگ و بو،
جن سے کامِ جاں مرا تازہ ہوا!
اور ملا لے پھر اسی ہستی کو تو،
جس نے ماضی میں مجھے چاہا کیا!

جب رات آئے

جب رات آئے،
تاروں کی کرنیں   ساتھ اپنے لائے،
اور شادمانی   دنیا پہ چھائے
کٹیا پہ میری
آتی ہے پیاری   خوابوں کی دیوی!
آنکھیں رسیلی
وحشت بھری ہیں!   دلہن کی نگاہیں،
بس ایک پل میں   لوگوں کے دل کو،
اپنا بنائیں!)
لب جیسے پھانکیں   میٹھے پھلوں کی،
چاہت کے لاکھوں   بھیدوں کے راگی
ملبوس اس کے!
کیا جانتے ہو،   ہے کون ہستی؟
بولو، بتاؤ،   نام اُس کا لاؤ۔
اپنی زباں پر!
گر اس کو جانو،   مجھ کو بتاؤ،
بدلے میں اُس کے
بوسے ملیں گے!
جس جس جگہ پر   رکھتی ہے پاؤں،
پھولوں کے جھرمٹ   ملتے ہیں واں پر!
ایسے ہے آتی۔
جیسے گھٹا میں   بجلی چمکتی!
گیتوں کو میرے
شعلے بنا کر،   ہوتی ہے اوجھل،
آنکھوں سے میری!
کیا جانتے ہو   ہے کون ہستی؟
گر اُس کو بوجھو،   مجھ کو بتاؤ،
بدلے میں اُس کے
بوسے ملیں گے!

سب سے اچھی، سب سے میٹھی موہنی!
میری محبوب، اولیں و آخری!
جب یہ دل، بے التفاتی جس پہ ہے،
دور ہو جائے گا اپنی زیست سے،
کیا کوئی اک مہرباں، اچھا خیال۔
آئے گا اُس کا، جسے تیرا خیال
زندگی میں بھی ہمیشہ ہی رہا!
آخری دم بھی اسی کے ساتھ تھا!

یوں اگر ہو خوش نصیبی سے کبھی،

اور ہوں آنکھیں تری نمناک سی ،
ہاں، چھلکنے ہی نہ دینا یہ سبو ،
دل میں لانا مت پشیمانی کو تو !
اک چتا پہ آکے کہہ دینا مری ،
جل گیا وہ دل جو میرا تھا کبھی !

تواتر

یہ نہ کہنا ، زندگی مُرجھا گئی ،
اور دن شبیں امیدوں کا گیا !
جب تک اس دل میں محبت ہے تری،
یہ چراغِ حُسن جلتا جائے گا !

یہ نہ کہنا حُسن افسانہ ہوا ،
(گرچہ پہلی سی وہ رعنائی نہیں!)
مستقل، دلکش ترا نہ عشق کا ،
تجھ کو رکھے گا یونہی دائم حسیں !

حُسنِ رفتہ کا ترے اک شائبہ،
مجھ کو اوروں سے کہیں محبوب ہے !
ایک سے بڑھ کر اک آئے ساحرہ ،
تو ہمیشہ کو مری مطلوب ہے !

~~~~~~

زندگی کے چند آخری سالوں تک مور کی زندگی جس قدر خوشگوار گذری وہ قابلِ رشک ہے۔ اُسے اپنے بچوں کی موت کا احساس بھی تھا اور اپنی ذہانت کا قدرتی زوال دیکھنے کے باوجود اس کی سیرت ابھی پہلے زندہ دل اوصاف کا مجموعہ رہی۔ گویا اُس نے عمر بھر زندگی کے نور اور اجالے سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی پہنچایا۔ گھریلو مسرتیں اس کے لئے سب سے زیادہ قابلِ قدر تھیں اور بہت عرصے تک اُسے یہ مسرتیں حاصل بھی رہیں اور وہ گھریلو اور سماجی زندگی کی تمام عشرتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کی شادی خوشگوار اور اس کی طبیعت کے عین مطابق تھی۔ وہ دوسروں کو خوش رکھنے اور آپ خوش رہنے کے لئے ہی پیدا ہوا تھا۔ جہاں گیا سراہا گیا، جہاں بیٹھا محبوب بنا۔ یہ مانا کہ اقتصادی وجوہ اُسے ہمیشہ مستقل طور پر محنت کرنے پر مجبور کرتے رہے۔ لیکن ہمیشہ اُسے نظم و نثر کا ادبی کام کرنے کو ملتا رہا جس سے اس کا خاطر خواہ گذارہ ہوتا رہا۔

اب ہم اس کی ایک دو اور نظمیں درج کرتے ہیں۔

تنوّع

نگس پہ قوتِ آوارگی کا غلبہ ہے ،
ہمیشہ ایک گُل تو ہی اُس کا مسکن ہے !
یہ تازگی کا عجب دل پسند نغمہ ہے ،
کہ جس کا بحرِ تنوّع ہی ایک مخزن ہے!
ذرا خیال کرو چشم واکو ساتھ لئے ،
بدلتے رہتے ہیں منظر جہاں میں قدرت کے،
تغیّرات زمانے کے اور موسم کے ،
کبھی ہیں عیش و مسرت کے دن کبھی غم کے !
اک انقلاب ہی سلطان کائنات کا ہے!
غلام بن کے رہے ،کام یہ ثبات کا ہے!
مجھے بھی ، مجھ کو بھی ہر دو جہان کے والی!
یونہی زمانے کی آزادیوں میں رہنے دے !
مجھے تنوّع کے اک موجۂ پریشاں کی
کہانی ، جذبۂ آزاد کو سنانے دے !
گر وہ راحتِ جاں، آہ میری محبوبہ،
جہانِ رنگ و تبسم بھی ہیچ ہے مجھ کو !
اُسی کا بھلا تنوع کا مجھ کو ہے نغمہ،
نہیں ہے بڑھ کے کبھی اس سے کوئی شے مجھ کو!

~~~~~~

اور اب ایک مثنوی یا رومان ملاحظہ کیجئے، اس میں پرتھوی راج چوہان اور سنجوگتا ہماری طرف سے ہیں۔

ایک گیت کی کہانی

جو کبھی آتی ہیں، ہاں بس ایک بار،
ایسی شب ہائے منوّر میں سے ایک ،
اس فضائے نیلگوں پہ چھائی تھی،

نغمۂ عشرت تھا جس کا ہم کنار!

آتی کانوں میں دریچے سے مرے
اک تھکی سی، نرم، دکھ والی صدا،
ہاں، کوئی پروانہ تھا جو یوں مجھے
تھا خراجِ حسن گا کر دے رہا!
کان دھر کر میں نے جب اُس کو سُنا
اس سے ملتا جلتا سا اک گیت تھا:
دیوتاؤں کی طرح ہے وہ رقیب
"مجھ کو، جس کے اتنے اچھے ہوں نصیب!
دیوتاؤں کی طرح ہے شادماں،
جس کے پہلو میں ہو تو آرامِ جاں!"
پرتھوی نے بھی یہ گایا تھا کبھی،
اور دریچے میں کھڑی سنجوگتا
بھیج کر داسی کے ہاتھوں اک کلی،
ہار بیٹھی تھی دلِ نازک ادا!
میں یونہی چپکی کھڑی سنتی رہی،
مجھ میں ہمت ہی نہ تھی، جا کر وہاں،
جس جگہ گاتا تھا میرا پرتھوی،
مضمحل دل کی بنوں آرامِ جاں!
اور وہ نغمہ بہہ کے آتا ہی رہا!
مجھ کو افسردہ بناتا ہی رہا!

اور اب الوداعی گیت۔

عبرت

لو، اب کہاں گئے وہ جنہوں نے سنا گئے
(محلوں میں جن کے اب ہیں خرابے بنے ہوئے)
بیتی ہوئی گھڑی کے عجب دل نشیں سے گیت!
اک روز اس جہاں میں تھی مشہور جن کی جیت!
وہ رنگ ہیں مٹے ہوئے، نغمے چھپے ہوئے!
وہ سب چلے گئے، وہ سبھی اب چلے گئے!
وہ دلربا جوان جنہوں نے کہا کئے
افسانۂ دل، کہ جنہیں سب سنا گئے،
اور وہ کنواریاں کہ جو تھیں جانِ داستاں،
ہاں، جن پہ وہ جوان مٹے اور مٹا گئے!
افسوس! اُن کی شکل حسیں اب نہیں یہاں!
وہ سب چلے گئے، وہ سبھی اب چلے گئے!
روزِ ازل سے ہیں یونہی منظر چھپا کئے،
آئیں گے اور جائیں گے، آئے، چلے گئے!
ہاں، ہم بھی ایک دن یونہی دنیا سے جائیں گے،
باقی رہیں گے بس یہی اپنے کہے سُنے!
وہ سب چلے گئے، وہ کبھی کے چلے گئے!

"باقی رہیں گے بس یہی اپنے کہے سنے" — بالکل صحیح ہے کم از کم طامس مور کا کہا سنا تو اب تک "باقی" کا لطف دیئے جا رہا ہے۔

میراجی

انتظار

کبوتر نہ قاصد نہ پیغامبر — کئی دن سے تو مجھ سے ہے بے خبر
نہیں دل کو سینے میں دم بھر قرار — ترے خط کا ازبسکہ ہے انتظار
مرے تن کا ہر ذرہ دل ہو گیا — جدائی کا غم جاں گسل ہو گیا
دمِ صبح ستلج پہ ہوتا ہوں میں — گھٹاؤں کی مانند روتا ہوں میں
خبر کیا تھی قسمت پلٹ جائے گی — یہ برسات رونے میں کٹ جائے گی
کوئی شغل فرقت میں بھاتا نہیں — مجھے رات بھر چین آتا نہیں
کہیں فرطِ غم میں برا کہہ نہ دوں — یہ ڈر ہے تجھے بے وفا کہہ نہ دوں
میں بھولا نہیں ہوں وفائیں تری — ذرا آ کہ لے لوں بلائیں تری
سفر کی صعوبت سے کیوں ہے نفور — نہیں ہے بہت دور فیروزپور
سٹیشن پہ جاتا ہوں میں روز و شب — یہاں تو خدا جانے آ جائے کب
تری چشم کیوں آج پُرخوں نہیں — جدائی میں تو مضطرب کیوں نہیں
یہ غم تجھ کو کب تک نہ تڑپائے گا — خدا جانے کس روز تو آئے گا
جو تجھ کو وہ شام و سحر یاد ہیں — تجھے تیرے پیماں اگر یاد ہیں
اگر تو سمجھتا ہے شیدا ہوں میں — اگر یاد ہے تجھ کو تیرا ہوں میں
تو آ میری جاں ایک دن کے لئے — ترستا ہوں اُس نیک دن کے لئے

اصغر حسین خاں نظیر

پیت کی کہانی

سکھی پیت کی سُن نہ کہانی ناگن ہے یہ سُندر رانی
بچپن ہی میں روگ لگایا پریتم کو نینوں میں بسایا
نینوں سے پھر نیر بہائے پریم کے سُندر پھُول کھلائے
من مندر پھولوں سے سجایا پیارا سندر روپ بنایا
بھینٹ چڑھا کر پریم بھون میں پالا اُن کو بھولے پن میں
سکھی نہ پھر بھی اُن سے بسائی اُلٹی پریت ہوئی دُکھ دائی
آشاؤں پر پھر گیا پانی سُپنا بن گئی پریم کہانی
پھول ہوا بو باس سے خالی دُکھیا من ہے آس سے خالی

سکھی پیت کی سُن نہ کہانی
ناگن ہے یہ سندر رانی

اندرجیت شرما

مرزا راجہ جے سِنگھ

عہدِ مغلیہ میں جو راجپوت سورما ہندوستان کے سیاسی اسٹیج پر نمایاں ہوئے ان میں تین نام تاریخ کے صفحات سے کبھی نہیں مٹائے جا سکتے۔ پہلا نام راجہ مان سنگھ کا ہے۔ کون مان سنگھ؛ جس کی زندگی کے کارنامے جلال الدین محمد اکبر کے پورے دورِ سلطنت پر چھائے ہوئے ہیں۔ کون مان سنگھ؛ جس نے اکبر کی وفات کے آٹھ سال بعد بھی نور الدین جہانگیر کے عہد کے ایک ثلث سے زیادہ زمانے تک ہندوستان کی قسمت کے پانسوں کو اپنی مٹھی میں رکھا اور کابل سے اڑیسہ اور پنجاب سے دکن تک اپنے نام کے ڈنکے بجوا دیئے کرنل ٹاڈ تو اپنی تصنیف "راجستان" میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ

"اگر مان سنگھ کے وقائع حیات کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے تو وہ ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی۔"

مان سنگھ کے سوانح حیات کے لئے جے پور میں بہت کچھ مواد ملے گا۔ لیکن دور کیوں جائیے۔ اکبر نامہ اور تزک جہانگیری کی ورق گردانی کیجئے۔ آپ صرف ان دو مستند ترین تاریخوں سے ایک قیمتی تذکرہ بآسانی مرتب کر سکیں گے۔

مجھے مرزا راجہ جے سنگھ پر کچھ لکھنا ہے لہٰذا ذرا مرزا کو فی الحال نظر انداز کر کے تیسرے نام کی طرف ایک سرسری نظر ڈال لیے۔ یہ کون! یہ سورے جے سنگھ دوسرا جے سنگھ ہے جس نے ۱۷۴۳ء میں وفات پائی۔ سورے جے سنگھ ۱۶۹۹ء میں جے پور کی گدی پر متمکن ہوا۔ یہ مرزا راجہ کا پڑپوتا تھا۔ اور اپنے عہد میں سچ پوچھئے تو اپنے مورث مرزا راجہ سے کم شہرت کا مالک نہ تھا۔ اورنگ زیب کا زمانہ تھا۔ سلطنت مغلیہ کا آفتابِ اقبال نصف النہار پر پہنچ کر رفتہ رفتہ غروب ہونے کے لئے بڑھ رہا تھا۔ مرہٹوں کی طاقت روز افزوں تھی۔ اور اس کے دیکھتے دیکھتے اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے سلطنت مغلیہ کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا۔

مسٹر کرنل ٹاڈ نے اس جے سنگھ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مدبر، منتقن، اور دور اندیش کی حیثیت سے جے سنگھ کا کیریکٹر ایک مستقل و پُرسکون مطالعہ چاہتا ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ راجپوتانہ کے سورما کس قدر عالی ظرف، عالی ہمت اور عالی حوصلہ تھے۔"

فرصت ہو گی تو تو ادبی دنیا کی کسی دوسری اشاعت میں مان سنگھ اور سورے جے سنگھ کی زندگی پر ایک مفصل نظر ڈالی جائے گی۔ اس خط میں مرزا راجہ کا تذکرہ ہمارے قلم کی جولانیوں کے راستہ کو مسدود کئے دیتا ہے۔ اور اتنا بھی موقع نہیں دیتا کہ ہم راجپوتوں کے قومی جوہروں کو پرکھیں اور دنیا کو ان کی قدر و قیمت آگاہ کر دیتا ہیں۔

قصہ مختصر مرزا راجہ جے سنگھ نے انبر (عنبر) کی گدی پر پچاس سال[1] حکمرانی کی۔ آنکھیں کھولیں[2] تو نور الدین جہانگیر کو بابر کے تخت و تاج کا وارث پایا۔ پر پرواز ہوئے تو شاہجہاں کا عہد تھا۔ اس وقت تک تو وہ ایک بہادر سپاہی ایک شیر دل جرنیل اور خوش تدبیر حکمران ہے اب جنگِ[3] برادران شروع ہوتی ہے بس یہاں سے اس کی سیاست دانی و تدبر میں چار چاند لگتے ہیں اور مرتے دم تک اس کی آن بان قایم رہتی ہے۔ مرزا نے مغلوں کے پرچم کے نیچے بلخ (متوسط ایشیا) سے بیجاپور (دکن)، قندھار (سرحد ایران) سے مونگیر (مشرقی بہار) تک اپنی شمشیر آبدار کے جوہر دکھائے بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ بڑے نام کئے۔ دشمنوں کے دلوں پر اپنا سکہ جما یا۔ لازوال شہرت حاصل کی۔ مالک کے دل اور آنکھوں میں جگہہ کی ملک میں عزت پائی۔ قوم کی آبرو رکھی۔

مصنف معاصر الامرا مرزا راجہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"بارہ برس کے سن سے مسلسل یا تو کسی معرکہ میں نبرد آزمائی کی یا سلطنت مغلیہ کے کسی صوبہ کی عنانِ حکومت ہاتھ میں رہی، چار چار پانچ پانچ برس گذر گئے گھر کی صورت نہیں دیکھی۔ شاہجہاں کے طویل عہد سلطنت اور اورنگ زیب کے ابتدائی دور میں شاید ہی کوئی سال ایسا ہو جس میں

---

[1] ۱۶۱۷ء سے ۱۶۶۷ء [2] پیدائش سے مراد نہیں۔ بلکہ مسند نشین ہونے کے زمانے کی طرف اشارہ ہے [3] تخت و تاج کے لئے اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں کی جنگ۔

جے سنگھ کسی مہم کے سر کرنے کے لئے نہ بھیجا گیا ہو اور پھر ظفریاب نہ پلٹا ہو، سیاست و تدبر کے میدان میں وہ سب سے گوئے سبقت لے گیا۔ اللہ رے استقلال اللہ رے ثابت قدمی دربارِ مغلیہ کے آداب کوئی اس سے سیکھے، مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کوئی اس سے حاصل کرے اردو اور راجپوت زبانوں کے علاوہ ترکی و فارسی زبانوں کا ماہر، جید عالم، غضب کا شمشیر زن، صف شکن، جے سنگھ ہی کا دل او کلیجہ تھا جو افغان و ترک راجپوتوں اور ہندوستانیوں کی مخلوط سپاہ کی کمان کرتا تھا"

افسوس ہے کہ ہندوستان کی ایسی جلیل القدر ہستی کی زندگی کا کوئی تذکرہ کسی مورخ نے نہیں لکھا۔ جے سنگھ ان گمناموں میں نہیں جن کے نام صفحۂ تاریخ سے محو ہو گئے۔ یہ وہ نام ہے جس کو زمانے کے ہزاروں انقلابات کبھی بھی نہیں مٹا سکتے"۔ مواد موجود ہے سب سے زیادہ گراں بہا چیز اُس کے خطوط کا مجموعہ ہے جو "ہفت انجمن" کے نام سے موسوم ہے۔ "ہفت انجمن" کا جامع و مرتب ادیراج ہے جو اس کا دست راست ہے۔ اس کا ایک نسخہ پیرس[1] میں اور ایک نسخہ سر ڈاکٹر جادو ناتھ سرکار کے پاس محفوظ ہے جے سنگھ کے اکثر خطوط ہفت انجمن میں موجود ہیں لیکن بعض رقعات و خطوط فارسی کے دوسرے تذکروں میں بھی ملتے ہیں ان میں سے چند دربار جے پور کے ریکارڈوں میں بھی ہیں۔ دربار جے پور کے ریکارڈوں میں وہ خطوط بھی ہیں جو شاہانِ مغلیہ نے جے سنگھ کو لکھے ہیں۔ ان میں وہ خطوط جو شہزادہ شجاع کی جنگ سے متعلق ہیں بہت دلچسپ ہیں۔ داراشکوہ کے تعاقب کے متعلق جو خطوط ہیں وہ ہندوستان نہیں بلکہ پیرس میں ملیں گے۔ سر جادو ناتھ نے مختلف مقامات سے شاہانِ مغلیہ اور جے سنگھ کی مراسلت کو فراہم کیا ہے، کیا اچھا ہوتا اگر موصوف ان تمام خطوط کو ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دیتے۔

سر جادو ناتھ سرکار نے ایک مضمون کے تحت میں جو موصوف نے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کے اجلاس دوازدہم منعقد جے پور دسمبر ۱۹۲۹ء میں پڑھا تھا بعض دلچسپ خطوط کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ خطوط بھی "ہفت انجمن" سے منتخب کئے گئے ہیں اور اُس وقت لکھے گئے ہیں جب جے سنگھ اپنی کشتیٔ عمر کو کھے کر جے پور میں گوشہ نشین تھا، خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخری بار آگرہ اس وقت گیا ہے جبکہ سیواجی کا واقعہ پیش آیا۔ سیواجی کو دامِ تزویر میں لانے کا سہرا جے سنگھ ہی کے سر ہے مگر افسوس ہے کہ اورنگ زیب نے اس کے تدبر کی داد دینے کے بجائے اس کو سیواجی کے فرار کے معاملے میں مشکوک نظروں سے دیکھا۔ بیجاپور میں جے سنگھ کی ناکامی اس آخری عمر میں اس کے لئے بہت شاق تھی۔ ذیل کے خطوط جے سنگھ کے متذکرہ بالا احساسات پر گونہ روشنی ڈالتے ہیں۔

پہلا خط کمار رام سنگھ[2] کے نام

مورخہ . . . ۱۶۶۶ء از جے پور

ابتدا میں جے سنگھ لڑکے کو ہدایت کرتا ہے کہ تم شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہو کر عرض کرو کہ مجھ کو مہم دکن سے علٰحدہ نہ کریں کیونکہ میں تمام کڑیاں جھیل آیا ہوں۔ راستہ صاف ہو گیا ہے اور اب جو شخص بھی میری جگہ بھیجا جائے گا وہ آسانی سے کامیابی حاصل کرلے گا۔ میری عمر بھر کی خدمات مٹی میں مل جائیں گی اور اس آخری وقت میں کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا۔ دوسری طرف منہ مانگی مراد بر آئے گی اور نااہل کے سر فتح و ظفر کا سہرا بندھ جائے گا۔

اس کے بعد لکھتا ہے۔

"میں اپنی ساری عمر تیر کر چکا ہوں۔ زندگی اب چند روزہ ہے، معلوم نہیں کب موت کا فرشتہ آکھڑا ہو۔ مرتے وقت بھی حضرت ظل سبحانی کا دامن نہ چھوڑوں گا۔ وہی مجھ کو ذلت و رسوائی سے بچائیں گے"

دوسرا خط بھی کمار رام سنگھ کے نام ہے لکھتا ہے۔

"کوئی بھی معاملہ ہو، خواہ اہم خواہ غیر اہم میں تم کو ہمیشہ اپنا واسطہ گردانتا ہوں لیکن افسوس ہے کہ تمہارا طرزِ عمل اب یہ ہو گیا ہے کہ جب مجھے شہنشاہی خدمات کے متعلق کوئی ضروری اور فوری درخواست تمہارے ذریعہ سے شہنشاہ کے حضور میں کرنا ہوتی ہے تو تم جواب تک نہیں دیتے اور سیر و شکار کو نکل جاتے ہو۔ اگر وقت گزرنے کے بعد جواب بھی دیتے ہو تو مفصل نہیں مجمل۔ اگر بالفرض محال تم کو اس کا احساس نہیں کہ میں تمہارا باپ ہوں تو اس کا احساس تو ضرور ہونا چاہیئے کہ تم دربار میں میری عرض رسانی کی خدمت پر مامور ہو۔ اگر حضرت ولی نعمت نے تم سے کبھی پوچھ لیا کہ جے سنگھ کی یہ عرض داشت کب موصول ہوئی تھی اور کب حضور میں پیش کی گئی تو تم ہی اس کے جواب دہ ہو گے۔ اگر تم ان دونوں باتوں میں سے ایک کا بھی لحاظ نہیں کرتے تو تم کو اختیار ہے

[1] Bibliotheque Nationale of Paris [2] جے سنگھ کا بیٹا جو دہلی میں تھا۔

جیسا جی چاہے کرو۔ شری رامجی میرے محافظ ہیں۔

(بربسر ما شری رام جی ست)

تیسرا خط گردھاری لال کے نام ہے۔ گردھاری لال جے سنگھ کا دربار دہلی میں وکیل ہے۔

جے سنگھ لکھتا ہے۔

"میرے مقدر کا لکھا سب پورا ہو گیا۔ دنیا میں ہر شخص اپنی جان صرف اولاد کے لئے کھپاتا ہے لیکن رام سنگھ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور وہ کبھی مجھ کو کچھ نہیں لکھتا اور اگر کچھ لکھتا بھی ہے تو یہی کہ مجھ کو اس کی کوئی اطلاع نہیں۔ میرے اوپر چار طرف سے تباہی آئی۔ میرا اختم ہو گیا۔ میرے پرگنے غائب ہو گئے۔ دکن کی مہم میں جو ذاتی مصارف ہوئے وہ سب فی النار ہو گئے اور سب سے زیادہ مجھے اپنے فرزند کے متعلق جو توقعات تھیں وہ بھی مفقود ہو گئیں۔ وہ (رام سنگھ) مجھ کو دربار کی کوئی خبر نہیں دیتا کہ کیا ہوا کس نے میرے متعلق کیا کہا؟ شہنشاہ کا کیا ارشاد ہوا؟ میں نے جو ان صوبہ جات میں جاں فشانیاں کی ہیں کبھی ان کا بھی کوئی ذکر ہوا یا نہیں؟ یہ سب تفصیل سے لکھو!"

~~~

یہ ہیں سترھویں صدی عیسوی کے ہندوستان کے ایک عالی اغ مدبر کے پارینہ خطوط کے ٹکڑے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جے پور گوشہ نشینی کی زندگی میں بھی مرتے دم تک عاقبت اندیش تھا اور بیوتانہ میں بیٹھے ہوئے اپنے "تدبر" سے اپنی اولاد کو دربار مغلیہ میں عروج ینے کے لئے مضطرب تھا۔

ان خطوط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سیواجی کے واقعہ نظربندی یدکے بعد میں اس کو پھر آگرہ جانا نصیب نہیں ہوا اور وہ اورنگزیب بدگمانیوں کی کوفت میں مرگیا۔

شہنشاہ حسین رضوی
~~~

شکست کی آواز

امنگوں نے مرے دل کو عجب الجھن میں ڈالا ہے ‏— سمجھتا ہے کہ جو بھی کام ہے وہ کرنے والا ہے؛
یہ کہتا ہے "نئے رستے دکھاؤں میں سواروں کو" ‏— یہ کہتا ہے کہ لے آؤں فلک سے ماہ پاروں کو
یہ کہتا ہے کہ صحراؤں کی دوری طے کروں پل میں ‏— حقیقت میں، یہ احساسِ شعوری طے کروں پل میں
جہانِ نو کو دیکھ آؤں جو ہے گہرے سمندر میں ‏— بیابانِ سنگ پالوں، منجمد ہے کوہ کے بر میں

یہ کہتا ہے کہ ساری کائنات اک ذرّہ بن جائے
جو ہے لاانتہا وقفہ وہ بس اک لمحہ بن جائے!

مگر اونچے ارادے ہیں تو کیا؟ اونچے ارادوں کو ‏— سمجھنے کا نہیں احساس حاصل سیدھے سادوں کو؛
جہاں میں سیدھے سادے آدمی کثرت سے بستے ہیں ‏— ہے محدود اُن کی ہمت اور محدود اُن کے رستے ہیں
تمدن اور تہذیبوں نے پھندا اُن پہ ڈالا ہے ‏— وہ کہتے ہیں کہ ہونا ہے وہی جو ہونے والا ہے!
بدل کر کیا کریں گے ہم طریقے آج قدرت کے ‏— ہمارے دامنوں پہ ہاتھ کل ہوں گے قیامت کے!
بہت ہی پست ہیں ذہنیتیں ابنائے عالم کی ‏— یہ اک نقطے پہ قائم ہیں، انہیں عادت نہیں رم کی!
انہیں تسکین ہے پہلی لکیروں کی فقیری میں ‏— یہ کھوئے ہیں تمنّا کی ضعیفی اور پیری میں!
میں اِن کو دیکھتا ہوں دل پہ ہوتا ہے اثر اِن کا ‏— میں اک مظلوم ہوں ماحول کے اس جذب ساکن کا!

مگر ہاں، باوجود اِس کے مرے دل میں جو الا ہے،
امنگوں نے مری ہستی کو اک اُلجھن میں ڈالا ہے!

میراجی

غزل

یہ رازِ اہلِ ہوس کی سمجھ میں آ نہ سکا — جو پاس آ نہ سکا تجھ سے دور جا نہ سکا

جو دل کہ فاش کنِ رازہائے ہستی تھا — حریمِ ناز کا پردا کبھی اُٹھا نہ سکا

ملے تو زہرِ ہلاہل سمجھ دلِ ناداں! — وہی تو آبِ بقا تھا جو ہاتھ آ نہ سکا

کیا تھا عشق نے بھی آج اہتمامِ فریب — پتے کی بات مگر رنگِ رُخ چھپا نہ سکا

سدا جنوں کو سمجھتا رہا کمالِ حیات
کبھی اس عقل کے پھندے میں وجد آ نہ سکا

سکندر علی وجد

"ٹوٹا ہوا دل"

افرادِ تمثیل

خانم ۔۔۔ گھر کی معمر مالکہ جس نے شادی نہیں کی

نسرین ۔۔۔ خانم کی سہیلی

سوسن ۔۔۔ پچیس سالہ ملازمہ

کرنل آصف سلیمان ۔۔۔ خانم کا دور سے رشتہ دار

منظر۔ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم جس کی آرائش میں حد درجہ نزاکت اور سنجیدگی سے کام لیا گیا ہے۔ کرسیاں نہائت سبک اور معمول سے نیچی ہیں آتشدان پر قدیم چینی کے چھوٹے چھوٹے ظروف اور تپائیوں پر مصری طرز کے نازک نازک گلدان رکھے ہیں۔ چیزیں اس ترتیب سے رکھی ہیں کہ ذرا بے پروائی برتی جائے تو گر کر ٹوٹ سکتی ہیں۔ پردوں کا رنگ سیاہی مائل سبز ہے اور چار کھڑکیوں میں سے صرف ایک کھلی ہے۔

سوسن۔ آپ تشریف رکھئے ۔۔۔ مس صاحبہ ابھی ایک منٹ میں آتی ہیں۔

نسرین۔ نہیں سوسن ابھی جاؤ اور اُن سے کہو اگر میرے لئے کپڑے بدلنے گئی ہیں تو میں بہت برا مناؤں گی۔

سوسن۔ مس نسرین آپ بیٹھئے تو۔ وہ صبح صبح کپڑے بدلے بغیر کسی ملاقاتی سے نہیں ملا کرتیں۔ اول تو یہاں ہمیں ملنے ہی کون آتا ہے۔

نسرین۔ میں ملاقاتی نہیں ہوں۔ میرا تو خیال تھا وہ شب خوابی کے لباس میں ہی ہوں گی اور میں جا پہنچوں گی۔ میرے لئے یہ تکلف بھلا . . . .

سوسن۔ وہ لباس بدل بھی چکی ہوں گی۔ آپ تشریف تو رکھئے۔ وہ ابھی آئیں کہ آئیں۔

نسرین۔ (مجبوری سے بیٹھتے ہوئے) آہ اتنی دیر کے بعد آج اُن سے ملنے کا یہ موقع ملا تھا۔ آج ہی شام مجھے کلکتہ واپس لوٹنا ہے۔

سوسن۔ ٹرین میں جائیے گا۔

نسرین۔ ہاں اور کب۔

سوسن۔ پھر آپ مجھ سے زیادہ دلیر ہیں میں اکیلی سفر نہیں کر سکتی۔

نسرین۔ سوسن مجھے یہ بتاؤ اب خانم اچھی تو رہتی ہیں۔

سوسن۔ جی ہاں آج کل تو اچھی ہیں مگر پھر صحت بگڑ جائے گی۔ آپ اُن کی طبیعت سے واقف ہی ہیں۔ پچھلے دنوں موتی نے بڑا صدمہ پہنچایا۔

نسرین۔ موتی کون؟

سوسن۔ موتی بلی کا نام ہے۔ ہم نے اُسے نر سمجھ رکھا تھا مگر اُس نے بچے دے دیئے۔ اس صدمہ سے خانم صاحبہ ایک دن اور رات بستر میں پڑی رہیں۔

نسرین۔ اوہو۔ پھر

سوسن۔ پھر اب ہم اُسے موتیا کہتے ہیں خانم صاحبہ کے کہنے پر۔ چونکہ وہ موتی کے نام سے ہل چکی تھی اسی لئے نام یکسر تبدیل نہیں کیا خواہ اب کچھ ہو لیکن وہ پہلی سی بات تو نہیں رہی نا۔۔ خانم کہتی ہیں موتیا کمبخت نے انہیں بڑا دھوکا دیا ہے۔

نسرین۔ تم اپنی سناؤ؟

سوسن۔ آپ کی مہربانی سے اچھی ہوں۔

نسرین۔ خوب۔ بالکل اچھی ہو؟

سوسن۔ جی ہاں لیکن۔ نسرین صاحبہ آپ ہی ایک ایسی ہیں جن کی بات خانم سنتی ہیں یہاں صرف ایک بات ہے جو مجھے تکلیف دیتی

ہے اور اگر آپ مجھ پر مہربانی کریں تو مجھے یقین ہے۔۔۔۔

نسرین۔ ہاں ہاں مجھے بتاؤ! کیا بات ہے؟

سوسن۔ آپ کو یاد ہو گا جب میں آج سے ۱۰ سال پہلے یتیم خانے سے سیدھی یہاں آئی تھی اور مجھے خانم صاحبہ نے ملازم رکھا تھا تو مجھ سے اس وقت انہوں نے کہا تھا۔ "دیکھو سوسن اب تم میرے پاس ہو۔ یہاں قطعاً کوئی آدمی تم سے ملنے نہ آئے" اور میں نے کہا تھا "نہیں جناب یہاں قطعاً کوئی نہیں آئے گا"۔ میں نے اس وقت کم عمری میں سمجھا تھا کہ مجھ یتیم سے کون ملنے آئے گا۔ میرا ہے ہی کون۔ لیکن اب ۔۔۔۔

نسرین (خفگی سے) لیکن اب!!! سوسن کیا تم مردوں سے دوستی کرنا چاہتی ہو؟

سوسن۔ نہیں چھوٹی بی بی جان میرا یہ مطلب نہیں۔ میں مردوں سے دوستی نہیں کرنا چاہتی۔ ایک عورت کا ایک ہی مرد دوست بن سکتا ہے۔ وہ کئی مردوں کو کس طرح دوست بنا سکتی ہے؟

نسرین۔ معلوم ہوتا ہے کسی کا خیال تیرے دل میں چٹکیاں لے رہا ہے!

سوسن۔ آپ سے کیا چھپاؤں چھوٹی بی بی۔ آپ یہاں کئی سال رہ چکی ہیں جمالی مجھے بہت تنگ کرتا رہا ہے۔ جب میں شہر جاتی تھی تو مجھے گھورتا رہتا تھا مگر میں آج تک اپنے وعدے پر قائم رہی ہوں۔

نسرین۔ بہت اچھا کیا۔

سوسن۔ چونکہ میں اپنی مالکہ سے وعدہ کر چکی تھی اس لئے اپنے قول سے پھرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے کئی بار اپنی اس کمزوری کا ذکر مس صاحبہ سے کرنا چاہا کہ جمالی کو کبھی کبھی یہاں آجانے کی اجازت دے دی جائے مگر جب بھی جرأت کر کے اُن کے پاس گئی۔ مجھے یوں معلوم ہوا کہ اُن کی آنکھوں میں کوئی ایسی چیز ہے جو مجھ سے زبان بند رکھنے کے لئے کہہ رہی ہے یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ جوانی میں اُن کا کوئی دوست رہا ہے۔

نسرین (دھمکاتے ہوئے) سوسن!

سوسن۔ (زیر لب) آپ کیا کرتی ہیں وہ خادمہ جسے دس سال اُن کے ساتھ اس چھوٹے سے ویران قصبے میں رہتے ہو گئے ہوں اور جس کو انہوں نے اتنے پیار سے اپنے پاس رکھا ہو۔ کیا اس کے کانوں میں اُس پرانی کہانی کی بھنک نہیں پڑ سکتی۔؟

نسرین۔ (لبوں پر انگلی رکھتے ہوئے) چپ سوسن۔

سوسن۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ یوں ہی بات زبان پر آگئی۔ اچھا آپ نے یہ بھی سنا وہ سرحد سے واپس آگئے ہیں میں نے انہیں خود دیکھا ہے

نسرین۔ کیا آصف سلیمان آگیا ہے؟

سوسن۔ جی ہاں آگئے ہیں مگر نام آپ نے لیا ہے میں نے نہیں لیا۔

نسرین۔ کب آیا ہے؟

سوسن۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں خانم کے ساتھ کل سودا خریدنے کے لئے دولت بخش کی دکان پر گئی تھی۔ ٹوکری میرے ہاتھ میں تھی۔ مہینہ بھر کے لئے چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدنا ہوتی ہیں۔ جب ہم وہاں پہنچیں تو اس دکان پر ایک آدمی سگار جلانے کے لئے دیا سلائی خرید رہا تھا ۔۔۔۔

نسرین۔ واہ۔ ندی آباد میں سگار؟؟؟

سوسن۔ سنئے تو۔ اُس نے خانم صاحبہ کو سلام کیا اور خانم صاحبہ گھبرا کر جھٹ میرے بائیں طرف آگئیں۔ انہوں نے میرا بازو زور سے پکڑ لیا اور کہا "مسٹر آصف سلیمان۔ کب آئے ہو"؟ اس طرح حیران ہو کر اور گھبرا کر کہا۔ "مسٹر آصف سلیمان! کب آئے ہو؟" اور پھر اسی طرح خرید و فروخت میں مصروف ہو گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اس میں شک نہیں خانم ہیں مضبوط دل کی۔ ——— آہ ——— اگر وہ اُس سے شادی کر لیتیں تو میں آج جمالی سے کھلے بندوں مل سکتی؟

نسرین۔ تم دل میلا نہ کرو سوسن۔ اگر آج موقع ملا تو میں ضرور تمہارے لئے کچھ نہ کچھ کہوں گی۔

(خانم داخل ہوتی ہے۔ پینتالیس سال کی عمر۔ سادہ لباس۔ کمزور جسم۔ چہرے پر زردی)

خانم۔ اخاہ۔ نسرین۔

نسرین۔ پیاری خانم (دونوں بغلگیر ہوتی ہیں۔ سوسن جاتی ہے) آپ کو اتنی صبح تکلیف دی ہے۔ معاف کرنا۔

خانم۔ واہ نسرین۔ تم اس سے پہلے بھی آ سکتی تھیں۔ بھلا مجھے کیا تکلیف ہوئی۔ (بیٹھتی ہے)

نسرین۔ آپ سے ملاقات کا یہی وقت ملا ہے۔ میں کل آئی تھی اور آج واپس جا رہی ہوں۔

خانم۔ (مسکرا کر) میرا خیال ہے تم اب اس گاؤں میں زیادہ نہ آسکو گی؟

نسرین۔ یعنی؟

خانم۔ شریر مجھ سے چھپاتی ہو۔ میں تمہاری منگنی کی خبر سن چکی ہوں۔

نسرین۔ (خفیف قہقہہ) کیا آپ کو یہ خبر سن کر خوشی نہیں ہوئی؟ میں نے اچھا نہیں کیا!

خانم۔ نہیں پیاری نسرین۔ مجھے ہمیشہ تمہاری خوشی سے خوشی رہی ہے میں تمہیں "خوش" دیکھتی ہوں تو میرا دل بھی باغ باغ ہو جاتا ہے۔

نسرین۔ پھر میری خواہش ہے تم آفتاب سے ملو اور اُسے اندر بلا لو۔ وہ میرے ساتھ آیا ہے۔ گو یہ مجھے معلوم ہے کہ اس مکان کے دروازے ایک مدت سے مردوں کے لئے بند ہو چکے ہیں اور یہاں کسی مرد کو آنے کی جرأت نہیں۔ تاہم مجھے تم سے امید ہے کہ کم از کم میرے معاملے میں اس بات کو مستثنےٰ قرار دو گی۔

خانم۔ نسرین کیوں شرمندہ کرتی ہو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارے منگیتر کو میں اس مکان میں بلاؤں جس مکان پر سالہا سال سے مرد کا سایہ تک نہیں پڑا

نسرین۔ اچھا معاف کیجئے۔ میری تو بڑی خواہش تھی کہ آفتاب کو یہ کمرا دکھاؤں جہاں آپ مجھے موزے بُننا اور کشیدہ کاری سکھاتی رہی ہیں۔

خانم۔ اگر ملاقات مکان سے باہر ہو۔ تو مجھے اس سے ملنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ یہاں میرے ہاں تم جانتی ہو مردوں کی خاطر تواضع کے لئے کوئی مناسب کمرہ بھی موجود نہیں۔ یہی ایک کمرہ ہے اور اگر بدقسمتی سے خدا نہ کرے۔ یہاں کوئی مرد آ بھی جائے تو میرا دل اس چینی کے سامان اِن نازک چیزوں اور یہ دیکھو نا اِن ہلکے پھلکے ظروف کے ٹوٹنے کے خدشہ سے دھڑکتا ہی رہتا ہے۔ میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے نسرین۔ تم نہیں جانتی مونیا کے رکھنے میں مجھے کئی روز پریشان رہنا پڑا۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ بلیاں بہت سبک رفتار ہوتی ہیں اور اُن کے پاؤں بہت نرم ہوتے ہیں تو میں نے اُسے گھر میں رکھنے کی اجازت دے دی۔ لیکن مرد معاف کرنا بہت بدتمیز ہوتے ہیں اُن کا اٹھنا بیٹھنا اُن کی ہر حرکت کرخت ہوتی ہے۔

نسرین۔ مگر آفتاب اُن آدمیوں میں سے نہیں ہے۔

خانم۔ اس میں کوئی شک نہیں مگر کسی گھر میں ایک مرد کی موجودگی ناگوار ہی ہوا کرتی ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو اُس جگہ مانوس تصور نہ کرے تو بے چارہ سچا ہے۔

نسرین۔ (مسکرا کر) تو آپ کے خیال میں مردوں کو پھر اصطبل میں رہنا چاہئے۔

خانم۔ مجھے دوسروں کے خیال کا علم نہیں بہر حال میں اسی نتیجہ پر پہنچی ہوں۔

نسرین۔ سوسن بھی تو چوبیس گھنٹے آپ کی ہی صحبت میں رہتی ہے اُس کا تو یہ خیال نہیں۔

خانم۔ سوسن؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔

نسرین۔ سوسن کی جوانی اب ڈھلنے والی ہے۔ اُس کی طبیعت اب بے کل رہتی ہے۔ آپ جانتی ہیں کیوں؟ اگر وہ اپنے وعدے پر جو اُس نے آپ سے کیا تھا قائم ہے۔

خانم۔ نسرین میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ "دیکھو سوسن تم سے ملنے کے لئے یہاں کوئی مرد نہ آئے۔" اور میں چاہتی بھی کوئی ایسی ہی ملازمہ تھی۔ لیکن اگر سوسن کو کسی سے محبت ہے تو اُسے ہر پندرہ روز کے بعد رخصت ملتی ہے۔ اور میں نے اس سے کبھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جاتی ہے۔ نسرین! میرا باورچی خانہ سوسن کے ملاقاتیوں کے لئے تو نہیں ہے نا۔ جب ہمارے طبقہ کے مردوں کو اتنی اونچی آواز میں بولنے کی بدعادت ہوتی ہے کہ کمرہ سر پر اٹھا لیتے ہیں تو سوسن کے طبقہ کے لوگوں کا تو سوال ہی چھوڑو۔

نسرین۔ آپ کا مکان آبادی سے کتنا دور ہے۔ بیچاری تنہائی محسوس کرتی ہے۔

خانم۔ اُسے بے انتہا کام ہوتا ہے۔ تنہائی کس طرح محسوس کر سکتی ہے؟

نسرین۔ کیا آپ نے سرما کی تاریک راتوں میں کبھی "تنہائی" محسوس نہیں کی؟

خانم۔ "تنہائی"؟ میری نسرین! میں تنہائی سے ڈرا کرتی تھی اور خاص کر جب یہاں چوریاں ہونی شروع ہو گئی تھیں مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اگر میں نے شادی کر لی ہوتی تو آج خاوند کی موجودگی میں میں اپنے آپ کو کتنا زیادہ محفوظ خیال کرتی۔ کیا میری زبان سے خاوند کا لفظ سن کر تمہیں صدمہ تو نہیں پہنچا؟

نسرین۔ نہیں نہیں۔ میں نے اپنی گفتگو میں یہ لفظ عمداً استعمال نہیں کیا تھا۔ میرے خیال میں کسی معاملہ کو جانتے ہوئے اس کا ذکر کرنا اچھا

نہیں ہوتا۔

خانم۔ ہاں وہ معاملہ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب مجھے بھی اور لڑکیوں کی طرح شادی کا بڑا چاؤ تھا مگر وہ شخص جس سے میں شادی کرنا چاہتی تھی۔ مجھے چھوڑ کر بہت دور چلا گیا کیونکہ جب اُس نے مجھ سے شادی کا سوال کیا تھا تو میں نے جواب میں "نہیں" کہہ دیا تھا۔ اگرچہ میری مراد یہ نہ تھی لیکن آہ اُس نے خیال کیا کہ میری مراد یہی تھی مجھے یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ میں نے "نہیں" کیوں کہا جبکہ میرا رُواں رُواں "ہاں" کہنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ آہ نسرین ——— نسرین۔ خدا تمہیں آفتاب کے ساتھ ہمیشہ خوش رکھے۔ خدا کا شکر کرو کہ تمہارے مُنہ سے "نہیں" نہیں نکلی۔

نسرین۔ خانم بہن آپ مجھ سے بہت بڑی ہیں مگر میں آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ مجھ میں بھی وہی حیا، وہی نسائیت وہی خودداری موجود ہے جس کے باعث ایسے نازک موقع پر زبان میں لکنت آجایا کرتی ہے۔ میں نے دو بار تو "نہیں" کہا۔ لیکن جب آفتاب نے مجھ سے تیسری بار سوال کیا تو میں نے سوچا کہ مجھے مان جانا چاہئے۔

خانم۔ آصف سلیمان نے تو مجھ سے بس ایک ہی بار پوچھا تھا۔ اس کے بعد آہ، وہ مایوس ہو کر چلا گیا۔

نسرین۔ آصف سلیمان!

خانم۔ ہاں یہ اُس کا نام تھا۔ اِسے بھول جانا نسرین۔ میں بتانا تو نہ چاہتی تھی مگر پرانی باتیں بھی کبھی فراموش ہوتی ہیں۔؟

نسرین۔ آصف سلیمان ——— لیکن ——— خانم بہن، اب بھی وقت ہے۔ بگڑا ہی کیا ہے۔

خانم۔ نہیں اب تو بھولی بسری ماضی کے دھندلکے کے سوا اور کچھ نہیں میرے لئے کوئی مستقبل نہیں۔ میں نے صرف اپنے سایوں کے ساتھ اپنا وقت گزارا ہے۔ مجھے اب روشنی میں آنے سے خوف آتا ہے۔

نسرین۔ اپنے سایوں کے ساتھ؟

خانم۔ اوہ خدا کرے کہ تمہیں سایوں کی دنیا میں کبھی نہ رہنا پڑے۔ تمہیں تو اپنا خاوند روشنی میں اچھا بھلا نظر آ رہا ہے اور تمہارے بچے تو حقیقت میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی کہ وہ تمہیں کتنی پیاری آواز میں بلائیں گے۔

نسرین۔ ایسی باتیں نہ کیجئے مجھے شرم آتی ہے۔

خانم۔ شرم! کس بات کی؟ زندگی اور اُس کی خوشیوں پر شرم! تم اُن پر فخر کرو نسرین ——— یہ حقیقت ہے۔

نسرین۔ بیشک۔ میں کافی خوش ہوں اور خوش ہونا چاہتی ہوں مگر میں حیران ہوں کہ "آپ" کیسے اس زندگی پر قانع ہیں۔

خانم۔ میں! (سرد آہ کھینچ کر) آہ نسرین زندگی کا دوسرا نام جوانی ہے۔ زندگی کی سنہری راتیں اور مسرت سے لبریز دن جوانی کے لئے بنائے گئے ہیں۔ میرے لئے اُس جوانی کا ماتم اور سایوں کی دنیا کافی ہے۔ بیشک ننھی نسرین میں تنہائی سے اکتا جایا کرتی تھی۔ میں بعض اوقات رو دیا کرتی تھی کیونکہ دن گزرنے کا نام نہ لیتے تھے۔ اور راتیں اُن سے بھی لمبی ہوا کرتی تھیں۔

نسرین۔ اور اب؟

خانم۔ تم نے کبھی خواب میں بچے دیکھے ہیں؟

نسرین۔ کئی بار

خانم۔ بس اب وہی خواب والے بچے میرے پاس ہوتے ہیں۔ وہ بالکل دوسرے لوگوں کے بچوں کی طرح ہیں لیکن پھر بھی میرے بچے میرے ہی ہیں وہ بڑھتے ہیں۔ وہ کبھی جوان نہیں ہوتے۔ اُن کے چہروں پر کیل اور دہاسے کا نام تک نہیں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے چہرے ہمیشہ شگفتہ، نرم، اور دُھلے ہوئے رہتے ہیں۔ وہ بڑے صاف ستھرے اور مودب ہیں وہ میرے پاس اُس وقت آتے ہیں جب میں تنہا ہوتی ہوں اور جب وہ آجائیں تو پھر میں تنہا نہیں ہوتی وہ اُن کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں جو میں نے آتش دان کے قریب رکھ چھوڑی ہیں تاکہ وہ سردیوں میں آگ تاپ سکیں۔ وہ کرسی فیروزہ کی ہے اور اس چھوٹے مونڈھے پر جس پر مخمل کی گدی رکھی ہوئی ہے جاوید بیٹھتا ہے۔ وہ میری ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو خراب نہیں کرتے۔ اُن کی آواز نہایت دلکش، مدہم اور نرم ہے اور بعض اوقات رات کو جب وہ اپنے ننھے ننھے بازو میرے گلے میں ڈال دیتے ہیں تو میں جاگ اٹھتی ہوں۔ میرے ننھے اپنا منہ بالکل اُس طرح میرے منہ کے ساتھ لگا دیتے ہیں جس طرح اصلی ماؤں کے اصلی بچے اپنے مکھڑے اُن کے لبوں سے لگا دیتے ہیں۔

نسرین۔ میرے خیال میں ایسے بچے اصلی بچوں سے بہتر ہیں۔

خانم۔ نہیں نہیں کبھی نہیں۔ نسرین ایسا خیال کبھی نہ کرنا میں نے تم سے آج ایسی باتیں کہہ دی ہیں جنہیں میں کسی سے بھی کہنا نہ چاہتی تھی تم میرے پاس کتنا عرصہ رہی ہو مگر میں نے اپنے دل کی بات تم سے کبھی نہیں کی تھی مگر اب تم سمجھ دار ہو۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو مجھے تم اپنی منگنی کی سناؤ۔ تم نے اپنا عروسی جوڑا کیسا بنایا ہے؟ ــــ ہاں گلاب کے بہترین پھول جتنے چاہو تم میرے باغیچے سے لے سکتی ہو ــــ عورت پر یہ دن زندگی میں ایک ہی مرتبہ آیا کرتا ہے۔

(سوسن آتی ہے)

سوسن۔ (گھبرا کر) خانم صاحبہ

خانم۔ خیر ہے سوسن؟

سوسن۔ باہر ایک صاحب آئے ہیں اور وہ "آپ" سے ملنا چاہتے ہیں۔

خانم۔ ایک صاحب!!!

سوسن۔ خانم صاحبہ یہ صاحب وہی ہیں جنہیں ہم نے کل دولت بخش کی دکان پر دیکھا تھا۔ وہ آج کل سے بھی زیادہ بنے ٹھنے ہیں۔ میں نے ہرچند اُن سے کہا کہ آپ اُن سے نہیں مل سکتیں مگر اُن سے میرا کہنا ایسا ہی تھا جیسے کسی دیوار سے کہہ دیا جائے۔

خانم۔ (کچھ ٹھہر کر اور اپنا حوصلہ اور ہمت جمع کر کے) سوسن ــــ انہیں آنے دو ــــ اُن سے ملاقات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

سوسن۔ یہاں پر؟؟؟

خانم۔ ہاں کیا ہرج ہے۔

سوسن۔ ہیں؟؟؟ خدایا کیا ہونے والا ہے (جاتی ہے)

خانم۔ نسرین تم میرے پاس کھڑی ہو جاؤ۔ یہ میرے لئے نہایت نازک گھڑی ہے تم ہرگز مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جانا۔

نسرین۔ اگر تم میرا اندر ٹھہرنا معیوب سمجھو تو بھی کھڑی رہوں۔

خانم۔ میرا دل بہت کمزور ہے۔ نسرین خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں ہو ورنہ خدا جانے مجھے کیا ہو جاتا (اپنے اوپر نظر ڈال کر) تمہارے صبح صبح آجانے سے میں نے کپڑے بھی بدل رکھے ہیں۔

نسرین۔ آپ بہت پیاری معلوم ہو رہی ہیں۔ چہرے پر ایک خاص کشش ہے۔ ونک رہا ہے۔

خانم۔ میں تو حیرت اور گھبراہٹ کا ایک مجسمہ ہوں۔ میرا پلّو ٹھیک ہے؟

نسرین۔ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔

خانم۔ نسرین میں اُن کے سامنے پیش کیا کروں؟ کیا مرد صبح چائے پیتے ہیں یا شربت پیتے ہیں؟ مجھے تو اُن کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں!

نسرین۔ اُسے سوائے آپ کے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

(سوسن اور سلیمان داخل ہوتے ہیں۔ سوسن کے لبوں پہ مسکراہٹ ہے وہ اُسے اندر چھوڑ کر خاموش واپس چلی جاتی ہے۔ سلیمان کی عمر پچاس سال کے قریب ہے۔ سر کے کئی بال سفید ہیں۔ تن و توش اچھا ہے۔ چہرے پہ فوجی وقار کے ساتھ ساتھ ایک حجاب سا بھی موجود ہے۔ لباس بڑا شاندار ہے۔ لب و لہجہ میں کبھی کبھی فوجی تحکم ہے)

خانم۔ آئیے سلیمان صاحب

سلیمان۔ (تھوڑا سا جھک کر) کرنل سلیمان۔ برطانیہ کا پنشن یافتہ کرنل۔

خانم۔ (تعارف کراتے ہوئے) کرنل سلیمان۔ میری بہت عزیز سہیلی مس نسرین (دونوں تھوڑا تھوڑا جھکتے ہیں)

سلیمان۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی مس نسرین مجھے اپنا خادم سمجھئے۔

خانم۔ تشریف رکھئے کرنل صاحب (سلیمان کرسی کی طرف مشکوک نظر سے دیکھتا ہے) اوہو۔ اس کرسی پر بیٹھئے یہ زیادہ مضبوط ہے۔

سلیمان۔ (بیٹھتے ہوئے) شکریہ خانم صاحبہ (کرسی بہت نیچی ہے اس کی لمبی ٹانگیں اُسے اس امر کا احساس دلاتی ہیں)

خانم۔ میں آپ کی کیا خاطر کروں سلیمان صاحب نہیں کرنل سلیمان صاحب کیا میں شربت منگواؤں یا آپ . . . .

سلیمان۔ نہیں مہربانی۔ میں شربت پیا ہی نہیں کرتا (دہ کھانستا ہے اور نسرین کی طرف اس طرح دیکھتا ہے گویا اُس کی موجودگی اُسے شاق گذر رہی ہے۔ وقفہ)

خانم۔ آپ کو فوج کی ہنگامہ خیز زندگی کے بعد یہ جگہ بڑی بے رونق معلوم ہوتی ہوگی؟

سلیمان۔ میں اتنی مدت کے بعد ہندوستان واپس آیا ہوں کہ مجھے ہر چیز دیکھ کر خوشی محسوس ہو رہی ہے۔

خانم۔ یہ صحیح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں (وقفہ) آپ اتنے سال کہاں کہاں پھرتے رہے؟

سلیمان۔ (نسرین کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) میں یہاں اپنے متعلق باتیں کرنے نہیں آیا۔

خانم۔ چونکہ آپ نے خطروں سے معمور زندگی بسر کی ہے۔ یقیناً آپ . . .

سلیمان۔ معاف فرمائیں۔ ایک سپاہی کی آپ بیتی کسی خاتون کو سنانے کے لئے نہیں ہوا کرتی۔ اغلب ہے میری زندگی آپ کے نزدیک اُتنی اہمیت نہ رکھتی ہو جتنی آپ کی زندگی میرے لئے رکھتی ہے۔

خانم۔ میری زندگی! لیکن میں نے تو . . . .

سلیمان۔ (کرسی سے اٹھ کر) ہاں ہاں یہی سننے کے لئے تو میں یہاں حاضر ہوا ہوں اور چونکہ مس نسرین آپ کی بہت عزیز سہیلی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ آپ کی ہر بات سے واقف ہوں گی اور مجھے اس بات کی فکر ہے کہ آپ کی زبان سے اُن باتوں کا پھر سننا انہیں صدمہ پہنچائے گا۔

خانم۔ نسرین تم ان کی باتوں میں نہ آنا۔ کرنل صاحب میں آپ کو اس ضمن میں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتی۔

نسرین۔ (اٹھتے ہوئے) ٹھیک ہے کرنل سلیمان صاحب۔ مجھے واقعی آپ دونوں کے پاس بیٹھنا نہیں چاہئے تھا۔

خانم۔ (گھبرا کر اٹھتی ہے) لیکن نسرین تمہارا وعدہ۔ کرنل صاحب آپ دراصل ہماری باتوں میں مخل ہوئے ہیں۔ نسرین مجھے اپنی منگنی کی باتیں سنا رہی تھی۔

سلیمان۔ (جھک کر) نسرین صاحبہ میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

نسرین۔ شکریہ کرنل صاحب۔

خانم۔ نسرین تم اپنی بات جاری رکھو۔

نسرین۔ سچ کہتی ہوں اور کوئی سنانے والی بات نہیں ہے۔

سلیمان۔ ——— اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اب!

نسرین۔ کیا میں جانے سے پہلے سوسن سے ایک بات کرلوں۔

خانم۔ تمہیں ابھی نہیں جانا ہوگا۔

نسرین۔ نہیں نہیں مجھے اب جانا چاہئے۔

خانم۔ لیکن تم نے۔ سنو تو۔

نسرین۔ اچھا تو جاتی مرتبہ آپ سے مل لوں گی۔ میں ابھی یہیں ہوں۔ آداب عرض کرنل صاحب۔

سلیمان۔ (دروازہ کھول کر جھکتے ہوئے) آداب عرض مس نسرین (جب پاس سے گزرتی ہے) آپ کی اس عقلمندی کے لئے شکریہ (نسرین جاتی ہے اور سلیمان دروازہ بند کرکے تحکمانہ لہجہ میں کہتا ہے) اب بولو خانم۔

خانم۔ (جھجک کر) ہوش کرو کرنل

سلیمان۔ خانم میرا نام آصف سلیمان ہے۔ کرنل کیا ہوا!

خانم۔ مجھے معلوم ہے۔

سلیمان۔ مجھے یاد ہے تم نے پچھلی مرتبہ بھی میرا نام نہیں لیا تھا ظالم خانم یہی کمرہ تھا نہ وہ؟ میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی شکست نہیں کھائی میں یہاں آیا تم اکیلی تھیں۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے التجا کی مگر تم نے "نہیں" کہہ کر میری آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ تمہاری نہیں پر میں اس قدر حیران ہوا کہ مجھے دوبارہ سوال کرنے کی جرأت نہ پڑی بلکہ دوبارہ التجا کرنے کا خیال ہی دماغ سے اڑ گیا میں یہ سمجھتا تھا کہ تم صرف میرے سوال کی منتظر تھیں مگر بعض اوقات آدمی کتنا بے وقوف بن جاتا ہے۔ میرے دل کو جتنا اُس روز صدمہ پہنچا تھا کبھی نہیں پہنچا۔ آج کتنے سال ہوئے؟ پندرہ سال؟

خانم۔ پندرہ سال تین مہینے دس دن۔ سترہ فروری ۱۹۲۳ء کا دن تھا

سلیمان۔ آہ تم نہیں بھولیں معلوم ہوتا ہے میری طرح تم نے بھی ایک ایک دن گن گن کر گزارہ ہے۔ اس امر کا صحیح اندازہ کون لگا سکتا ہے کہ ہندوستان پہنچنے کے لئے میں نے کس بے صبری سے اپنا راستہ طے کیا ہے۔ جب جہاز کسی بندرگاہ پر ٹھہرتا تھا تو جہاز کے کپتان کے لئے میرے دل سے بد دعائیں نکلتی تھیں۔ خانم تمہیں کیا علم کہ میں نے اُسی روز سے جس روز میں وہاں پہنچا تھا واپس آنے کی کوشش شروع کردی تھی۔ متواتر پندرہ سال تک میری کوشش جاری رہی۔ مجھے ہمیشہ یہی خیال رہا کہ میں خط کی طرح جلد ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ آج کوشش بارور نہیں ہوئی تو کل ضرور ہوگی اس وجہ سے میں تمہیں خط بھی نہیں لکھ سکا اور میں تم سے کچھ خفا بھی تھا۔ پہلے تو مجھے رخصت نہ مل سکی اور اگر مل بھی جاتی تو نصف راستے کے کرائے کے لئے مجھے قرض اٹھانا پڑتا۔ میری بدقسمتی دیکھو جب مجھے رخصت ملی تو مجھے میعادی بخار نے آدبایا۔ جب میں تندرست ہوا تو مجھے ایک چھوٹی سی لڑائی میں جانا پڑا اور جب میرا زخم ٹھیک ہوا تو . . . .

خانم۔ آپ کو زخم آگیا تھا۔

سلیمان۔ ہاں اُس وقت تو معمولی تھا مگر بعد میں مجھے کئی مہینے ہسپتال میں رہنا

پڑا۔ ہسپتال سے خلاصی پائی ہی تھی کہ ہماری فوج کو رزمک بھیج دیا گیا۔ وہاں سے شنگھائی اور شنگھائی سے مصر۔ عمر کا بہترین حصہ اسی طرح جگہ جگہ کی خاک چھاننے میں گزر گیا۔ جب میں مصر آیا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے پنشن کی درخواست کر دی اور وطن کی راہ لی۔ یہ ہے میری مختصر داستان۔ اب تم بتاؤ خانم تم کیا کرتی رہی ہو؟

خانم۔ میں! ابا کے مر جانے کے بعد بالکل تنہا رہ گئی۔ بس آج تک اسی چار دیواری میں ہی رہی ہوں۔ میری یہی دنیا تھی۔

سلیمان۔ انہیں خدا بخشے۔ مجھے پتہ نہیں کس نے اطلاع دی تھی۔۔۔

خانم۔ اُن کے مر جانے کے بعد شہر کی زندگی سے مجھے معلوم نہیں کیوں اتنی نفرت ہو گئی۔ مجھے اپنا وطن سونا سونا معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ میری زندگی کا زیادہ حصہ وہیں بسر ہوا تھا۔ میں نے یہاں رہنا زیادہ پسند کیا۔ بڑی خاموش سی جگہ ہے۔ وطن میں کیا پڑا تھا۔

سلیمان۔ تمہیں معلوم ہے مسافرت میں لفظ "وطن" میرے لئے کیا معنی رکھتا تھا۔ جب میں دوسرے لوگوں کو وطن کی باتیں کرتے سنتا تو وہ اکثر اپنی ماؤں، بیویوں، بہنوں اور بچوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ آخر جب ہم اپنے گھر کا ذکر کرتے ہیں تو اُس سے مراد یہی چیزیں ہوا کرتی ہیں نا۔ مگر جب وہ اپنے اپنے گھر کا ذکر کرتے تو میرے تصور میں ندی آباد ہوتا تھا۔ ۔ ۔ ۔

خانم۔ آپ ندی آباد میں کب رہے ہیں؟

سلیمان۔ خوشتر آں شہرے کہ دروے دلبر است۔ تم جو رہتی ہو یہاں۔

خانم۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔

سلیمان۔ خدا کے لئے مجھے آپ نہ کہو۔

خانم۔ اور کیا کہوں۔

سلیمان۔ "تم"

خانم۔ ایسا نہیں ہو گا۔

سلیمان۔ جانتا ہوں تم بہت ضدی ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے میں واپس کیوں آیا ہوں؟

خانم۔ کیا آپ پنشن کی عمر نہیں پا چکے؟

سلیمان۔ عمر؟؟؟ خانم میں اتنا ہی جوان ہوں جتنا میں یہاں سے گیا تھا۔ میں تم سے صرف ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ میں یہاں سے روانہ ہوا ہی تھا کہ میرے دل میں ایک وہم سا پیدا ہو گیا اور اُسی وہم نے مجھے آج تک واپس آنے کے لئے بے قرار رکھا۔ فرض کرو میں نے پہلی مرتبہ تمہاری بات نہ سنی ہوتی اور دوبارہ تم سے پوچھا ہوتا۔ کیا تم نے پھر بھی "نہیں" کہی ہوتی۔

خانم۔ میں یہ کیونکر بتا سکتی ہوں کہ میں نے کیا جواب دیا ہوتا۔؟

سلیمان۔ اس کے بتا دینے میں کیا ہرج ہے آخر کچھ نہ کچھ تو بتا سکتی ہو؟

خانم۔ اتنے برسوں کی پرانی بات کو لے بیٹھے ہیں آپ۔

سلیمان۔ تمہارا خیال ہے کہ میں گئی گزری بات کو گئی گزری کر دوں گا۔

خانم۔ اگر آپ ایسا کریں تو بڑی مہربانی۔

سلیمان۔ نہیں خانم میں ایسی مہربانی نہیں کرتا۔ یہ میں مانتا ہوں کہ ماضی ماضی ہے۔ مگر آخر کار مستقبل بھی تو کوئی چیز ہے

خانم۔ کیا آپ کا ارادہ اپنی آیندہ رہائش کا انتظام یہاں ندی آباد میں کرنے کا ہے؟

سلیمان۔ خیال تو یہی ہے۔ فی الحال نواب نصرت جاہ کے پاس رہوں گا اِدھر اُدھر کوئی اچھا سا مکان دیکھوں گا۔ امید ہے ایک ہفتہ کے اندر اندر مل جائے گا۔

خانم۔ بس یہ ٹھیک ہے۔ اس طرح میں آپ سے اپنے مکان پر تو نہ مل سکوں گی۔

سلیمان۔ کیا مطلب؟

خانم۔ آپ نے مجھے وہ ملاقات یاد دلا دی ہے۔ جب آپ جاتی مرتبہ مجھ سے یہاں ملنے آئے تھے۔ آپ کے جانے کے بعد سوائے آج کے دن کے میرے مکان پر کسی آدمی کا سایہ تک نہیں پڑا۔ زمین کے منشی کو بھی یہاں آنے کی اجازت نہیں۔ آج آپ نے یہاں آ کر میرے تمام قواعد توڑ ڈالے ہیں۔

سلیمان۔ خوب۔ میں نے قواعد توڑ ڈالے ہیں۔ کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہو۔

خانم۔ آپ سمجھتے نہیں کہ یہ مکان ایک بوڑھی عورت کا مکان ہے اور۔۔۔

سلیمان۔ ہزار لعنت بھیجو بوڑھی عورت پر۔ خانم میں کھری کھری باتیں کیا کرتا ہوں (فرش پر پاؤں مار کر) من سپاہی زادہ ام گفتار باید درشت میں کہتا ہوں خانم میرے لئے تم ویسی کی ویسی ہو جیسی میں تمہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ اب بھی تمہارے چہرے پر مجھے وہی جوانی کی سرخی

نظر آ رہی ہے جس سے رخصت کے وقت تمہارا چہرہ تمتا رہا تھا۔ تمہاری نشیلی آنکھوں میں اب تک وہی روشنی موجود ہے جس نے مسافرت میں مجھے زندہ رکھا ہے۔ اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے لبوں سے وہی مسکراہٹ جھانک رہی ہے۔ آہ تم کیا جانو میری خانم تمہاری مسکراہٹ نے میرے بستر علالت کو کتنا آرام دہ بنا دیا تھا۔ ہلکے ہلکے بخار میں نرم نرم بستر پر لیٹ کر تمہاری مسکراہٹ کو یاد کرنا کیا مزے کی چیز تھی اور ہاں تمہارے سفید ٹخنوں کی یاد نے جو کبھی کبھار تمہاری ساڑھی کے بورڈر یا بیٹی کوٹ کی جھالر کے ہٹنے سے نظر آجایا کرتے تھے میرے تھکے ہوئے دل و دماغ کو اس وقت تسکین دی ہے۔ جب گولیاں شائیں شائیں کرتی میرے پاس سے گزر جایا کرتی تھیں . . .

خانم۔ اپنی آنکھیں مل لیجئے۔

سلیمان۔ کیوں؟

خانم۔ مجھے دیکھنے کے لئے۔ میں "اب" کیا ہوں۔

سلیمان۔ آج تو خدا کی قسم مجھے کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی کل اگر تھی تو مجھے معلوم نہیں۔

خانم۔ آپ مجھے بنا رہے ہیں۔

سلیمان۔ مجھ پر یہ گمان خانم!

خانم۔ آپ ادب نسائیت کا خیال کر رہے ہیں اور کیا۔ اس کے اظہار کے لئے بھی اب کسی زندہ دل کو تلاش کیجئے جو میری طرح نیم جان نہ ہو جس کے چہرے پر جھریاں نہ ہوں . . .

سلیمان۔ یہاں کوئی آئینہ نہیں ہے کیا؟

خانم۔ میں روز دیکھتی ہوں۔

سلیمان۔ پھر آپ کا آئینہ جھوٹ بکتا ہے۔

خانم۔ جانے دو کرنل یہ مذاق ہیں ان باتوں کو سننا پسند نہیں کرتی۔ اپنے یہاں آنے کا مقصد بتائیے؟

سلیمان۔ مقصد۔ مقصد، مختصر الفاظ میں . . . .

خانم۔ خدا کے لئے مختصر الفاظ میں آپ بہت باتونی بن آئے ہیں۔

سلیمان۔ ہاں ہاں مختصر ہی لیجئے۔ ہم فوجیوں کا تو طور طریق ہی مختصر ہے۔ مقصد میرا یہ ہے — مجھے آپ سے شادی کرنا مقصود ہے۔ خانمی اب دوبارہ پوچھ رہا ہوں۔ یہ طویل مدت جس طرح بھی گزری گزر گئی۔ اس پر اب پچھتانا بے فائدہ ہے اور وہ قصور بھی میرا نہیں تھا۔ سنا ہے عورت فوراً اپنی رائے بدل لیتی ہے — کیا تم نہیں بدل سکتیں؟

خانم۔ میں بھی بدل چکی ہوں سلیمان

سلیمان۔ (آگے بڑھتے ہوئے۔ خوشی سے) خدا کی قسم۔ میری بہت اچھی خانم۔

خانم۔ (ہاتھ سے پرے ہٹاتے ہوئے) آپ سمجھے نہیں۔

سلیمان۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم نے اب اپنی رائے بدل لی ہے یعنی اب . . . .

خانم۔ سلیمان جب میں نے "نہیں" کہا تھا تو یہ لفظ میرے ہونٹوں سے نکلا تھا جبکہ آج سے پندرہ سال پہلے میرا دل اور دماغ "ہاں" کہنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ مگر آج میں دل اور دماغ سے مشورہ کرنے کے بعد "نہیں" کہہ رہی ہوں۔

سلیمان۔ (فرش پر پاؤں مار کر) خانمی اس مرتبہ میں "نہیں" "نہیں" نہیں سنوں گا۔ میں ایک بار نہیں دو بار نہیں بلکہ کئی بار پوچھتا جاؤں گا۔ تاوقتیکہ تم . . . .

خانم۔ آخر کب تک سلیمان؟ تاوقتیکہ میں اپنے آپ کو ایک لڑکی سمجھنے لگوں۔ اونہہ۔ آپ کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ میں اب بوڑھی ہوں آپ کا بار بار پوچھنا میری جوانی واپس نہیں لا سکے گا نہ آپ کی۔

سلیمان۔ میری؟ اگر محبت اور چاہت جوان رہے تو وقت آدمی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

خانم۔ تو کیا آپ کی محبت ابھی تک جوان ہے؟

سلیمان۔ ویسی ہی جوان، تازہ اور مضبوط جیسی یہاں سے جاتے وقت تھی یقین جانو اس میں ذرا کمی بیشی نہیں ہوئی اور یہ ویسی کی ویسی۔

خانم۔ (بات کاٹ کر) میں بتاتی ہوں کیوں۔ چونکہ آپ ہندوستان سے باہر چلے گئے اور آپ کو بہت عزت اور شہرت حاصل ہوئی اس لئے آپ نے محبت کو بالائے طاق رکھ کر دل و دماغ کو اور خیالات سے بھر لیا۔

سلیمان۔ نہیں بھر نہیں لیا . . . .

خانم۔ تو پھر آپ نے میرے خیال کو اپنے دل کے ایک محفوظ گوشے میں چھپا رکھا ہوگا جیسے جواہرات کو چھپا کر محفوظ رکھا جاتا ہے اور کبھی کبھی آپ میرے خیال کو اپنے نہاں خانۂ دل سے نکال کر میری یاد تازہ کرنے کے بعد اُسے پھر اُسی محفوظ جگہ پر رکھ دیتے ہوں گے اور کہیں اگلی لڑائی کے ختم ہونے پر آپ کو اُسے دوبارہ دیکھنے کا موقع ملتا ہوگا لیکن میرا دماغ ان لڑائیوں کے تخصصوں سے آزاد تھا جس طرح پھلوں کو تازہ رکھنے کے لئے ڈبوں میں بند کرکے اوپر مہر لگا دی جاتی ہے۔ میں نے اُس طرح اپنی محبت کو تازہ رکھنے کے لئے اسے دل میں بند کرکے مہر نہیں لگائی تھی بلکہ میں نے اس ناسور کو کھلا چھوڑ رکھا تھا اور اس کا درد ہر لحظہ بڑھتا رہا۔ مگر آخر کار یہ زخم وقت کے ہاتھوں مندمل ہوگیا۔ آہ وقت دنیا میں ہر شخص سے ایک جیسا سلوک نہیں کرتا۔ اُس محبت کے گرد جو آپ کے دل میں میرے لئے تھی۔ وقت ایک پُرنور ہالہ بناتا رہا مگر اُس محبت کو جو میرے دل میں آپ کے لئے تھی وقت نے ختم کر دیا۔ مار ڈالا ذبح کر ڈالا۔

سلیمان۔ میری پیاری خانم۔ اب بھی وقت ہے۔ تیر کماں سے نہیں نکلا محبت کبھی نہیں مرتی۔ وہ سو جاتی ہے۔ میں تمہارے دل میں سوئی ہوئی محبت کو بیدار کر دوں گا اُس میں زندگی ڈال دوں گا۔

خانم۔ بہت سال گزر چکے سلیمان۔ ایک طویل عرصہ۔ سوچو تو آخر انسان کا دل . . . . میں چاہتی ہوں کہ آپ میری بات سمجھ جائیں ـــــ میں خوشی نہیں چاہتی۔ مجھے زندگی نے فارغ رہنے کا سبق دیا ہے۔ میرا وقت اب اچھا کٹ رہا ہے۔

سلیمان۔ میرا وقت کس طرح گزرے گا ؟

خانم۔ آپ کا وقت۔ آپ نے بڑا اچھا وقت گزارا ہے جس طرح ایک مرد کو گزارنا چاہیئے۔ عزت پائی دولت حاصل کی۔ دنیا دیکھی سفر پر سفر کیا گویا کہ ایک مکمل زندگی بسر کی۔

سلیمان۔ میں امیدوں پر زندہ رہا ہوں۔ اب غم کھا کر نہیں جی سکتا۔

خانم۔ اُسے ایک بھولا بسرا خواب سمجھو۔

سلیمان۔ کس چیز کا ؟

خانم۔ کس چیز کا! یہ طویل عرصہ آپ کے لئے بہترین دورِ حیات لایا۔ مگر میرے لئے ایک دائمی مصیبت۔

سلیمان۔ تب ـــــ تب میرے لئے کوئی امید نہیں ـــــ خانم!

خانم۔ کوئی نہیں۔

سلیمان۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اـــــ وـــــ ہ۔ آج میرا افسانہ زندگی ختم ہو چکا۔ مجھے لڑائی پر فوج کے ساتھ کہاں کہاں نہیں جانا پڑا۔ رزنک۔ مصر۔ برما۔ سنگھائی مگر میں نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا . . . .

خانم۔ کرنل صاحب اب آپ ہندوستان میں واپس آگئے ہیں۔

سلیمان۔ (استہزا سے) کرنل۔

خانم۔ لو خدا حافظ مسٹر سلیمان۔

سلیمان۔ خانم۔ میں خانماں برباد ہی رہوں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم کیوں انکار کر رہی ہو۔

خانم۔ لو خدا حافظ۔

سلیمان۔ آہ خانم . . . . خدا حافظ (زیرِ لب) تم نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ (جاتا ہے)

خانم۔ میرا دل تو کبھی کا ٹوٹ چکا ہے۔ (بیٹھتی ہے ـــــ غمگین اور افسردہ آواز میں) ہ زندگی اپنی جو اس رنگ میں گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

نسرین۔ اندر آسکتی ہوں؟

خانم۔ نسرین۔ میرے کہنے پر کہ میں آفتاب سے نہیں مل سکتی۔ تمہارے دل کو صدمہ تو ضرور پہنچا ہوگا۔

نسرین۔ ہم دونوں کا یہی خیال تھا کہ آپ انکار نہیں کریں گی۔ خیر کوئی بات نہیں

خانم۔ نہیں نسرین تم اُس سے میری طرف سے کہہ دو کہ وہ یہاں صرف ایک مرتبہ آسکتا ہے مگر اپنے جوتوں کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد اور یہاں خاموشی سے بیٹھا رہے۔

نسرین۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ ہم دونوں کس قدر خوش ہوں گے۔

(جاتی ہے۔ خانم دو چار کرسیاں سیدھی کرتی ہے۔ سوسن دروازہ کھٹکھٹاتی ہے)

خانم۔ آجاؤ۔

سوسن۔ (حیرانی سے) خانم صاحبہ ؟؟؟

خانم۔ کیا ہوا سوسن ؟

سوسن۔ وہ صاحب جو ابھی یہاں سے گئے ہیں . . .

خانم۔ کیا ہوا انہیں ؟

سوسن۔ انہوں نے مجھے یہ دس روپے کا نوٹ (دکھاتی ہے) دیا ہے۔ کیا میں اِسے رکھ سکتی ہوں ؟

خانم۔ ضرور۔

سوسن۔ انہوں نے کہا تھا کپڑے سلوا لینا یا کسی کو تحفہ کے طور پر اعلیٰ درجہ کے سگرٹ لے دینا۔ میں نئے کپڑے نہیں سلواؤں گی۔ میرے پاس بہت سے ہیں۔ میں دس روپے کے سگرٹ خرید دوں گی۔

خانم۔ سگرٹ ؟ اتنے۔

سوسن۔ جمالی کے لئے

خانم۔ جمالی کے لئے ؟ جمالی کون ہے ؟

سوسن۔ دولت بخش کا لڑکا۔ پڑھا لکھا ہے۔ کیا اُسے سگرٹ کیس خرید دوں۔ بڑے سگرٹ پیتا ہے۔ کہتا ہے مجھ سے شادی کرلو . . .

خانم۔ چپ سوسن۔ تمہیں یاد نہیں میں نے کہا تھا۔ یہاں کوئی مرد نہ آئے۔ اُس کا ذکر تک نہ ہو۔

سوسن۔ جی۔ مجھے یاد ہے۔ اچھی طرح یاد ہے۔

خانم۔ تم اب جوان ہو سوسن . . .

سوسن۔ ہیں ؟ ؟ ؟ اس نومبر میں پورے پچیس سال کی ہو جاؤں گی۔

خانم۔ نہیں تم جوان ہو . . .

سوسن۔ نہیں جی اب کہاں ؟

خانم۔ نہیں سوسن تم جوان ہو۔ میں مانتی ہوں میں نے کہا تھا یہاں کوئی مرد نہ آئے اُس کا ذکر تک نہ ہو لیکن اگر تم کسی مرد سے ملنا چاہتی ہو۔ اُس سے شادی کرنا چاہتی ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں اُس کے متعلق تحقیقات کراؤں گی۔ اگر وہ اچھے گھرانے کا ہوا تو اُسے ہفتہ میں ایک مرتبہ یہاں آنے کی اجازت ہے مگر اس شرط پر کہ وہ نہایت احتیاط سے چلے اور باورچی خانے میں شور نہ مچائے اور زیادہ اونچی آواز میں نہ بولے۔

سوسن۔ (اپنے گھٹنوں پر بیٹھ کر خانم کے گھٹنوں کو پکڑ کر) آہ میری بہت ہی اچھی مالکہ خدا آپ کو خوش رکھے۔

خانم۔ جاؤ سوسن —— خدا کرے کہیں کسی نوجوان کا دل نہ دُکھاؤں

(سوسن جاتی ہے دروازہ بند ہوتا ہے) (آہستہ آہستہ رُک رُک کر)

آہ میرے خدا میری زندگی بھی کیا ہے۔ اونہہ میں اپنی زندگی کو زندگی کب کہہ سکتی ہوں —— ہرگز نہیں۔ ایک بے نام سی خلش۔ اداسی۔ تنہائی۔ پھر وہی بہت لمبی راتیں۔ ختم نہ ہونے والے دن۔ (غمگین لہجہ میں)

بنے ہیں ہونٹ مرے نالہ و فغاں کے لئے

ہے سینہ وقف مرا سوزشِ نہاں کے لئے

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔ پردہ گرنے کے بعد سسکیاں بھرنے کی آواز آتی ہے)

(میرلڈ برگ ہاؤس)

آغا بابر بٹالوی

کیفِ امروز

وہ مستِ ناز پھر مرا مہماں ہے آج کل ۔۔۔ دل پھر اسیرِ کاکلِ پیچاں ہے آج کل
گھر میرا رشکِ گنبدِ گرداں ہے آج کل ۔۔۔ زینت طراز وہ مہِ تاباں ہے آج کل
دن عید ہے تو رات شبِ قدر ہے مری ۔۔۔ پہلو میں میرے وہ شہِ خوباں ہے آج کل
مینا بدوشِ ساقیِ جلوہ طراز ہے ۔۔۔ پھر انبساط و کیف کا ساماں ہے آج کل
گم ہو گیا ہے دل مرا راہوں میں حُسن کی ۔۔۔ بازو پہ میرے زلفِ پریشاں ہے آج کل
طاری ہے ایک کیف سا کل کائنات پر ۔۔۔ لاہور میں وہ شوخ غزل خواں ہے آج کل
کعبے سے اُٹھ رہی ہے گھٹا جھوم جھوم کر ۔۔۔ آتش بجام ساقیِ دوراں ہے آج کل

بزمیؔ نہ کیوں لکھے مے و مینا کی شوخیاں
وہ شوخ صدرِ مجلسِ رنداں ہے آج کل

بزمیؔ انصاری بی۔اے

ریڈیو اور فلم

اداکار کی جسمانی صلاحیتیں

اعلان کے مطابق ہم اس شمارے سے "ریڈیو اور فلم" کا حصہ شروع کر رہے ہیں۔ اس دفعہ فلم کے متعلق ایک مضمون پیش نظر ہے۔ آئندہ ریڈیو کا ذکر ہوگا۔ ہمیں اس سلسلے میں اپنے قلمی معاونین اور قارئین سے بھی مدد کی توقع ہے۔

ادارہ

آرٹ کی تکمیل کے لئے خواہ وہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو۔ جسمانی ضرورتوں سے مفر نہیں بعض مواقع پر تو دماغی صلاحیتیں کتنی ہی اعلیٰ اور موزوں کیوں نہ ہوں لیکن جسمانی نقص اور کمزوری آرٹ تکمیل سے محرومی کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً آنکھوں کی معذوری مصوری کی راہ میں سنگ گراں ہے مصور خواہ کتنی ہی فطری صلاحیتیں رکھے لیکن اندھے پن کے سبب یہ ناممکن ہے کہ وہ مصوری میں نام پیدا کرے۔ بہت چھوٹی اور ٹھیلی انگلیوں والا شخص ساز عمدگی سے بجا نہیں سکتا۔ تُتلا شخص گانے میں شہرت نہیں پیدا کر سکتا۔ اسی طرح اداکار کی جسمانی کمزوریاں اور نقائص اس کو اچھا اداکار بننے سے روکتے ہیں۔

گو یہ صحیح ہے کہ بعض فنون لطیفہ کے ماہروں نے اپنی جسمانی کمزوریوں کے باوجود بھی نام اور کمال کچھ اس طرح پیدا کیا کہ رہتی دنیا تک ان کی شہرت باقی رہے گی مثلاً بتھوون BEETHOVEN نے موسیقی میں اس وقت نام پیدا کیا۔ جب کہ وہ بہت۔ بہرا ہو گیا تھا۔ لیونارڈو ڈاونس LEONARDO DAVINCI نے اپنی آخر عمر میں بائیں ہاتھ سے مصوری سیکھی۔ جب کہ اس کا سیدھا ہات فالج کے اثر سے کام کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ ایک ایسا مصور بھی گزرا ہے۔ جس نے دونوں ہات گنوانے کے بعد۔ پاؤں کی انگلیوں سے مصوری کی اور اپنے کمال کو برابر باقی رکھا۔ جنگ عظیم میں آسٹریا کے ایک ماہر موسیقی نے اپنا سیدھا ہات ضائع کیا۔ لیکن بعد میں بائیں ہات سے پیانو بجانا اس طرح سیکھا کہ لوگوں نے اس کے کمال میں کوئی کمی محسوس نہیں کی لیکن ہمیں یہ غور کرنا چاہئیے کہ اس قسم کے واقعات کتنے ہیں؟ آیا یہ مستثنیات میں سے ہیں۔ یا یہ کہ ہر شخص کے ایسا کرنے کا امکان ہے۔ تجربات شاہد ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ ہر شخص نہ بتھوون ہو سکتا ہے۔ نہ لیونارڈو۔ لیونارڈو نے بائیں ہاتھ سے جو تصویریں بنائی ہیں ویسی تصویریں بڑے بڑے مصور سیدھے ہات سے نہیں بنا سکے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی طبیعتوں کی جولانی عام طبیعتوں سے جدا گانہ ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے واقعات مستثنیات میں سے ہیں اور ان کے حالات زندگی کو سامنے رکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر شخص ایسے ہی حالات میں اسی حیثیت سے ممتاز ہو سکتا ہے۔

عام طور پر اداکار کے لئے اگر وہ نام دنمود پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تو اس میں جسمانی خوبیاں بھی علاوہ فطری صلاحیت اور اعلیٰ دماغی قابلیت کے ہونی چاہئیں۔ اندھے۔ کانے۔ بہرے۔ لنگڑے لولے وغیرہ تو خارج از بحث ہیں معمولی نقائص بھی اسٹیج پر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا لحاظ ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً سر کا جسم کی مناسبت کے لحاظ سے بہت بڑا ہونا پشت یا کمر خمیدہ ہونا۔ ایک پاؤں بڑا اور ایک چھوٹا ہونا اور اوپر کا جسم بہت بڑا ہونا۔ یا اس کے برخلاف پاؤں لمبے تڑنگے اور اوپر کا جسم بہت ہی چھوٹا ہونا وغیرہ۔

مشہور نقاد ایمی بھیانکی لکھتی ہیں: "مجھے وہ گفتگو ابھی تک یاد ہے، کیونکہ میں اس سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ میں بہت کم سن تھی اور ہمارے ہاں ایک شام ای۔ ڈبلو گاڈون، آسکر وائلڈ۔ ولیم آرچر، ہرمن ویزان پروفیسر سر ہیوبرٹ وان۔ ہرکومر جیسی ممتاز ہستیاں جمع تھیں۔ باتوں باتوں میں یہ سوال چھڑا کہ آیا ایسی جسمانی خصوصیات کی تعریف ممکن ہے کہ جس سے عمدہ آواز پیدا ہوتی ہے۔

"میرے خیال میں تناسب کی ضرورت ہے" میرے والد نے کہا۔

"ہا" گاڈون چلایا "خوب کہا بھیانکی تم نے ——— تناسب حقیقت میں تناسب ہی کی ضرورت ہے"

واقعہ یہ ہے کہ جسمانی تناسب کا اثر آواز پر پڑتا ہے۔ مشاہدہ اور

تجربہ اس کے گواہ ہیں کہ جسمانی کمزوریاں آواز پر اثر کرتی ہیں اور جسمانی تناسب کی خوبیاں خوش الحانی اور موزوں آواز کا باعث ہوتی ہیں۔ لمبا نکیلا اور پتلا چہرہ بہت کم عمدہ آواز پیدا کرتا ہے۔ یا جہاں سینہ اور بازو وغیرہ معمولی طور پر پتلے ہوں وہاں بھی عمدہ آواز کا گمان نہیں ہو سکتا اِلّا یہ کہ چہرے سے ان کو خاص مناسبت ہو۔ چوڑائی اس سلسلہ میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ سینہ کی چوڑائی۔ چہرے کی چوڑائی اور ناک کی چوڑائی۔ آپ اچھی اور موزوں آواز رکھنے والے اداکاروں کا تصور کیجیے اور ان کے جسم پر اپنی تنقیدی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کے اجسام میں چوڑائی کا تناسب قائم تھا۔ میں یہاں دو اداکاروں کی مثال پیش کروں گا۔ ایک عمدہ آواز کی اور ایک نحیف اور خراب آواز کی اور ان دونوں کی جسمانی حالتوں پر تبصرہ کروں گا۔ ایک ہنری ارونگ اور دوسرے ویزن۔ ارونگ کا چہرہ لمبا، پتلا تھا اور ناک اونچی اور لمبی۔ کندھے بھی اونچے تھے اور سینہ تنگ تھا۔ اس لئے ان کی آواز نحیف و نزار تھی اور جب وہ اپنی آواز اونچی کرتے تھے تو ایک قسم کی باریک تیزی پیدا ہوتی جو بسا اوقات تماشائیوں کے کانوں پر گراں گذرتی تھی۔ اس کے خلاف ویزن کا چہرہ چوڑا تھا۔ اور ناک بھی اسی مناسبت سے کشادہ تھی۔ چوڑا اور مضبوط سینہ اور بھرے ہوئے بازو سب مل جل کر ایک عجیب و غریب قسم کی موزونیت پیدا کرتے تھے جس کے سبب ان کی آواز صاف اور بلند تھی۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ جسمانی موزونیت کی موجودگی میں آواز کی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس طرح ایک شاعر، ماہر موسیقی، مصور یا فن کار کے لئے موزونیت اور فطری صلاحیتوں کے علاوہ تعلیم و تربیت خصوصاً اپنے فن سے واقفیت ضروری ہے۔ اسی طرح اداکار کے لئے فطری آواز کے ساتھ ساتھ اس کے طریقۂ استعمال سے آگاہی لازمی ہے۔ خوش گلو شخص بغیر فن سے واقف ہوئے ماہر موسیقی نہیں ہو سکتا جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ کونسی گت کس طرح گائی جاتی ہے۔ آواز کے اتار چڑھاؤ سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ اور سُر تان کی پابندی کتنی ضروری ہے ظاہر ہے کہ وہ اپنی بہترین خداداد آواز سے کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتا۔ یہی حال اداکار کا ہے۔ اس کے لئے نہ صرف موزوں آواز کا مالک ہونا ضروری ہے۔ بلکہ تربیت یافتہ ہونا بھی لازمی ہے۔ چنانچہ ویزن نے اپنی خداداد تعلیم و تربیت سے بے پروائی نہیں کی جس کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے فن کو خوب چمکا سکا۔

اداکاری کے سارے نقاد اس پر متفق ہیں کہ اداکار کے لئے موزوں جسامت اور عمدہ آواز جزو لاینفک ہیں۔ اگر کسی اداکار سے یہ خصوصیات نکال لی جائیں تو اکثروں کی رائے ہے کہ وہ اداکار نہیں رہتا۔ انگلستان کے پرانے اداکاروں کی فہرست پر ایک نظر ڈالئے۔ اور تھامس بٹرٹن۔ ڈیوڈ گیرک۔ جان ہنڈرسن۔ کولی سبر۔ مالٹربٹی۔ منڈن میکریڈی۔ میاکلن بکسٹن۔ ولیم فیرن۔ مسز سبر۔ مسز پریچرڈ وغیرہ کی تصویروں کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کے چہرے چوڑے۔ اور ناکیں کشادہ تھیں۔ نتھنے پھیلے ہوئے اور سانس کی آمد و شد کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ بٹرٹن۔ گیرک۔ ہنڈرسن میں یہ خصوصیات زیادہ نمایاں ملیں گی۔ اس لئے ان کے حالات میں آپ کو ہر جگہ آواز کی خوبی کی تعریف ملے گی۔

متذکرہ بالا اداکاروں کی تصویروں سے کیمبل اور ارونگ کی تصاویر کا مقابلہ کیجیے۔ کیمبل کی صورت میں وہی خصوصیات نظر آئیں گی جو ارونگ کی شکل میں نمایاں ہیں یعنی لمبا چہرہ۔ اونچی پتلی ناک اور تنگ دہانہ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دونوں کی آواز قابل اعتراض حد تک پست اور غیر موزوں تھی کیمبل کو دمہ کی شکایت تھی اور ارونگ کو سل کے آثار تکلیف کا باعث ہوا کرتے تھے۔

ایسے جسمانی نقائص جیسے کہ سر کا جسم کی موزونیت کے لحاظ سے بہت بڑا ہونا۔ یا اوپر اور نیچے کے جسم میں توازن کا نہ رہنا اور ایک کا دوسرے سے بدنما حد تک بڑا ہونا۔ پشت یا کمر کا خمیدہ ہونا وغیرہ ہیں یقیناً ناقابل درستی ہیں لیکن آواز کی خرابی بڑی حد تک دور ہو سکتی ہے۔ سانس لینے کے مختلف طریقوں اور اس کی مقررہ ورزش سے آواز کھلتی ہے۔ اور حلق صاف ہو سکتا ہے۔ اور نتھنے ہوا کو اچھی طرح داخل اور خارج کر سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب آواز سے تعلق رکھنے والے اعضا درست ہوں گے تو آواز بھی موزوں ہو جائے گی۔

یہاں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آواز کا جسم کی موزونیت اور غیر موزونیت سے کیا تعلق ہے جسم کی خوبی علیحدہ خصوصیت ہے اور آواز کی اچھائی علیحدہ خصوصیت۔ یاد رہے کہ آواز کا تعلق جسم سے ہے اور جب تک وہ اعضا جو کہ آواز کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں اچھے نہ ہوں آواز کا بھی اچھا ہونا ناممکن ہے مشہور اطالوی مقولہ ہے کہ مقرر اور گویا اپنے جسم سے بولتا اور گاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے اور ایک حد تک وسیع معنوں میں صحیح ہے تو

یہ کہنا پڑے گا کہ اداکار بھی اپنے جسم سے بولتا ہے۔

جب یہ صحیح ہے کہ اداکار کا جسم بولتا ہے تو اس کا خیال ضروری ہے کہ اگر آواز موزوں پیدا کرنا ہو تو جسم کی صحت کا لحاظ رکھا جائے۔ کیونکہ نقص سے بھرے ہوئے اور غیر متوازن جسم سے موزوں اور عمدہ آواز نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس لئے آواز کی بہتری کے لئے جسم کو بہتر بنانا چاہئے۔ مگر ہمارے اداکار اس کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ اگر وہ جسم کی پرداخت کرتے بھی ہیں تو ظاہری حسن کی خاطر اور اس کے اندرونی اثرات سے وہ بالکل ہی ناواقف ہیں۔ عورتیں سو فی صد جسم کی نگہداشت حسن کی خاطر کرتی ہیں مگر ان کی نگہداشت چہرہ ہی کی حد تک محدود رہتی ہے۔ کیونکہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر چہرہ حسین ہو تو کافی ہے۔ حالانکہ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جب تک تمام اعضاء میں تناسب اور موزونیت باقی نہ ہو۔ اور وہ بھی حسین نہ ہوں چہرہ حسین نہیں رہ سکتا۔ انسانی اعضاء ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہیں اور وہ اپنے اثرات برابر ڈالتے رہتے ہیں۔ ایک عضو کی خرابی رفتہ رفتہ دوسرے اعضاء کو خراب کرتی ہے۔ اگر اس خرابی کو بر وقت روک دیا گیا تو وہ پھیلنے نہیں پاتی۔

آپ نے گانے والوں کو دیکھا ہوگا کہ موسیقی میں کمال تو بڑی چیز ہے۔ اچھا ذخل بھی پیدا کرنے کے لئے انھیں کافی ریاضت کرنی پڑتی ہے اور پھر اس کے حصول کے بعد وہ مسلسل مشق کرتے رہتے ہیں تاکہ انھیں لگاؤ باقی رہے۔ تھوڑے دنوں تک بھی اگر وہ بغیر مشق کے رہیں تو پرانا تجربہ خداداد آواز اور فطری صلاحیت سب بالائے طاق رہ جاتی ہیں۔

بالکل اسی طرح اداکار کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ اس کو اپنے فن کی ضروری تکمیل کے لئے بھی کافی ریاضت کرنی چاہئے اور جب اس کو لگاؤ پیدا ہو جائے تو یہ تعلق باقی رکھنے کے لئے مسلسل مشق کا سلسلہ جاری رکھے۔ دور جدید میں اداکاری محض بھونڈی نقالی نہیں رہی ہے بلکہ ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اور اگر اداکار اس جدید نظریہ اور تنقید پر پورا اترنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس فن لطیف کے اصول و قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی درجہ حاصل نہیں ہوگا۔

"آواز، دکھاؤ اور جذبات کا اظہار ———— یہی تین خصوصیتیں ہیں جن کی وجہ سے اداکار اپنے فن کے کمال کا مظاہرہ کر سکتا ہے"۔ جی۔ ایچ لوی کہتا ہے "کوئی فطری صلاحیتیں بغیر ان خصوصیات کے اظہار کے کام نہیں آ سکتیں۔ اداکار کے لئے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ محسوس کرے بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ وہ ان احساسات کی ترجمانی بھی کرے اور پھر ترجمانی بھی ایسی کہ ہو بہو، سچی اور موثر۔ کرخت آواز بھدا اور تاثرات سے خالی چہرہ۔ غیر موزوں حرکات نہ صرف اداکاری پر بدنما داغ لگاتے ہیں بلکہ ڈراما کا بھی خون کرتے ہیں۔ الفاظ کتنے ہی پرمعنی ہوں جملے کتنے ہی پُر درد ہوں۔ بندشیں کتنی ہی چست ہوں اور فقرے کتنے ہی برمحل ہوں لیکن خراب اداکاری سب پر پانی پھیر دیتی ہے۔

سارا برن ہارٹ جن کی خوش الحانی مشہور رہے۔ ایک جگہ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ اسٹیج پر صرف خوش الحانی سے کام نہیں چلتا۔ رسیلی تانیں اور مدھری آواز ضرور اثر پیدا کرتی ہیں۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ اداکار کی حرکات و سکنات بھی موزوں ہونی چاہئیں۔ ورنہ آواز کا اچھا اثر نہ ہوگا۔

"ایک چیز" وہ کہتی ہیں "جس کی طرف سے عام طور پر بے پروائی برتی جاتی ہے۔ وہ آواز کے ساتھ حرکت کی موزونیت ہے۔ حرکت ہی سے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ غم و غصہ کے علامات ظاہر ہوتے ہیں۔ خوشی اور بحالی کا رنگ جھلکتا ہے۔ درد و پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آواز بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اور حرکت اور آواز کا اشتراک عمل سونے پہ سہاگہ ہوتا ہے لیکن اداکار کو یہ معلوم کرنا چاہئے کہ حرکت کو آواز پر فوقیت ہے۔ اور اس کے غیر موزوں ہونے پر اداکاری کا ناس ہونا یقینی ہے۔ تماشائی اور نقاد دونوں ہی آواز کی خرابیوں کے ساتھ ایک حد تک رعایت کر سکتے ہیں لیکن حرکت کی غیر موزونی کو قطعاً ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے"۔

۱۳ رجون ۱۹۲۶ء کے "سنڈے ٹائمز" میں اس زمانہ کی ایک مشہور ایکٹرس مس جون کول کی فن کاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کسی نقاد نے بتلایا کہ کس طرح اس کی کامیابی کا راز حرکات میں مضمر ہے۔ وہ خوبصورت نہ تھی۔ بلکہ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس کے اعضاء میں بہت سے نقائص تھے۔ لیکن اداکار کی جسمانی موزونیت کا معیار اگر پیش نظر رکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ اس میں تناسب موجود تھا اور اپنی حرکات و سکنات میں ان سے بڑی مدد لیتی تھی۔ بلکہ اس کی اداکاری کا سارا دار و مدار ان ہی پر موقوف تھا۔ وہ اپنے پورے جسم سے اداکاری کرتی تھی اور جس عضو سے جو کام لینا چاہئے وہ برابر لیتی تھی اور ان میں افراط و تفریط کا جو کہ شائبہ

نہ تھا۔ اس لئے مناسبت اور موزونیت نمایاں تھی۔ اس کی حرکات جذبات و احساسات کی سچی ترجمانی کرتی تھیں۔ تماشائی اس کے الفاظ سے زیادہ حرکات پر نظریں جماتے تھے اور کہا یہ جاتا ہے کہ زبان نہ جاننے والا بھی اس کی حرکات و سکنات سے مطالب و معانی کی تہ تک پہنچ سکتا تھا۔

یہ طے ہے کہ مس کول کوئی آسمان کی پری تو ہیں نہیں کہ انھیں اداکاری میں جو کمال حاصل ہوا وہ فوق البشری ہے۔ بلکہ ان کی ساری خوبیاں تعلیم و تربیت کی باقاعدگی میں پوشیدہ ہیں۔ چہرے پر تاثرات پیدا کرنے اور اعضاء کو حرکت دینے میں انھوں نے جو کمال پیدا کیا تھا وہ سب کا سب اکتسابی تھا یعنی۔ دلجمعی مسلسل محنت اور توجہ کی مدد سے انھوں نے شہرت حاصل کی اور اسی بناء پر یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ اداکار جو صحیح القویٰ ہو اور موصوفہ کی طرح محنت شاقہ کرے۔ ان کی سی خوبیاں پیدا کر سکتا ہے تعلیم اور تربیت کے لئے اس کا خیال رہنا چاہئے کہ اسکی ابتدا کم سنی ہی کے زمانے سے ہونی چاہئے۔ جب کہ چہرہ اور اعضاء کی ساخت نشوونما اور تبدیلی کے قابل ہوتی ہے پختگی کے آثار پیدا ہونے کے بعد گو کہ قطعی ناکامی نہیں ہوتی لیکن نسبتاً مشکل زیادہ ہوتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی ساتھ جیسا کہ کہیں اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ خاص توجہ اور اصول صحیحہ کی پیروی کے علاوہ مسلسل مشق کی ضرورت ہے۔

مسٹر برنارڈ شا جن کی ڈراما اور اداکاری سے متعلق تنقیدیں اپنی وضع قطع میں ایک خاص چیز ہوتی ہیں ایک ایسی ایکٹرس کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں جس کو اظہار جذبات و احساسات پر اتنا قابو تھا کہ ان کی جلد سے جلد تبدیلیوں کو بغیر کسی وقفہ کے کچھ اس طرح نمایاں کرتی تھی کہ ماہرین نفسیات عش عش کرتے رہ جاتے تھے۔

"جسمانی پھرتی اور اعضاء پر قابو ایسی اہم خصوصیتیں ہیں کہ جن کی وجہ سے اداکار اس فن میں مہارت پیدا کر سکتا ہے بشرطیکہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی تیزی سے کام کرے۔ مشاہدہ سے بروقت کام لے اور اداکاری کی صلاحیت اس کا ساتھ دے۔"

یہ خیال کرنا کہ زندگی کے روزمرّہ کام کاج جسمانی تربیت کے لئے کافی ہیں اور اداکاری کے لئے مزید کسی قسم کی ورزش کی ضرورت نہیں اداکاری کے فن سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ زندگی کی کشمکش میں جو ورزش ہوتی ہے وہ برائے نام معمولی قسم کی صحت کے لئے کافی ہوتی ہے لیکن جسم کو سبک اور لوچ دار بنانے میں کسی طرح مفید نہیں ہو سکتی۔ اداکار کو کم از کم اتنا تو روزانہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنے اعضاء کو پوری طرح حرکت کا موقع دے۔ اس طرح کہ ان کے جوڑوں میں ایک قسم کی لچک پیدا ہو جو آگے چل کر مسلسل مشق کی وجہ سے جسم کے مختلف حصوں پر قابو حاصل کرنے کے مواقع پیدا کرے گی جس طرح کہ ناچنے والے کے لئے ضروری ہے کہ جسم کے ہر ہر عضو اور ہر ہر حصہ کو اپنے قابو میں رکھے بعینہ اسی طرح اداکار کیلئے بھی لازمی ہے کہ وہ بھی اپنے جسم پر اتنا ہی کامل اختیار رکھے ورنہ وہ اپنے جسم کو جذبات کے اظہار کا آلہ نہ بنا سکے گا۔

اداکار کو بسا اوقات ایک ہی رات میں اور ایک ہی تماشے میں زندگی کے مختلف دور اور جذبات کی مختلف کیفیتوں کا اظہار کرنا پڑتا ہے ابھی وہ جوانی کی ساری رنگینیاں سمیٹ کر اپنے تبتر سے ظاہر کر رہا ہے اور ابھی چہرے کو سکیڑ کر اور شکنوں کو طاری کر کے جوانی کا انحطاط اور ضعیفی کا اضمحلال نمایاں کرتا ہے۔ کچھ دیر پہلے خوشی سے اس کی باچھیں کھلی نظر آتی ہیں۔ اور کچھ دیر بعد اُداسی اور مایوسی کی گھٹائیں اس کی پیشانی پر چھا جاتی ہیں۔ کبھی دہشت و خوف کے مارے آنکھیں پھٹی جاتی ہیں اور کبھی ان سے سکون و طمانیت جھلکتی ہے۔ یہی آنکھیں کبھی شوخی سے چمکتی ہیں۔ اور کبھی شرم و حیا سے جھکی پڑتی ہیں۔ ان ہی سے کبھی خوشی کے آنسو اُبل پڑتے ہیں اور کبھی دل خون ہو کر ٹپک پڑتا ہے۔ غرض یہ کہ بہت تھوڑے وقت میں اداکار کو اکثر مرتبہ ایسے اضداد کا جمع کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ جس کے لئے جب تک دماغی صلاحیتوں کا ساتھ جسمانی پھرتی نہ دے اداکار کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اداکار کو نہ صرف بات کرتے وقت جسمانی حرکات سے کام لینا پڑتا ہے۔ بلکہ دوسروں کی گفتگو سنتے وقت بھی اپنے اعضاء سے مدد لینی ضروری ہے۔ مثلاً تماشائیوں پر یہ واضح کرنا اداکار کے لئے لازمی ہے کہ دوسروں کے الفاظ اور فقروں کا اس پر کیا اثر پڑ رہا ہے بعض فقرے اشتعال انگیز ہوتے ہیں بعض غمگین و افسردہ کرنے والے ہوتے ہیں کسی سے دل کی کلی کھل جاتی ہے اور کسی فقرے پر بے ساختہ قہقہہ منہ سے نکل جاتا ہے۔ غرض یہ کہ ہر ہر لفظ اور ہر ہر فقرہ جس طرح مختلف طریقوں سے ادا کیا جاتا ہے اسی طرح مختلف اثرات پیدا کرتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نہ صرف بولنے میں اداکاری کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ سننے میں بھی۔ یہ پہلو اداکار ہمیشہ نظرانداز کر جاتے ہیں۔ اور بولتے وقت تو متاثر ہوتے ہیں لیکن سنتے وقت بالکل ہی بے پروا نظر آتے ہیں۔ ناتجربہ کا

دوسروں کی گفتگو کے وقت اپنا آئندہ پارٹ سوچتے اور یاد کرتے رہ جاتے ہیں۔ اسٹیج پر اداکار کا بت کی طرح غیر متاثر رہنا بے انتہا بدنما نظر آتا ہے۔

مگر یہ خاموش اداکاری زبان کو حرکت دئیے بغیر ایسی آسان نہیں کہ بغیر محنت و مشق کے حاصل ہو سکے۔ اس موقع پر اتنی لطیف اداکاری کرنی پڑتی ہے کہ اس میں تصنع کا شائبہ تک نہ ہو۔ ذرا سی بے احتیاطی اور جسم کو ضرورت سے زیادہ حرکت دینا۔ یا خواہ مخواہ منہ بنانا بہت ہی کریہہ منظر پیش کرتا ہے۔ حرکات و سکنات میں بھی نفسیاتی اشارے اور کنائے۔ ایسے موقع پر استعمال کئے جانے چاہئیں اور دراصل خفیف سی جنبشوں کے ذریعہ جذبات کے امنڈتے ہوئے طوفان کا سماں باندھا جا سکتا ہے۔

اداکاری کا یہ انتہائی کمال اطالوی ایکٹرس "ڈیوس" میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ اس کی چشم و ابرو کے اشاروں میں معانی و مطالب کے دفاتر پوشیدہ ہوتے تھے۔ ایک نگاہ غلط انداز سے وہ جذبات کو تہ و بالا کرتی تھی اور پیشانی کی ایک شکن سے احساسات کے سمندر میں جزر و مد پیدا کرتی تھی۔ ایسے تماشائی جو اطالوی زبان سے بے بہرہ ہوتے تھے۔ وہ بھی اسکی جسمانی نقل و حرکت اور چہرہ کے اتار چڑھاؤ میں ڈراما کی حقیقت کو پہنچ جاتے تھے۔

جس طرح روما ایک ہی دن میں نہیں بن گیا تھا۔ اسی طرح "ڈیوس" بھی اپنا کمال ایک ہی دن میں نہیں پیدا کر لیا۔ چار سال کی عمر سے وہ اسٹیج پر آتی اور جاتی رہی۔ مختلف بہروپ اس نے بدلے مختلف پارٹ اس نے ادا کئے۔ متعدد اداآموزوں سے اس نے تلمذ حاصل کیا اور ان سب سے زیادہ اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس میں اداکاری کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ ضرورت تھی تو صحیح طریقہ کار اور مشق پیہم کی۔ اور اس نے عقل سلیم سے کام لے کر سر اونچا کرنے کی بجائے سر نہوڑا کر دنیا کے نشیب و فراز کو دیکھا اور نتائج خود اخذ کئے۔ اور فن کی تکمیل کے لئے کوئی ریاضت ایسی نہیں چھوڑی جو کہ اس کے دسترس میں تھی۔ وہ گھنٹوں مجسموں کے آگے بیٹھی ان کے تیور دیکھا کرتی تھی۔ بڑے بڑے مصوروں کی تصاویر پر وہ نظریں گاڑتی۔ اور ان سے فرصت ملتی تو جیتی جاگتی۔ چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی۔ گوشت و پوست والی تصاویر کی حرکتوں پر غور کرتی۔ ـــــ تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوئی کہ برنارڈ شا جیسا ناقد کہے کہ ڈیوس کی نقل و حرکت اور نشست و برخاست میں اتنا تنوع ہے کہ جس کا تعین بھی نہیں کیا جا سکتا اور ان سب میں ایک خاص نزاکت۔ لطافت اور خوب صورتی ہے۔ ہر جذبہ اور ہر احساس کا ذرا ذرا سا فرق بھی وہ تماشائیوں کو محسوس کراتی ہے اور پھر لطف یہ کہ ان لاتعداد حرکتوں میں ایک حرکت بھی غیر موزوں اور غیر حسین ہونا تو کجا بار خاطر بھی نہیں ہوتی۔

ڈیوس کی مثال سے یہ ظاہر کرنا مقصد تھا کہ اداکار کو محض فطری صلاحیتوں اور ذہانت و فراست پر تکیہ نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ فنی تعلیم و تربیت سے کسی حال میں بے توجہی نہ کرنی چاہئے۔ ورنہ یہ یاد رہے کہ کمال حاصل کرنا ناممکن ہے۔ عام طور پر نہ صرف اداکار ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں بلکہ اداکاروں کا انتخاب کرنے والے اور بعض متعصب ناقد جنہیں نہ تجربہ کا حق حاصل ہے۔ نہ مشاہدہ۔ اسی غلطی کا شکار رہیں۔ اور بڑی مشکل تو یہ ہے کہ ان واقعات کی موجودگی میں بیچارے اداکار کو محنت و مشق کرنے کے مواقع حاصل نہیں ہوتے۔ اور بسا اوقات وہ یہ سمجھ کر کہ ان کا کوئی وزن نہیں ہے۔ وہ مشق سے جی چراتا ہے جس کا لازمی نتیجہ اداکاری کی فنی خوبیوں کی معدومی ہے۔

ہونہار اداکار ایک تو عوام کی نافہمی کی وجہ سے فنی تعلیم و تربیت حاصل نہیں کرتے اور دوسرے اس وجہ سے کہ ان کے آگے فن اداکاری پر عمدہ ادب موجود نہیں ہے۔ عہد گزشتہ کے اداکار کن اصولوں کی پیروی کرتے تھے اور کن طریقوں پر کاربند ہو کر مہارت پیدا کرتے تھے؟ اپنی کتاب "اداکاری کے مسائل" میں لوئی کالورٹ لکھتے ہیں کہ "اداکار کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ درپیش ہوتی ہے کہ اسے اپنا راستہ آپ بنانا پڑتا ہے۔ اور اپنا معیار آپ قائم کرنا پڑتا ہے۔ گزشتہ دور تاریکی میں ہوتا ہے۔ اور آئندہ کی اسے خبر نہیں ہوتی اور حال کے متعلق وہ مختلف الخیال نقادوں کے آئینہ میں اپنے کمال کا عکس دیکھتا ہے۔ فنی کتابوں کا فقدان اس کو کمال سے واقف نہیں کراتا۔ ایسی کتابیں تو البتہ مل جاتی ہیں۔ جن میں اداکاروں کی نسبت سطحی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہو اور ایسا ادب بھی کم نہیں جس میں چیخنے چلانے۔ ہاتھ ہلانے اور پاؤں پٹکنے کی ترکیبیں موجود ہوتی ہیں لیکن ایسی کتاب مشکل ہی سے ملتی ہے جس میں اداکاروں کے تجربات اور مشاہدات بیان کئے گئے ہوں۔ ان کی دشواریاں اور ان پر قابو پانے کی تدبیریں لکھی گئی ہوں اور اداکاری کے فن سے متعلق تمام ضروری مواد جمع کر دیا گیا ہو۔ اداکار کی پیشہ ورانہ زندگیاں مفید نہیں ہوتیں، بلکہ ان کی فنی زندگیاں دراصل نئے اداکار کو شمع ہدایت دکھاتی ہیں"

سٹینس لوسکی وغیرہ نے بھی اسی قسم کی شکایتیں کی ہیں۔ اداکاری پیشہ ورانہ نقطۂ نظر سے تو ترقی کر رہی ہے لیکن اتنی ہی توجہ فنی پہلو پر نہیں کی جاتی۔ اس خرابی کی ذمہ دار صرف اداکار ہی نہیں بلکہ نقاد اور انشا پرداز بھی ہیں جو اس موضوع پر عمدہ اور معیاری ادب پیش نہیں کرتے۔

سید بادشاہ حسین

غزل

محبت میں سکونِ دل کہاں ہے
ترا ہوشیارِ غم غافل کہاں ہے

کہاں ہے آرزو اے دوست تیری
وہ میری محنتِ حاصل کہاں ہے

ہے خود الفت بھی گم اِس جستجو میں
دلِ آوارہ کی منزل کہاں ہے

حقیقت جس کو سمجھا تھا زمانہ
مرا وہ قصۂ باطل کہاں ہے

محبت میں خودی کے جور رنگیں
میں سہتا تھا مری مشکل کہاں ہے

مری بربادِ الفت کی نہ پوچھو
یہ غم اب درد کے قابل کہاں ہے

جنوں نے مجھ کو پھر صحرا میں گھیرا
وہ میری راہ بے منزل کہاں ہے

کہاں ہے وہ قرارِ دردِ ہستی
وہ جانِ اضطرابِ دل کہاں ہے

نہیں ملتا کوئی بے تابِ الفت
جنوں اب گرمیٔ محفل کہاں ہے

ہے تیری وحشتوں کا پردہ اے قیس
یہ پردہ پردۂ محمل کہاں ہے

تلاطم برق و باراں سیل گرداب
ہماری ناؤ کا ساحل کہاں ہے

یہ بزمِ حسن یہ مے خانہ تیرا
کہاں ہے اے دلِ غافل کہاں ہے

ہے پاداشِ ستم کا نالہ صیاد
یہ شورِ طائرِ بسمل کہاں ہے

محبت کیا ہے اپنا عشق تائب
ہمارا مدعا جز دل کہاں ہے

(ملک) مراتب علی تائب

تیرے بغیر

بے مزہ ہے زندگی کی داستاں تیرے بغیر
بلکہ ہے خود زندگی بارِ گراں تیرے بغیر!

وہ کلی دل کی خزاں میں بھی جو مرجھائی نہ تھی
فصلِ گُل میں ہو گئی نذرِ خزاں تیرے بغیر!

بجھ گیا دل جس میں پنہاں تھا ہجومِ آرزو
کیا کروں نظارۂ ابرِ رواں تیرے بغیر!

ہو چکا مفقود ہمدم! چاندنی راتوں کا کیف
چاندنی راتیں ہوئیں آزارِ جاں تیرے بغیر!

کھو چکے رعنائیاں، زیبائیاں مدت ہوئی
سبزہ زار و منظرِ آبِ رواں تیرے بغیر!

مٹ گیا وہ حسنِ ہنگامِ طلوعِ آفتاب
دلنشیں ہے صبح کا منظر کہاں تیرے بغیر!

سر بسر بے کیف ہیں بے لطف ہیں حسن ہیں
آبشار و جوئبار و گلستاں تیرے بغیر!

جگن ناتھ آزاد، بی اے

رُت آگئی

ساقیا! وہ دیکھ اٹھی ہے گھٹا رت آگئی
اپنی چشمِ مست کا ساغر بڑھا رُت آگئی

چھا رہی ہے تیرے متوالوں پہ گونہ بے خودی
چاندنی راتوں کی وہ "بہتی" سنا رُت آگئی

آ گئے پینے پلانے اور چھلکانے کے دن
مستیاں آنکھوں کی صہبا میں ملا رُت آگئی

جھانکتی ہے پھر افق سے نکھری نکھری سی بہار
خرمنِ غم پر ذرا بجلی گرا رُت آگئی

پھر کوئی بے تاب نغمہ مُطرب رنگیں نوا
وجد میں پھر روحِ موسیقی کو لا۔ رُت آگئی

جعفر شیرازی



آپ کے سنگار کا نکھار

آٹو دل بہار

کے چند قطروں پر منحصر ہے جو آپ اپنے رومال یا لباس پر لگائیں گے آٹو دل بہار ایک غیر معمولی دلفریب خوشبو ہے جو بالکل سے سبز ہے قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ چھوٹی شیشی ایک ڈرام ۱۲/ر

خوشبو دار کارڈ ار مفت نمونوں کے لئے ۲ر کے ٹکٹ بھیجیں۔

آٹو ممی بلوم شب ملے بہار کے پھولوں کی خوشبو قیمت عہ فی اونس مفت نمونہ کے لئے ۲ر کے ٹکٹ۔

آٹو مشک بہار رومال کے لئے مشک اذفر کی بہترین خوشبو ہے نمونہ کے لئے ۲ر کے ٹکٹ

سول ایجنٹ:۔

اینگلو انڈین ڈرگ اینڈ کیمیکل کمپنی بمبئی نمبر ۲ ار ے ڈی،



دن کو بہتر طور پر شروع کریں

لسٹرین کلائیکو تھامو

کا روزانہ استعمال ناک اور دانتوں کی صفائی کے لئے اور دانتوں کو گرنے سے بچانے کے لئے بہترین عمل ہے سائنس کے جدید اصولوں پر بنا ہوا یہ سیال نہایت خوشگوار مزہ رکھتا ہے اور منہ کو خوشبودار اور صاف کر دیتا ہے اور جراثیم کو بالکل تباہ کر دیتا ہے۔ ہر معزز دوا فروش سے مل سکتا ہے۔

تیار کردہ:۔ **گرائس اینڈ اوون کمپنی نیویارک امریکہ**

ہندوستان کے باضابطہ اور مختار ایجنٹ برائے ہندوستان۔ برما و سیلون

ایم اے جے نوبل نمبر ۱۹ پارسی بازار سٹریٹ فوٹ بمبئی

ہندوستان سنو

HINDOSTAN SNOW



اگر آپ ہمیشہ ہندوستان سنو استعمال کریں گے تو یقیناً آپ کے چہرے کی جلد کبھی خراب نہ ہو گی بلکہ تازہ نرم اور گلاب جیسی ملائم رہے گی۔ ہندوستان سنو کے استعمال سے جلد کی کوئی مرض نزدیک نہیں آتی۔ گرمی کے موسم میں چہرے پر لگانے سے ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے مچھر کے کاٹنے کے بعد ہندوستان سنو لگانے سے جلن دور ہو جاتی ہے گھر سے باہر نکلنے سے پہلے استعمال کیا کریں سورج کی تپش اثر نہ کرے گی غرض ہندوستان سنو گالوں کو ملائم کرنے چہرے سے مہاسے اور جھریاں دور کرنے کے لئے بہترین سنو ہے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ایجنٹ درکار ہیں مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت کریں۔

یونیورسل پرفیومری ورکس نمبر ۹۵ کالبیکر سٹریٹ بمبئی نمبر ۳



طاقت اور تندرستی کے لئے

بچوں کو

ڈونگرے کا بال امرت

پلانا چاہیئے

اس کے استعمال سے بچوں کی کھانسی بخار رفع ہوتے ہیں۔

دنیائے ادب

اقبال کی نگاہ میں عورت کی حیثیت

جس وقت ہندوستان کے نشاۃ الثانیہ کی تاریخ لکھی جائے گی، اس وقت اقبال کی اہمیت کا لوگوں کو صحیح اندازہ ہوگا۔ محض اردو شاعری ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے حرکت و عمل کے مظاہرے بھی اس شاعر اعظم کے مرہون منت ہیں۔ اس نے محض شاعری نہیں کی، قوم کو حرکت و عمل جدوجہد اور تگ و دو کے جو روح پرور نغمے سنائے اور زندگی اور زندہ دلی کا جو پیغام دیا وہ بہت حد تک ہماری بے حسی کو دفع کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا۔

اس نے زندگی کے مسائل حل کرنے میں اکثر ٹھوکریں کھائیں لیکن اس نے کبھی زندگی سے گریز نہیں کیا اور تمام سیاسی و معاشرتی مسائل پر گہری نگاہ ڈالی۔ اردو شاعری میں یہ گہرائی اور بلندی ایک نئے دور کی بنیاد ڈالتی ہے۔ مثلاً چند اشعار پیش ہیں ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے ۔۔۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

مرد بے حوصلہ کرتا ہے زمانہ کا گلا ۔۔۔ بندۂ حُر کے لئے نشتر تقدیر ہے نوش

دے ولولۂ شوق جسے لذت پرواز ۔۔۔ کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج

صرف یہی نہیں بلکہ الفاظ کی جدت اور بیان کی ندرت کے لحاظ سے بھی اردو کا کوئی شاعر ان کا مد مقابل نہیں ہو سکتا۔ کہا گیا ہے کہ اعلیٰ ترین شاعر نہ صرف اپنے تجربات سے محظوظ ہوتا ہے بلکہ ان پر غور و خوض بھی کرتا ہے نیز اپنے ذہن میں ہم آہنگی کا ایک احساس پیدا کر لیتا ہے جس کی روشنی میں وہ اپنے سارے تجربات کی جانچ کر کے ایک انتہائی کوشش میں اس کو عالمگیر اور مثالی قالب عطا کرتا ہے۔ اقبال اس معیار پر پورا اترتا ہے اور اس لحاظ سے اردو شاعری میں منفرد اہمیت کا مالک ہے۔

اقبال کی موت ایسا سانحۂ عظیم ہے اور اس سے ہمارے دلوں پر ایسی شدید ضرب کاری لگی ہے کہ اس کے کلام کا تشریحی تجزیہ ابھی ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن ان کے سامنے سب سے بڑی نیاز عقیدت جو پیش کی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ ہم ان کے کلام و پیام کو تحقیق کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کریں اور دیکھیں کہ کہاں تک وہ ہم کو ہمارے مسائل کے حل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اقبال ایک خاص دور اور ایک خاص ذہنیت کی پیداوار تھے اور باوجود وسعت علم اور فلسفہ پر کامل عبور کے انہوں نے جو لائحہ عمل ہمارے سامنے پیش کیا وہ ایک رجعت پسندانہ ذہنیت کا حامل ہے۔ اقبال کے پیام کے مداح ممکن ہے اس بیان پر چیں بر جبیں ہوں لیکن یہ ان کی زیادتی ہے۔ جب تک شخصیت پرستی کی یہ رکیک ذہنیت ہم سے دور نہیں ہوگی ہماری عقل پر پردہ پڑا رہے گا اور ہم عمل کے لئے بے کار رہیں گے اقبال کے پیام کے ارتقا اور نصب العین پر کبھی فرصت کے وقت بحث کی جائے گی اس وقت موضوع زیر بحث ان کے پیام کا صرف ایک پہلو ہے۔

سوسائٹی میں عورت کی حیثیت ہی وہ محور ہے جس کے گرد ہمارے سارے معاشرتی مسائل چکر لگاتے ہیں اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ہندوستانیوں نے نہ تو وہ لائحہ عمل تجویز کیا ہے جس پر ہماری سوسائٹی کے نصف مظلوم حصہ کو گامزن ہونا ہے اور نہ اس بات کا تصفیہ کیا ہے۔ کہ ہم جدھر جا رہے ہیں وہ راہ ہم کو کدھر لے جا رہی ہے۔ ناممکن تھا کہ ایسا بنیادی مسئلہ اقبال کی وسعت بیں نگاہوں سے محفوظ رہ جاتا۔ چنانچہ "بانگ درا" ہی میں اس نے اکبر کے طنز یہ انداز میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد "ضرب کلیم" میں جس میں اس نے اکثر مسائل حاضرہ پر

تصور کیا ہے۔ ایک پورا باب اس کے لئے وقف ہے اور پھر اپنی معرکتہ الآرا اور عہد آفریں کتاب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (بزبان انگریزی) میں بھی اس پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ مثنوی رموز بے خودی میں بھی اس موضوع سے متعلق چند اشعار ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

(بانگ درا)

اسی سلسلہ میں ایک اور جگہ فرمایا ہے ؎

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوشمند غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہے گی

کون کہہ سکتا ہے کہ ان اشعار میں اکبر کی شاعری کی روح حلول نہیں کر گئی ہے۔ وہی رجعت پسندی، وہی قدامت پرستی، وہی جدید تمدن کے خلاف احتجاج! لیکن افسوس ہے کہ ان بزرگان قوم کے سامنے تاریخ کا یہ مسئلہ نہیں تھا کہ معاشرتی اور اقتصادی تحریکیں، بنیادی مسائل کا پرتو ہوتی ہیں اور فرسودہ نظام کے نام لیوا طنز کے ذریعے سے پانی کے دھارے کو نہیں روک سکتے۔ اکبر کی شاعری میں وہ تنازع منعکس ہے جو پرانی اور نئی روشنی کے ملاپ سے، متوسط طبقہ کے مسلمانوں کو درپیش ہے اقبال کی شاعری بھی اس جذباتی ردِ عمل کا آئینہ ہے۔ مگر چونکہ وہ محقق بھی ہیں اور مفکر بھی اس لئے انہوں نے اپنے جذبات پر فلسفیانہ رنگ چڑھا دیا ہے۔

اقبال کے فلسفیانہ کردار کی ترتیب اور ذہنی نشو ونما میں جو اثر سب سے زیادہ فیصلہ کن ثابت ہوا وہ ان کا یورپ کا سفر تھا۔ مشرقی فلسفہ کی تحقیق کے سلسلہ میں ان کو اکثر جرمن اکابر کے خیالات کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ ان کے ذہنی افق کی تشکیل میں اس تعلق نے زبردست کام کیا اور اگرچہ یہ تو قطعی غلط ہے، جیسا بعض لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ اصولاً و فروعاً ان کا فلسفہ نطشے اور برگساں کے فلسفہ کا چربہ ہے کیونکہ ایک ایسے طباع شخص پر اندھی تقلید کا الزام صداقت پسندی کے منافی ہے، لیکن یہ ضرور صحیح ہے کہ اقبال کے فلسفہ میں اور ان دو حضرات کے فلسفہ میں واضح اور بین مماثلت ہے۔ اس وقت گنجائش نہیں کہ نطشے اور برگساں کے فلسفہ پر گہری روشنی ڈالی جائے لیکن موضوع زیر بحث کو سمجھنے کے لئے ان حضرات کے فلسفہ کا موجودہ سیاسی تحریکوں سے تعلق کا ذکر کرنا ازبس لازمی ہے۔

شوپنہار کا فلسفہ قدیم ہندو فلسفہ اُپنشد کے فیضان کا منت کش ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ موجودہ رجعت پرست فسطائی تحریک کا مورث اعلیٰ بھی شوپنہار ہی ہے۔ فسطائی فلسفہ کا قریبی تعلق نطشے سے ہے جو شوپنہار کا "شاگرد" تھا۔ فلسفیانہ بحث اس موقع پر ہمارے موضوع سے خارج ہے ورنہ میں یہ دکھاتا کہ وہ حضرات جو شوپنہار اور نطشے کے فلسفے میں بنیادی فرق جتاتے ہیں کس حد تک غلط ہیں یہ غلط فہمی بہت حد تک شوپنہار کے فلسفہ کے متناقض براہین کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ کا تیسرا شخص فرانسیسی فلسفی برگساں ہے یہاں پر صرف اتنا بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر "صوفی" شوپنہار فسطائیت کا مورث اعلیٰ تھا اور رجعت پسند کلبی نطشے "اس تحریک کا طبمانہ نقیب"، تو فسطائیت کے فلسفہ کی بنیادی تمدین کا سہرا۔ مادیت اور روحانیت کے امتزاج کی کوشش کرنے والے فلاسفر برگساں کے سر ہے۔ اقبال کے فلسفہ کا ان ہر سہ حضرات کے بنیادی فلسفہ سے جو تعلق ہے وہ بحث کا محتاج نہیں۔ "فلسفۂ شاہین" "نظریۂ فوق البشر" "نقطۂ ستی کردار" اور بے شمار جزوی اور اساسی نکتے ہیں جو اس دعوے کو ثابت کرتے ہیں۔

پھر قبل اس کے کہ ہم اقبال کے فلسفہ میں عورت کی حیثیت پر روشنی ڈالیں لگے ہاتھوں ذرا شوپنہار کے نظریہ پر بھی غور کر لیجئے اور اس فلسفہ کا جو عملی مظاہرہ فسطائی جرمنی میں پیش ہو رہا ہے اس کو بھی بھول نہ جائیے۔ شوپنہار عورت کی شہری حیثیت کو کبھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ وہ عورت کو قطعی نکما خیال کرتا تھا اور ان کا کام محض افزائش نسل تجویز کرتا تھا شوپنہار کے رویہ میں اور قدیم ہندو فلسفہ کے معماروں میں بہت یکسانیت پائی جاتی ہے۔ شوپنہار کا یہ نظریہ جو قرون وسطیٰ کی خصوصیت تھی آج اس بیسویں صدی میں فسطائی تحریک کے علم برداروں کا الہام ثابت ہوا ہے اور فسطائیت کا جو رویہ نسوانی تحریک کے خلاف ہے۔ وہ نتیجہ ہے اس قریبی تعلق کا جو شوپنہار کے فلسفہ کو فسطائیت سے ہے۔ آج جرمنی کی عورتوں کے سامنے جو لائحہ عمل پیش کیا جا رہا ہے وہ "بندگی، بچے، اور باورچی خانہ" کے تین عنوانوں سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ "بندگی" یا مذہب پرستی، اس لئے کہ اس کے بغیر عورتیں اپنی آزادی کو بیچنے کے لئے آسانی سے تیار نہ ہوتیں۔ "بچے" اس لئے کہ ہٹلر کی فوج کی تعداد میں کمی کا خطرہ نہ پیدا ہو۔ "باورچی خانہ" اس لئے کہ مرد کی فوقیت د

برتری برقرار رہے اور اس لئے بھی کہ جب مردوں ہی کو روزگار نہیں ملتا تو عورتوں کو اس کشمکش میں شریک کر لینے سے مصیبتوں کا اور اضافہ ہو جائے گا۔ ہٹلر بہ بانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ "عورتوں کا فرض محض بچے پیدا کرنا ہے جو سپاہی ہو سکیں۔ میدان جنگ میں قتل ہونے سے زیادہ اعلیٰ تخیل انسانیت کے پیش نظر نہیں!" "مادریت" کا یہ نظریہ قدیم ہندو کھشتری تخیل کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ ہٹلر کا دست راست گوئرنگ کہتا ہے "عورت کی جگہ گھر میں ہے اور اس کا فرض تھکے ماندے سپاہی کی تفنن طبع" اور ہٹلر کا پبلسٹی ایجنٹ گیبلس رقمطراز ہے "عورت کا فرض خوب صورت بننا اور بچے جننا ہے مادہ طیور اپنے کو نر پرندوں کے لئے سنوارتی اور انڈوں پر بیٹھتی ہیں، اس کے بدلے نر حفاظت کا کام اپنے ذمہ لیتا ہے" بالکل درست، اس وحشیانہ اور حیوانی تحریک کے سامنے ایسا ہی نصب العین ہونا چاہیئے جو حیوانوں کا طریقۂ کار ہو!

ان حقائق بالا کی روشنی میں دیکھیے تو آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ کم از کم نطشے کا نظریہ [illegible]ل کے تخیل پر کس حد تک اثر انداز ہوا آگے میں یہ بھی دکھ[illegible] کوشش کروں گا کہ فسطائیت کے وہ دعاوی جن کا اوپر ذکر ہو[illegible] اقبال کے نصب العین سے کتنے متفق ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اقبال [illegible] مسلمان تھا اور فلاسفر تھا۔ اس لئے وہ شوپنہار اور منو کا ہم نوا ہو کر عورت کو برائیوں کا ملجا و ماوی نہیں قرار دے سکتا اور نہ عورت کی ذات کو برائیوں کا پیش خیمہ تصور کر سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے ناقابل تقلید شاعرانہ انداز بیان سے کہتا ہے ؎

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں

یہ تجرید و تحلیل ممکن ہے [illegible] بنیادی مسئلہ کی طرف سے ہم کو بہکا دے، لیکن یہ صاف گو انسان کبھی الفاظ چباتا نہیں اور اپنے خیالات عورت کی حیثیت کے متعلق نہایت واضح الفاظ میں ظاہر کرتا ہے، "آزادی نسواں" کے عنوان کے تحت کہتا ہے ؎

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردان خردمند

جب اس راز کے انکشاف کا موقع آتا ہے تو اس کو اگرچہ شاعرانہ استدلال سے بیان کیا ہے لیکن اس کے معنی و مطلب قطعی آشکارا ہیں کہتے ہیں ؎

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادئ نسواں کہ زمرد کا گلوبند؟

اے کاش آزادی کا یہ پیغام بر، حرکت و عمل کا یہ نقیب غور کرتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ آزادئ نسواں یا زمرد کا گلوبند؟ اس منطق کو یہیں پر کیوں محدود کر دیا۔ اس کو ذرا اور وسعت دی ہوتی تو "خودی" کا سارا پیغام بے معنی ہو جاتا۔ زمرد کا گلوبند ہو۔ یا یاقوت و ہیرے کا۔ یہ مادی اشیا، خودی کا کس طرح نعم البدل ہو سکتی ہیں۔ مگر یہاں تو عورت کے لئے خودی کا ذکر ہی نہیں آتا ہے اور یہ اعلےٰ پیام ان کے لئے شرمندۂ معنی نہیں! عورت کی حفاظت کے عنوان سے فرماتے ہیں ؎

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

یہ ایسا فاش قسم کا متناقص دعوٰے ہے کہ اس کی بوالعجبی ہم کو یقیناً انگشت بدنداں ہونے پر مجبور کرتی اگر ہم اس نظریہ کی تلخ حقیقت کو قابل قبول سمجھتے۔ وہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہم عورت کی "انسانیت" کو تسلیم نہیں کرتے۔ عورت اس نقطۂ نگاہ سے ایک انسانی ہستی نہیں رہتی۔ بلکہ یا تو وہ ایک عجیب الخلقت چیز ہے۔ یا ایک ماورائے انسان ہستی۔ ہمارا سارا جنسی بیوپار کسبی و غیر کسبی کا معاملہ اسی بات کا ممنون ہے کہ جب ہم عورت کی جنسی حیثیت ہی پر غور کریں گے تو اس کی انسانی حیثیت معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ ہمارے اخلاق کے نام نہاد پاسبان فضول شور مچاتے ہیں۔ دراصل ان ہی کے تخیل اور نظریہ کا اثر ہے کہ بے اخلاقی کا سیلاب مذہب اور قانون کی نت نئی دیواروں کے باوصف اب تک روکے نہیں رکا۔ رکے بھی کیسے۔ ہمارا دماغی افق اس حد تک تاریک ہو چکا ہے کہ ہم عورت کا تصور جنسی و نفسانی حیثیت کے بغیر کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم تو عورت کو محض ایک نسائی پیکر سمجھتے ہیں۔ پھر یہ واویلا شیون کہ "اخلاقیات" کو بروئے کار لائے قدرت اور انسانی فطرت سے جنگ کے مترادف ہے۔ اور کیوں اعتراض کیا جاتا ہے کہ ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

"یہ زمرد کی گلوبندی" اور "مرد کی نگہبانی کے الفاظ ہٹلر کو زیادہ زیب

دیتے ہیں۔ ایک ایسے ملک اور نظام کے لئے زیادہ مناسب ہیں جہاں علم ایک بے معنی شے قرار دی جاتی ہے اور انسانیت کا منتہائے مقصد محض جنگ جوئی اور جنگ پرستی قرار دیا جاتا ہے۔ اقبال کے الفاظ قریب قریب گیبلس کے الفاظ کے ہم معنی ہیں (یعنی مادہ پرندے اپنے کو نر پرندوں کے لئے "سجاتے" سنوارتے ہیں اور انڈوں پر بیٹھتے ہیں۔ اس کے بدلے نر "حفاظت" کا کام اپنے ذمہ لیتا ہے) اقبال اور ہٹلر کا یہ اتحاد کتنا عجیب اتحاد ہے۔ ایک طرف اسلام کا پرستار، مساوات کا نام لیوا۔ آزادی کا علم بردار اقبال! اور دوسری طرف تنگ سماج پرستار، بربریت کا شیدا۔ آزادی کو بے معنی لفظ قرار دینے والا "چنگیز" ہٹلر!

اصل وجہ یہ ہے کہ اقبال مغربی تہذیب سے بیزار ہے اور ہر وہ چیز جو اس تہذیب سے تعلق رکھتی ہے اس کی نگاہوں میں کھٹکتی ہے۔ وہ اس بات کو ضرور محسوس کرتا ہے کہ بنیادی مسئلہ کی طرف ہمیشہ نگاہ غلط انداز ڈالی گئی ؎

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں

ظاہر ہے کہ اس سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری ساری کوششیں محض اس لئے شرمندۂ کامیابی نہیں ہوئیں کہ ہم نے ہمیشہ غلط نظریے قائم کئے۔ جس کی وجہ سے ہماری بحث بنیادی مسئلہ سے دوچار نہیں ہوئی ہم نے ہمیشہ آزادی۔ پردہ اور تعلیم کے الفاظ میں اس مسئلہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی لیکن کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ جب تک معاشی اقتصادی آزادی نہ حاصل ہو۔ ہماری نام نہاد آزادی محض فریب خیال ثابت ہوگی۔ یہ شکایت کرنے کے بعد کہ ؎

فکر او از تاب مغرب روشن است ظاہرش زن باطن او نازن است

وہ پریشان ہو کر پکار اٹھتا ہے ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

میری تو شکایت یہی ہے کہ ہماری معاشرت اور ہماری "تعلیم" زن کو "نازن" نہیں بناتی یعنی زن کا جو جنسی صنفی اور تفریحی تخیل ہم نے قائم کیا ہے اور جو ماورائے دیگر انسانی فرائض ہے وہ بدستور برقرار رہتا ہے اور ہم زن کو صرف اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ سوسائٹی کے باغ میں خوش نما۔ خوش رنگ، دلفریب تتلیوں کا کام دے۔ اگرچہ سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ افزائش نسل عورت کے فرائض کا محض ایک رُخ ہے (جو یقیناً لازمی ہے) لیکن سوسائٹی کی بقا و بہبود کے لئے عورت کے ذمے دیگر فرائض بھی عائد ہوئے ہیں۔ جہاں تک نسل کی حفاظت کا سوال ہے مرد اور عورت جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں کیونکہ اعضا اور عمل کی تفریق دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ یہ "تحفظ نسلی" کا فرض ہے لیکن "تحفظ شخصی" کے لئے مرد و عورت یکساں اعضا رکھتے ہیں۔ یکساں فرض دونوں کے ذمہ ہے۔ دونوں کا دائرۂ عمل ایک ہے آرٹ، سائنس، صنعت، حرفت، زراعت، تجارت، سیاست، مذہب تہذیب و تمدن یہ سب تحفظ شخصی کے مظاہرے ہیں۔ ان کی بقا و تحفظ ان کی برقراری و ترقی ایک عام فرض ہے۔ جو مرد و عورت دونوں پر عائد ہوتا ہے جس کے لئے مرد و عورت دونوں کلیۃً یکساں حیثیت سے ذمہ دار ہیں۔ اقبال اگرچہ اپنے کو "مظلومی نسواں سے ہوں غم ناک بہت" بتاتے ہیں لیکن وہ اس "عقدۂ مشکل کی کشود" اس لئے نہیں کر پاتے کہ انھوں نے ان دونوں فرائض کو خلط ملط کر دیا اور یہ کہنے کے بعد کہ ؎

راز ہے اس کے تپ غم کا یہی نکتۂ شوق آتشیں لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود

وہ یہ سمجھ گئے کہ عورت کی کل کائنات اسی لذت تخلیق سے محفوظ ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ ؎

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

محض لفظی بحث ہے۔ اعضا اور عمل کی یہ تفریق دونوں کے فرائض کو اتنا جدا نہیں کرتی کہ عورت محض افزائش نسل کو اپنی کل حرکت، سارا عمل، پورا فرض سمجھے اور تمام وہ ذہنیتیں اور عمل کی تمام وہ موجیں جو اس کی "انسانی" دنیا میں اٹھکیلیاں کرتی رہتی ہیں۔ ان کو فعل عبث قرار دے اور اپنے سے بعید سمجھے اور پھر جب اس پر جائز حرکت و عمل کی دنیا حرام قرار دی جا چکی اور وہ سوسائٹی میں کوئی مہتم بالشان کام سرانجام نہ دے سکی تو کہا جاتا ہے "مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی" اور پھر اس کو یہ کہہ کر بہلایا جاتا ہے کہ ؎

اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

اقبال کی علمی اور فلسفی دنیا میں عورت کا کام محض افلاطوں پیدا کرنا ہے ہٹلر کی دنیا میں محض سپاہی پیدا کرنا۔ اقبال کی "زندہ حقیقت" یہ ہے کہ عورت مرد کی دست نگر رہے۔ مرد اس کا محافظ رہے۔ عورت بچے پیدا کیا کرے اور مرد "خودی" کے مسائل حل کیا کرے! اور جو قوم اس قعر مذلت میں گرنا قبول نہیں کرتی اس کے لئے یہ حکم صادر ہوتا ہے "اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد" لیکن تاریخ محض خواہشات سے

بدلی نہیں جاسکتی۔ یونان و روما۔ ہند و بابل کا تنزل وانحطاط۔ بوسیدگی و فرسودگی اس بات کی شاہد ہے کہ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اقبال کا آزاد عورت کے متعلق یہ کہنا کہ ؎

ایں گل از بستان ما نارستہ بہ \
داغش از دامان ملت شستہ بہ

مجھے ان بوڑھی عورتوں کا خیال دلاتا ہے جو تعلیم یافتہ اور آزاد عورت کو دیکھ کر کوستی ہیں۔ اپنے مخصوص نظریہ کا اعادہ وہ اس سلسلہ میں بھی کرتا ہے ؎

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور \
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

اگرچہ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "فرنگی معاشرت" کیا چیز ہے۔ سائنتفی تہذیب یا حرفتی تہذیب۔ سامراجی نظام یا فسطائی یا اشتراکی، بورژوا[1] نظام یا پرولیتاری، کیونکہ ہر ایک میں عورت کے سامنے جداگانہ مطمح نظر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ حرفتی تہذیب جو صنعتی انقلاب کے بعد منصۂ شہود پر آئی اپنے دن گزار چکی ہے اور دنیا کے سامنے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے۔ ایک جگہ پر قیام ناممکن معلوم ہوتا ہے فسطائیت کے صوفی فلاسفر اسپنگلر نے تو خیر اپنی شہرۂ آفاق کتاب "زوال مغرب" میں انقلاب فرانس ہی کو مغربیت کے زوال کا پہلا زینہ قرار دیا ہے۔ اسپنگلر نے جو تجزیہ کیا ہے، اقبال نے اپنی کتاب تشکیل جدید میں اس کی صداقت پر مہر لگائی ہے لیکن اسپنگلر کی یہ مذہبی تشریح اس بات پر پردہ نہیں ڈال سکتی کہ جس چیز سے تہذیب کا "زوال ظاہر ہوتا ہے وہ وہ افراتفری اور ابتری ہے جو بظاہر موجودہ معاشرت کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ صرف ایک نئے دور کی پیدائش کا پتہ دیتی ہے اور یہ درد کرب محض یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم محض ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ ہاں اس بات کا تصفیہ بخش جواب آسان نہیں کہ آیندہ دور انسانی معراج اور معاشرتی ترقی کا دور ہوگا یا دنیا پھر کئی صدی پیچھے لوٹے گی اور رجعت پرست فسطائی تحریک میں اپنے کو روپوش کرے گی۔ اقبال کا یہ سوال کہ ؎

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟ \
مرد بے کار و زن تہی آغوش

بہت معنی خیز سوال ہے کہ ہم کو ایک بنیادی مسئلہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے ہمارے موجودہ نظام میں بے روزگاری ایک وبا کی طرح پھیل رہی ہے اور ہمارے تہذیب کے دعوے کو جھٹلاتی ہے لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ دنیا میں آج غریبی اور بے روزگاری کا مسئلہ اشیا کی کمی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ ہم نے سائنس کی مدد سے اشیاء کی پیداوار کا مسئلہ تو حل کر لیا ہے لیکن ان کی تقسیم کا اور استعمال کرنے کا مسئلہ اب تک حل نہ کر سکے۔ زن کی تہی آغوشی کی شکایت ذرا فضول سی ہے۔ اگرچہ شاعرانہ تضاد کے لحاظ سے "مرد بے کار و زن تہی آغوش" ایک نہایت ہی عمدہ طرز ادا ہے لیکن اگر موخر الذکر الزام میں کچھ حقیقت ہے تو وہ اتنی بنیادی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پیدائش کی تعداد میں کمی ہماری موجودہ تہذیب کا ایک مریضانہ پہلو ہے لیکن اس کا احساس عام ہو چلا ہے اور اس کا تدارک تھوڑے عرصہ کی بات ہے۔

اوپر کی بحث ہم کو لاچار اس ناخوشگوار نتیجہ کی طرف لیجاتی ہے کہ اقبال نے اس مسئلہ کے حل میں جو مطمح نظر پیش کیا ہے وہ ہمارے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ "شاعر مشرق" کا نظریہ۔ اس ذہنیت کا غیر محسوس طور پر شکار رہا ہے جس کے تحت مشرق اپنی پستی کا احساس کر کے مغرب پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش میں سرگرم ہے اور اگر کہیں کہیں مغرب کے داغ کو نمایاں کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے تو اکثر اس فعل عبث کا نتیجہ محض ہماری کمزوری کو اور مستحکم کرنے کی صورت میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ بہرحال یہ ضروری نہیں کہ کوئی مفکر یا شاعر ہر مسئلہ کا صحیح حل پیش کر سکے۔ اور اگر اقبال اس مسئلہ میں ناکام رہے تو یہ ہماری بدقسمتی ہے اور اس سے ان کی عظمت پر حرف نہیں آتا۔؟

ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر ایک ترکی کے قومی شاعر اعظم ضیاء کے وہ اشعار پڑھے جس میں اس نے اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہتا ہے :-

"جب تک عورت کی صحیح اور مکمل اہمیت نہ پہچانی جائے گی۔ قومی زندگی نامکمل رہے گی"

"میں نہیں جانتا کہ ہم نے عورت کو پس پشت کیوں ڈال رکھا ہے"

"تو پھر کیا اس کو اپنی سوئی نیزہ میں تبدیل کر دینی چاہیئے۔ تاکہ وہ ہم سے زبردستی اپنے حقوق حاصل کرے"

کاش یہ الفاظ ہمارے "ترجمان حقیقت" کے ہوتے!

•

سعید جعفری (ام۔اس۔سی)

[1] Bourgois

نقد و نظر

مقالات یوم اقبال

(مرتبہ انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ لاہور۔ سائز ۲۷×۱۷/۸ کاغذ لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ جلد خوبصورت قیمت اردو و انگریزی یک جا تین روپے۔ ناشرین۔ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور)

علامہ اقبال مرحوم کی وفات سے ۲ ماہ پہلے ہندوستان بھر میں یوم اقبال منایا گیا تھا۔ اس موقعہ پر مختلف علمی اور ادبی مجلسوں میں اقبال کی شاعری اور ان کے پیغام پر مضامین پڑھے گئے تھے۔ لاہور کے کالجوں کے نوجوان طلباء نے اپنے زیر اہتمام ایک خاص مجلس منعقد کی اور اس میں چند بیش قیمت مضامین سنائے گئے۔ مقالات یوم اقبال ان مضامین کے مجموعے کا نام ہے۔ چند مضامین اردو میں ہیں اور چند انگریزی میں۔ اردو کے مضامین میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔ **ڈاکٹر اقبال کا علم کلام** ۔ از سید سلیمان ندوی۔ **پیام اقبال اور قرآن کریم** از چودھری غلام احمد پرویز **شاعر ربانی** از راجہ حسن اختر **اقبال اور فنون لطیفہ** از سید عابد علی عابد۔ سید سلیمان اور مولانا عبد السلام ندوی نے اپنے مضمون میں علامہ مرحوم کے ان اشعار پر روشنی ڈالی ہے۔ جو علم کلام کے چند اہم مسائل مثلاً توحید باری۔ معراج۔ وحی و الہام۔ خیر و شر اور تقدیر کو دور حاضر کی ترقی یافتہ ذہنیت اور مسلمانوں کی قومی زندگی کی ضروریات کے مطابق پیش کرتے ہیں۔ اس مقالہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اقبال نے اسلامی عقاید کا اثبات ان کے علمی نتائج سے کیا ہے اور خودی کا جو فلسفہ ان کا مخصوص فلسفہ ہے۔ اس سے انہوں نے ان مسائل کی تشریح و اثبات میں بھی کام لیا ہے" مقالہ زیر نظر میں فاضل مصنفین نے علامہ مرحوم کے عقاید و استدلال کی بعض نہایت لطیف باریکیاں اُن کے اشعار سے نمایاں کی ہیں۔ مثلاً تقدیر کے مسئلہ کی وضاحت اقبال نے ایک جگہہ یوں کی ہے۔

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام ۔ یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خرد مند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر ۔ ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات ۔ مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

ہماری رائے میں یہ مقالہ اپنی سنجیدہ معقولیت اور سلجھے ہوئے انداز بیان کے لحاظ سے اس مجموعے کے حصہ اُردو کا بہترین مقالہ ہے۔

پیام اقبال اور قرآن کریم میں فاضل مقالہ نگار نے علامۂ مرحوم کے کلام میں سے متعدد مثالیں لے کر آیات قرآنی سے ان کی مطابقت اور مماثلت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اقبال نے قرآن کے حقائق کو کس خوبصورتی سے شاعرانہ زبان میں ادا کیا ہے۔ اگرچہ ہمیں یہ امر تسلیم ہے کہ قرآن کے عملی فلسفہ نے اقبال کے نظریۂ عمل پر ایک بڑی حد تک اثر کیا ہے لیکن صاحب مضمون کئی مقامات پر اپنے دعوے کے اثبات میں بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں اور ان کا استدلال معمولی فہم و ذکا سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہہ لکھتے ہیں کہ "زندگی کے سلسل کے متعلق غزل کا بھی ایک شعر سنئے اور دیکھئے غزل کی رنگینی باقی رکھتے ہوئے بھی حقائق کیسے بیان کئے جا سکتے ہیں۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو اب مشکل ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

قیامت کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وَاِذَ النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (جب نفوس کو دوبارہ) اٹھایا جائے گا۔ خاک اپنی پریشانی کے بعد پھر سے دل "بن جائے گی"۔ یہاں فاضل مقالہ نگار نے ایک لطیف مطلع غزل کے ساتھ جو ناانصافی کی ہے وہ ذوق سلیم پر ظاہر ہے۔ ہمیں یہاں پنجابی کے مشہور رومان ہیر کے وہ مفسر یاد آ گئے جو ہیر اور رانجھے کے سوال وجواب کو روح اور جبرئیل امین کا مکالمہ قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کی دور از کار مثالوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو مقالہ خاصہ اچھا ہے۔ اور مضمون نگار کی کاوش اور محنت کا آئینہ دار۔

شاعر ربانی اس مقالہ کی اٹھان بہت اچھی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُسے مختصر کرنے کے لئے اسے اس کے تفصیلی اجزا سے محروم

کر دیا گیا ہے۔ بظاہر صاحب مضمون کو کلامِ اقبال پر بہت عبور حاصل ہے اور انہوں نے بظاہر حقائقِ عالم اور قوموں کے عروج و زوال کے مسائل کا کلامِ اقبال کی روشنی میں بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ مضمون مثالوں سے مالامال ہے اور اگر حیاتِ اجتماعی اور بقائے فرد و ملت کے متعلق اقبال کے کلام میں سے بہترین مثالیں یک جا دیکھتی ہوں تو اس مضمون میں دیکھئے۔

اقبال اور فنونِ لطیفہ۔ بظاہر فنونِ لطیفہ کے متعلق اقبال کے نظریہ کی وضاحت اور اس کے کلام سے اس نظریہ کی تشریح مقصود ہے لیکن مقالہ کا مطالعہ کرنے کے بعد جو اثر ذہن میں باقی رہتا ہے وہ یہ ہے کہ صاحبِ مضمون نے مقالہ کی آڑ میں بعض ہمعصر شعرا پر بلا وجہ زبانِ طعن و تشنیع دراز کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر زیرِ نظر کتاب علامہ اقبال کی زندگی میں مرتب ہوتی اور مرحوم سے اس کی ترتیب کے متعلق مشورہ لیا جاتا تو اُن کی سنجیدگی اس مجموعہ میں موجودہ مضمون کی شمولیت کی ہرگز روادار نہ ہوتی۔ ذکر اقبال کے نظریۂ حُسن کا ہے اور کوسا جا رہا ہے بے چارے جوش کو ؎ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست!

اس سے قطع نظر مضمون میں حُسن اور آرٹ اور ان دونوں کے مظہرِ جمیل "عورت" کے متعلق جو نظریے پیش کئے گئے اور علامہ مرحوم کے چند اشعار کو ان پر چسپاں کر کے اُن کے عام نظریۂ حُسن کو جس رنگ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اس سے ہمیں سخت اختلاف ہے اور ہمیں حیرت ہے کہ صاحبِ مضمون کو ہندوستان بھر کے زندہ ادب میں توانائی اور حیات پروری کی کوئی مثال ملتی ہے تو پنجابی کے اس بے ہنگم سامعہ خراش اور تہی مایہ گیت میں کہ

"جگّا جمیاں تے مانی گڑ ونڈیا
تے گھر گھر نیَن وے پھرے۔ اوڑے۔ اوڑے
تے جگ دی جوانی دے دن تھوڑے"

ہمارے بہت سے ناظرین چونکہ پنجابی سے ناآشنا ہوں گے اس لئے اُن کی آسانی کے لئے پہلے دو مصرعوں کے معنی ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔ تیسرا مصرعہ نسبتاً سہل ہے "جگّا پیدا ہوا تو نو من گڑ بانٹا گیا جیسے نائن گھر گھر بانٹتی پھر رہی ہے۔" اور ان اشعارِ آبدار کے متعلق سید عابد علی صاحب لکھتے ہیں "اس گیت میں نہ صرف پنجاب کے ایک آتش نفس تنومند جاٹ کی ہنگامہ پرور زندگی کی کہانی ہے۔ بلکہ جس طرح ہم اقتصادی طور پر کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ اس طرف نہایت لطیف اشارات ہیں۔ پنجاب کے بعض گیت موضوع کی توانائی اور حیات پروری کے ساتھ لفظوں کی ایک خاص ترکیب اور نفسِ مطلب کے اظہار کا ایک خاص انداز رکھتے ہیں اور ان کو سن کر مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے کہ پاکوبی اور دست افشانی کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے علاوہ ان میں زندگی کے مسائل سے معرکہ آرا ہونے کی ترغیب بھی موجود ہے"۔ بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ ہرچہ شک آرد کافر گردد۔ اس مضمون کی ایک اور خصوصیت عورت دشمنی ہے۔ آرٹ میں عورت کے وجود کو جو رتبہ حاصل ہے۔ اس سے وہی منکر ہو سکتا ہے جو نہ آنکھیں رکھتا ہو اور نہ کان۔ فاضل مقالہ نگار نے آرٹ میں عورت کے درجہ کے متعلق علامہ اقبال کے نظریہ کی وضاحت میں ان کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

؎ ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس!
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

مگر ان کی نظر علامہ ممدوح کے اس شعر کی طرف نہیں گئی۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

"عورت" کی مخالفت اور آرٹ میں اس کے درجہ کی "پستی" پر عابد صاحب نے خوب زورِ قلم صرف کیا ہے۔ حالانکہ خود عابد صاحب کے مضامین نظم و نثر کی رنگینی ہمیشہ عورت کے ذکرِ جمیل کی مرہونِ منت ہے۔

ان مضامین کے علاوہ کچھ منظومات بھی ہیں۔ جناب حفیظ ہوشیارپوری نے عزم للحیات اور خدا کے متعلق علامہ اقبال اور ان کے مقابلے میں شوپنہار اور نٹشے کے نظریے نظم میں پیش کئے ہیں اور خوب پیش کئے ہیں۔ حضرت حفیظ جالندھری نے ایک نظم لکھی ہے "اقبال حفیظ کی نظر میں"۔ نظم یوں تو خاصی ہے لیکن کہیں کہیں غیر مانوس الفاظ اور تراکیب موجود ہیں مثلاً "غراہٹیں" اردو میں نئی چیز ہے۔

حصۂ انگریزی میں تین مضامین قابلِ ذکر ہیں۔

اقبال کا فلسفۂ خودی از ایف کے۔ خان دُرّانی

سیرتِ حسنہ کے متعلق اقبال کا نظریہ از خواجہ غلام السیدین۔

اور اقبال کی شاعری میں "انسان" از پروفیسر گورکھن سنگھ۔ مقدمہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے لکھا ہے اور اس میں عجیب بات یہ ہے کہ کتاب کے مختلف مقالات کے متعلق آپ نے تقریباً کچھ نہیں لکھا۔ ایک آدھ فقرے میں تمام مضمون نگاروں کا تعارف کرا دیا گیا ہے اور نام کسی کا

بھی نہیں لیا گیا۔ ان مضامین پر سیر حاصل تبصرہ کرنا اردو کے ایک ادبی رسالہ کے لئے نہ ضروری ہے اور نہ موزوں۔ اس لئے کتاب کے اس حصہ کے متعلق فقط اسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ بعض مضامین خاصی تحقیق اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔ خصوصاً ورّانی صاحب کا مضمون بہت خیال انگیز ہے۔

کتاب کے مذکورہ محاسن کے مقابلے میں چند خامیاں بھی ہیں اور ان میں سب سے بڑی خامی ایڈیٹنگ کی کمزوری ہے۔ کتابت اور کمپوزنگ کی متعدد دلچسپ غلطیوں (مثلاً وطنیت کی قوم ص۸۔ وحدت وجوب ص۱۸ اس کے ذرّے سے ص۲۱ ILTAF (مقدمہ از پروفیسر تاثیر) وغیرہ وغیرہ) کے علاوہ بعض مضامین میں زبان و محاورہ کی جو غلطیاں ہیں۔ ان کی صحت نہیں کی گئی۔ بلکہ خود مولف صاحب کے اردو مقدمے میں زبان کے نقائص موجود ہیں۔ مثلاً "مبارک بادی کے خطوط" "تذکرہ سے مفقود" وغیرہ۔ بہت اچھا ہوتا اگر ناشرین کتاب کی ایڈیٹنگ کی طرف زیادہ توجہ دیتے اور یہ کام کسی تجربہ کار ادیب کے سپرد کرتے۔ نوجوان آخر نوجوان ہیں ان کی بلند ہمتی میں کلام نہیں لیکن حسنِ تالیف اور شئے ہے۔

"ص"

غزل

دل کو چلے ہیں ڈھونڈنے عالمِ رنگ و بو میں ہم
گیسوئے مشکبو میں ہم ناخنِ ماہ رو میں ہم

موجِ صبا بہار میں پھول لٹائے کو بہ کو
خاک لیئے پڑے رہیں دامنِ آرزو میں ہم

حیف ادھر نہ ہو سکی ایک نگاہ پھر بھی
جلتے رہے تمام شب محفلِ شمع رو میں ہم

صورتِ سرو نامراد، صورتِ سبزہ پائمال
پھولے پھلے نہ عمر بھر گلشنِ آرزو میں ہم

واقعی اک امید ہے وجہِ بقائے کائنات
زندہ ہیں کب سے دن گنے موت کی آرزو میں ہم

دردِ سخن میں بھر چکے، لحن کہاں سے لائیے
سوزِ جگر نہ بھر سکے نجم رگِ گلو میں ہم

نجم ندوی